دیارِ پورب میں علم اور علماء

قاضی اطہر مبارکپوری

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیارِ پورب میں علم اور علماء

از

قاضی اطہر مبارکپوری رح
(۱۹۱۶ء-۱۹۹۶ء)

البلاغ پبلی کیشنز
۱۰-اعظمی اپارٹمنٹ N-1 ابوالفضل انکلیو جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

دیارِ پورب میں علم اور علماء

جس میں

شیرازِ ہند پُورب کی سات سو سالہ اسلامی تاریخ کے چار علمی اَدوار قائم کر کے
ہر دور کی علمی و دینی سرگرمی اور اربابِ فضل و کمال کا اجمالی تعارف
کرایا گیا ہے، اس کے بعد اس دیار کے کئی خانوادہ ہائے علم
و فضل کے علماء و مشائخ، ان کے اساتذہ، تلامذہ،
معاصرین اور متعلقین کا تذکرہ درج ہے،
جس سے سرزمین پُورب میں غلام
سلطنت کے قیام سے لیکر
نوابِ اَودھ کے خاتمہ تک کی علمی و دینی تاریخ معلوم ہوتی ہے۔

از

قاضی اطہر مبارکپوریؒ

(۱۹۱۶ء - ۱۹۹۶ء)

نام کتاب : دیار پورب میں علم اور علماء

مصنف : قاضی اطہر مبارکپوری

تصحیح : مولانا قمر الزماں مبارکپوری

کمپوزنگ : القاضی کمپیوٹر مبارکپور اعظم گڑھ

طبع اول : ۱۳۹۹ھ مطابق ۱۹۷۹ء

طبع دوم : ۱۴۳۰ھ مطابق ۲۰۰۹ء

قیمت : ۳۵۰ روپے

ناشر : **البلاغ پبلیکیشنز**، N-1/10 ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی ۔ ۲۵

ملنے کے دیگر پتے:

۱۔ **البدر بک سنٹر**، مہاجنی ٹولہ، سرائے میر، اعظم گڑھ، یوپی

۲۔ قاضی اطہر اکیڈمی، مبارکپور، اعظم گڑھ، یوپی

Name of Book : **Deyare Purab Mein Ilm Aur Ulama**

Author : **Qazi Athar Mubarak Puri**

Published by : **Al-Balagh Publications**

N-1/10 Abul Fazl Encalve

Jamia Nagar, New Delhi-110025

Phone: 011-26942592

E-mail: abpublications@gmail.com

Price Rs.350.00

شجرۂ نسب خانوادۂ قاضیان

مبارک پور ضلع اعظم گڑھ اتر پردیش انڈیا

قاضی شیخ علی

قاضی شیخ امام بخش

قاضی محمد رضا — قاضی شیخ حسام الدین

قاضی شیخ رجب

میاں جی حاجی لعل محمد — میاں جی ولی محمد

میاں جی محمد شفیع — میاں جی حاجی محمد عمر

میاں جی عبداللہ — میاں جی حاجی اسداللہ — میاں جی حاجی محمد حسین — میاں جی حاجی محمد حسن

مورخ اسلام مولانا قاضی اطہر مبارک پوری — قاضی حیات النبی — قاضی ضیاء النبی — قاضی غلام النبی — قاضی عبدالعزیز

قاضی خالد کمال — قاضی ظفر مسعود — قاضی سلمان مبشر — قاضی حسان احمد

قاضی فوزان طارق — قاضی فرحان احمد — قاضی عدنان احمد — قاضی ریحان احمد

قاضی فیصل — قاضی محمد — قاضی ریان احمد

مراجع ومصادر

(۱)	اخبار الاخیار	شاہ عبدالحق محدث دہلوی	ہاشمی پریس دہلی
(۲)	اخبار الاصفیاء	مولانا عبدالصمد انصاری اکبرآبادی	مجتبائی پریس وقلمی
(۳)	اعظم گڑھ گزیٹیر	مسٹر ڈی،ایل،ڈرک بروکمان	الہ آباد
(۴)	اذکار ابرار ترجمہ گلزار ابرار	مولانا فضل احمد	مفید عام پریس آگرا
(۵)	انتصاح عن ذکر اہل الصلاح	شاہ محمد علی قلندر	مطبوعہ ۱۲۹۴ھ
(۶)	انوار العیون فی اسرار المکنون	شیخ عبدالقدوس گنگوہی	گلزار محمدی پریس لکھنؤ
(۷)	الافاضۃ القدوسیہ	مولانا شریف احمد مصطفےٰ آبادی مبارکپوری	احمدی پریس الہ آباد
(۸)	اقبال نامہ جہانگیری	معتمد خان ساقی	
(۹)	آئینہ اودھ	مولانا ابوالحسن قطبی مانکپوری	نظامی پریس کانپور
(۱۰)	برکات الاولیاء	مولوی امام الدین گلشن آبادی	افضل المطابع ۱۳۲۲ھ
(۱۱)	بیت الکلام فی وفیات الاعلام	مولانا خوب اللہ الہ آبادی	حیدرآباد
(۱۲)	بحر زخار	شیخ وجیہ الدین اشرفی لکھنوی	قلمی ۱۲۴۰ھ
(۱۳)	بادشاہ نامہ جلد اول	عبدالحمید لاہوری	
(۱۴)	باغستان	اماالدین رضی	
(۱۵)	تاریخ فرشتہ	محمد قاسم فرشتہ	نول کشور لکھنو
(۱۶)	تاریخ المنوال	مولانا عبدالسلام مبارکپوری	احمدی پریس پٹنہ
(۱۷)	تذکرہ علماءھند	مولوی رحمان علی	نول کشور لکھنو
(۱۸)	تذکرۃ العلماء	مولوی خیر الدین الہ آبادی	الطافی پریس کلکتہ

(۱۹)	تذکرہ علماء مبارکپور	مورخ اسلام مولانا قاضی اطہر مبارکپوری	رحیمی پریس بمبئی
(۲۰)	تذکرہ صبح وطن	نواب محمد غوث خاں بہادر	مطبع کشن راج مدراس
(۲۱)	تجلی نور	مولوی نور الدین زیدی ظفر آبادی	جادو پریس جونپور
(۲۲)	تاریخ بنارس		
(۲۳)	تاریخ اودھ	مولوی نجم الغنی	لکھنو
(۲۴)	ترجمہ مآثر الکرام	صمصام الدولہ شاہنواز خان	لاہور
(۲۵)	تراجم علماء اھل حدیث	مولانا تکی نوشہروی	دلی
(۲۶)	جامع کرامات الاولیاء	شیخ یوسف بن اسمٰعیل سہانی	مصر
(۲۷)	جونپور نامہ	مولوی خیر الدین محمد جونپور	قلمی
(۲۸)	حیات شبلی	علامہ سید سلیمان ندوی	معارف پریس اعظم گڈھ
(۲۹)	حدیقۃ الاقالیم	مولوی خیر الدین محمد جونپوری	نول کشور لکھنو
(۳۰)	خلاصۃ الاثر	شیخ محمد امین بن فضل اللہ شامی	مصر
(۳۱)	خلاصہ تاریخ مسعودی	مولوی محمد صادق	غالب الاخیار پریس
(۳۲)	خزینۃ الاولیاء	مفتی غلام سرور ہاشمی لاہوری	مطبع ثمر ہند لکھنو
(۳۳)	رسالہ جبر واختیار	ملا محمود جونپوری	برکات اکبر الہ آباد
(۳۴)	رسالہ شطاریہ	شیخ عبداللہ شطاری	
(۳۵)	سبحۃ المرجان	مولانا غلام علی آزاد بلگرامی	بمبئی
(۳۶)	سمات الاخیار	مولوی عبدالمجید مصطفےٰ آبادی	اکلیل بہرائچ
(۳۷)	سفینۃ الاولیاء	شاہزادہ داراشکوہ	منشی نول کشور لکھنو
(۳۸)	سیرۃ البخاری	مولانا عبدالسلام مبارکپوری	دلی
(۳۹)	سنن ترمذی	امام ابوموسیٰ ترمذی	دلی
(۴۰)	سنن ابی داؤد	امام ابوداؤد سجستانی	دلی

(۴۱)	شمس بازغہ	ملا محمود جونپوری	لکھنؤ
(۴۲)	شیر وشکر	مولانا شاہ ابوالخیر بھیروی	قلمی
(۴۳)	صبح وطن	مولانا نواب سید علی حسن خان	بھوپال
(۴۴)	صحیح البخاری	امام بخاری	مصر
(۴۵)	صحیح مسلم	امام مسلم قسیری	مصر
(۴۶)	طبقات اکبری	مولانا نظام الدین مقیم ہروی	نول کشور لکھنؤ
(۴۷)	طبقات الشافعیۃ الکبریٰ	شیخ تاج الدین سبکی	مصر
(۴۸)	عمل صالح	محمد صالح کنبوہ	لاہور
(۴۹)	غزانامہ مسعود	مولوی عنایت حسین	نظامی پریس کانپور
(۵۰)	الفرائد فی شرح الفوائد	ملا محمود جونپوری	بنارس
(۵۱)	فتوح البلدان	علامہ ابوالحسن بلاذری	مصر
(۵۲)	القلائد من الفرائد	مولانا احمد حسین رسول پوری مبور کپوری	ڈھاکہ بنگلہ دیش
(۵۳)	کشف الظنون	ملا کاتب چلپی	استنبول
(۵۴)	کرامات الاولیاء	شیخ نظام الدین احمد صدیقی	قلمی
(۵۵)	کتاب الانتصار	الخیاط	مصر
(۵۶)	کتاب اللمع	ابوالحسن الاشعری	قاہرہ
(۵۷)	گلزار ابرار	مولانا شاہ حسن غوثی	قلمی
(۵۸)	گنج ارشدی	مولانا شاہ غلام رشید جونپوری	قلمی
(۵۹)	گلزار اعظم	نواب والا جاہ	مدراس
(۶۰)	گل رعنا	علامہ عبدالحیٔ لکھنوی	لکھنؤ
(۶۱)	گنج فیاضی		
(۶۲)	گلزار ابراہیم		

(۶۳)	لطائف اشرفی	شیخ نظام الدین غریب یمنی	نصرت المطابع دہلی
(۶۴)	المنجد	معلوف یسوعی	بیروت
(۶۵)	منہاج الادلۃ		
(۶۶)	مآثر الکرام	مولانا غلام آزاد بلگرامی	مفید عام آگرہ
(۶۷)	معجم البلدان	یاقوت حموی	مصر
(۶۸)	مرآۃ الاسرار	مولانا عبدالرحمن چشتی	قلمی
(۶۹)	مشکوٰۃ النبوۃ	شیخ سید علی موسوی حیدرآبادی	قلمی
(۷۰)	مطلوب الطالبین	شاہ محمد ملاق	قلمی
(۷۱)	مظہر الاحدیہ	مولوی عبدالاحد ظفرآبادی	مطبع کاظمی کانپور
(۷۲)	مناقب غوثی	شیخ شمس الدین حیدری	قلمی
(۷۳)	مآثر الاسرار	مولانا غلام آزاد بلگرامی	مفید عام آگرہ
(۷۴)	ماہنامہ معارف	دارالمصنفین	معارف پریس اعظم گڈھ
(۷۵)	نتائج الافکار	محمد قدرۃ اللہ گوپاموی	بمبئی
(۷۶)	نجات الرشید	ملا عبدالقادر بدایونی	لاہور
(۷۷)	نزہۃ الخواطر	علامہ عبدالحیٔ لکھنوی	حیدرآباد
(۷۸)	واقعات وحوادث مبارکپور	مولوی علی حسن فاروقی مبارکپوری	قلمی
(۷۹)	الهند فی العهد الاسلامی	علامہ عبدالحیٔ حسنی	حیدرآباد

فہرست مضامین

اظہارتشکر

از: قاضی سلمان مبشر مبارکپوری

الحمدلله وحده والصلاة والسلام علی من لانبی بعده امابعد۔

والد محترم مورخِ اسلام حضرت مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ کی اہم ترین تصنیف ''دیار پورب میں علم اور علماء'' پہلی بار ۱۹۷۹ء میں ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہوئی تھی، چونکہ اس کتاب کی اشاعت پر ایک عرصہ گزر چکا ہے اور اہل علم حضرات کی طرف سے اسکا مطالبہ ہورہا ہے اہمیت کے مدنظر دوبارہ شائع کی جارہی ہے۔

چونکہ ماضی میں شیراز ھند جونپور دیار پورب میں علم وعلماء کا گہوارہ رہا ہے ، اس لئے اس دیار کے اہل علم اپنے ماضی کے علمی ودینی گہوارہ کی تلاش میں سرگرداں ہیں، اور ماضی کی طرف نظر ڈالنے کے لئے ، اگر اس وقت کوئی کتاب ہے تو وہ ''دیار پورب میں علم اور علماء'' ہے۔ اس کی ورق گردانی کے بعد کچھ نہ کچھ ماضی کی علمی روشنی نظر آتی ہے، اس لئے اس کتاب کی اہمیت وافادیت اور زیادہ ہوگئی ہے۔

چونکہ ابھی تک ہندوستان کے دیار پورب کی کوئی دینی وعلمی تاریخ اس کتاب سے پہلے نہیں لکھی گئی ہے، نہ ہی حکمراں اور اہل علم حضرات کی طرف سے اس میدان میں کوئی توجہ دی گئی تھی، بلکہ عمدا دیار پورب کو نظر انداز کیا گیا جبکہ جونپور کو شیراز ھند سے تعبیر کیا گیا تھا، مگر یہ سیاست اور اقتدار کی ستم ظریفی ہے جس پر صرف افسوس کیا جاسکتا ہے۔

مورخ مبارکپوریؒ نے یہ کمی شدت سے محسوس کی اور اس خلاء کو پر کرنے کی کوشش کی اور دیار پورب کی سات سو سالہ اسلامی وعلمی تاریخ کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے ،آپ نے جو کچھ لکھا ہے، اس پر کسی نے کوئی اضافہ نہیں کیا ہے۔

اس وقت تصنیف وتحقیق کا میدان وسیع ہوتا جارہا ہے، دیار پورب میں دینی وعلمی اداروں کی تعداد زیادہ ہے، اوران علوم کے حاملین کی کثرت ہے اس لئے توقع ہے کہ یہ کتاب اس طبقہ کے لئے سنگ میل ثابت ہوگی، اور اس میدان کے شہ سواروں کی رہنمائی کرے گی۔

اللہ تعالیٰ سے دعاء ہے کہ اس کتاب کو قبول عطا فرمائے ، اور مصنف کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین یارب العالمین۔

طالب دعاء

قاضی سلمان مبشر مبارکپوری
مدیر قاضی اطہر اکیڈمی
مبارکپور اعظم گڑھ یوپی انڈیا

المرقوم ۱۰/ ۵/ ۱۴۲۹

مطابق ۱۷/ ۵/ ۲۰۰۸ء

Tel : 0091-5462-250640
Mob: 0091-9936381171

عزمِ مومن

از مصنف

سایۂ شمشیر میں یہ کار کرسکتا ہوں میں
جذبۂ آزادی کا اظہار کرسکتا ہوں میں

جس میں آزادی سے ہو نہ سانس لینا بھی نصیب
لعنت ایسی زیست پر سو بار کرسکتا ہوں میں

آج بھی پابندیِ رسمِ خلیل اللہ سے
آتش نمرود کو گلزار کرسکتا ہوں میں

اسوۂ یوسف ہے زنداں میں شریکِ زندگی
حلقۂ زنجیر سے بھی پیار کرسکتا ہوں میں

ہم نشیں! طائف کے ان خوں پوش لمحوں کی قسم
زندگی کو خوگرِ آزار کر سکتا ہوں میں

یاد ہے مجھ کو ابھی رسمِ خبیبِ پاکباز
ہنس کے پوری آرزوئے دار کرسکتا ہوں میں

میں مجاہد ہوں، بحقِ غازیانِ صف شکن
آج بھی نیزوں کو شعلہ بار کرسکتا ہوں میں

چھیڑ کر اطہر! سرِ بزمِ وغا سازِ جہاد
اپنے ہر اک شعر کو تلوار کرسکتا ہوں میں

بسم اللہ الرّحمٰن الرحیم

تعارفِ مصنف

مورخِ اسلام

حضرت مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ کے مختصر حالاتِ زندگی

از- مولانا قمرالزماں مبارکپوری سکریٹری جعفرلائبریری مبارکپور ضلع اعظم گڑھ اتر پردیش

مورخِ اسلام حضرت مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ کا خاندانی نام عبدالحفیظ بن شیخ حاجی محمد حسن ہے۔ انھوں نے ۴ر رجب ۱۳۳۴ھ مطابق ۷ر مئی ۱۹۱۶ء کو محلّہ حیدر آباد، قصبہ مبارکپور، ضلع اعظم گڈھ، صوبہ اتر پردیش کے ایک ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی جو مغل بادشاہ ہمایوں کے دورِ حکومت میں راجہ سید شاہ مبارک رحمتہ اللہ علیہ بانیِ مبارکپور کے ہمراہ ضلع الہ آباد کے کڑا مانک پور سے ترکِ سکونت کر کے یہاں آباد ہوا تھا۔

مولانا کے خاندان میں ایک عرصہ تک نیابتِ قضا کا عہدہ قائم تھا۔ اسی لئے آپ بھی قاضی کہے اور لکھے جاتے ہیں، انگریزوں کے آخری دور میں محکمہ قضا ایک اعزازی محکمہ تھا، مبارکپور کے قریب محمد آباد گوہنہ دارالقضا تھا اور قاضی محمد سلیم متوفٰی ۱۲۶۶ھ ربیع الآخر ۱۲۵۰ھ سے سولہ برس تک محمد آباد گوہنہ کے قاضی القضاۃ رہے۔ جنھوں نے مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ کے جدِ اعلیٰ شیخ امام بخش کو مبارکپور کا نائب مقرر کر کے اس حلقہ میں اقامت دین وامامت جمعہ وعیدین، پیش آمدہ وقتی مسائل، نکاح، طلاق، وراثت، اختلاف بین المسلمین کے قضایا وغیرہ کی انجام دہی کی ذمہ داریاں سپرد کیں۔

مورخِ اسلام مبارکپوریؒ کے پردادا شیخ محمد رجب بن شیخ محمد رضا کے دو صاحبزادے

تھے، میاں جی حاجی لعل محمد اور میاں جی ولی محمد، میاں جی ولی محمد کے دولڑ کے تھے، میاں جی محمد شفیع مرحوم اور میاں جی حاجی محمد عمر مرحوم۔ میاں جی حاجی لعل محمد زندگی بھر کسی نہ کسی درجہ میں خاندانی روایات کے حامل رہے، حج وزیارت کی دولت حاصل کی تھی۔ انکی اولاد میں ۴/صاحبزادے اور دو لڑکیاں تھیں۔ (۱) میاں جی عبداللہ متوفی ۱۵/رجب ۱۳۵۷ھ (۲) میاں جی حاجی اسداللہ متوفی ۲۵/صفر ۱۳۸۲ھ (۳) میاں جی حاجی محمد حسین متوفی ۲۵/رجب ۱۳۶۵ھ (۴) میاں جی حاجی محمد حسن متوفی ۱۸/فروری ۱۹۷۸ء۔ الحمدللہ میاں حاجی لعل محمد کے چاروں صاحبزادوں نے متاہل زندگی گزاری اور ان کا خاندان اپنے وطن مبارکپور میں رہتا ہے۔

مورخ مبارکپوریؒ کے والد شیخ حاجی محمد حسن بھائیوں اور بہنوں میں سب سے چھوٹے تھے، ان کے کل چھ اولادیں ہوئیں، جن میں پانچ لڑکے اور ایک لڑکی۔ سب نے متاہل زندگی گزاری، جن کی ترتیب مندرجہ ذیل ہے:

(۱) مورخِ اسلام مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ متوفی بروز یکشنبہ ۲۸/صفر ۱۴۱۷ھ مطابق ۱۴/جولائی ۱۹۹۶ء، اپنے بھائی بہنوں میں سب سے بڑے تھے، اور آپ کی کل آٹھ اولادیں ہوئیں، جن میں چھ لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں۔

(۲) محمودہ خاتون متوفیہ ۱۹۹۵ء، ان کی کل آٹھ اولادیں ہیں، جن میں چھ لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں

(۳) قاضی حیات النبی متوفی ۱۹۸۰ء، ان کے دو لڑکے ہیں۔

(۴) قاضی ضیاء النبی متوفی ۱۹۹۴ء کل پانچ اولادیں ہیں، جن میں دو لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں۔

(۵) قاضی غلام النبی بقید حیات ہیں، اور چھ اولاد کے والد ہیں، جن میں دو لڑکے اور چار لڑکیاں ہیں۔

(۶) قاضی عبدالعزیز باحیات ہیں، اور انکی کل نو اولادیں ہیں، جن میں ۷/لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں آپ کے تمام بھائی اور انکی اولاد مبارکپور میں رہائش پذیر ہیں اور زندگی کی دوڑ میں جدوجہد کررہے ہیں۔

مولانا نے گھر پر اپنے والدین مکرمین سے ابتدائی ناظرہ پڑھا اور محلّہ کے ایک گھریلو مکتب میں تیسرا پارہ پڑھنے کے دوران جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور میں داخلہ لیا۔ یہاں حافظ علی حسن سے ختم قرآن کرکے، منشی عبدالوحید لاہرپوریؒ سے اردو، منشی اخلاق احمد سے ریاضی اور

مولانا نعمت اللہ مبارک پوریؒ سے فارسی وخوش نویسی کی تعلیم پائی۔ صفر ۱۳۵۰ھ تا شعبان ۱۳۵۹ھ تک تقریباً دس برس اسی مدرسہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور کے با صلاحیت اساتذہ: حضرت مولانا مفتی محمد یٰسین مبارکپوریؒ متوفی ۲۲ر محرم ۱۴۰۴ھ سے اکثر و بیشتر کتابیں، مولانا شکراللہ مبارکپوریؒ متوفی ۵ر ربیع الاول ۱۳۶۱ھ سے منطق و فلسفہ کی زیادہ تعلیم، مولانا بشیر احمد مبارکپوریؒ متوفی ۳ر شوال ۱۴۰۴ھ سے علم منطق کی بعض کتابیں، مولانا محمد عمر مظاہری مبارکپوریؒ متوفی ۱۳ر اپریل ۱۹۹۵ء سے تفسیر جلالین اور اپنے حقیقی ماموں مولانا محمد یحیٰی رسولپوریؒ متوفی ۱۱ر صفر ۱۳۸۷ھ سے عروض وقوافی اور ہیئت کے بعض اسباق کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اردو، فارسی اور عربی میں صاحبِ کمال ہوئے۔ آخری سال دورۂ حدیث کے لئے جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد گئے اور وہاں حضرت مولانا سید فخر الدین احمد متوفی ۱۳۹۲ھ سے صحیح بخاری، سنن ابن ماجہ، سنن ابی داؤد، مولانا سید محمد میاں متوفی ۱۶ر شوال ۱۳۹۵ھ سے سنن ترمذی، دیوان حماسہ اول، مقاماتِ زمخشری اور مولانا محمد اسمٰعیل سنبھلیؒ متوفی ۱۳۹۵ھ سے صحیح مسلم پڑھ کر ۱۳۵۹ھ میں سند فراغ حاصل کی۔

مولانا اپنی طالب علمی کے زمانہ ہی میں اپنی قوتِ مطالعہ اور کثرت مطالعہ کتب بینی کی وجہ سے عربی زبان وادب کے متعلقات ومبادی جیسے لغت، اشتقاق، خاصیاتِ ابواب، صلات نحو، صرف، وغیرہ کے باب میں بڑی صلاحیت وبصیرت حاصل کر چکے تھے۔ ان کے عربی کا ذوق مقاماتِ حریری، دیوان حماسہ، دیوانِ متنبّی، سبعہ معلقہ کے درس اور لغت وادب کی کتابوں کے مطالعہ کا نتیجہ ہے، ابتداء میں کڑی محنت ومطالعہ کی برکت تھی کہ قاضی صاحب نے اپنی تعلیمی زندگی میں مشکل مقامات کو حل کرنے کی پوری پوری صلاحیت پیدا کر لی تھی، جس کی وجہ سے اس دور کو انھوں نے نہایت نشاط علمی کے ساتھ گزارا۔ یہی وجہ تھی کی قاضی صاحب کو اپنی طالب علمی کے دور ہی میں مدرسہ احیاء العلوم کے عربی تلامذہ کی بعض درسی کتابوں کی تدریس وتفہیم کی ذمہ داری اربابِ بست وکشاد کی طرف سے سونپی گئی، جس کو مورخ مبارک پوریؒ نے نہایت خوش اسلوبی اور تمام تر علمی کامیابیوں کے ساتھ سرانجام دیا۔

مولانا کو ابتدا ہی سے کتابوں کے جمع کرنے اور خرید نے کا شوق تھا، انھوں نے جلد سازی

کرکے اس کی رقم سے بڑی اہم اہم کتابیں جمع کیں، کتاب و مطالعہ کے اسی ذوق کی وجہ سے ان میں مضمون نگاری اور شعر و شاعری کا رجحان پیدا ہوا، اس طرح مولانا کا پہلا مضمون ''مساوات'' کے زیرعنوان رسالہ'' مومن بدایوں '' کے دسمبر ۱۹۳۴ء مطابق ۱۳۵۳ھ میں شائع ہوا جو ان کے حصولِ تعلیم کی مدت ہے، اسی طرح مولانا کی پہلی نظم فرقان بریلی کے شمارۂ جمادی الثانی ۱۳۵۷ھ میں'' مسلم کی دعا '' کے عنوان سے چھپی۔

مولانا مبارکپوری تکمیلِ تعلیم کے بعد شوال ۱۳۵۹ھ سے محرم ۱۳۶۴ھ تک یعنی ساڑھے چار سال تک اپنی مادرِ علمی احیاء العلوم میں عربی کے مدرس رہے۔ کچھ وقفہ کے بعد شوال ۱۳۶۶ھ سے صفر ۱۳۶۷ھ مطابق یکم اکتوبر ۱۹۴۶ء تا جنوری ۱۹۴۷ء کل پانچ ماہ تک اسی مدرسہ میں عربی کے عارضی مدرس بھی رہے۔

مولانا فراغت کے بعد کافی مالی پریشانی میں رہے، امرتسر اور لاہور گئے۔ وہاں جنوری ۱۹۴۷ء میں مولانا عثمان فارقلیط مدیر روزنامہ'' زمزم '' کے نائب اڈیٹر بنائے گئے، اور ان کی رہنمائی میں صحافت میں قدم رکھا لیکن وہ ۱۰؍جون کو تقسیم ھند کی شورش سے وطن لوٹ آئے اور پھر کبھی نہ جا سکے۔ محرم ۱۳۶۷ھ/نومبر ۱۹۴۷ء تا رجب ۱۳۶۷ھ/ ۱۹۴۸ء بہرائچ میں ہفتہ وار اخبار'' انصار'' کے مدیر رہے، جو سات ماہ کے بعد حکومت اتر پردیش کی معاندت کے بعد بند ہوگیا۔ شوال ۱۳۶۷ھ/ ۱۹۴۸ء سے شعبان ۱۳۶۷ھ/ ۱۹۴۹ء تک جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں مدرس رہے۔ یہاں کا ایک سالہ تدریسی دور مولانا کے علمی و قلمی زندگی کا اہم ترین دور ہے۔ رجال السند والہند کی ابتداء یہیں ہوئی جو علمائے سندھ اور ہند کے احوال و کوائف میں ایک اہم کتاب سمجھی گئی ہے۔

تلاشِ معاش میں قاضی صاحب ذوالحجہ ۱۳۶۸ھ نومبر ۱۹۴۹ء میں بمبئی گئے، اور وہاں جمیعتہ العلماء صوبہ بمبئی کے دفتر میں کام کرنے لگے، اس طرح آٹھ ماہ گزارنے کے بعد جب ۱۵؍جون کو ۱۹۵۰ء کو روزنامہ'' جمہوریت'' بمبئی کا پہلا شمارہ اشاعت پذیر ہوا تو مولانا اس کے نائب مدیر بنا دیئے گئے، آپ کی محنت اور لگن کی وجہ سے روزنامہ چند ہی دنوں میں بمبئی کا مقبول ترین روزنامہ سمجھا جانے لگا، اور روزنامہ''انقلاب'' بمبئی کی مقبولیت اور دائرہ اثر کو بھی متاثر

کرنے لگا، فروری ۱۹۵۱ء سے مقبول ترین اخبار ''انقلاب'' سے وابستہ ہو کر اس کے نائب مدیر کے فرائض انجام دینے لگے، مولانا کے مضامین اور قلمی نوادر کی وجہ سے ''انقلاب'' کو بہت فروغ ملا، اس اخبار میں مولانا کے تو ہونے کو تین تین چار چار کالم ہوتے تھے، مگر اس میں احوال و معارف کو جو ہر قسم کی معلومات کا خزانہ ہوا کرتا تھا۔ قدیم و جدید دونوں حلقوں میں مقبولیت حاصل تھی۔ ۲۳ر فروری ۱۹۵۱ء سے ۱۰ر اپریل ۱۹۹۱ء تک کے ''انقلاب'' میں مطبوعہ احوال و معارف کو اگر کتابی صورت میں الگ الگ عنوان کے تحت مرتب کیا جائے تو کئی معیاری کتابیں صورت پذیر ہو سکتی ہیں۔ اور اس طرح منتشر اور پھیلا ہوا کالم علمی حلقوں میں مصادر و مراجع کا بہترین ذریعہ بن سکتا ہے۔ مگر یہ کام ایک مرد کار کی توجہ سے ہی انجام پا سکتا ہے۔

جب ۱۴ر مئی ۱۹۵۴ء کو ہفتہ روزہ ''البلاغ'' کا اجرا ہوا تو اسی کے ساتھ ماہ نامہ ''البلاغ'' بمبئی کی تاسیس بھی ہوئی اور دوسرے دو مدیروں کے ساتھ مولانا کو بھی اسکی ارادت میں شریک کیا گیا، کچھ دنوں کے بعد دونوں مدیروں نے رسالہ سے ترکِ تعلق کر لیا، مگر مولانا مبارک پوری نے تقریباً ۲۶ رسال تک ''البلاغ'' کا مدیر تحریر رہ کر اس کو جاری رکھا۔

مولانا کی علمی زندگی علمی و قلمی انہماک واشتغال، سادگی و پرکاری، توکل و استغنا، ایمان و یقین، خود اعتمادی خوش اعتقادی، حزم و احتیاط، نظم و ضبط، کم گوئی و استغراق، تفکر و تبحر، محنت و جاں فشانی، جگر کاوی و دل سوزی، یکسوئی و دل جمعی، ترتیب و تنظیم، تہذیب و شائستگی، خوش نظری و جہاں بینی اور خوش روئی و خوش خلقی سے عبارت تھی۔ بمبئی جیسے دولت کے شہر میں رہکر مولانا کو دنیاداری اور دولت کمانے کے بہت سے مواقع نصیب ہو سکتے تھے، مگر مولانا میں جو دنیا بیزاری، علم پروری اور اخلاص کا جذبہ تھا، اس نے دولت کمانے کے تمام راستوں سے گریز کیا، سعودی عربیہ اور عرب ممالک کے سلطانوں، رئیسوں، تاجروں اور قدر دانوں میں اپنا علمی اثر و نفوذ رکھنے کے باوجود اس طرح کی تمام پیشکش کو انھوں نے ٹھکرا دیا، جس سے دولتِ دنیا میں اضافہ ہو سکتا تھا، مولانا اپنے دینی و علمی اور قلمی اشتغال میں یوں کھوئے رہے کہ قوتِ لا یموت سے صرف تعلق باقی رکھا، دوسرے تمام رشتوں اور رسم دل بستگی و دل جوئی کو اپنی ذاتی زندگی میں کبھی کوئی اہمیت نہیں دی، آپ کو پانچ

مرتبہ حج وزیارت کی سعادت نصیب ہوئی۔

مولانا صرف ایک ادیب وشاعر ہی نہیں تھے، وہ دین وسیاست کے ساتھ عملی زندگی سے بھی ربط رکھتے تھے، اور دوسری تحریکوں سے دلچسپی رکھنے کے دوش بدوش علمی ودینی اداروں کی تاسیس میں بھی گرمی دکھاتے تھے، ۱۱ر جمادی الثانی ۱۳۷۱ھ ۱۹۵۱ء کو مدرسہ مفتاح العلوم بھیونڈی کو جاری کیا، جو آج بھی ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے، اسی طرح مبارک پور میں تصنیف و تالیف کے لئے دائرہ ملیہ قائم کیا، اس ادارہ کے ذریعہ آپ کی کچھ کتابیں شائع ہوئیں، جدید تعلیم کے لئے ۱۰ر اپریل ۱۹۷۶ء کو انصار گرلس اسکول مبارک پور اور ۱۴۰۰ھ میں مدرسہ حجازیہ کی تاسیس عمل میں آئی۔

قاضی صاحب کے اساتذۂ احیاء العلوم میں کوئی ادیب وشاعر، صحافی وانشا پرداز مصنف و مرتب نہیں تھا، مگر انھوں نے اپنی ذاتی صلاحیتوں اور خداداد مہارت سے اس تصور کو عملاً سچ کر دکھایا کہ اگر انسان میں شاہین کا تجسس اور چیتے کا جگر ہے، نیز عزم وحوصلہ کی کمی نہیں ہے تو وہ چھوٹی جگہ رہتے ہوئے بھی، مرحلۂ وہم وگمان سے گزر کر رجال علم کی صف میں اپنی جگہ بنا سکتا ہے، اور معاشرہ کو اپنی موجودگی کا احساس دلا سکتا ہے۔ مولانا مرحوم کی ایک ایک سطر اپنے اندر علمی و تعلیمی نشاط، تاریخی وکتابی جذبۂ شوق، بلند حوصلگی، عالی ہمتی، خودسازی وعہد سازی کا تموج واہتزاز رکھتی ہے۔

مورخِ اسلام مبارک پوری کے زرنگار قلم سے پچاس کتابیں منصۂ شہود پر آئی ہیں، سب سے پہلی کتاب ''اسلامی نظامِ زندگی،، ۱۹۴۹ء میں بمبئی سے شائع ہوئی اور سب سے آخری کتاب وفات سے چند روز پہلے ۱۹۹۶ء میں ''خواتینِ اسلام کی دینی وعلمی خدمات،، شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیو بند سے شائع ہوئی، انکی اکثر کتابیں دوبارہ شائع ہو رہی ہیں، آپ کی کتاب ''عرب و ہند عہدِ رسالت میں،، اور ''ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں،، کا عربی وسندھی زبان میں ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے، اسی طرح ''رجال السند والہند،، کا اردو ترجمہ منتظر اشاعت ہے، آپ کی زندگی میں بعض کتابیں شائع نہیں ہو سکی تھیں، جنکی اشاعت کی اب تیاری ہو رہی ہے، آپ کی مطبوعہ تصانیف کی فہرست

مندرجہ ذیل ہے:

(۱) ائمہ اربعہ (۲) اسلامی نظامِ زندگی (۳) افاداتِ حسن بصری (۴) اسلامی شادی (۵) آسودگانِ خاک (۶) اسلامی ہند کی عظمت رفتہ (۷) آثار و اخبار (۸) بناتِ اسلام کی دینی و علمی خدمات (۹) تبلیغی و تعلیمی سرگرمیاں عہدِ سلف میں (۱۰) تاریخ اسماء الثقات (عربی) (۱۱) تذکرۂ علمائے مبارک پور (۱۲) تدوین سیرو مغازی (۱۳) جواہر الاصول فی علم حدیث الرسول (عربی) (۱۴) جواہر القرآن (۱۵) الحکومات العربیۃ فی الہند و السند (عربی) (۱۶) حج کے بعد (۱۷) خلافتِ راشدہ اور ہندوستان (۱۸) خلافتِ امیہ اور ہندوستان (۱۹) خلافتِ عباسیہ اور ہندوستان (۲۰) خیر القرون کی درسگاہیں (۲۱) خواتین اسلام کی علمی و دینی خدمات (۲۲) دیارِ پورب میں علما اور علماء (۲۳) دیوانِ احمد (۲۴) رجال السند و الہند الی القرن السابع (عربی) (۲۵) صالحات (۲۶) طبقات الحجاج (۲۷) العرب و الھند فی عھد الرسالۃ (عربی) (۲۸) العقد الثمین فی فتوح الھند و من ورد فیھا من الصحابۃ والتابعین (عربی) (۲۹) علی و حسین (۳۰) علمائے اسلام کے القاب و خطابات (۳۱) عرب و ہند عہدِ رسالت میں (۳۲) قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک (۳۳) قاضی اطہر مبارکپوریؒ کے سفرنامے (۳۴) علمائے اسلام کی خونیں داستانیں (۳۵) کاروانِ حیات خود نوشت سوانح (۳۶) مآثر و معارف (۳۷) معارف القرآن (۳۸) مسلمانوں کے ہر طبقہ میں علم اور علماء (۳۹) مئے طہور (۴۰) محمد کے زمانے کا ہندوستان (۴۱) مطالعات وتعلیقات (۴۲) مکتوب امام احمد بن حنبل (۴۳) ھندوستان میں علم حدیث کی اشاعت (۴۴) مسلمان (۴۵) الھند فی عھد العباسیین (عربی) (۴۶) ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں۔

مولانا مرحوم کے ان مستقل تصنیفی کاموں کے علاوہ سینکڑوں علمی، دینی اور تاریخی مقالات و مضامین ''البلاغ'' بمبئی، ''معارف'' اعظم گڑھ، ''برہان'' دہلی، ''صدق جدید'' لکھنؤ، دارالعلوم دیوبند اور دیگر اخبار ورسائل میں شائع ہوئے ہیں، ان بکھرے ہوئے علمی و دینی جواہر

پاروں کو کتابی شکل دینے کی کوشش کی جارہی ہے۔

مولانا کی علمی وقلمی خدمات کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا، حکومتِ ہند نے ۱۹۸۵ء میں صدر جمہوریہ ایوارڈ دیا، ۱۹۸۴ء و ۱۹۸۶ء میں صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق نے اعترافِ علمی میں دیگر تحائف اور نشانِ پاکستان دیا، اسی کے ساتھ پاکستانی دانشوروں کی طرف سے ''محسنِ سندھ'' کے خطاب سے نوازے گئے۔

مولانا انجمن تعمیراتِ ادب لاہور کے معتمد، ادارہ التراث العربی کویت کے مشیر علمی، رویتِ ہلال کمیٹی بمبئی کے رکن، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے رکنِ تاسیسی، شیخ الہند اکیڈمی دیوبند کے سربراہ، دارالمصنفین اعظم گڑھ کے رفیق اعزازی، برہان دہلی کے اعزازی مدیر، دارالعلوم تاج المساجد بھوپال، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، جامعہ اشرفیہ نیا بھوج پور (بہار) کے رکن مجلس شوریٰ بنائے گئے۔

اللہ نے مولانا کے علم، اولاد اور مال میں بڑی برکت دی، جو کسی کسی کے ہی حصہ میں آتی ہے، یہ مولانا کے دینی اخلاص، علمی انہماک، باطنی طہارت، تزکیۂ نفس اور دنیا بیزاری کا نتیجہ ہے علمی دنیا کا یہ بطل عظیم اور رجلِ کریم یکشنبہ ۲۷ر صفر ۱۴۱۷ھ/۱۴ر جولائی ۱۹۹۶ء کو شب ۱۰ بجے علائقِ دنیا سے رشتہ توڑ کر اپنے مالک حقیقی سے جاملا، اللہ تعالیٰ آپ کو رحمت وانوار کی بارشوں میں رکھے۔ آمین

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اولاد واحفاد

مولانا قاضی اطہر مبارک پوریؒ دنیاوی نعمتوں کے اعتبار سے بھی خوش نصیب تھے، مولانا مرحوم کی کل آٹھ اولادیں ہوئیں، جن میں چھ اولاد ذکور اور دو اولاد اناث ہیں، مولانا کے دو بچے شریف انور اور انور جمال صغرسنی ہی میں فوت ہو گئے، مولانا نے علم و دین داری کی جو روایات آگے بڑھائیں، ان کی اولاد میں بھی تعلیم و تعلم اور دین و دیانت کی وراثت پروان چڑھی، اور سب کے سب لڑکے اور لڑکیاں تعلیم یافتہ اور صاحبِ صلاحیت ہیں، بلکہ یہ سلسلہ اب اولاد سے گزر کر احفاد تک بھی آ گیا ہے، اور ''این خانہ ہمہ آفتاب است،، کی بہترین مثال پیش کر رہا ہے۔

(۱) مورخِ اسلام حضرت مولانا قاضی اطہر مبارک پوریؒ مرحوم کے سب سے بڑے فرزند مولانا خالد کمال مبارکپوریؒ تھے، یکم دسمبر ۱۹۳۸ء ان کی تاریخ ولادت ہے، بڑے ذہین وفطین و خوش مزاج تھے، ابتدائی اردو کے بعد فارسی اور عربی کی تعلیم مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور میں حاصل کرنے کے بعد دو سال تک دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث مکمل کرنے کے بعد ۱۹۵۸ء میں سند فراغت حاصل کی، تکمیلِ تعلیم کے بعد جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں تدریسی خدمات انجام دیں، پھر اپنے والد مرحوم کے ۱۹۵۱ء میں قائم کردہ مدرسہ مفتاح العلوم بھیونڈی میں تدریسی خدمات انجام دینے لگے، اس دوران آپ کی ذہانت وصلاحیت سے متاثر ہو کر حکومتِ مصر کے قونصل جنزل عبدالمنعم النجار نے مشہور علمی درسگاہ جامعہ ازہر میں سرکاری وظیفہ پر داخلہ کے لئے زور دیا، لیکن مولانا قاضی اطہر مبارک پوریؒ اسلامی تہذیب وشرافت کی اقدار پر دل وجان قربان کیے ہوئے تھے، انھیں یہ دیکھ کر سخت ذہنی اذیت ہوتی تھی کہ جامعہ ازہر سے پڑھ کر واپس آنے والے اسلامی لباس سے عاری اور بے ریش ہو جایا کرتے تھے، اور اپنے رہن سہن، میں یہود

ونصاریٰ کا نمونہ بن جاتے تھے، اس لئے مولانا کو وہاں بھیجنے میں سخت تکدر و تامل تھا، مگر جب مدینہ یونیورسٹی قائم ہوئی، تو مولانا نے اپنے فرزند کے علمی وفنی کمالات اور دینی حمیت میں اضافہ کے لئے نشاط وانشراح کے ساتھ ۱۹۶۲ء میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں داخل کرادیا، پانچ برس تک لائق اساتذہ سے علمِ دین کی تکمیل کر کے ۱۹۶۷ء میں مدینہ منورہ کی کلیۃ الشریعہ سے فارغ ہوئے، اور حکومت سعودی عرب کی وزارت اسلامی امور کی طرف سے گھانا مغربی افریقہ میں مبعوث بنا کر دین اسلام کی تبلیغ واشاعت کے لئے مامور کئے گئے، مغربی افریقہ میں مولانا خالد کمال کی علمی ودینی اور اصلاحی وتبلیغی سرگرمیوں نے قومی ودینی زندگی میں نمایاں تبدیلیاں پیدا کیں، ان کی کوششوں سے سعودی حکومت نے قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیکر حج سے روکا، مولانا خالد کمال نے گھانا میں چودہ برس تک اہم دینی وعلمی خدمات انجام دیں، وہاں انگریزی میں ''اطہر'' کے نام سے ایک ماہ نامہ بھی جاری کیا، حکومت سعودی عرب نے مولانا خالد کمال کی خدماتِ جلیلہ کے اعتراف میں ۱۹۸۱ء میں نیوزی لینڈ تبادلہ کردیا، جہاں وہ اپنی وفات ۵/دسمبر ۱۹۹۹ء تک برسرکار رہے، آپ نے پندرہ بار حج بیت اللہ ادا کیا۔

نیوزی لینڈ میں مولانا خالد کمال مبارک پوری صاحبؒ نے ایک عظیم الشان اسلامک سینٹر قائم کر کے اس میں ایک مسجد بھی تعمیر کرائی، نیوزی لینڈ میں مسلمانوں کی یہ پہلی مسجد قرار پائی، اس کی تعمیر وتزئین کے لئے مولانا خالد کمال نے یورپ اور امریکہ کا دورہ کیا۔ مولانا خالد کمال میں بہت سی خوبیاں تھیں، وہ ادیب وشاعر اور اسلامی دانشور بھی تھے، طالب علمی کے زمانے ہی میں والد صاحب کی طرح قرطاس وقلم کی امانت انھیں حاصل ہوگئی تھی، ان کے مظامینِ نظم ونثر جو ''البلاغ'' اور دوسرے رسائل میں شائع ہوئے، ان سے علمیت وادبیت کا احساس ہوتا ہے، مولانا بڑے ہنس مکھ اور محفل کو زعفران زار بنا دینے والے تھے، وہ جہاں بھی رہتے اپنی موجودگی کا احساس دلاتے رہتے تھے، انھیں اداروں کو ترقی دینے اور انھیں قومِ مسلم کے لئے کارآمد بنانے کا بہت اچھا سلیقہ معلوم تھا، ۵/دسمبر ۱۹۹۹ کو نیوزی لینڈ میں غریب الوطنی کی موت آئی، وہیں پیوند خاک ہوئے۔

مرتبہ بخشنے شہادت کا موت پردیس ہی میں آدھمکی

مولانا خالد کمال مبارک پوری کے ایک لڑکے فوزان طارق اور باقی اولاد پانچ میں لڑکیاں ہیں، مولانا کی تمام اولادیں متاہل زندگی گزار رہی ہیں، اور سب کی سب نیوزی لینڈ میں مقیم ہیں، وطن آنا جانا رہا ہے۔

فوزان طارق کی ابتدائی تعلیم مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور میں ہوئی، پھر نیوزی لینڈ میں یونیورسٹی کی سطح تک تعلیم حاصل کی، پھر عربی پڑھنے کے لئے قاہرہ بھی گئے، فوزان طارق اس وقت نیوزی لینڈ میں سرکاری صیغۂ ملازمت سے وابستہ ہیں۔

(۲) مولانا قاضی اطہر صاحب مبارک پوریؒ کے دوسرے صاحب زادے قاضی ظفر مسعود صاحب ہیں، ان کی تاریخ پیدائش یکم دسمبر ۱۹۴۱ء/۴ر جمادی الاولیٰ ۱۳۶۰ھ ہے، انھوں نے مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور سے پرائمری درجات پاس کرنے کے بعد ایم پی انٹر کالج مبارک پور سے ۱۹۶۰ء میں ہائی اسکول پاس کیا، پھر دینی و مذہبی تعلیم کے لیے مدرسہ احیاء العلوم میں داخلہ لیا ، اور ۱۹۶۹ء میں مدرسہ مفتاح العلوم مئو سے پہلی پوزیشن میں عالم کا امتحان پاس کیا، دو مرتبہ شرف حج بیت اللہ حاصل کیا۔ ۱۹۶۸ء میں فخر المحد ثین علامہ سید فخر الدین شیخ الحدیث دار العلوم دیو بند نے آپ کی علمی لیاقت سے خوش ہوکر خصوصی سندِ حدیث سے نوازا، قاضی ظفر مسعود کی علمی و دینی سرگرمیوں سے کئی میدان سرسبز ہیں۔ انھیں مشاعروں، ادبی تقریبات اور علمی گفتگو سے خاص تعلق ہے، مطالعہ کے موضوعات میں بڑا تنوع اور پھیلاؤ ہے، مبارک پور میں لڑکیوں کی پہلی انگریزی درس گاہ انصار گرلس انٹر کالج کے بانیوں میں سے ہیں، اس سے پہلے بھی کئی انجمنوں، لائبریریوں اور اداروں کو وجود میں لانے کا فخر حاصل کر چکے ہیں۔ انھیں موقع محل کے اچھے اور معیاری اشعار خوب ازبر ہیں، اور انکے استعمال میں بڑی برجستگی کا مظاہرہ کرتے ہیں، انھوں نے مولانا قاضی اطہر کے سلسلے میں کئی اشاریئے ترتیب دیے ہیں، جو تحقیقی کام کرنے والوں کی رہنمائی کا بہترین فریضہ انجام دے سکتے ہیں، آپ کو اللہ تعالیٰ نے ۹ر اولاد کی ولدیت کا شرف بخشا ہے، جن میں صرف ایک لڑکے مولوی قاضی فرحان ظفر سلمہٗ ہیں، ان کی ولادت ۱۱ر نومبر ۱۹۷۶ء کو ہوئی، ان کی ابتدائی اردو اور عربی کی تعلیم مدرسہ احیاء العلوم میں ہوئی اور فراغت ایشیا کی شہرۂ آفاق درس گاہ

دارالعلوم دیو بند سے ہوئی، گھر پر عائلی زندگی گزار رہے ہیں، اور کاروبار میں اپنے والد کے مددگار بنے ہوئے ہیں۔

مورخِ اسلام حضرت مولانا قاضی اطہر مبارک پوری علیہ رحمہ کے تیسرے فرزند مولانا قاضی سلمان مبشر مبارک پوری (ولادت یکم جنوری ۱۹۵۱ء) ہیں، اردو عربی اور فارسی کی تعلیم احیاء العلوم میں پانے کے بعد ایک سال کے لئے دارالعلوم دیو بند گئے، اور وہاں سے سندِ فراغ لینے کے بعد ۱۹۷۲ء میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں داخلہ لیا، اور ۱۹۷۸ء میں کلیۃ الدعوۃ و اصول الدین کی تکمیل کر کے سعودی عرب کی وزارت اسلامی امور کی طرف سے مبعوث بنا کر گھانا مغربی افریقہ میں مامور کیے گئے، وہاں فیملی کے ساتھ ۱۴ ربرس رہے، اور دینی خدمات سرانجام دیں، ۱۹۹۲ء میں سعودی حکومت نے تبادلہ کر کے ہندوستان بھیج دیا، اور مختلف مدارس میں انھوں نے تعلیم دی، اس وقت "دارالعلوم حسینن آباد انجان شہید میں استاذ حدیث ہیں، آپ نے چھ مرتبہ حج کیا، اپنے والد مورخِ اسلام مبارک پوریؒ کے علمی و دینی کارناموں کو منظر عام پر لانے کے لئے دل میں تڑپ رکھتے ہیں، اور اس سلسلہ میں مختلف افراد و ادارہ سے مسلسل رابطہ قائم کئے ہوئے ہیں، مولانا مرحوم کی جن کتابوں کے ایڈیشن ختم ہوگئے ہیں، انکی اشاعتِ ثانی اور جو کتابیں منتظر اشاعت ہیں، ان کو زیورِ طبع سے آراستہ کرنے کی تگ و دو میں اپنے وقتِ عزیز اور صرف کثیر کو لگا رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی مساعی جمیلہ کو شرفِ قبولیت بخشے مولانا قاضی سلمان مبشر کے حبالہ عقد میں مورخِ اسلام مولانا قاضی اطہر مبارک پوریؒ کے حقیقی ماموں حضرت مولانا محمد یحیٰ صاحب رسول پوریؒ کی صاحبزادی نزہت خاتون ہیں، جن کے بطن سے پانچ اولاد ہیں، جن میں تین اولاد ذکور اور دو اولاد اناث ہیں، بڑے صاحبزادے قاضی فیصل نے ابتدائی تعلیم غانا (مغربی افریقہ) میں حاصل کی، اور ۱۹۸۸ء میں اپنے تایا مولانا مولانا خالد کمال کے سایۂ عاطفت میں رہ کر نیوزی لینڈ میں تعلیمی مراحل طے کرنے لگے، وہاں کے مختلف اسکول، کالج یونیورسٹی میں تعلیم مکمل کی، وکٹوریہ یونیورسٹی ولنگٹن سے کمپیوٹر سائنس میں اعلیٰ قابلیت حاصل کر کے اسی شعبہ میں ملازمت کرلی، پانچ سال کے بعد سڈنی (آسٹریلیا) میں کار منصبی کی انجام دہی کے لئے چلے گئے، جہاں اپنے بیوی بچوں

کے ساتھ برسرکار ہیں، دوسرے صاحبزادے قاضی محمد ہیں، جن کی ابتدائی تعلیم غانا میں ہوئی ۱۹۹۵ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ منتقل ہو گئے، یہاں سے ۲۰۰۳ء میں ایم۔اے ویسٹ ایشیا اسٹڈی میں ٹاپ کیا، اور مڈل کے مستحق ہوئے، اس وقت اسٹریلیا میں اعلیٰ تعلیم حاصل کررہے ہیں۔ تیسرے لڑکے قاضی ریان ہیں، جنھوں نے گھانا میں پڑھنے کے بعد مدرسہ احیاء العلوم کے شعبۂ فارسی میں داخلہ لیا، شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج اعظم گڑھ سے بی کام کیا۔

مولانا قاضی اطہر مبارک پوریؒ کے سب سے چھوٹے بیٹے قاضی حسان احمد (متولد یکم جمادی الآخر ۱۳۷۳ھ ہیں جنھوں نے مدرسہ احیاء العلوم میں اپنا تعلیمی سلسلہ شروع کیا، اور شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ ڈگری کالج اعظم گڑھ سے بی اے کیا، اس کے بعد اپنا ذاتی کاروبار شروع کیا، اس وقت انصار گرلس کالج میں امورِ مفوضہ کی انجام دہی میں لگے ہوئے ہیں، ان کی پرورش و پرداخت میں آٹھ اولادیں ہیں، جن میں ۲؍ذکور اور ۶؍اناث ہیں ان کے بڑے بیٹے قاضی عدنان کی ابتدائی تعلیم مدرسہ احیاء العلوم میں ہوئی، اور سندِ فراغ مظاہر العلوم سہارن پور سے حاصل کی، اس وقت ممبئی میں ملازمت کررہے ہیں۔

امۃ الرحمٰن ام سلمیٰ (پ یکم مارچ ۱۹۴۸ء ۱۹ی ربیع الثانی ۱۳۶۷ھ) مولانا قاضی اطہر کی بڑی صاحبزادی ہیں، جو ننہالی رشتہ میں محمد آباد گوہنہ ضلع مئو کے رہنے والے ماسٹر مصباح الدین محمد رافع سے منسوب ہیں، اولاد میں ایک لڑکا اور تین لڑکیاں ہیں ماسٹر مصباح الدین صاحب مولانا قاضی اطہر مبارک پوریؒ کی زوجہ سائرہ خاتون کے ماموں زاد ہیں، شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ سے بی ایس سی کر کے گرکھپور یونیورسٹی سے ایم ایس سی کیا۔ اور ۱۹۶۷ء سے اسلامیہ انٹر کالج فیروز آباد میں بائیلوجی کے لکچرار رہے ۲۰۰۵ء سے پرنسپل کے عہدہ پر فائز ہیں، مع اہل و عیال فیروز آباد میں قیام ہے۔

مولانا قاضی اطہر کے نواسے سعد الدین ولد ماسٹر مصباح الدین نے فیروز آباد میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سے فیض درس اٹھایا، اس کے بعد منی پال (کرناٹک) سے ڈینٹل کا کورس کیا، پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے نیوزی لینڈ گئے، تکمیل تعلیم کرکے وہیں طبی خدمات

انجام دے رہے ہیں۔

مولانا کی چھوٹی بیٹی شمیمہ عائشہ (پ ۵/شعبان ۱۳۷۹ھ) ماسٹر رضوان احمد علیگ نوادہ مبارکپور کے عقد مناکحت میں ہیں جو مولانا کے حقیقی ماموں مولانا محمد یحییٰ صاحب رسول پوری کے سگے نواسے ہیں، انھوں نے مبارک پور میں تحصیلِ علم کر کے مسلم یونیورسٹی کی راہ لی، اور وہاں رہ کر بی۔اے۔کیا، اس کے بعد ملک سعود یونیورسٹی ریاض (سعودیہ عربیہ) میں تکمیل درس کی، اس وقت ابوظبی میں بسلسلہ ملازمت مقیم ہیں۔۶/اولاد میں ۴/اولاد نرینہ اور ۲/اولاد اناث ہیں، انکے بڑے لڑکے صفوان احمد ہیں، اس وقت سعودی عرب میں ملازمت کر رہے ہیں، دوسرے لڑکے شیبان ہیں، وہ برہان پور (ایم۔پی) میں بی۔یو۔ایم۔ایس۔کا میڈیکل کورس کر رہے ہیں،

اس طرح دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ مولانا قاضی اطہر کی علمی وجاہت کے اثرات کو اللہ نے اولاد و احفاد اور قریب تک کے رشتہ میں منتقل کر دیا ہے، یہ خداوندِ قدوس کی بہت بڑی دین ہے

قمر الزماں مبارک پوری
یکم جمادی الاولی ۱۴۲۹ھ
مطابق ۷/مئی ۲۰۰۸ء

تأثراتِ دل

بیادگار مؤرخ اسلام حضرت مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوریؒ

نقیب موسم گل تھا متاع عزت تھا
وہ دورِ شوکت و اقبال کی علامت تھا
گزر گیا وہ سریرآرائے علم وحکمت تھا
وہ فخرِ دین کا پروردہ فخر ملت تھا

اداسیوں کے ہر اک سمت سلسلے کیوں ہیں
تھکن سے چور ہمارے یہ قافلے کیوں ہیں
یہ کس کے جانے پہ دنیائے علم سونی ہے
فضائے صحنِ چمن ماتمی ہے، خونی ہے

ادیب و شاعر و راز آشنا ونکتہ داں
خطیب و عالم و فاضل، مورخِ دوراں
ادب کے گیسوئے پیچاں سدھارنے والا
غزل کی زلف پریشاں سنوارنے والا

وہ تاجدار معارف وہ بادشاہ قلم
عرب کا نغمۂ شیریں از زبان عجم
وہ علم وفن کا نگہبان تھا زمانے میں
وہ عہد ماضی کی پہچان تھا زمانے میں

پیامِ نو تھا ہر اک فن کے راہ رو کے لئے
خدا تعالیٰ کا انعام نسل نو کے لئے

علوم دیں کی امانت کا پاسبان تھا وہ
دیار شرق کی عظمت کا اک نشان تھا وہ

اب اپنے خواب کی تعبیر کون لکھے گا
ہمارے عہد کی تاریخ کون لکھے گا

اے شمع خفتۂ زندہ دلانِ اعظم گڑھ
بہار رفتۂ دیں پرورانِ اعظم گڑھ

ہمیشہ یاد میں روئیں گے تیری ساقی ورند
جہاں میں باقی ہے جب تک رجال سندو ہند

تمہاری ذات تواضع تھی خاکساری تھی
تھا حسن خلق، بصیرت تھی، بردباری تھی

تجھے سعادت دنیا و دیں میسر تھی
تمہارے نور سے ساری زمیں منور تھی

تم اپنی صورت و سیرت میں رشک اختر تھے
تم اسم عرف میں کہتے ہیں لوگ اطہر تھے

حسین پھول تھا وہ ایک باغ امت کا
یہ کس ہوا نے بجھایا چراغ امت کا

اُف اے وحیدؔ کہ ابر گریزپا تھا وہ
ہمارے سر کے لئے سایۂ ہما تھا وہ

چمن اداس تھا گل آبدیدہ شبنم تھی
وحیدؔ اس کی جدائی ہمالۂ غم تھی

مولانا عبدالوحیدؔ قاسمی پارہ کمال جونپور
۱۹۹۶ء

بسم اللہ الرّحمٰن الرحیم

پیش لفظ

''ندوۃ المصنفین'' کے رفیق خاص مولانا قاضی اطہر مبارک پوری کی غالباً یہ ساتویں تالیف ہے، جو اس ادارے سے شائع ہو رہی ہے، کتاب اب سے دو سال قبل شائع ہو جانی چاہئے تھی، لیکن کاغذ کی ناقابل بیان بے تحاشا گرانی، اپنے حالات کی تنگ دامانی، اور لیتھو پریسوں میں نظم وضبط کی ابتری کی وجہ سے دو سال یوں ہی نکل گئے۔

قاضی صاحب نے ''عرب و ہند عہدِ رسالت میں'' ''ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں'' ''خلافِ راشدہ اور ہندوستان'' ''خلافتِ بنی اُمیہ اور ہندوستان'' جیسی تاریخی کتابیں لکھ کر علمی حلقوں میں اپنا لوہا منوالیا ہے اور ان کا شمار ہمارے ملک کے مستند مورخوں میں ہو گیا ہے۔

زیرِ نظر تالیف بھی مختلف حیثیتوں سے ایک اہم تاریخی تالیف ہے، اس میں ملک کے پوربی علاقوں، الہ آباد، صوبۂ اودھ، جون پور وغیرہ کے اصحاب علم وفضل اور ان کے علمی واصلاحی کارناموں کا بھر پور جائزہ لیا گیا ہے، جیسا کہ معلوم ہے کہ ہندوستان کے مختلف علاقوں کے عُلماء و فضلاء اور مشائخ طریقت کے حالات پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں، اور اپنے اپنے مذاق کے مطابق خوب خوب لکھی گئی ہیں، رنگ رنگ سے لکھی گئی ہیں، لیکن اس کو ایک سانحہ ہی کہنا چاہئے کی مردم خیز خطہ پورب ہمارے قلم کی جولانیوں سے بڑی حد تک محروم رہا، اور ہم اسکا پورا حق ادا نہیں کر سکے، اس لئے یہ کہنا درست ہوگا کی علماء پورب کی سوانح حیات اور ان کے زمانے کے خاص حالات اور

ماحول کی خصوصیات پر اردو میں اب تک کوئی مفصل ومستند کتاب وجود میں نہیں آئی تھی۔ سرزمین پورب کے صاحبان علم وفضل کا پہلا باقاعدہ تعارف آزاد بلگرامی کے سبحۃ المرجان اور ماثر الکرام سے ہوا، بعد میں اور بھی متعدد کتابیں تحریر کی گئیں، جو غالباً طبع نہیں ہوئیں اور اب ناپید ہیں، اس طرح شرقی ہندوستان کی تاریخ کا یہ اہم ترین باب زاویۂ خمول ہی میں رہا، اور یہ تشنگی برابر محسوس ہوتی رہی۔

فاضل مولّف مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے سالہا سال کی محنت اور تلاش وتحقیق کے بعد ایک نفیس تحقیقی کتاب مرتب کردی، مضامین پر سرسری نظر دوڑانے سے اندازہ ہوا کہ کتاب صرف خشک تاریخی واقعات کی کھتونی نہیں ہے بلکہ اس میں ان علاقوں کی سات سو سال کی علمی تاریخ کو فلسفۂ تاریخ کی کسوٹی پر کسنے کی کوشش کی گئی ہے، ہر دور کی حکومت اور اس دور کے اہل علم اور مشائخ کے روابط وتعلقات کی نوعیت پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے، مضامین کی وسعت کا اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کی کتاب کی ترتیب میں کم وبیش پچاس کتابوں سے مدد لی گئی ہے اور کئی سو عنوانات قایم کرکے تحقیق کا حق ادا کیا گیا ہے۔

یہ روایت قایم ہوگئی ہے کہ فاضل مولّف جب کوئی کتاب تیار کرتے ہیں، ان کی خواہش ہوتی ہے کہ اس میں تیمناً میری ہی چند سطروں کا تعارف شامل ہو، یہ سطریں اسی قدیم روایت اور دستور کو باقی رکھنے کے لئے تحریر کی گئی ہیں۔ توقع ہے کتاب مقبول ہوگی، اور پڑھنے والے اپنی اپنی استعداد کے مطابق اس سے نفع اندوز ہوں گے۔

عتیق الرحمن عثمانی

۲۱ ربیع الاوّل ۱۳۹۹ھ

مطابق ۱۹ رفروری ۱۹۷۹ء

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

مقدمہ

الحمد للّٰہ رب العالمین ،و العاقبۃ للمتّقین، والصلوٰۃ
والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین سیدنا و نبینا
و مولانا محمّدٍوّاٰلِہٖ واصحابہ، واتّباعہ اجمعین.

ازین دیار ازاں سرخوشیم کہ گاہے
نسیم بوئے توام زیں دیار می آید

﴿میں اس بستی میں اس وجہ سے خوش ہوں کہ کبھی کبھی مجھ کو اس بستی میں تمہاری خوشبو کا احساس ہوتا ہے۔﴾

اسلام اور اسلامی علوم و رجال کا کارواں حجاز سے نکل کر مشرق میں مکران، سندھ، قیقان، قندابیل، قصدار، بوقان، منصورہ، دیبل، ملتان، لاہور ہوتا ہوا دہلی پہونچا پھر دیکھتے ہی دیکھتے علم و علماء کے قافلے ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیل گئے چنانچہ دہلی کے آگے ملک پورب یعنی صوبۂ الہ آباد، اودھ اور صوبۂ عظیم آباد بھی ان کے قدوم میمنت لزوم سے یوں فیضیاب ہوا کہ یہاں کے شہر اور قصبات و قریات معدنِ علم و علماء بن گئے، خاص طور سے جون پور کی تاسیس کے بعد اس کے اطراف و جوانب مسجدوں اور مدرسوں اور خانقاہوں کے ساتھ علماء و فضلاء اور مشائخ سے یوں معمور و مشحون ہوئے کہ دیار پورب شیراز ھند بن گیا، اس خطۂ زمین سے شیخ الاسلام فریدالدین اودھیؒ، شیخ الاسلام شرف الدین منیریؒ، مولانا علاءالدین نیلی اودھیؒ شیخ شمس الدین یحییٰ اودھیؒ، شیخ نصیرالدین اودھی چراغ دہلویؒ، شیخ حسام الدین مانک پوری، راجہ سید حامد شاہ مانک پوریؒ، ملک

العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی، ملا محمود جون پوری، ملا محمد افضل جون پوری، مولانا حاجی ابوالخیر بھیرویؒ، مولانا اللہ داد جون پوری، دیوان محمد رشید جون پوری، شیخ احمد عبدالحق ردولویؒ، سید اشرف سمنانیؒ، شیخ علی متقی جون پوریؒ برہان پوری مکیؒ، علامہ سید محمد مرتضیٰ، بلگرامی زبیدیؒ، شیخ محب اللہ بہاری، حافظ امان اللہ بنارسیؒ، ملا احمد جیون امیٹھویؒ، ملا نظام الدین فرنگی محلی، شیخ غلام نقش بند لکھنویؒ، مولانا شاہ ابوالغوث گرم دیوان بھیروی لُہراویؒ کے علاوہ بھی بہت سے عباقرۂ دوراں اور جہابذۂ زمان پیدا ہوئے۔ اسی سرزمین سے سید محمد مہدی جون پوری، شیخ بدیع الدین مدار اور کبیر اٹھے، جنکے افکار اور خیالات نے مستقل مکتب فکر کی حیثیت پائی، اسی دیار میں روحانی طرق وسلاسل میں چشتیہ، سہروردیہ، شطاریہ، اشرفیہ، قلندریہ، عاشقیہ، مداریہ، کو فروغ حاصل ہوا۔ آخری دور میں اس سرزمین سے مجاہدین کی تحریک عام ہوئی، جو بنگال سے سرحد تک پھیلی ہوئی تھی، جس کا مقصد اس ملک میں اسلامی حکومت کا قیام تھا، یہاں کے شہر اور قصبات علماء و مشائخ کی کثرت اور خانقاہات، و مدارس کی رونق سے شیراز و اصفہان اور نیشاپور و ہرات کے ہمعنان معلوم ہوتے تھے، اور بہت سے علمی و روحانی خانوادے کئی صدیوں تک اپنے فیوض و برکات عام کرتے رہے۔

مگر یہ عجیب بات ہے کہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے علماء وفضلاء و مشائخ کے مقابلہ میں دیار پورب کے ان بزرگوں کے تذکرے بہت کم لکھے گئے، اور جو کچھ موجود ہیں، وہ بہت بعد کی کتابوں کے رہین منت ہیں، اس سلسلہ میں پہلی بات یہ ہے کہ لودھیوں نے جون پور کی شرقی سلطنت پر قبضہ کرنے کے بعد بڑی تباہی برپا کی جس سے یہاں کے نہ صرف سلاطین سابقہ کے آثار و علائم ختم ہوئے اور علماء وفضلاء اور ان کے کارناموں کو بھی لودھی سلطنت کا سیلاب بہالے گیا، اور دوسری بات یہ ہے کہ جب دسویں اور گیارہویں صدی میں تذکرہ نویسی کا دور شروع ہوا تو اس دیار کے اہل علم نے اس کی طرف توجہ نہیں کی، اس دور میں اخبار الاخیار، گلزار ابرار، سفینۃ الاولیاء وغیرہ لکھی گئیں، اور ان کے مصنفین نے اس دیار کے اہل علم وفضل کے کچھ حالات لکھے، بعد میں یہاں کے علماء وفضلاء کا باقاعدہ تعارف مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے سبحۃ المرجان اور مآثر الکرام کے ذریعہ کرایا، اس کے بعد کئی کتابیں لکھی گئیں، جن میں دیار پورب کے علماء و مشائخ کے حالات

ہیں مگر اکثر ناپید اور غیر مطبوعہ ہیں۔

علمائے پورب پر اب تک کوئی ایسی جامع و مفصل کتاب نہیں لکھی گئی جس سے ان کی شخصیت اور ان کے کارناموں کا تفصیلی تعارف ہو سکے، اور معلوم ہو کہ اس قدیم معدن علم و علماء اور شیراز ھند پورب سے کیسے کیسے سر آمدگان روزگار اٹھے ہیں، اور انھوں نے کیا خدمات انجام دی ہیں؟

پیش نظر کتاب اس قرضہ کی ادائیگی کی پہلی کوشش ہے، اس کا پہلا باب ''دیار پورب کے چار علمی ادوار'' ہے جس میں اس دیار کی تقریباً سات سو سالہ علمی تاریخ کا جائزہ لیا گیا ہے۔ خاص طور سے ہر دور کی حکومت اور علماء و مشائخ کے تعلقات واضح کئے گئے ہیں، اس کے بعد اس دیار کے مشہور علمی و دینی خانوادوں کے تذکرے یوں درج کئے گئے ہیں کہ ہر خانوادہ کے علماء و فضلاء اور اساتذہ و تلامذہ اور معاصرین و متعلقین کے ذکر سے اس کے دور کا علمی و دینی ماحول سامنے آجاتا ہے۔ گویا ہر تذکرہ اپنے دور کا آئینہ دار ہے، اس طرح یہاں کی سات سو سالہ علمی و دینی تاریخ اجمالی طور سے سامنے آجاتی ہے، ضرورت ہے کہ شیرازِ ھند پورب کی علمی و دینی تاریخ مفصل طور سے مرتب کر کے تلافی مافات کی جائے وَاللہُ الْمُوَفِّقُ۔

قاضی اطہر مبارک پوری
مبارک پور اعظم گڑھ
یوم عرفہ ۱۳۹۶ھ، یکم دسمبر ۱۹۷۶ء

دیارِ پورب کے چار علمی اَدوار

مسلم دورِ حکومت میں دہلی کے مشرق میں صوبۂ الٰہ آباد، صوبۂ اودھ، اور صوبۂ عظیم آباد پر مشتمل جو وسیع اور محدود خطہ ہے اس کو ملک پورب کہتے ہیں۔ ہر صوبہ میں دارالامارت، ہر دارالامارت سے متعلق بڑے بڑے شہر، ہر شہر سے متعلق قصبات اور ہر قصبہ سے متعلق دیہات تھے۔ ملک پورب کے قصبات شہروں کے حکم میں تھے، جن میں عالیشان عمارتیں، شرفاء کے محلات، علماء، مشائخ، مختلف قسم کے پیشہ ور، مدارس اور مساجد تھیں جو جمعہ و جماعت سے معمور رہتی تھیں [1]۔ اسی ملک کو ہم دیار پورب سے تعبیر کرتے ہیں۔

پہلا علمی دَور

دیارِ پورب میں اسلام

دیار پورب کی سرزمین پر آفتاب اسلام کی ضیا پاشی کب ہوئی اور اس ظلمت کدہ میں دین وایمان کا نور کس زمانہ میں پھیلا؟ اس کی تعیین مشکل ہے، البتہ یہ بات یقینی ہے کہ سلطان محمود غزنوی کی مسلسل فتوحات کے زمانہ میں ہندوستان کا یہ علاقہ اسلام اور مسلمانوں سے آشنا ہو چکا تھا، خاص طور سے بنارس کی فتوحات نے ان اطراف میں بڑی اہمیت اختیار کر لی تھی، اس کے بعد حضرت سالار مسعود غازی علوی (ولادت ۴۰۵ھ شہادت ۴۲۸ھ) اور ان کے رفقاء کی مجاہدانہ سرگرمیوں کی وجہ سے یہاں اسلام اور مسلمانوں کا شہرہ ہوا۔

---

[1] (سبحۃ المرجان ص ۵۳)

سالار مسعود غازی علوی نے دہلی فتح کرنے کے بعد اودھ میں مقام ستر کھ (بارہ بنکی) کو مرکز بنا کر قنوج، کڑا، مانک پور، بہرائچ اور بنارس وغیرہ میں جہاد کیا، کرایا، اور ۴۲۰ھ کے حدود میں اطراف و جوانب کی ہر بڑی بستی میں مہمات روانہ کیں، مولانا عبدالرحمٰن چشتی نے مرآۃ الاسرار میں لکھا ہے۔

وبعد ازاں ملک افضل راباا قرباء او بطرف بنارس ونواحی آں رخصت نمود، وآستانہ اوبا دیگر شہداء آنجا شہرت دارد، و بعد ازاں ملک عمر و ملک طغرل رابا جماعت ایشاں بطرف پرگنات بیس واڑہ تعین کرد، دراں نواحی ترددنمایاں کردہ بشرف شہادت فائز گشتند، چنانچہ مقابر ملک عمر شہید وطغرل شہید وغیرہ درقصبہ بملور؟ و نواحی آں زیارت گاہ خلق است، وملک عمر شہید بغایت مردانہ خفتہ است وتصرفے راحت داد، وہمیں......... در ہر شہرے ودر ہر قصبہ ملک و بہردیہے مردم اہل صلاح و صاحب شجاعت وکارواں جابجا نصب نمودہ چنانچہ دریں ملک ہر جا رسیدم اثرے از اصحاب الشہداء یافتہ ام وہمہ جا زیارت گاہ خلق است[1]

امیر مسعود نے ملک افضل کو ان کے رفقاء کے ساتھ بنارس کی طرف روانہ کیا، ان کا مزار دیگر شہداء کے مزارات کے ساتھ اس علاقہ میں مشہور ہے، اس کے بعد ملک عمر اور، ملک طغرل کو ان کی جماعت کے ساتھ بیسواڑہ کے پرگنوں کی سمت بھیجا جنھوں نے ان اطراف میں مجاہدانہ سرگرمی دکھا کر شہادت پائی چنانچہ ملک عمر شہید اور ملک طغرل شہید وغیرہ کی قبریں بملور؟ اور اس کے اطراف میں زیارت گاہ ہیں ان میں ملک عمر شہید بڑے رعب و جلال اور تصرف کے ساتھ آرام فرما ہیں اسی طرح ہر شہر اور ہر قصبہ میں ملک حضرات کو اور ہر قریہ میں مصلحوں اور بہادروں کو جا بجا متعین کیا، چنانچہ میں اس علاقہ میں جہاں جہاں گیا ہوں ہر جگہ ان شہداء کا نشان پایا ہے۔

مولوی محمد صادق نے خلاصۂ تواریخ مسعودی میں لکھا ہے کہ آپ (سالار مسعود)

[1] مرآۃ الاسرار قلمی جلد اوّل ذکر سلطان الشہداء امیر مسعود

۴۲۰ھ میں ستر کھ آئے، تمام ملک میں کوئی شہر وقصبہ وگاؤں نہیں کہ آپ کے ساتھ کا شہید نہ ہو تمام ملک ہند میں غازیان اسلام منتشر تھے، ہر جگہ کو نور شہادت سے منور کیا، اسی وقت سے ہندوستان میں اسلام نمودار ہوا [1]

مولوی عنایت حسین نے غزانامہ مسعود میں لکھا ہے۔ کہ جس جس ملک میں حضرت کے نمک خوار تھے، بڑے بڑے سردار تھے، بعد آپ کے سب نے شہادت پائی، اسلام کی بیخ جمائی، ہر شہر و دیار میں ایک نہ ایک شہید لشکر سالار مسعود ہے، قبر اس کی موجود ہے، کوئی مقام خالی نہیں ہے، کل زیر نگین ہے۔[2]

اور مولانا شاہ ابوالحسن قطبی مانک پوری نے آئینۂ اودھ میں بیان کیا ہے کہ کسی تاریخ میں سوائے لڑائی کڑا مانک پور کے اور کوئی لڑائی سید مسعود کی درج نہیں ہے، لیکن اکثر قبریں گنج شہیدان دیہات وقصبات متعلقہ اضلاع رائے بریلی، وسلطان پور، وفیض آباد، وپرتاب گڑھ و اعظم گڑھ، وجون پور، وبنارس، وغازی پور میں برابر پائی جاتی ہیں اور جہاں جہاں قبریں ہیں باوجود تمادیٔ ایام کے عام طور پر بلاکسی اختلاف کے یہ کہا جاتا ہے کہ یہاں یہاں معرکۂ مجاہدانہ غازی میاں ہوا ہے، اور یہ ان ہی کے ساتھی کی قبریں ہیں.........ناظرین کتاب کو خیال رہے کہ ممالک مغربی وشمالی اودھ میں جہاں مقابر شہیدانِ ہمراہیانِ غازی میاں کہا جائے، اس کو باور کرنے میں تامل نہ کیا جائے۔[3]

اور مولانا عبدالسلام مبارک پوری نے تاریخ المنوال واہلہ میں معتبر حوالہ سے لکھا ہے کہ بزمانہ، سید سالار مسعود غازی ملک افضل بغرض فتح بنارس و ملک علوی نائب ان کے و ملک طاہر بمقام مئو، وملک مردان بمقام شادی آباد غازی پور آئے، مزارات ان کے ان مقام پر ہیں، ستر کھ (ملک اودھ) سے ملک حاجی بمقام ٹانڈہ متعین ہوئے تھے، مسعود غازی ستر کھ سے پورب نہیں آئے، ملکِ طاہر کے ساتھ جو سپاہی تھے سب غزنیں واطراف تیراہ کے تھے، غالباً شنواری خیل

---

[1] خلاصۂ تواریخ مسعودی ص ۷ مطبوعہ غالب الاخبار ۱۲۸۸ھ۔ [2] غزانامہ مسعود ص ۶۷ مطبوعہ نظامی پریس کان پور ۱۲۸۷ھ۔ [3] آئینۂ اودھ ص ۳۷ مطبوعہ نظامی کان پور ۱۳۰۳ھ

کے مسلمان بھی ملک طاہر کے ساتھ تھے، اور حاشیہ میں ہے کہ ملک شدنی کا مزار مبارک پور کے متصل ہے، غالبًا یہ اس طرف بھیجے گئے تھے، اور انکے ساتھی یہاں آباد ہوئے۔[1]

چونکہ سالار مسعود غازی اور انکے رفقاء کی مہمات وفتوحات وشہادات دیار پورب میں بالکل ابتدائی دور میں تھیں۔ ان علاقوں میں مسلمانوں کی آبادیاں نہیں تھیں، اور ان لوگوں کی شہادت کے بعد ایک زمانہ تک مسلمانوں نے ادھر کا رخ نہیں کیا، اس لئے نہ ان کے واقعات مرتب ہوسکے، اور نہ صحیح معلومات فراہم ہوسکیں، اور مرورِ زمانہ کے بعد جو روایت مشہور ہوئیں انہیں پر اکتفا کرنا پڑا، یہی وجہ ہے کہ سالار مسعود غازی اور ان کے رفقاء کے صحیح حالات و واقعات تاریخوں میں نہ ہونے کے برابر ہیں، اوپر جو کچھ درج کیا گیا ہے اس کی بھی تاریخی حیثیت یہی ہے۔

بہرحال بنارس سے بہرائچ تک کے علاقوں میں سالار مسعود غازی اور ان کی فوجوں نے جہاد کیا، اور ۴۸۸ھ میں ان کی شہادت کے بعد سیکڑوں سال تک اس علاقہ میں یوں خاموشی رہی کہ غازیوں اور شہیدوں کے نام اور حالات بلکہ ان کی قبروں کا صحیح حال ملنا مشکل ہوگیا، یہاں تک کہ سلطان قطب الدین ایبک نے دہلی اور اجمیر کا نظم ونسق سنبھالنے کے بعد سلطان شہاب الدین غوری کو دعوت دی کہ وہ پھر اس دیار میں مجاہدانہ سرگرمی دکھائے، چنانچہ ۵۹۱ھ میں سلطان شہاب الدین غوری نے قنوج پر فوج کشی کی، اور راجہ جے چند راٹھور سے اٹاوہ کے قریب جنگ ہوئی، جس میں مسلمان فتحیاب ہوئے، اس کے بعد قنوج اور بنارس کے تمام علاقے مسلمانوں کے زیر تصرف آگئے، اور بنارس سے نیپال کی سرحد تک قبضہ ہوجانے کے نتیجہ میں بنگال کا راستہ صاف ہوگیا، کہنا چاہئے کہ دیار پورب میں اسی دور سے اسلام اور مسلمانوں کا عمل دخل ہوا اور مسلمان اپنے دینی وملی امتیازات وخصوصیات کے ساتھ ابھرے، اسی دور میں کڑا مانک پور اس دیار کا دار الحکومت قرار پایا، بلکہ اس سے آگے مشرق میں لکھنوتی اور بنگال کو بھی مرکزیت حاصل ہوئی، اور ان مرکزوں میں دہلی سے حکام رکھے جانے لگے، اسی غلام خاندان کی سلطنت ۶۰۲ھ تا ۶۸۹ھ میں اس دیار میں علم و فضل اور علماء وفضلاء کا پہلا دور شروع ہوا۔

---

[1] (تاریخ المنوال ج ۲ ص ۸۱ مطبوعہ پٹنہ)

غلام دور میں علم و علماء

اس سلطنت کی ابتداء سلطان شہاب الدین غوری کے ترکی غلام قطب الدین ایبک سے ۶۰۲ھ میں ہوئی، صورت یہ ہوئی کہ وہ ۵۵۴ھ میں بلاد ہند کی حکومت پر مامور ہوا، اور ۶۰۲ھ میں دہلی فتح کر کے لاہور میں خود مختار سلطنت کی بنیاد رکھی، اور وہیں فوت ہوا، اسی کے دور میں پورب میں قنوج اور اودھ کے علاقے فتح ہوئے، اور نیپال کے نیچے سے لیکر بنارس تک کا تمام علاقہ مسلمانوں کے زیرِ نگیں ہوگیا، اس خاندان میں حسب ذیل سلاطین گزرے ہیں، جنھوں نے دہلی کے تخت پر بیٹھ کر دیار پورب اور بنگال و بہار تک حکومت کی ہے۔

(۱) سلطان قطب الدین ایبک (۲) سلطان شمس الدین ایلتمش (۳) سلطان رکن الدین بن سلطان شمس الدین ایلتمش (۴) سلطانہ رضیہ بنت سلطان شمس الدین ایلتمش (۵) سلطان ناصر الدین بن سلطان شمس الدین ایلتمش (۶) سلطان معز الدین بن ناصر الدین اس کے نائب فیروز شاہ خلجی نے ۶۸۹ھ میں اسے قتل کر کے خلجی سلطنت کی بنیاد رکھی۔

پورب میں پہلا علمی دور ۶۰۲ھ میں سلطان ایبک کے دور سے شروع ہوا، اور خلجی دور سے گزرتا ہوا تغلق دور میں ۷۷۲ھ میں ختم ہوا، اس پونے دو سو سالہ دور میں بلادِ مشرق اور بہار و بنگال کے علاقوں میں دینی و علمی سرگرمیاں جاری ہوئیں، اور علماء فحول اور مشائخ عظام پیدا ہوئے، میر غلام علی آزاد نے مآثر الکرام میں پورب کے علمی ادوار کا تجزیہ کرتے ہوئے پہلے دور کے بارے میں لکھا ہے:

بر ملتفتانِ ایں اوراق، و حقائق جویانِ قارئین کتاب ہذا اور طالبانِ حقائق
انفس و آفاق جلوہ پیرا باد کہ سرزمین پورب کو معلوم ہو کہ سرزمین پورب قدیم زمانہ سے

از قدیم الایام معدنِ علم و علماء ست، سید محمد کرمانی صاحب سیر الاولیاء کہ مرید سلطان المشائخ نظام الدین دہلوی ست قدس سرہ می گوید کہ مولانا فرید الدین شافعی شیخ الاسلام اودھ بود، مولانا علاء الدین نیلی اودھی پیش شیخ الاسلام قاری کشاف بود، مولانا شمس الدین یحیٰ و دیگر علماء اودھ سامع بودند، ..... اگر چہ جمیع صوبہ جات ہندیہ بہ وجود حاملان علوم تفاخر دارند لئہ سیما حصارِ پائے تخت کہ بہ واسطۂ مرجعیت صاحب کمالان ہر قسم دراں جا فراہم می آیند، واز تراکم افکار و اجتماع عقول اہل ہر عصر کمالات نفس ناطقہ راچہ علم عقلی و نقلی وچہ غیر آں بہ پایۂ بالاتر می رسانند، اما صوبہ اودھ والہ آباد خصوصیتے دارد کہ ہیچ صوبہ نتواں یافت۔[1] الخ	علم و علماء کا گہوارہ رہا ہے، سید محمد کرمانی مصنف سیر الاولیاء اور مرید حضرت نظام الدین قدس سرہ کا قول ہے کہ مولانا فرید الدین شافعی اودھ کے شیخ الاسلام تھے مولانا علاء الدین نیلی اودھی ان کے سامنے تفسیر کشاف پڑھتے تھے اور مولانا شمس الدین یحیٰ اور دوسرے علماء اودھ سنتے تھے، اگر چہ ہندوستان کے تمام صوبے حاملین علوم کے وجود پر فخر کرتے ہیں خاص طور سے دار السلطنت دہلی کہ یہاں ہر قسم کے اہل کمال جمع ہیں اور ہر زمانے کے افکار و عقول انبوہ در انبوہ پائے جاتے ہیں، اور علماء علم عقلی و نقلی کا پایہ بلند کئے ہوئے ہیں، مگر صوبہ اودھ و صوبہ الہ آباد اس بارے میں وہ خصوصیت رکھتے ہیں، جو کسی اور صوبہ میں نہیں مل سکتی ہے۔

دور اول کی پوری مدت اس دیار میں علماء، فضلاء، مشائخ اور ارباب فضل وفن کی آمد و رفت اور قیام کی ہے، اور جوں جوں وقت گزرتا گیا یہاں شہر وقصبات اور قریات علماء وفضلاء سے معمور ہوتے گئے، یہاں تک کہ تغلق خاندان کے تیسرے حکمراں سلطان فیروز شاہ نے ۷۷۲ھ میں جون پور کو آباد کر کے اسے دیار مشرق کا مرکز بنایا، اس کے بعد یہاں کے چپے چپے میں علوم و علماء کارواں در کارواں چلتے پھرتے نظر آنے لگے۔

اب ہم غلام خاندان کے دور میں پورب کی علمی سرگرمی اور علماء کے خدمات کا سرسری

---

(۱) مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۲۱ ذکر ملا نظام الدین،

جائزہ لیتے ہیں۔ شیخ الاسلام فرید الدین اودھی کا شمار اس دور کے نامور علماء میں ہوتا تھا، اودھ سے دہلی تک ان کے علم کی دھوم تھی، اور تشنگانِ علم و معرفت اس آب حیات سے سیراب ہو رہے تھے، ان کے تلامذہ و مسترشدین میں مولانا علاء الدین نیلی اودھی اور مولانا شمس الدین محمد بن یحییٰ اودھی خاص شہرت کے مالک ہیں جن سے دہلی میں ان کے فیوض و برکات تقسیم ہوئے، اور انکے تعلیمی و تدریسی سلسلہ کو آگے چل کر بڑی ترقی ہوئی، سید حمزہ بن حامد واسطی سلطان شمس الدین ایلتمش کے دور سلطنت میں ہندوستان آئے، اور کڑا اور کوڑا کے درمیان سلطان پور نامی قریہ میں سکونت پذیر ہو کر خلق اللہ کو فیض پہونچایا، شیخ سلیمان بن عبد اللہ ہاشمی بھی اسی دور میں ہندوستان آئے، سلطان شمس الدین نے تعظیم و تکریم کی اور خطیر رقم نذر کر کے شاہی قیام گاہ میں ٹھہرنے کی درخواست کی مگر انھوں نے دہلی سے نکل کر اودھ کے قصبہ کنتور میں سکونت اختیار کی اور وہیں ۶۵۷ھ میں انتقال کیا، شیخ قدوۃ الدین بن میرک شاہ اسرائیلی اودھی حضرت خواجہ عثمان ہارونی کے مرید تھے، ہندوستان آ کر اودھ میں مقیم ہوئے، اور مفتوحہ علاقوں کے قاضی مقرر کئے گئے، ۶۰۵ھ میں فوت ہوئے، ان کے بعد ان کے صاحبزادے شیخ اعز الدین قاضی اودھ ہوئے، مشہور ہے کہ اس دیار میں باون (۵۲) گاؤں قاضی قدوۃ الدین کی اولاد سے آباد ہیں، قدوائی خاندان ان ہی کی طرف منسوب ہے، شیخ قطب الدین بن محمد، سلطان قطب الدین ایبک کے دور میں ہندوستان آئے، اور کڑا مانک پور میں جہاد کر کے فتحیاب ہوئے، سلطان ان کی بڑی تعظیم و تکریم کرتا تھا، اور اپنے ساتھ صدر مجلس میں بٹھاتا تھا، ۶۷۷ھ میں کڑا میں فوت ہوئے، مولانا ابو توامہ شرف الدین حنفی دہلوی نے سلطان ایلتمش کے زمانہ میں دہلی سے سنار گاؤں بنگالہ جا کر وہیں درس و تدریس کا سلسلہ جاری فرمایا، اور شیخ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری نے ان سے تعلیم حاصل کی، قاضی شمس الدین بہرایچی والیِ بہرائچ محمود بن ایلتمش کے زمانہ میں وہاں کے قاضی تھے، ان کے بعد ۶۵۱ھ میں قاضی القضاۃ کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ شیخ بدر الدین علوی حسینی خواجہ عثمان ہارونی سے فیض حاصل کر کے ہندوستان آئے، اور قصبہ ڈلمو (رائے بریلی) میں سکونت اختیار کی اور یہیں ۶۴۶ھ میں فوت ہوئے۔ اسی زمانہ میں مولانا تقی الدین بن محمود انہونوی اودھی انہونہ (رائے بریلی) میں قیام کرتے

تھے۔ شیخ داؤد بن محمود چشتی اودھی کا مکان پالہی مئو میں تھا۔ ان کے پیر و مرشد حضرت شیخ فرید الدین اودھی اودھ کے سفر میں دو بار ان کے گاؤں میں تشریف لائے تھے، شیخ شہاب الدین سہروردی کے مریدوں میں شیخ شہاب الدین بن محمد سہروردی کاشغری جگ جوت کے لقب سے مشہور ہیں، انھوں نے پٹنہ کے قریب جٹھلہ نامی گاؤں میں آکر سکونت اختیار کی۔ سلطان شمس الدین التمش کے دور میں دو بھائی سید شمس الدین اور سید شہاب الدین شہر گردیز سے دہلی آئے اور سید شہاب الدین وہاں سے کڑا مانک پور آکر اقامت گزیں ہوئے، ان کی نسل سے سید راجہ حامد شاہ مانک پوری ہیں جنھوں نے سلاطین شرقیہ جون پور کے زمانہ میں دیار پورب کو اپنا دینی و روحانی مرکز بنایا، اور ان کی اولاد نے آبادیاں قائم کیں، چنانچہ راجہ سید مبارک بانی مبارکپور اور راجہ سید خیر اللہ بانی خیر آباد انہیں کی اولاد سے ہیں۔ اسی دور میں دو بھائی شیخ نظام الدین فرغانی اور شیخ صمصام الدین فرغانی ہندوستان آئے، اور انھوں نے سرزمین بنگال کو اپنی مجاہدانہ سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ والیِ بنگال محمد بن بختیار خلجی نے انکو اپنے مقربین میں شامل کر کے جنگ و جہاد میں حصہ لیا، اور زرِ کثیر صرف کر کے دونوں بھائیوں کے ساتھ اس دیار میں اسلامی خدمات انجام دیں، شیخ نظام الدین کی وفات ۶۴۱ھ میں ہوئی۔

خلجی دور میں علم و علماء

جیسا کہ معلوم ہوا سلطان معز الدین بن ناصر الدین کے نائب جلال الدین فیروز شاہ خلجی نے اسے ۶۸۹ھ میں قتل کر کے خلجی خاندان کی سلطنت قایم کی جو ۷۲۰ھ تک باقی رہی اور اس تیس سالہ دور میں حسب ذیل سلاطین ہوئے۔ (۱) سلطان جلال الدین فیروز شاہ خلجی (۲) سلطان علاء الدین محمد شاہ خلجی (۳) سلطان شہاب الدین بن علاء الدین خلجی (۴) سلطان ناصر الدین خسرو خاں خلجی، اس کی سلطنت خسرو غازی نے ختم کی جو بعد میں سلطان غیاث الدین تغلق کے نام سے بادشاہ بنا اور تغلق خاندان کی سلطنت قایم کی، خلجی دورِ حکومت میں کڑا مانک پور کے سرکاری مرکز

میں ایک سانحہ ہوا جس کے اثرات پورب پر پڑے، صورت یہ ہوئی کی جلال الدین خلجی اور انکے بھتیجے اور داماد علاء الدین خلجی کے درمیان کڑا مانک پور میں جنگ ہوئی، جس میں بھتیجے نے اپنے چچا کو ملاقات کے بہانے بلا کر دریائے گنگا کے بیچ میں قتل کر دیا، اور اپنی سلطنت کا اعلان کر دیا، اس وقت علاء الدین کڑا مانک پور اور اودھ کا حاکم تھا، اس مختصر دورِ سلطنت میں پورب اور بہار و بنگال کی دینی اور علمی رونق بڑھتی رہی اور ان علاقوں میں علماء و مشائخ، مدرسوں اور خانقاہوں کے ذریعہ اپنے اپنے انداز میں کام کرتے رہے، چنانچہ مولانا بدر الدین حنفی اودھی سلطان علاء الدین محمد شاہ خلجی کے دور میں اودھ کے علماء کبار میں تھے، یہاں سے دہلی تشریف لے جاتے اور کئی کئی ماہ تک وہاں مقیم رہ کر وعظ و تذکیر کی خدمت انجام دیتے تھے۔ ان کی مجلس وعظ میں عوام و خواص میں سے ہر طبقہ کے لوگ جمع ہوتے تھے، اور بہت زیادہ متاثر ہوتے تھے، شیخ الاسلام حضرت شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری ۶۶۱ھ میں بعہد سلطان ناصر الدین محمود بن ایلتمش پیدا ہوئے، انھوں نے خلجی دور میں بہار میں دین و ایمان کی بزم سجائی ۷۸۲ھ میں وصال فرمایا۔ ان کے فیض و برکات سے خلجی دور خوب مستفید ہوا، مولانا صلاح الدین سترکھی کا وطن سترکھ (بارہ بنکی) تھا، اور سلطان علاء الدین کے دور سلطنت میں دہلی میں تدریس و افادہ میں مشغول تھے۔ مولانا مؤید الدین کڑوی متوفی ۷۲۶ھ اپنے وقت کے باکمال علماء میں تھے۔ اور سلطان علاء الدین خلجی جس زمانہ میں کڑا کا حاکم تھا، مولانا موصوف اس کے ندیموں میں تھے، پھر علائق دنیا سے ایکسو ہو کر حضرت نظام الدین بدایونی کی خدمت میں یوں رہے کہ سلطان علاء الدین نے اپنی سلطنت کے زمانہ میں ان کو طلب کیا، مگر فقر و استغنا کو جاہ و حشم پر ترجیح دیکر صاف انکار کر دیا، مولانا نصیر الدین کڑوی بھی سلطان علاء الدین کے دور میں دہلی میں رہ کر تعلیم و تدریس کی خدمت انجام دیتے تھے، مولانا نظام الدین ظفر آبادی متوفی ۷۳۵ھ اس دور کے مشہور علماء و مشائخ میں تھے، یہ اور ان کے صاحبزادے شیخ نصیر الدین علاء الدین کے دور میں غزنی سے دہلی آئے تھے۔

ان حضرات کے علاوہ اس دور میں صدہا اربابِ فضل و کمال دیارِ مشرق میں موجود تھے، جن کا تعلق بعد کے تغلق کے دورِ سلطنت سے بھی تھا۔

تغلق دور میں علم وعلماء

جیسا کہ معلوم ہوا خلجی خاندان کے آخری حکمران سلطان ناصر الدین کی سلطنت خسرو غازی نے ختم کر کے سلطان غیاث الدین تغلق کے نام ولقب سے سلطنت قائم کی، جو ۷۲۰ھ سے ۸۱۶ھ تک رہی، اس کی مدت تقریباً ۹۶ سال ہے اور یہ حکمران گزرے ہیں (۱) سلطان غیاث الدین تغلق (۲) سلطان محمد بن تغلق (۳) سلطان فیروز شاہ تغلق اس کا نام جونا تھا (۴) سلطان محمود شاہ تغلق، تیسرے بادشاہ سلطان فیروز شاہ تغلق نے ۷۷۲ھ میں اپنے نام پر جون پور آباد کر کے بلاد پورب کو علم ومعرفت کے نئے دور میں داخل کیا، اور تغلق دور سلطنت کے نصف ثانی میں مشرق میں علم کا دوسرا دور شروع ہوا۔

تغلق دور سلطنت میں بلاد مشرق اور اودھ کے کئی علماء وفضلاء دہلی میں اپنی مسند تدریس و تلقین سے علم و روحانیت کی سوغات تقسیم کر رہے تھے، اسی دور میں مولانا فرید الدین اودھی شیخ الاسلامی کے منصب پر فائز تھے۔ اور ان کا شمار دہلی کے نامور علماء میں تھا، اور اودھ سے دہلی تک ان کے علم وفضل کی دھوم مچی ہوئی تھی، اودھ کے دو مشہور عالموں نے دہلی ہی میں ان سے کسب فیض کر کے دوامی شہرت پائی، ایک مولانا شیخ شمس الدین محمد بن یحییٰ اودھی جو سلطان محمد بن تغلق کے عہد میں ۷۴۷ھ میں فوت ہوئے، ان کے تلامذہ میں مولانا شیخ نصیر الدین محمود بن یحییٰ بن عبد اللطیف اودھی علم ومعرفت کی بزم میں ''چراغِ دہلی'' کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔ انھوں نے ۷۵۷ھ میں دہلی میں انتقال کیا، ان کے تلامذہ میں شیخ محمد بن یوسف گیسودراز، شیخ علاؤ الدین سندیلوی، شیخ علاؤ الدین الندی، قاضی عبد المقتدر شریحی کندی، اور مولانا خواجگی وغیرہ ہیں، مؤخر الذکر دونوں حضرات سے قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے تحصیل علم کی ہے، اور شیخ الاسلام

فرید الدین اودھی کے دوسرے شاگرد رشید مولانا علاؤ الدین نیلی اودھی ہیں جو خاص شہرت کے مالک ہیں۔ اس دور میں یہ اودھی علماؤ مشائخ دہلی کی علمی و روحانی فضا پر چھائے ہوئے تھے، اور کفرستان اودھ کے ان ایمانی چراغوں سے دہلی کے بام ودر روشن تھے۔ شیخ الاسلام شرف الدین احمد بن یحیٰی منیری متوفی ۷۸۲ھ کے لئے سلطان محمد شاہ تغلق نے عظیم الشان خانقاہ تیار کرائی جہاں سے وہ بندگانِ خدا کو علم و روحانیت کی دولت تقسیم کرتے تھے، شیخ علاؤ الدین بن اعز الدین کنتوری کو محمد شاہ تغلق نے اودھ سے دہلی بلا کر اپنے یہاں قیام کی گزارش کی مگر انھوں نے انکار کرتے ہوئے اپنے دونوں صاحبزادوں شیخ اعز الدین اور شیخ جمال الدین کو سلطان کے پاس رہنے کی اجازت دی، اور خود کنتور چلے گئے اس کے بعد محمد شاہ تغلق نے، شیخ اعز الدین کو قتل کر دیا، اور شیخ جمال الدین نے دہلی میں رہ کر شیخ نصیر الدین یحیی اودھی سے استفادہ کیا اور کنتور آ کر اپنے والد کی جگہ سنبھالی، قاضی مظہر الدین کڑوی بھی شیخ نصیر الدین اودھی سے فیض یافتہ تھے اور سلطان فیروز شاہ تغلق کے ندماء و مقربین میں اہم مقام رکھتے تھے، اس دور میں اودھ کی بزم علم و معرفت کے ایک چراغ نے سرزمینِ بنگال کو بقعۂ نور بنایا یعنی مولانا سراج الدین عثمان چشتی اودھی بنگال تشریف لے گئے اور ان سے خلق اللہ نے فیض اٹھایا، ان ہی میں حضرت شیخ علاء الدین عمر بن اسعد لاہوری پنڈوی متوفی ۷۵۸ھ بھی ہیں، جنھوں نے اپنے مرشد شیخ سراج الدین عثمانی اودھی کے کام کو آگے بڑھایا اور پنڈوہ میں مستقل قیام کر کے ارض بنگال کو علم و معرفت کا گلستان بنایا ان کے والد بعض سلاطین بنگال کے وزیر تھے اور فقہ، اصولِ فقہ، ادب و عربیت کے عالم و فاضل مانے جاتے تھے، سید امیر ماہ افضل الدین بہرائچی متوفی ۷۷۲ھ مشہور بزرگ تھے، فیروز شاہ تغلق نے ۷۵۴ھ میں بنگال سے واپسی پر ان سے ملاقات کر کے چند دیہات جاگیر میں دئے۔

ان علماء و مشائخ کے علاوہ اس دور میں دیار پورب میں صدہا اربابِ فضل و کمال موجود تھے اور اپنے اپنے حلقہ میں خدمت انجام دیتے رہے تھے۔ مثلاً مولانا نصیر الدین جونپوری مرید شیخ اشرف الدین منیری مولانا کمال الدین سنتوسی بہاری، مولانا قاضی فخر الدین بن رکن الدین سترکھی بجنوری متوفی ۷۵۹ھ شیخ تقی الدین علی حسینی بھکری جھونسوی، متوفی ۷۵۸ھ شیخ علی بن محمد

جھونسوی متوفی ۷۶۰ھ، شیخ ظہیر الدین بن تاج الدین حسینی ظفر آبادی، شیخ صدر الدین قریشی ظفر آبادی متوفی ۷۷۵ھ، قاضی سماء الدین بن فخر الدین بجنوری متوفی در لکھنؤ ۷۷۶ھ شیخ زین الدین بن عبدالرحمن دہلوی اودھی مولانا قاضی رکن الدین بن صدر الدین قرشی ظفر آبادی متوفی ۷۹۶ھ قاضی رکن الدین بن نظام الدین کڑوی شیخ جمال الدین اودھی، مولانا رکن الدین بہاری شیخ زاہد بن محمد بہاری، شیخ اسد الدین بن شیخ تاج الدین حسینی ظفر آبادی، متوفی ۷۹۳ھ، وغیرہ وغیرہ تغلق دور سلطنت میں آسمان مشرق کے شمس وقمر تھے، جن کی روشنی سے از دہلی تا بنگال روشن تھا۔

دیار پورب میں پہلے علمی دور کا یہ سرسری جائزہ ہے، جو ۶۰۲ھ سے شروع ہو کر ۷۷۲ھ میں ختم ہوا، اور اس کی مدت پونے دوسو سال ہے، اس دور میں بنگال میں سنارگاؤں، اور پنڈوہ، بہار میں منیر اور پٹنہ۔ اودھ اور اس کے اطراف میں کڑا، مانک پور، اجودھیا، کنتور، سترکھ، بجنور، سندیلہ، جھونسی، ظفر آباد، بہرائچ، دل مئو پالہی مئو، وغیرہ علم وفضل کے مرکز تھے، جہاں علماء وفضلاء اور مشائخ کی اچھی خاصی تعداد تھی۔

دوسرا علمی دور

دیار پورب کا پہلا علمی دور سلطان قطب الدین ایبک کی ابتدائے سلطنت ۶۰۲ھ سے شروع ہوکر خلجی دور سے ہوتا ہوا تغلق دور ۷۷۲ھ میں جون پور کی تعمیر و تمصیر پر ختم ہوا۔ اس پونے دوسو سالہ دور میں پورب میں علماء وفضلاء اور مشائخ کی اچھی خاصی تعداد مختلف قصبات و قریات میں پائی جاتی تھی، مگر مانک پور کڑا کے علاوہ پورب کے علاقہ میں کوئی دوسرا علمی اور دینی مرکز نہیں تھا، تا آنکہ تغلق خاندان کے تیسرے حکمران، سلطان فیروز شاہ تغلق نے ۷۷۲ھ میں شہر جون پور آباد کر کے ایک عظیم دینی و علمی مرکز قائم کیا، اور حضرت قطب الاسلام حاجی صدر الدین چراغ ہندی ظفر آبادی کی ذات والا صفات سے سواد جون پور میں اسلام کو فروغ ہوا، اور عہد فیروز شاہ تغلق سے لیکر خاتمۃ السلاطین محمد شاہ کے دور تک تقریباً چار سو سال تک یہ شہر اپنے حدود وسمت میں علم وفضل اور علماء وفضلاء کا گہوارہ بنا رہا، اس چار سو سالہ دور میں تغلقی، شرقی، لودی اور تیموری سلطنتوں کی آمد و رفت رہی، مگر دیار پورب اور حدود جون پور کی علمی و دینی محفل کی رونق میں کوئی فرق نہیں آیا، اور تخت وتاج کے انقلابات کی زد سے مسجد و مدرسہ اور دلق وسجادہ محفوظ رہے، اس پورے دور کی علمی سرگرمی کا اجمالی نقشہ مولانا خیر الدین محمد الہ آبادی جون پوری نے تذکرۃ العلماء میں اس طرح کھینچا ہے۔

''یہ شہر اپنی بنیاد کے وقت سے معدن علم اور مخزنِ فضل و کمال رہا ہے، ملا محمد اصفہانی نے سیر الملوک میں لکھا ہے کہ ہندوستان کے تمام صوبہ جات دانشمندوں اور باکمال لوگوں کے مولد ومنشاء ہیں خاص طور سے صوبۂ اودھ اور صوبہ الہ آباد۔ ان دونوں صوبوں کے ہر شہر و قریہ

میں مدرسے، خانقاہیں اور مسجدیں، اساتذہ، علوم وفنون سے آراستہ رہتی ہیں، اور ہر مدرسہ اور خانقاہ میں صدہا طالبان علوم اور کاسبان فیوض نعرۂ ھل من مزید بلند کرتے ہیں، صوبہ الہ آباد کے متعلقات میں ایک شہر ہے، جسے سلطان فیروز دہلوی نے ۷۷۲ھ میں آباد کر کے جون پور کے نام سے موسوم کیا، یہ شہر سلاطین شرقیہ کے عہد میں دارالسلطنت قرار پایا، شہر اور اس کے اطراف وجوانب میں صدہا مساجد ومدارس تعمیر ہوئے، مختلف اقلیموں کے علماء وفقراء اس شہر میں پہونچے اور ہر ایک کیلئے وہاں کے سلاطین وحکام کی طرف سے وظائف اور جاگیریں مقرر ہوئیں تاکہ مدرسین طالب علموں کی تعلیم وتدریس میں اور مشائخ تلقین و تربیت میں جمعیت خاطر کے ساتھ کوشش کریں، اور جو طلبہ دور دراز مقامات سے جوق در جوق آتے تھے، ان کی خاطر داری اور عزت واحترام میں مدرسوں اور خانقاہوں کے ذمہ داروں میں سے ہر ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتا تھا، ایران کے بادشاہ طہماسپ نے سلطان ہمایوں سے پہلی ہی ملاقات میں فضلائے جون پور کے متعلق دریافت کیا، اور اس دیار میں علماء کی کثرت وانبوہ معلوم کر کے شہر شیراز کی ویرانی پر حسرت وافسوس کا اظہار کیا، اور اسی دن حکم صادر کیا کہ شیراز میں مدارس کی تاسیس اور وہاں کے علماء کی تعظیم وتوقیر کی جائے اور اصفہان اور اس کے اطراف وجوانب میں مدرسے اور خانقاہیں بنا کر علماء کو تعلیم وتدریس پر مامور کیا،

تاریخ شاہجہانی میں لکھا ہے کہ صاحبقراں شاہجہاں نے شہر جون پور کو شیراز ہند کا لقب دیکر اسے دارالعلم سے موسوم فرمایا ہے، الغرض سلطان فیروز شاہ کے عہد سے لیکر خاتمۃ السلاطین محمد شاہ کی سلطنت تک یہ شہر مجمع فضلاء ومرجع طلباء رہا ہے اور یہاں کے علماء و مشائخ کی تعظیم وتوقیر کے لئے سلاطین کے احکام وفرامین حکام جون پور کے پاس پہونچتے رہے، ان بزرگوں کی معاشی مدد اور حفظ مراتب کے لئے صدر اور بخشی مامور کئے جاتے تھے۔ جو وقائع نگار سلاطین کے دربار سے جون پور کے حالات لکھنے پر مامور کئے جاتے تھے، وہ ہر مدرسہ اور خانقاہ میں خود جا کر اور انکے کوائف معلوم کر کے سلاطین تک پہونچاتے، اور ہر زمانہ

کے بادشاہ، مدرسین اور مشائخ کا آمد و خرچ معلوم کر کے ان کی ضرورت کے مطابق وظائف اور قطائع میں اضافہ کیا کرتے تھے، جو شاہزادے اور امرائے سلطنت اس دیار سے گزرتے تھے، سلاطین کی رضا جوئی کے خیال سے معتقدانہ انداز میں ہر مدرسہ اور خانقاہ میں حاضر ہو کر زیادہ سے زیادہ نذر گزرانتے تھے۔[1] الخ

دیار پورب کے اس چار سو سالہ علمی اور دینی دور کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر کے بنائے جون پور ۷۷۲ھ سے لیکر لودھی سلطنت کے خاتمہ ۹۳۲ھ تک کی ایک سو آٹھ سالہ مدت کو یہاں کا دوسرا علمی دور قرار دیتے ہیں، جس میں تغلقی، شرقی اور لودھی سلطنتوں کا عروج و زوال ہوا۔ آئندہ سطروں میں ہم ہر دور کی علمی و دینی سرگرمی کا جائزہ لیں گے خاص طور سے سلاطین و امراء اور مشائخ و علماء کے خوش گوار تعلقات کو بیان کرینگے،

بقیہ تغلق دور میں علم و علماء

تغلق خاندان کا تیسرا حکمراں سلطان فیروز شاہ تغلق محرم ۷۵۲ھ میں تخت سلطنت پر بیٹھا، وہ اس کے لئے آمادہ نہیں تھا، مگر شیخ نصیر الدین محمود بن یحییٰ اودھی چراغ دہلی اور دیگر علماء و مشائخ نے زور دیکر اسے راضی کیا، رمضان ۷۹۰ھ میں فوت ہوا، سلطان فیروز شاہ تعمیرات اور اہل علم و فضل کا شیدائی تھا، اس کے دور سلطنت میں علماء و مشائخ کو سالانہ ۳۶ لاکھ تنکہ وظائف دیئے جاتے تھے، برنی نے اسی کے نام پر تاریخ فیروز شاہی لکھی اس نے دہلی میں مدرسہ فیروزیہ اور مسجد تعمیر کی۔ فیروز آباد آباد کیا اور اپنی سلطنت کے بیسویں سال ۷۷۲ھ میں جونپور آباد کر کے دیار پورب کو دار العلم والعلماء بنایا، حقیقت یہ ہے کہ اسی بادشاہ کی علم پروری اور علماء نوازی نے سرزمین پورب کو دار العلم، دار الامان دہلی ثانی اور شیراز ھند بنایا۔

سلطان فیروز شاہ نے جون پور کو آباد کر کے بیک وقت اسکو مشرقی علاقہ کا دار الحکومت اور

---

[1] تذکرۃ العلماء ص ۳۔ ۴۔ ۵۔ الطافی پریس کلکتہ۔

دارالعلم بنایا اور شہزادہ فتح خاں کو وہاں کا حاکم اور مولانا علاؤ الدین دہلوی کو مدرس و معلم بنا کر بھیجا۔ ایک نے اس کا ملکی نظام سنبھالا اور دوسرے نے مملکت علم کے نظم ونسق کو درست کیا، تذکرۃ العلماء میں تاریخ شاہی کے حوالہ سے مرقوم ہے کہ مولانا علاؤ الدین دہلوی تغلق دور کے مشاہیر علماء اور اکابر فضلاء میں تھے، سلطان فیروز شاہ نے جونپور آباد کر کے ان سے استدعا کی کہ وہاں تشریف لے جا کر طلبہ کو درس دیں، مولانا انکار کے بعد جب جانے کے لئے تیار ہوئے تو سلطان نے ان کی خدمت میں خود حاضر ہو کر انعام واکرام سے خوب نوازا، اور شاہانہ انداز پر لوازم سفر مہیا کیے۔ اپنا خاص گھوڑا سواری کے لئے پیش کیا، اور خود رکاب پکڑ کر مولانا کو اس پر بٹھایا اور وہ چار سو شاگردوں کے ساتھ دہلی سے جونپور کے لئے روانہ ہوئے۔ سلطان نے ان تمام طالب علموں کو بھی عطایا دیے، اور ایک شاہی امیر کو اس قافلہ کی خدمت کے لئے ساتھ کیا، اور راستہ کے تمام امراء وحکام نے اپنی اپنی سرحد میں اس علمی ودینی کارواں کا شاندار استقبال کیا، شاہزادہ فتح خاں جو اپنے والد سلطان فیروز شاہ کی طرف سے حاکم جونپور تھا، یہاں موجود تھا مولانا کی آمد کی خبر سن کر ارکان دولت کے ساتھ شہر سے بارہ کوس باہر استقبال کے لئے آیا، اور کمال عقیدت کے ساتھ شہر کے حصار کے جلوخانہ سے ایوان تک مولانا کی رکاب میں پیدل آیا، اور سلطان کے حکم کے مطابق مولانا کو دوبارہ طلائی سکوں سے وزن کر کے یہ رقم ان کو نذر کی، مولانا علاء الدین دہلوی نے جون پور آنے کے بعد علوم وفنون کی تعلیم واشاعت میں ایسی کوشش کی کہ تھوڑے ہی عرصہ میں یہاں چوالیس مدرسے قائم ہو گئے، اور ان کے غلغلہ سے پورا دیار پورب گونج اُٹھا۔

”دراندک ایام ازیمنِ قدوم مولانا چہل وچہار مدرسہ درشہر جون پور وحوالی آں از مدرّسان و طالبانِ علم آراستہ شد۔“	تھوڑے ہی دنوں میں مولانا علاء الدین دہلوی کے قدموں کی برکت سے جون پور اور اس کے اطراف میں چوالیس مدرسے، مدرسین وطلباء سے آراستہ ہو گئے،

مولانا کا یہ علمی کارنامہ دس سال سے بھی کم مدت میں انجام پایا، وہ جون پور ہی میں

۷۸۲ھ میں فوت ہوئے، اور شہر کے جنوب میں بیرون حصار دفن کئے گئے۔[1]

۷۹۶ھ میں تغلق خاندان کے چوتھے اور آخری بادشاہ سلطان محمود شاہ تغلق نے اپنے باپ کے وزیر مَلک سرور خواجہ جہاں کو سلطان الشرق کا خطاب دے کر جون پور کی فرمانروائی عطا کی، وہ اپنے ساتھ دہلی سے مولانا شرف الدین لاہوری کو جون پور لایا، اور ان دونوں نے شاہزادہ فتح خاں اور مولانا علاء الدین کے کام کو آگے بڑھایا، تذکرۃ العلماء میں طبقات ناصری کے حوالہ سے ہے کہ مولانا شرف الدین لاہوری اشرف الشرفاء اور افضل الفضلاء تھے، فضائل صوری و معنوی کے جامع، اور عالم باعمل و عامل باعلم تھے، ۷۹۶ھ میں سلطان محمود شاہ نے خواجہ جہاں کو سلطان الشرف کا خطاب دیکر کشور مشرق کی فرمانروائی کا پروانہ دیا تو وہ مولانا شرف الدین کو بڑی عقیدت و ارادت سے لاہور سے بلا کر سلطان محمود شاہ کے حضور میں لے گیا، اور مَلک العلماء کا خطاب دیکر اپنے ہمراہ جون پور لایا، خواجہ جہاں نے یہاں آکر یحییٰ منزل کو توڑ کر بدیع منزل کے نام سے عمارت بنوائی، اور اس کے پہلو میں مولانا شرف الدین کے لئے مسجد، مدرسہ اور خانقاہ تعمیر کی وہ مولانا سے استفادہ کے لئے خود مدرسہ میں آتا تھا، اور ان کی امامت میں ان کی مسجد میں نماز پڑھتا تھا، مولانا ۸۰۰ھ میں جونپور میں فوت ہوئے، ان کی وصیت کے مطابق لاش جونپور سے لاہور پہونچائی گئی، ان کے بڑے صاحبزادے امیر صدر الدین علم و فضل کے ساتھ دولت و ثروت کے بھی مالک تھے، خواجہ جہان کے بعد سلطان مبارک شاہ شرقی کے وزیر بنے اور سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے دور میں وزارت چھوڑ کر گوشہ نشین ہو گئے پھر سلطان کی اجازت سے مکہ مکرمہ چلے گئے اور وہیں فوت ہوئے، انکی تصانیف میں شرح کافیہ، حاشیہ شرح عضدی اور حاشیہ تفسیر بیضاوی وغیرہ ہیں۔[2]

درحقیقت سرزمین پورب کا سارا علمی افتخار ان ہی چاروں کا مرہون منت ہے، جن میں دو امراء اور دو علماء شامل ہیں، اور ان ہی عناصر اربعہ سے یہاں کا علمی مزاج بنا ہے۔ اس پچیس سالہ دور میں باہر کے کئی علمی خانوادے دیار پورب میں آکر مستقل سکونت پذیر ہوئے جن میں صدیوں تک علم و فضل کا چرچا رہا، ان میں شیخ مخدوم ظہیر الدین صدیقی متوفی ۲۷ر ذوالحجہ ۷۸۵ھ محمد آباد گہنہ

[1] تذکرۃ العلماء ص ۱۰ و ۱۱ [2] تذکرۃ العلماء ص ۱۱ و ۱۲،

میں آباد ہوئے، ان کی ولادت تاج پور سارن میں ہوئی تھی، شیخ ابوالفتح رُکن الدین ملتانی سے خرقۂ خلافت پایا تھا، ان کے صاحبزادے مخدوم جمال الدین بن ظہیرالدین ان کے سجادہ نشین ہوئے، اوران کے بعد شیخ داؤد بن شیخ جمال الدین بن شیخ ظہیرالدین کو ولایت وخلافت ملی، ان تینوں کی قبریں محمد آباد کے مغرب میں سڑک کے شمال جانب ٹیلہ پر آستانہ روضہ میں ہیں، جس پر گنبد ہے۔ اسی سے متصل ایک مسجد بھی ہے، اسی خانوادہ ظہیریہ سے شیخ محمد ماہ تھے، جو مبارکپور سے متصل مقام املو میں جاگیر پاکر سکونت پزیر ہوئے، ۱۸۳۶ء کے کاغذات کشتواری میں ان کی جاگیر کا ذکر موجود ہے۔

فیروز شاہ تغلق بانی جونپور کے دور میں ایک اور بزگ محمد آباد گوہنہ میں آئے جن کے خاندان میں کئی اہل علم پیدا ہوئے مولوی عبدالاحد ظفر آبادی نے مظہر الاحدیہ میں لکھا ہے کہ شیخ خلیل اللہ فاروقی بعہد تغلق باہر سے دہلی آئے اوران کے بیٹے شیخ بایزید جونپور آئے جو نیا نیا آباد ہوا تھا، اورارباب علم وفن کا مرکز بن رہا تھا، جونا خاں (سلطان فیروز شاہ تغلق بانئ جونپور) نے ان کو پرگنہ محمد آباد میں کوئریا پار، کبیر پور، اور چک میر کی جاگیر دی، ان کے بیٹے، شیخ جمال الدین نے محمد آباد میں سکونت اختیار کی، ان کے بیٹے شیخ محمد اعظم سلاطین شرقیہ سے وابستہ رہے ان کو قیام پور کا علاقہ جاگیر میں ملا۔ انھوں نے اپنے والد کے نام پر موضع جمال پور بسایا، ان کے تین بیٹے تھے۔ شیخ دریائی خاں، شیخ کبیر خاں اور شیخ گدائی خاں، یہ لوگ تیموری دور حکومت میں برسر اقتدار رہے، اور کبیر پور اور جمال پور میں کوٹ اور قلعے اور کنویں تعمیر کیے، شیخ سعداللہ نبیرہ شیخ گدائی خاں کے بعد جاگیر پر دوسروں نے قبضہ کرلیا، مگر غلام علی پسر گدائی خاں نے اسکو دوبارہ حاصل کرلیا، یہ راجہ اعظم شاہ بانی اعظم گڑھ کے نائب دیوان تھے، اوران کے برادر نسبتی شاہ بدر عالم راجہ اعظم شاہ کی دیوانی میں عہدہ دار تھے۔ شیخ سعداللہ بن شیخ گدائی خاں کے تین بیٹے تھے، جن میں سے حضرت شیخ غلام فرید صاحبِ علم وفضل اور سب میں ممتاز تھے، انھوں نے ملا نظام الدین فرنگی محلی متوفی ۱۱۶۱ھ سے تعلیم پائی تھی، ان کے زمانہ میں نواب فضل علی خاں حاکم غازیپور نے چکلہ اعظم گڑھ کے دو پٹوں پر قبضہ کرلیا تھا، اس کے والد شیخ عبداللہ شیوخ محمد آباد میں سے تھے، اور ماں کسی معمولی خاندان سے

تھیں، نواب فضل علی خاں نے مولانا غلام فرید سے پورے چکلہ اعظم گڑھ پر قبضہ کے لئے دعا کی درخواست کی، مگر انھوں نے منظور نہیں کی۔

''ہماں فضل علی خاں دوتپہ از چکلہ اعظم گڑھ بقبضۂ خود آورد، بآنحضرت عریضہ نوشت کہ تمنائے حکومت مسلم چکلہ دارم، بہ ہمت بزرگانہ امداد فرمایند۔ آنحضرت بجواب اوایں بیت نوشتہ فرستاد	فضل علی خاں نے چکلہ اعظم گڈھ کے دوتپوں پر قبضہ کرکے مولانا غلام فرید کو ایک عریضہ لکھا کہ میں پورے چکلہ پر حکومت کرنے کی خواہش رکھتا ہوں آپ میری مدد فرمائیں انھوں نے اس کو یہ شعر لکھ کر بھیج دیا کہ

مسکین خرے آرزوے دم کرد

نایافتہ دُم، دوگوش گم کرد[1]

﴿بے چارے گدھے نے دم کی خواہش کی دم بھی نہیں ملی اور دونوں کان بھی کھو دیئے﴾

شرقی دور میں علم وعلماء

۷۷۲ھ سے ۹۶۲ھ تک کے تقریباً پچیس سالہ دور میں تغلق خاندان کے سلاطین کی توجہ سے جون پور اور دیار پورب میں علم وعلماء کی آمد آمد ہوئی، اسی دور میں اس دیار کے سیاسی وملکی حالات نے کروٹ لی، اور یہاں ایک آزاد تازہ دم مسلم سلطنت کا قیام ہوا، اور دہلی کی مرکزی حکومت کی ابتری نے پورب میں نیا رنگ دکھایا، طبقات اکبری میں ہے کہ ارباب تواریخ متفق ہیں کہ جب سلطان محمد تغلق شاہ کی سلطنت کا آفتاب سمت الراس سے گزر کر مائل بہ مغرب ہوا تو پورے قلمرو میں خلل واضطراب کی کیفیت پیدا ہوئی، سپاہ اور فوج میں جذبۂ نفرت وبغاوت نے سر اٹھایا، اور طرح طرح کے فتنے ظاہر ہوئے، اس کا سبب یہ تھا کہ سلطنت کے اہم عہدوں پر چھوٹے لوگ قابض ودخیل ہوکر ہوا وہوس میں مبتلا ہوگئے، جس سے بڑے اور ذمہ دار لوگ بددل ہوگئے۔[2]

---

[1] مظہر الاحدیہ ۱۵۱ و ۱۵۲ مطبع کاظمی کان پور ۱۳۳۲ھ [2] طبقات اکبری ص ۲۰۶

ان ہی حالات میں تغلق خاندان کے چوتھے اور آخری حکمران سلطان محمود شاہ کے زمانہ میں اس کے فرستادہ حاکم جون پور خواجہ جہاں ملک سرور نے ۷۹۶ھ یا ۷۹۷ھ میں اپنی مستقل حکومت کا اعلان کرکے ''سلطان الشرق کا خطاب اختیار کیا'' سلاطین شرقیہ جون پور میں حسب ذیل چھ سلاطین ہوئے، (۱) سلطان الشرق خواجہ جہاں ملک سرور از ۷۹۷ھ تا ۸۰۲ھ مدت چھ سال چند ماہ (۲) سلطان مبارک شاہ شرقی (ملک قرنفل متبنیٰ خواجہ جہاں ملک سرور) از ۸۰۲ھ تا ۸۰۴ھ مدت ایک سال چند ماہ (۳) سلطان ابراہیم شاہ شرقی برادر خورد مبارک شاہ از ۸۰۴ھ تا ۸۴۴ھ مدت چالیس سال چند ماہ (۴) سلطان محمود شاہ شرقی پسر سلطان ابراہیم شاہ از ۸۴۴ھ تا ۸۶۲ھ مدت اٹھارہ سال چند ماہ (۵) سلطان محمد شاہ شرقی پسر سلطان محمود شاہ از ۸۶۲ھ تا ۸۶۲ھ مدت پانچ ماہ (۶) سلطان حسین شاہ شرقی پسر سلطان محمود شاہ شرقی از ۸۶۲ھ تا ۸۸۱ھ مدت انیس سال۔

شرقی سلطنت کی حدود طبقات اکبری کے بیان کے مطابق دہلی کی جانب پرگنہ کول اور ابری تک، بہار کی جانب ترہت تک اور شمال کی جانب بہرائچ تک سلطان الشرق خواجہ جہان نے خودمختاری کے بعد پرگنہ کول دکپیلہ و بہرائچ کو زیر کیا، اور بنگال (لکھنوئی) کے راجوں مہاراجوں سے ہاتھیوں کا تحفہ جاری کرایا، جو شاہان تغلق کے زمانہ میں بند ہوگیا تھا۔[1]

جون پور کی بنیاد کا خمیر علمی تھا، پہلے ہی دن سے علم وعلماء کا ماویٰ وملجا بنا، اور پچیس سال کے بعد یہاں جو سلطنت قائم ہوئی اس کا مزاج بھی سراسر علمی تھا، اور اس کے حکمرانوں نے اپنے اپنے دور میں علم اور علماء کی بہترین خدمت کی، اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ یہاں کا پہلا حاکم شہزادہ فتح خان اپنے ساتھ مولانا علاء الدین دہلوی کو جون پور لایا تھا، جن کے ہمراہ چار سو طالب علم آئے تھے، اور جنھوں نے قلیل مدت میں چوالیس مدرسے جاری کئے، اس کے بعد ۷۹۶ھ میں خواجہ جہاں کو یہاں کی حکومت ملی تو، اس نے مولانا شرف الدین لاہوری کو جون پور لاکر ان کے لئے مسجد، مدرسہ اور خانقاہ بنوائی، اور شرقی سلطنت قائم کرنے کے بعد بھی ان سے استفادہ کرتا رہا، اور جب ۸۰۰ھ

[1] طبقات اکبری ص ۲۵۷

میں ان کا وصال ہو گیا، تو ان کے صاحبزادے مولانا صدر الدین درباری علماء میں ممتاز شخصیت کے مالک رہے، خواجہ جہاں کے بعد جب اس کا منہ بولا بیٹا سلطان مبارک شاہ تخت نشین ہوا، تو اس نے مولانا موصوف کو وزارت عطا کی اور اپنے مختصر دورِ حکومت میں ان کو ہر طرح سے نوازا۔

جون پور کی تاسیس ۷۷۲ھ سے لیکر شرقی سلطنت کے پہلے حکمراں کے آخری زمانہ ۸۰۲ھ تک دیارِ مشرق میں علم و علماء کی تازہ بہار آتی رہی، اس دور میں جب کہ دہلی کا مرکز حوادث و فتن کی آماجگاہ بنا ہوا تھا، اور وہاں کی علمی و دینی محفلیں اجڑ اجڑ کر دوسرے دیار و امصار کی طرف منتقل ہو رہی تھیں جون پور دار العلم، دار الامان، اور دہلی ثانی بن رہا تھا، ایک صدی قبل تاتاریوں کے قتل و غارت کے اثرات پورے مشرقی عالم اسلام میں باقی ہی تھے کہ ۷۷۱ھ میں تیموری فتنہ نے سر اٹھایا، اور وسط ایشیا کو روندتا ہوا ۸۰۱ھ میں دہلی پہنچ گیا۔ جس سے وہاں کے اہل علم پریشانی میں مبتلا ہو گئے، ادھر جون پور امن و امان اور علم و علماء کا گہوارہ بن رہا تھا، ان حالات میں خاص طور سے دہلی کے اودھی علماء و فضلاء اور ان کے تلامذہ اور مسترشدین نے جون پور کا رخ کیا، اور دہلی کی تباہی کے نتیجہ میں جون پور کی آبادی ہوئی۔ مَصَائِبُ قومٍ عند قومٍ فوائِدَ ﴿ایک قوم کی مصیبت دوسری قوم کے لئے فائدہ بخش ہوتی ہے﴾

شرقی سلطنت کے تیسرے سلطان ابراہیم شاہ شرقی کا چالیس سالہ دور اس سلطنت کا عہد زریں اور پورب میں علمی بہار کا زمانہ ہے۔ اس کے مبارک و مسعود عہد میں مختلف دیار و امصار کے ارباب علم و فضل جون پورِ دار الامان میں پناہ گزیں ہوئے، سلطان موصوف مورخوں کے بیان کے مطابق گرویدۂ مشائخ و فقراء، محبّ علم و علماء، عدل پرور، رعایا نواز اور خدا ترس بادشاہ تھا اور اس کا دورِ سلطنت نہایت بابرکت تھا، مولانا نظام الدین احمد بن مقیم ہروی نے طبقات اکبری میں اس عہد زریں کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

بعد از وفات شاہ امرائے دولت شرقی	سلطان مبارک شاہ شرقی کی وفات کے بعد
برادر کہتر او را سلطان ابراہیم خطاب دادہ بر	امرائے دولت نے اس کے چھوٹے بھائی
تخت سلطنت و اورنگ حکومت اجلاس	کو، سلطان ابراہیم کا خطاب دے کر تخت

نمودند وطبقات انام در مہد امن و امان قرار گرفتند علماء و بزرگان کہ از آشوب جہاں پریشان خاطر بودند بجون پور کہ در آں ایام دارالامان بود سر بر آوردند وآں دارالسلطنت از قدوم علماء دارالعلم گردید، وچندیں کتب ورسائل بنام او تصنیف شد، مثل حاشیہ ہندی و بحر المواج و فتاویٰ ابراہیم شاہی، وارشاد غیر ذلک، چوں عونِ الٰہی قرین آں بادشاہ بود، لاجرم در عنفوان دولت بتجارب وکامرانی از جمیع سلاطین ہند در مضمار معانی قصب السبق ربودہ[1]

سلطنت پر بیٹھایا اور عوام نے امن وامان کے گہوارے میں سکون پایا، جو علماء اور مشائخ آشوب جہاں سے پریشان خاطر تھے جون پور آگئے جو اس وقت دارالامان تھا، دارالسلطنت جونپور علماء کی آمد سے دارالعلم بن گیا، اور کئی کتب ورسائل سلطان ابراہیم کے نام سے تصنیف ہوئے، جیسے حاشیہ ہندی، بحر المواج، فتاویٰ ابراہیم شاہی اور ارشاد وغیرہ چونکہ توفیق خداوندی اس بادشاہ کا ساتھ دے رہی تھی اس لئے وہ امور سلطنت کے تجربات اور مقاصد کی کامیابی میں ہندوستان کے تمام بادشاہوں سے بازی لے گیا۔

محمد قاسم فرشتہ نے لکھا ہے:۔

اما شاہے بود متصف بعقل ودانش و تدبیر در عصر وے فضلائے ممالک ہندستان و دانشمندانِ ایران وتوران کہ از آشوب جہاں پریشان خاطر بودند بدارالامان جون پور آمدہ در مہد امن وامان غنودند واز خوانِ احسان او ذلہا برداشتہ

سلطان ابراہیم شاہ شرقی عقل ودانش اور تدبیر کے اوصاف سے متصف تھا، اس کے دور میں ہندوستان کے مختلف شہروں کے فضلاء اور ایران وتوران کے ارباب علم ودانش جو آشوب جہاں سے پریشان خاطر تھے، جون پور میں آکر امن وامان کے گہوارے میں آرام سے سوئے اور اس کے دستر خوان کرم سے بہرہ ور ہوئے، اور اس کے نام سے کئی کتب ورسائل لکھے، عقل وتدبیر اور سیاست وشجاعت رکھنے والے امراء

[1] طبقات اکبری ص ۵۲۹

بنام نامی او (چنانچہ وسیاست وشجاعت در دولت خانۂ او جمع شدہ مثل درگاہ سلاطین ایران رنگین گردید،

وزراء اس کے دربار میں جمع ہوئے، جن کی وجہ سے اس کا دربار سلاطین ایران کے دربار کی طرح پرکشش اور رنگین ہوگیا تھا۔

جہاں آفریں تا جہاں آفریں چو او مرزبانے نیامد پدید[1]

﴿دنیا کے پیدا کرنے والے نے جہاں تک دنیا بنائی ہے اس کی مثال کسی خاص زمانے میں سامنے نہیں آئی۔﴾

۸۱۶ھ میں آخری بار ابراہیم شاہ شرقی دہلی کی تسخیر کے لئے چلا مگر راستہ سے لوٹ آیا، اور اپنی توجہ ملک اور رعایا کی خدمت، امن وامان کی بحالی، عدل وانصاف کی فراوانی علماء وفضلاء اور مشائخ کی خبر گیری پر مرکوز کردی، تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے۔

وبعد از کوچ چند از راہ برگشتہ بدار العلم جون پور آمد وبصحبت علماء و مشائخ وتعمیر ولایت، وتکثیر زراعت مشغول شد سالہا ہیچ طرف سواری نفرمود، ومردم از اطراف و اکناف ہندوستان کہ مشحون از خلل شدہ بود روئے بجون پور آوردہ ہر یک فراخور مرتبت وحالت نوازش می یافتند، واز خادم ومشائخ وعلماء و سادات و نویسندہ از ہر حیثیت بجائے رسید کہ جون پور را دہلی ثانی می گفتند، وکوچک وبزرگ آں دیار وجود شاہ ابراہیم شاہ شرقی از جملہ

چند بار دہلی کی تسخیر کے ارادے سے کوچ کرنے کے بعد سلطان ابراہیم دارالعلم جون پور میں واپس آکر علماء وفضلاء کی صحبت، ملک کی تعمیر اور زراعت کی تکثیر میں مشغول ہوگیا، اور کئی سال تک باہر نہیں نکلا، اس درمیان میں ہندوستان کے مختلف دیار کے لوگ پریشان حالی و بے چینی کی وجہ سے جون پور چلے آئے، اوران میں سے ہر ایک نے اپنی حیثیت کے مطابق شاہی نوازش سے حصہ پایا معمولی درجہ کے خدام سے لیکر علماء ومشائخ، سادات اور لکھنے پڑھنے والے عہدے اور منصب سے یوں نوازے گئے کہ جون پور دہلی ثانی کے نام سے مشہور ہوگیا،

---

[1] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۰۵

کوچک و بزرگ آں دیار وجود شاہ ابراہیم شاہ شرقی از جملہ مغتنمات شمردہ دو روزہ حیات را بنشاط و انبساط می گذرانیدند، از شاہ گرفتہ تا گدا بالتمام خوش وقت بودند حزن واندوہ ازاں دیار بستہ بود۔[1]	اور تمام چھوٹے بڑے سلطان ابراہیم شاہ شرقی کی ذات کو غنیمت جان کر دو دن کی زندگی کو نشاط وانبساط کے ساتھ بسر کرنے لگے شاہ وگدا خوش وقت تھے، اور اس دیار سے رنج وغم اپنا بوریا بستر لپیٹے ہوئے تھا۔

ابراہیمی دور میں تمام اطراف کے علماء ومشائخ کھنچ کھنچ کر جون پور آگئے، اور ہندوستان کے علم کا خلاصہ یہاں جمع ہوگیا، قاضی شہاب الدین دولت آبادی، قاضی نصیر الدین دہلوی، شیخ ابوالفتح بن عبدالحی بن مولانا عبدالمقتدر شریحی کندی دہلوی، شیخ نصیر الدین بن نظام الدین غزنوی دہلوی، مولانا قیام الدین دہلوی ظفرآبادی، شیخ محمد عیسیٰ دہلوی جون پوری، شیخ فتح اللہ اودھی انصاری شیخ محمد بن خضر دہلوی وغیرہ بڑے اطمینان وسکون سے تعلیم وتدریس، ارشاد وتلقین، ذکر وشغل اور رشد وہدایت میں مشغول ہوئے، اور ان کے خانوادے کئی صدیوں تک معدنِ علم وفضل رہے۔

سلطان ابراہیم شاہ شرقی نے قاضی شہاب الدین دولت آبادی کو غایت عقیدت اور کمال محبت سے جون پور آنے کی دعوت دی، اور اپنے خاص نمائندوں کو ہدایا وتحائف دے کر ان کی خدمت میں بھیجا، قاضی صاحب علماء وفضلاء اور طلبہ کی ایک جماعت کے ساتھ روانہ ہوئے، سلطان نے بڑھکر استقبال کیا، اور جامع مسجد (اٹالہ مسجد) کے پہلو میں ان کے لئے مدرسہ اور مکان بنوایا، فرشتہ کا بیان ہے کہ، سلطان نے قاضی صاحب کی توقیر وتعظیم میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، خاص خاص تقریبوں میں قاضی صاحب کو شاہی دربار میں چاندی کی کرسی پر بٹھاتا تھا، ایک مرتبہ قاضی صاحب بیمار پڑے تو سلطان مزاج پرسی کے لئے، ان کے گھر گیا، اور پانی کا ایک بھرا ہوا پیالہ لیکر قاضی صاحب کے سر پر گھمایا اور یہ کہکر پانی پی گیا کہ بار خدایا جو مصیبت ان پر آنے والی ہو،

[1] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۰۶

اسے میرے نصیب میں کر کے ان کو شفا دیدے، اس واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس صاحب تخت و تاج کو شریعت محمدی ﷺ کے علماء سے کس قدر انسیت و محبت تھی۔[1]

تذکرۃ العلماء میں ہے کہ ایک مرتبہ قاضی عبدالمقتدر شریحی دہلوی نے اپنے تلمیذ رشید قاضی شہاب الدین کی خواہش اور سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے شوق زیارت پر جونپور کا قصد فرمایا، قاضی شہاب الدین اور سلطان ابراہیم سیکڑوں علماء و فضلاء، ہزاروں طلبہ، شہزادوں اور ارکانِ دولت کو لیکر بارہ کوس تک پیشوائی کے لئے نکلے، سلطان نے جب دیکھا کہ قاضی صاحب اپنے استاد کی رکاب میں پیدل چل رہے ہیں تو خود بھی گھوڑے سے اتر پڑا، آگے بڑھے تو شاہی اصطبل کے تین گھوڑے موجود تھے۔ سلطان نے قاضی عبدالمقتدر کا ہاتھ پکڑ کر ایک گھوڑے پر بٹھایا، دوسرے پر قاضی شہاب الدین سوار ہوئے، اس کے بعد سلطان سوار ہوا، اور تینوں ساتھ روانہ ہوئے، جہاں راستہ تنگ ہوتا سلطان دونوں عالموں کو آگے کرتا اور خود ان کے پیچھے چلتا اسی ترتیب سے شہر میں داخل ہوئے، جلو خانہ سے لے کر ایوان شاہی تک انواع واقسام کے طلاباف کپڑے بچھائے گئے تھے، قصر شاہی کے قریب پہنچے تو سلطان نے قاضی عبدالمقتدر کی رکاب پکڑ کر ان کو اتارا اور شاہی مسند پر بٹھا کر خود قاضی شہاب الدین کے ساتھ خدمت میں کھڑا رہا، اس موقع پر جو شاہی ہدایا د تحائف پیش کئے گئے ان کی مجموعی قیمت ایک لاکھ سے زیادہ تھی، قاضی عبدالمقتدر ایک سال تک اسی اعزاز واکرام کے ساتھ جونپور میں مقیم رہے، ہر ہفتہ ایک دن محفل وعظ منعقد ہوتی تھی، جس میں سلطان ابراہیم، شاہزادے، بیگمات اور ارکان دولت شریک ہوتے اور صدہا غیر مسلم مشرف باسلام ہوتے تھے، اور عوام زار و قطار روتے تھے، ایک سال کے بعد قاضی عبدالمقتدر نے ضعف اور پیری کا عذر کر کے سلطان سے دہلی جانے کی اجازت چاہی اور سلطان کی درخواست پر اپنے صاحبزادے شیخ عبدالواحد کو جونپور میں چھوڑ کر خود دہلی تشریف لے گئے۔[2]

تذکرۃ العلماء کا یہ بیان قاضی عبدالمقتدر سے متعلق محل نظر ہے کیوں کہ ان کی وفات ۷۹۱ھ میں ہوئی ہے، اور سلطان ابراہیم ۸۰۴ھ میں تخت نشین ہوا ہے، اس لئے اس کا تعلق کسی

---

[1] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۰۶ [2] تذکرۃ العلماء ص ۱۷

دوسرے نامور عالم سے معلوم ہوتا ہے۔

مخدوم شیخ احمد عبدالحق ردولوی متوفی ۸۳۷ھ ابراہیمی دور کے اکابر اولیاء اللہ میں ہیں۔ ایک مرتبہ سلطان ابراہیم شاہ قصبہ اپچولی گیا، تو شیخ احمد عبدالحق نے ملاقات کرنی چاہی، اور فرمایا کہ النّاس علیٰ دین ملوکھم کی رو سے ابراہیم مسلمان بادشاہ ہے۔ اس کی رعایا کو مسلمان رہ کر اس کی محبت کا دم بھرنا چاہیے، جب لشکر شاہی کے قریب پہونچے تو قاضی رضی نے بڑھ کر ان کا استقبال کیا۔ اور ان کو اپنی قیام گاہ میں ٹھہرا کر سلطان سے کہا کہ ایک درویش جو قطبِ وقت ہے، ملاقات کے لئے آیا ہے، سلطان ابراہیم شاہ نے کہا کہ میں خود ان سے شرف ملاقات حاصل کرنا چاہتا ہوں، قاضی رضی نے کہا کہ رات میں ان سے ملنا مناسب نہیں معلوم ہوتا، پہلے ان کی خدمت میں کچھ نذر کرنا چاہیے، اگر قبول کرلیں گے تو سلطان کا ملنا مناسب ہوگا، سلطان کو یہ بات پسند آئی، اور فوراً ردولی کے علاقہ میں چار گاؤں اور ہزار بیگھہ زمین جاگیر میں دینے کا حکم دیا، قاضی رضی پروانہ اور کچھ نقدی لیکر شیخ احمد عبدالحق کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور کہا کہ سلطان نے یہ نذر پیش کی ہے، شیخ صاحب نے قاضی رضی سے فرمایا:۔

تم اور ابراہیم کیا دوسرے خدا پیدا ہوگئے ہو جو رزاقی کا دعویٰ کرتے ہو؟ جو خدا ابراہیم اور اس کے ملازموں، گھوڑوں اور ہاتھیوں کو روزی دیتا ہے، اور تم کو تمہارے نوکروں اور گھوڑوں کو روزی دیتا ہے کیا وہ مجھے کہ اس کے در کا فقیر ہوں، اور میرے لڑکوں کو روزی نہیں دے گا، جو تم اور سلطان درمیان میں آتے ہو؟

اس کے بعد اپنے خادم بختیار سے مخاطب ہوکر کہا:۔

کنواں ہوئے تو پاٹوں سمندر کہ پاٹن جائے ۔۔۔ بارا ہوئے تو برجوں جھیل کہ برجن جائے

اور سلطان سے ملاقات کئے بغیر رات ہی کو واپس چلے گئے [1]۔

ایک مرتبہ شیخ احمد عبدالحق جونپور تشریف لے گئے، اور سلطان ابراہیم سے ملاقات فرمائی اور دربار میں ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی بھی موجود تھے، شیخ اور سلطان میں گفتگو

---

[1] انوار العیون فی اسرار المکنون ص ۳۱، ۳۲۔

ہو رہی تھی، قاضی صاحب نے کسی بات میں دخل دیدیا، مگر بعد میں معذرت کی، جب یہ بات میر صدر جہاں سید اجمل کو معلوم ہوئی تو انھوں نے قاضی صاحب سے کہا کہ اگر سلطان ابراہیم اور شیخ احمد عبدالحق میں ملاقات ہوگئی، تو پھر ہم لوگوں کو یہ خیال دل سے نکال دینا چاہیئے کہ سلطان ہم پر یا شاہی امور پر توجہ دے سکیں گے، یہ درویش صاحب حال اور اہل کمال ہیں، ان کی نظر کیمیا اثر سے تانبا سونا بن جاتا ہے۔[1]

میر صدر جہاں سید اجمل شریعت وطریقت کے جامع، علوم ومعارف کے حامل اور ورع وتقوی میں بڑا اونچا مقام رکھتے تھے، سلطان ابراہیم اُن سے بے حد عقیدت ومحبت رکھتا تھا، ان کو صدر جہاں کے منصب پر ممتاز کیا اور ان کے لئے دریا کے کنارے نہایت خوبصورت مسجد بنوائی جو آج بھی جھجری مسجد کے نام سے موجود ومشہور ہے، سلطان کا ایک شاہزادہ بھی ان کی خانقاہ کے جوار میں دفن ہے۔[2]

شیخ عیسٰی دہلوی کو سلطان ابراہیم شاہ نے کمال آرزو سے دہلی سے جونپور بلایا، وہ اپنے چاروں فرزندوں یعنی خواجہ احمد، خواجہ محمد، خواجہ حامد اور خواجہ محمود کے ہمراہ یہاں تشریف لائے، سلطان ان کے ساتھ بڑی عقیدت سے پیش آیا، اور بہت کچھ مال ومتاع سے نوازنا چاہا، مگر انھوں نے قبول نہیں کیا، البتہ سلطان نے ان کے لئے ایک خانقاہ بنوادی، جس میں متوکلانہ زندگی بسر کرکے تلامذہ ومریدین کی علمی ودینی خدمت اور ان کی تعلیم وتربیت کا کام انجام دیتے رہے، سلطان ہر ہفتہ شاہزادوں کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا، اور فیض اٹھاتا تھا۔[3]

شیخ محمد بن خضر متوفی ۸۱۱ھ ابراہیمی دور میں دہلی سے جونپور آئے، اور ایک میدان میں درخت کے سایہ میں فروکش ہوئے، سلطان ابراہیم کو ان کی خبر ملی تو کمال عقیدت سے ان کے لئے مکان کا انتظام کیا، اور پورے اعزاز واحترام کے ساتھ رکھا اور ان کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے شیخ مشید کو پرگنہ محمد آباد گہنہ میں قریہ ولید پور وغیرہ کئی گاؤں جاگیر میں دیئے، بعد میں شیخ مشید کا خاندان وہیں منتقل ہوگیا جس میں شاہ ابوسعید، شاہ ابوالخیر، شاہ اسمٰعیل، ملا محمود، شاہ ابوالغوث اور شاہ ابواسحاق وغیرہ پیدا ہوئے۔[4]

---

[1] انوار العیون ص ۳۴ [2] تجلی نور ج ۱ ص ۵۰ [3] تذکرۃ العلماء ص ۲۰، [4] تجلی نور ج ۱ ص ۴۸ وغیرہ

میر سید حمید الدین محمد آبادیؒ

امیر حمید الدین مذکور در عہد سلطنتِ ابراہیم شرقی ”در محمد آباد سکونت فرمودند و پنج پسرے داشتند مسمّٰی سید محمد و سید حسن و سید محی الدین و سید پھول و سید میراں و ہر یکے اولاد داشتند امیر سید صدر جہاں اجمل مفتی بلدۃ جون پور و قاضی شہاب الدین ملک العلماء دولت آبادی و مخدوم سید اشرف جہانگیر نیز دراں زماں بودند شجرۂ نسب سید حمید الدین ساکن محمد آباد گوہنہ بن سید تاج الدین بن سید سراج الدین بن سید کمال الدین بن سید محمود بن حضرت امیر سید اجمل ترمذی[1]

سلطان ابراہیم شرقی کے زمانے میں امیر حمید الدین نے محمد آباد گوہنہ میں سکونت اختیار کی، ان کے پانچ لڑکے سید محمد، سید حسن، سید محی الدین، سید پھول اور سید میراں تھے اور یہ پانچوں بیٹے صاحب اولاد تھے، اور امیر سید صدر جہاں شیخ اجمل مفتی شہر جونپور، قاضی شہاب الدین ملک العلماء دولت آبادی، مخدوم سید اشرف جہانگیر سمنانی بھی اسی زمانے میں تھے، سید حمید الدین کا شجرۂ نسب اس طرح ہے۔ سید حمید الدین ساکن محمد آباد گوہنہ بن سید تاج الدین بن سید سراج الدین بن سید کمال الدین بن سید محمود بن حضرت امیر سید اجمل ترمذی الخ

شاہ میرن جان خلف اکبر سید شاہ علی جعفر نے اپنی کتاب تکملۂ وفیات میں لکھا ہے،

” چند روز قبل از حادثہ غدر ۱۸۵۷ء بتقریب شادی برادر عزیز شاہ محمد علیم خلف جناب عمی حضرت شاہ امین الدین قیصر بمقام ولید پور رفتہ بودم یکروز بغرض زیارت مزار جدی حضرت امیر کبیر

غدر ۱۸۵۷ء سے چند روز پہلے میں اپنے چچا حضرت شاہ امین الدین قیصر کے خلف رشید برادر عزیز شاہ محمد علیم کی تقریب شادی میں ولید پور حاضر ہوا۔ ایک دن اپنے جد امجد حضرت امیر کبیر سید حمید الدین

---

[1] بیاض شاہ اجمل الہ آبادی (قلمی)

سید حمید الدین از ولید پور بہ محمد آباد گوہنہ کہ قریب دو فرسنگ دارد در میان آں جوئے موسوم بہ تونس جاری شدہ بہ ملاقات حکیم صاحب موصوف کہ در حیات بودند رفتم نشاں قبر حضرت امیر دریافتہ در قبرستان کہ از مقام حکیم صاحب دو میل فاصلہ بودہ باشد رسیدہ بشرف اندوز زیارت مزار جد خود شدم	کے مزار کی زیارت کے لئے ولید پور سے محمد آباد گوہنہ گیا۔ولید پور سے محمد آباد گوہنہ قریب دومیل کی دوری پر ہے،ان دونوں کے بیچ میں ٹونس ندی بہتی ہے، وہاں میں نے حکیم صاحب موصوف سے ملاقات کی وہ ابھی باحیات تھے،ان سے حضرت امیر سید حمید الدین کی قبر کا نشان معلوم کر کے قبرستان پہونچا یہ قبرستان حکیم صاحب کے گھر سے دومیل کی دوری پر واقع ہے ۔وہاں جاکر اپنے جد امجد سید حمید الدین کے مزار کی زیارت سے مشرف ہوا۔

ہمارے خیال میں دیار اعظم گڑھ میں سب سے پہلا مدرسہ شیخ مشید کی جاگیرداری میں موضع سلطان پور (بھیرا) میں جاری ہوا،ان کے خانوادہ کے عالم شاہ ابوالخیر بھیروی متوفی ۱۰۵۹ھ نے اپنی کتاب شیر وشکر میں لکھا ہے کہ شیخ مشید کے دوست میر صدر جہاں سید اجمل ایک مرتبہ بنگالہ کی سفارت سے جونپور واپس ہوتے ہوئے اس قریہ میں پہونچے اور دیکھا کہ کارندوں اور ملازموں نے پوری جاگیر میں لوٹ کھسوٹ مچا رکھی ہے،جون پور پہونچ کر شیخ مشید کو صورت حال سے آگاہ کر کے اس کے انتظام کی طرف متوجہ کیا،اس کے بعد لکھتے ہیں: [۱]

میر مذکور حضرت شمس العلماء قدوۃ الاتقیاء مخدوم شیخ معروف کہ اکبر الاولیاء مخدوم بودند با جماعت صوفیان و طلبہ بقریہ مذکور آمدند ،	میر صدر جہاں کے کہنے پر شیخ مشید کے بڑے صاحبزادے شمس العلماء قدوۃ الاتقیاء شیخ معروف صوفیاء اور طلبہ کی ایک جماعت لیکر قریہ مذکور میں آئے ،

ظاہر ہے کہ شمس العلماء قدوۃ الاتقیاء شیخ معروف نے یہاں آکر جاگیر کے بندوبست کے ساتھ صوفیاء اور طلبہ کی جماعت کی تعلیم وتربیت کا کام جاری کیا ہوگا۔

---

[۱] شیر وشکر باب سوم قلمی ۔

اس کے دوسرے سال میر صدر جہاں ہی کے مشورہ سے شیخ معروف کے چھوٹے بھائی شیخ علی بھی یہیں آ گئے جس کی وجہ سے انتظامی امور کی طرف سے یکسوئی ہوئی اور شیخ معروف کا تعلیمی وتدریسی انہماک بڑھ گیا، اس کا تذکرہ شاہ ابوالغوث گرم دیوان متوفی ۱۰۸۷ھ کے زمانہ تک ملتا ہے،

اسی دور میں شیخ فتح اللہ بن عبداللہ انصاری اودھی دہلی سے جونپور آئے، وہ جامع مسجد میں وعظ کہتے تھے، جس میں امراء واعیان بھی شریک ہوتے تھے، قاضیٔ وقت نے جامع مسجد میں ان سے ملاقات کی، اور ان کے وعظ میں برابر حاضر ہوتا رہا، بعد میں ان کو پرگنہ ماہل میں کئی گاؤں جاگیر میں ملے۔ جہاں شیخ فتح اللہ منتقل ہو گئے اور اس کے قریب اپنے لڑکے کے نام پر بہاء الدین پور ایک گاؤں بسایا، پھر کندھیارا کے نام سے دوسرا گاؤں بسایا، ان کی اولاد میں علمی سلسلہ چلتا رہا، آخری دور میں شیخ گلشن علی بن شیخ عطاء اللہ ماہلی متوفی حدود ۱۲۰۰ھ اور مولوی حسن علی حسن بن شیخ نوازش علی ماہلی متوفی ۱۲۵۸ھ پیدا ہوئے۔[1]

اسی دور میں ایک بزرگ شیخ عبدالحکیم اپنے دس لڑکوں کے ساتھ وارد جونپور ہوئے، سلطان ابراہیم نے ان کی بھی آؤ بھگت کی اور کئی مواضعات جاگیر میں دئے اور انکے لڑکے اونچے عہدوں پر فائز ہوئے، خود شیخ عبدالحکیم کو سلطان کی طرف سے خان کا خطاب ملا، اور نتھو پور (گھوسی) وغیرہ کئی پرگنوں کے مدار المہام مقرر ہوئے، انھوں نے منجھولی سے لیکر بہار تک کے علاقوں کا نہایت عمدہ نظم ونسق قائم کیا اور وہاں سلطان کے نام کا سکہ جاری کیا، بعد میں انکی اولاد نتھو پور عرف سپاہ میں آباد ہوگئی، اور جب آخری شرقی بادشاہ سلطان حسین شاہ کو سکندر لودی نے شکست دی اور نظام سلطنت میں ابتری پیدا ہوئی تو مقامی سرکشوں نے شیخ عبدالحکیم اور ان کے کئی لڑکوں کو قتل کر ڈالا، شاہ ابوالغوث گرم دیوان بھیروی لہرادی کی والدہ اسی خاندان کے شیخ میر جان صدیقی کی صاحبزادی تھیں۔[2]

شیخ عیسیٰ کا تذکرہ پہلے گزر چکا ہے، ان کے فرزند حضرت شیخ محمد بن عیسیٰ تاج جونپوری متوفی ۸۷۰ھ علمائے ربانیین اور اولیائے کاملین میں سے تھے، سلطان ابراہیم شاہ اور اسکے بیٹے

---

[1] تذکرہ صبح وطن ص ۵۸ ونتائج الافکار ص ۲۰۸ وغیرہ [2] مناقب غوثی باب ہشتم قلمی۔

سلطان محمود شاہ دونوں ان سے انتہا درجہ کی عقیدت و محبت رکھتے تھے، ایک مرتبہ سلطان ابراہیم نے کمال عقیدت سے انکی خدمت میں بڑے قیمتی کپڑے بھیجے، شیخ محمد بن عیسیٰ تاج نے ان کے لینے سے انکار کردیا اور یہ اشعار پڑھے،

من دلق خود باطلس شاہاں نمی دہم　　　من فقرِ خود بملک سلیمان نمی دہم

از رنج فقر در دل گنجے کہ یافتم　　　ایں رنجِ را براحتِ شاہاں نمی دہم

﴿ میں بادشاہوں کے ریشمی کپڑے (اطلس) کے بدلے میں اپنی گدڑی نہیں دے سکتا میں اپنے فقر کو سلیمان علیہ السلام کے ملک وحکومت سے نہیں بدل سکتا رنج فقیری کی وجہ سے میرے دل میں ایک خزانہ عظیم ہے اس لئے میں بادشاہوں کی راحت کے لئے اس رنج کو نہیں دے سکتا، ﴾

شیخ محمد بن عیسیٰ جمعہ کی نماز محلّہ دریبہ کی مسجد خالص مخلص میں پڑھتے تھے، بڑھاپے تک ان کا یہی معمول رہا، ایک مرتبہ سلطان محمود نے ان کی پیری اور کمزوری دیکھ کر عرض کیا کہ اگر اجازت ہوتو آپ کی خانقاہ کے قریب ایک مسجد تعمیر کرادی جائے اور آپ کی اجازت سے سلطان نے جامع مسجد (جامع الشرق) کی تعمیر شروع کردی، جس کی تکمیل سلطان حسین شاہ نے کی، [1]

سلطان ابراہیم کے فقراء و مشائخ سے ہر حال میں حسن ظن رکھنے کے سلسلے میں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ شیخ رکن الدین بن مخدوم شیخ صدر الدین سہروردی جونپوری متوفی ۸۷۴ھ سے ایک مرتبہ خلاف شرع کوئی فعل سرزد ہوگیا، قاضی القضاۃ ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے اس پر سخت نکیر کی، اور اپنے شاگرد شیخ عبدالملک عادل کو تنبیہ کے لئے بھیجا، مگر وہ شیخ رکن الدین کی مشیخت کے مقابلہ میں اپنی عالمیت سے کام نہ لے سکے، اور انکے ہمنوا بن گئے، اس لئے قاضی صاحب نے کوتوال شہر نصرت خاں کو پروانہ لکھا کہ وہ شیخ رکن الدین کو شہر بدر کردے، کوتوال نے بھی شیخ رکن الدین کی طرفداری کی اور سلطان ابراہیم سے کہا کہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دینا مناسب ہے، چنانچہ سلطان نے بھی چشم پوشی کرلی،

ایک مرتبہ قلندروں کی ایک جماعت نے شیخ رکن الدین سے کچھ سوال کیا، انھوں نے

---

[1] تجلی نورج ۱ ص ۲۳

اپنے فرزند جلال کا ہاتھ پکڑ کر ان کے حوالہ کر دیا، اس واقعہ کی خبر سلطان ابراہیم کے وزیر عماد الملک قاضی خاں کو ہوئی تو انھوں نے قلندروں کو پانچ سو کی رقم دیکر جلال کو ان سے لے لیا، اور شیخ رکن الدین کے گھر پہونچا دیا۔ [1]

عہد ابراہیمی میں باہر سے آنے والے فضلاء میں قاضی نظام الدین (شہاب الدین احمد بن محمد) گیلانی متوفی ۸۷۵ھ نمایاں شخصیت کے مالک تھے، انھوں نے گجرات میں تحصیل علم کی تھی، سلطان ابراہیم شاہ کی علم پروری، اور علماء نوازی کا شہرہ سن کر جونپور آئے، اور مراحم خسروانہ سے نوازے گئے، قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے ان کے علم وفضل کی بنا پر ان کو سلطان کے مقربین میں شامل کرلیا اور وہ پہلے جونپور کے قاضی بنائے گئے، پھر مچھلی شہر کے، جہاں انکی اولاد بہت پھولی پھلی، اور ان میں علماء ومشائخ پیدا ہوئے، قاضی نظام الدین گیلانی نے سلطان ابراہیم کے حکم سے "فتاویٰ ابراہیم شاہیہ" تالیف کی۔ [2]

مفتی محمد بن ابو البقاء کرمانی جونپوری متوفی ۸۷۰ھ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور جونپور آکر شیخ ابوالفتح بن عبدالحیٔ کندی سے تعلیم حاصل کی، دیار جونپور میں ان کے فتاویٰ بہت مقبول و مشہور ہوئے، سلطان ابراہیم ان کے علم وفضل کی وجہ سے ان کا بڑا معتقد تھا، اور مسائل شرعیہ میں ان سے رجوع کرتا تھا، ایک مرتبہ سلطان نے ایک باغی اور سرکش راجہ کی تادیب کے لئے فوج روانہ کی، اس جنگ میں ایسے لوگ بھی مارے گئے جو باغی اور سرکش نہیں تھے، سلطان کو یہ چیز جہاد کے خلاف معلوم ہوتی تھی، اس نے مفتی صاحب سے استفتاء کیا، انھوں نے جواب دیا کہ ان سے قتال جائز ہے، اگرچہ وہ فی الحال باغی ومتمرد نہیں تھے، مگر وہ اعدائے اسلام ہیں، اور موقع کی تلاش میں رہا کرتے ہیں۔ [3]

مولانا عادل الملک بن عبدالملک جونپوری اس دور کے مشہور علماء ومشائخ میں تھے پنڈوہ (بنگال) جا کر شیخ علاء الدین پنڈوی سے طریقت حاصل کی، اور جونپور واپس آکر کچھ دنوں مقیم رہے، سلطان ابراہیم ان کا بھی معتقد تھا، اور انکی ذات کو بابرکت سمجھتا تھا، ۸۲۰ء میں سلطان نے

[1] تجلی نور ج ۱ ص ۳۳ [2] تجلی نور ج ۲ ص ۴۱ [3] نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۱۳۳،

ان کو رائے بریلی میں جاگیر عطا کر کے وہیں آباد کرا دیا۔

شیخ خضر بن حسن بلخی حدیث کے بڑے عالم تھے، وہ اپنے وطن بلخ سے ہندوستان آئے اس وقت سلطان ابراہیم شاہ کی علم نوازی کا عام چرچا تھا، اس لئے دوسرے علماء وفضلاء کی طرح شیخ خضر بھی جونپور چلے آئے، سلطان نے ان کو لکھنؤ میں تدریس کی خدمت پر مامور کر کے ملیح آباد کے اطراف میں کئی گاؤں کی جاگیر عطا کی۔

قاضی رضی الدین ردولوی، قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے نواسے اور شاگرد تھے، سلطان ابراہیم نے ان کو ردولی کا قاضی بنایا، جہاں انھوں نے مستقل سکونت اختیار کر لی۔

مشہور عالم و بزرگ حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی کچھوچھوی متوفی ۸۰۸ھ سے سلطان ابراہیم کو بیحد عقیدت تھی، جب وہ جونپور تشریف لاتے تو سلطان ان کی خدمت میں حاضر ہوتا، ایک مرتبہ جب وہ جونپور کی جامع مسجد میں آئے تو سلطان ابراہیم قاضی شہاب الدین کی معیت میں حاضر خدمت ہوا، اس وقت سلطانی فوج قلعۂ چنار کا محاصرہ کئے ہوئی تھی، واپسی پر سید صاحب نے سلطان کو اپنی مسند عنایت فرمائی اور فتح کی بشارت دی، اس کے تیسرے دن، قلعۂ چنار کی فتح کی خبر آئی، اس لئے سلطان نے دوبارہ حاضر خدمت ہو کر نذر پیش کی مگر سید صاحب نے قبول نہیں فرمایا، کئی شاہزادے حلقہ ارادت میں شامل ہو کر قیام جون پور کے لئے مصر ہوئے، سید صاحب نے ان کی دلجوئی میں فرمایا کہ ہم جون پور میں اگر چہ نہیں رہیں گے مگر سلطان کی حدود سے باہر نہیں جائیں گے، اور جون پور میں دو ماہ سے زیادہ مقیم رہے۔[1]

اسی دور میں سید عثمان شیرازی درویش دہلی ہوتے ہوئے وارد جون پور ہوئے، اور سلطان اور ارکانِ دولت ان کے ساتھ بھی عزت و احترام سے پیش آئے، ملک خالص مخلص اور دوسرے امراء نے ان کے لئے محلہ دریبہ میں ایک سنگین مسجد بنوائی، جس میں شیخ محمد بن عیسیٰ تاج بھی نماز جمعہ ادا کیا کرتے تھے، یہ مسجد اب بھی موجود ہے، اور اسی کے قریب شیخ عثمان کا مزار ہے۔[2]

افضل العلماء ملا بہرام متوفی ۸۲۹ھ مرتاض جہاں، حافظ قرآن، نجیب الطرفین، اور

---

[1] لطائف اشرفی ج۲ص ۱۰۵و۱۰۶ [2] تجلی نور ج ۱ص ۴۵۔

حاجی الحرمین الشریفین تھے، دہلی میں اکتسابِ علم وفضل کر کے شاہزادہ ظفر کے ساتھ ظفر آباد آئے اور وہاں کی جامع مسجد کے امام وخطیب بنائے گئے، جس علاقہ میں سکونت اختیار کی اس کو منطق ٹولہ کہتے تھے [۱]

سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے بعد اس کے بیٹے سلطان محمود شاہ شرقی ۸۴۴ھ تا ۸۶۲ھ نے بیس سال سے زیادہ مدت تک حکومت کی وہ بھی عادل ومنصف ہونے کے ساتھ ساتھ محب العلم والعلماء تھا، اس نے بھی اپنے دور میں بہت سے علمی ودینی آثار قائم کیے، اور باپ کی طرح علم پروری اور علماء نوازی میں شہرت پائی۔ شیخ محمد بن عیسیٰ ابراہیمی دور کے علماء کبار اور مشائخ عظام میں تھے، ان کے لئے سلطان محمود شاہ نے ان کی خانقاہ کے قریب جامع مسجد (جامع الشرق بڑی مسجد) تعمیر کی جس کی تکمیل سلطان حسین شاہ کے دور میں ہوئی۔

مخدوم سید علی بن داؤد علماء جون پور میں علوم ظاہری وباطنی کے جامع اور رموز صوری و معنوی سے واقف تھے، سلطان محمود شاہ اور اس کی ملکہ بی بی راجی دونوں ان سے کمال عقیدت و محبت رکھتے تھے، بی بی راجی نے ان کے لئے شہر سے باہر ایک عالیشان سنگین مسجد بنوائی جو مسجد لال دروازہ کے نام سے مشہور ہے، اور جامع الشرق کا نمونہ ہے، اسی سے متصل مخدوم سید علی کے لئے خانقاہ بنوائی اور اسی کے نام سے ایک گاؤں علی پور آباد کیا۔[۲] یہ مسجد نہایت خستہ حالی میں تھی، مگر چند سال سے اس میں مدرسہ حسینیہ کے قائم ہونے سے مسجد آباد ہوگئی ہے۔

سلاطین شرقیہ خصوصاً سلطان محمود شاہ شرقی کے دور میں علم وعلماء کی کثرت اور ان کی علمی و دینی سرگرمی کا اندازہ ایک واقعہ سے بخوبی ہوسکتا ہے، جسے ملا عبدالقادر بدایونی نے نجات الرشید میں بیان کیا ہے، جس میں ایک موقع پر ایک سو بیس علماء وفضلاء جمع ہوئے، اور ایک اہم مسئلہ میں دوگروہوں نے دادِ تحقیق دی۔

انھوں نے لکھا ہے کہ سلطان محمود شرقی کے دورِ حکومت میں پورب کے بعض کفار نے سرکشی کر کے خراج کی پوری رقم ادا نہیں کی فتنہ وفساد کے دوران میں مسلمانوں کی بستیوں پر یلغار کی

[۱] تجلی نور ج ۲ ص ۲۷، [۲] تجلی نور ج ۱ ص ۴۶

اور دین اسلام کے خلاف کھلے طور سے طعن وتشنیع کرنے سے دریغ نہیں کیا سلطان محمود نے اس بارے میں دیار پورب کے علماء سے استفتاء کیا اور تقریباً ایک سوبیس علماء کا محضر بلایا جس میں علماء کے دوگروہ تھے، ایک طرف کے سربراہ مولانا سماء الدین وزیر الملقب بہ قتلغ خاں شارح کافیہ تھے، ان کا فتویٰ تھا کہ ان حرکتوں کے باوجود ان سرکش کافروں کا قتل ونہب اور غلام بنانا جائز نہیں ہے، دوسری طرف کے سربراہ قاضی اعظم لکھنوتی تھے جن کو مکہ مکرمہ سے امام اعظم ثانی کا خطاب ملا تھا، انھوں نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا، اس مسئلہ میں علماء کے مابین کئی دنوں تک بحث ومباحثہ اور تحقیق وتلاش کی سرگرمی رہی، آخر میں قاضی اعظم کے قول وفتویٰ پر سب کا اتفاق ہوا اور انھوں نے رسالۂ اعظمیہ لکھکر اس کے دلائل تفصیل سے بیان کیے۔

بعد میں شیخ اللہ داد شارح ہدایہ نے جزیہ اور خراج کی بحث میں اس رسالۂ کے دلائل کا جواب لکھا، ان سطور (نجات الرشید) کا لکھنے والا فقیر جو کہ اس دیار کے اوضاع واطوار سے واقف ہے رسالہ اعظمیہ کو ترجیح دیتا ہے۔[1]

سلطان محمود شاہ کے بعد اس کا بیٹا سلطان محمد شاہ صرف چند ماہ حکومت کرسکا، اس کے بعد سلطان محمود شاہ کا دوسرا بیٹا سلطان حسین شاہ تخت پر بیٹھا (۸۶۲ھ تا ۸۸۱ھ) اس پر شرقی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔ اس نے بھی اپنے اُنیس (۱۹) سالہ دور میں قدردانی علم وعلماء میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔

اس دور میں قاضی سماء الدین جون پوری اعلم العلماء تھے، ان کو قاضی شہاب الدین دولت آبادی سے تلمذ حاصل تھا، سلطان حسین شاہ نے ان کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا تھا، اس لئے اپنے دور میں ان کو وزیر بنا کر قتلغ خان کا لقب دیا تھا، جس وقت سلطان حسین سلطان بہلول لودھی بادشاہ دہلی کے مقابلہ میں گیا، قاضی سماء الدین اس کے ساتھ تھے، شکست کے بعد بہلول لودھی نے ان کو گرفتار کرکے دہلی میں قید کیا جہاں وہ ۸۹۴ھ تک زندہ رہے۔[2]

مخدوم دانیال خضری متوفی ۸۹۴ھ راجہ حامد شاہ مانک پوری کے مرید وخلیفہ تھے،

---

[1] نجات الرشید ص ۲۴۰ طبع لاہور [2] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۸۱،

صاحب مرآۃ الاسرار کے بیان کے مطابق وہ سلطان حسین شاہ کے دور میں جون پور تشریف لائے، اور انتقال کے بعد اپنے حجرہ کے صحن میں جو سلطان محمود شاہ کے حوض خاص کے پشتہ کے پیچھے تھا، دفن کئے گئے کہتے ہیں کہ ایک ماہ تک ان کی قبر سے مشک کی خوشبو آتی رہی۔[1]

سلطان ابراہیم، سلطان محمود اور سلطان حسین تینوں حضرت شیخ محمد بن عیسیٰ تاج متوفی ۸۷۰ھ کے معتقد تھے، ایک دن وہ اپنے حجرے کی گل کاری کر رہے تھے، کہ سلطان حسین حاضر خدمت ہوا، شیخ نے ہاتھ دھو کر مصافحہ و معانقہ کرنا چاہا مگر سلطان حسین شاہ نے اسی حال میں مصافحہ و معانقہ کی خواہش کی آپ نے اس کی خواہش پوری کر دی، سلطان کے کپڑے میں مٹی لگ گئی، اس کی یہ عقیدت تھی کہ اس نے وصیت کی کہ اس کو اسی کپڑے کا کفن دیا جائے، سلطان ان کی بڑی خدمت کرنا چاہتا تھا، مگر وہ قبول نہیں کرتے تھے، ایک مرتبہ سلطان نے ان کے صاحبزادے شیخ حبیب اللہ سے درخواست کی کہ آپ اپنے والد محترم اور ان کے متعلقین، اور خانقاہ کے واردین و صادرین کے اخراجات کے لئے کچھ جاگیر قبول کرلیں۔ شیخ محمد بن عیسیٰ نے سنا تو سلطان کی خاطر سے خاموش رہے مگر جب سرکاری کارپرداز غلہ اور خطیر رقم لیکر حاضر خدمت ہوئے، تو ان کے دل میں الجھن پیدا ہوگئی، اور فرمایا کہ حبیب اللہ اس غلہ کو کھانے کے بعد خاک کھائے گا، کہتے ہیں کہ اسی سال شیخ حبیب اللہ کا انتقال ہوا۔

سلطان بہلول لودھی نے دہلی کی سلطنت پر قبضہ کرنے کے بعد جونپور کی تسخیر کا قصد کیا، سلطان حسین شاہ کو معلوم ہوا تو اس نے شیخ محمد بن عیسیٰ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس سے مطلع کیا، آپ نے فرمایا کہ ''قاصد محروم و مقہور است'' اس کے بعد بہلول لودھی کی جونپور کی طرف پیش قدمی سے پہلے ہی خود سلطان حسین شاہ اس سے جنگ کے لیے نکلا مگر قنوج میں شکست کھا کر جونپور واپس آیا۔ اور شیخ محمد بن عیسیٰ کی خدمت میں حاضر ہو کر رنج والم کا اظہار کیا، آپ نے فرمایا بات وہی ہوئی اگر بہلول جنگ کا ارادہ کرتا تو وہ محروم ہوتا، تم نے یہ کام کیا تو وہ بات تم پر پوری ہوئی، آخر میں جب سلطان حسین لودھیوں کے مقابلہ میں شکست کھا کر بہار میں پناہ گزین ہوا تو شیخ صدر الدین کی

[1] تجلی نور ج ۱ ص ۵۷،

خدمت میں حاضر ہو کر دعا اور مدد کی درخواست کی انھوں نے جواب دیا کہ ''انداختہ خواجہ محمد عیسیٰ را مانمی توانیم برداشت'' یعنی شیخ محمد بن عیسیٰ کے ٹھکرائے ہوئے کو ہم نہیں اٹھا سکتے ہیں۔[1]

شیخ بہاء الدین جون پوری کے علم و فضل اور سلطان حسین کے جود و سخا سے دین و دنیا دونوں بہم نظر آتے تھے، سلطان نے ان کے لئے عظیم الشان خانقاہ بنوائی جس میں شاہانہ طرز کے ایوان تھے چند مواضع جاگیر میں بھی دیئے، جس سے شیخ بہاء الدین کی خانقاہ فقراء و طلبہ کی مرجع بن گئی، اور اطمینان و سکون سے تعلیم و تعلم اور ارشاد و تلقین کا کام ہوتا رہا۔[2]

مولانا اللہ داد جون پوری نے سلطان حسین کی خواہش پر فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہدایہ اور اصول فقہ کی مشہور کتاب اصول بزدوی کے حواشی تحریر فرمائے، اور دونوں کے خطبہ میں سلطان حسین کا نام تحریر کیا، سلطان نے اس کے صلہ میں مولانا اللہ داد کو شاہی خزانہ سے ایک لاکھ روپیہ نذر کیا، جسے مولانا نے چند دنوں میں حاجت مندوں میں تقسیم کرا دیا، اس سے طالب علموں کی حالت اتنی سدھر گئی کہ ان میں اور شاہزادوں میں کوئی فرق نہ معلوم ہوتا تھا۔[3]

مولانا صفی جون پوری سلطان حسین شاہ کے دور کے مشہور علماء و فضلاء میں سے تھے، انھوں نے بہلول لودھی، اور سکندر لودھی کا زمانہ بھی پایا ہے، ان کی تصانیف میں شرح کافیہ بہت مشہور ہے، جسے انھوں نے سلطان حسین کے ایک شاہزادہ کے لئے لکھا تھا، اور سلطان نے اس کے صلہ میں آپ کو خلعت شاہی سے نوازا تھا، جس وقت سلطان حسین شاہ بہلول لودھی سے جنگ کے ارادہ سے دہلی کی طرف روانہ ہ۔ د، مولانا صفی اس کے ساتھ تھے، اتفاق سے اثنائے جنگ میں بہلول لودھی کی افغانی فوج نے ان کو گرفتار کرلیا، جب وہ بہلول لودھی کے سامنے پیش کئے گئے تو اس نے ان کے ساتھ بڑی تعظیم و تکریم اور لطف و مدارات کا معاملہ کیا، اور اپنے ساتھ رکھا، شہزادہ سکندر بن بہلول لودھی نے ان کی خدمت میں رہکر تحصیل علم کی جب سلطان سکندر لودھی، سلطان حسین کے مقابلہ میں فتح ہوا تو جون پور کے شاہی قصور و محلات کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، اور سلاطین شرقیہ کی تعمیر کردہ مسجدوں کو بھی ویران کرنا چاہا، مگر مولانا صفی جو اس کے ہم رکاب تھے، اس

[1] تجلی نور ج ۱ ص ۲۲ تا ۲۴۔ [2] تذکرۃ العلماء ص ۲۵۔ [3] تذکرۃ العلماء ص ۲۵۔

سے باز رکھا، اس پر آشوب دور میں جون پور کے جو علماء و فضلاء اور مشائخ و مدرسین قتل و غارت کی مصیبت میں مبتلا تھے، آخر میں مولانا صفی کی وساطت سے سلطان سکندر لودھی کے دربار میں باریاب ہوئے، سلطان نے ان سب کا مال و اسباب واپس کرادیا۔ اور ہر ایک کو حسب حال نوازش خسروانہ سے نوازا اور جون پور کا نظم و نسق درست کر کے اپنے بیٹے جلال خاں کو وہاں کا حاکم مقرر کیا اور دہلی کی راہ لی، مولانا صفی بھی ان ہی کے ساتھ واپس ہوئے، مگر راستہ میں آگرہ پہونچ کر ان کا انتقال ہوگیا۔[۱]

شرقی دور سلطنت کے برکات و حسنات میں حضرت شیخ جمال الدین ہانسوی متوفی ۶۵۵ھ کے فرزند ارجمند شیخ بہاء الدینؒ بھی ہیں جنھوں نے سندھالہ سے آکر محمد آباد گوہنہ میں سکونت اختیار فرمائی، ان کے پوتے شیخ اسماعیل ''کلاں'' تھے۔ ان کے پوتے شیخ ابراہیم دانشمند صاحب کشف و کرامت بزرگ گزرے ہیں۔ مرآۃ الاسرار میں ہے۔

از فرزندانِ شیخ جمال الدین ہانسوی	شیخ جمال الدین ہانسوی کی اولاد میں
شیخ بہاء الدین جدّ شیخ اسمٰعیل از سندھالہ	سے شیخ اسمٰعیل کلاں کے دادا شیخ بہاء الدین
وقت سلطان شرقی در قصبہ محمد آباد گوہنہ	نے مقام سندھالہ سے سلطان شرقی کے
استقامت نمود[۲]	زمانہ میں محمد آباد گوہنہ میں سکونت اختیار کی،

اکبر بادشاہ تسخیر بنگالہ سے واپسی پر شیخ ابراہیم دانشمند کی خدمت میں حاضر ہوا تھا ان کا مزار کھرانٹی (متصل محمد آباد گوہنہ) میں ہے۔

اس دور کے چند مشاہیر اربابِ علم و فضل

اوپر صرف ان چند علماء و فضلاء اور مشائخ کا تذکرہ کیا گیا، جو سلاطین شرقیہ سے خصوصی تعلق رکھتے تھے، ان کے علاوہ شرقی قلمرو میں ہزاروں اہل کمال موجود تھے، جو اپنے اپنے حلقوں میں دین و دیانت، اور علم و فن کی خدمت میں مصروف تھے، ذیل کے حضرات اپنی اپنی ذات سے

---

[۱] تذکرۃ العلماء ص ۲۶، [۲] مرآۃ الاسرار بحوالہ حدائق الحنفیہ ص ۳۳۲۔

پوری انجمن تھے۔

ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی، خواجہ صدر جہاں شیخ اجمل بن امجد بہرائچی، قاضی تاج الدین ناصحی ادہمی ظفرآبادی، قاضی سماء الدین جون پوری، قاضی سناء الدین مچھلی شہری، قاضی نظام الدین بن صدر الدین زینبی غزنوی مچھلی شہری، قاضی شہاب الدین اودھی، قاضی محمد بن محمود نصیرآبادی، قاضی محمود بن علاء الدین نصیرآبادی، شیخ فتح اللہ انصاری اودھی، مولانا علاء الدین جون پوری، مولانا عادل الملک جونپوری، شیخ محمد بن عیسیٰ جون پوری، شیخ صفی الدین نعمانی ردولی، شیخ محمد بن قاسم اودھی، شیخ نظر بن حسن بلخی، مولانا عبد الملک جون پوری، سید اشرف سمنانی کچھوچھوی، شیخ سعد اللہ خیرآبادی، شیخ محمد بن خضر دہلوی جون پوری، قاضی نصیر الدین گنبدی جون پوری، شیخ محمد بن ظہیر الدین کڑوی، شیخ محمد بن قطب (شیخ مینا) لکھنوی، شیخ متوکل کنتوری، شیخ محمود بن حمید کنتوری، شیخ مسعود بن ظہیر فتح پوری، مولانا نور الدین ظفرآبادی، حکیم شہاب الدین جون پوری، شیخ عبد الرزاق کچھوچھوی، مولانا فخر الدین ردولوی، شیخ فیض اللہ بن شیخ حسام الدین مانک پوری، شیخ فیروز بن موسیٰ دہلوی جون پوری، شیخ قاسم بن برہان الدین چشتی اودھی، شیخ قطب الدین ظفرآبادی، مولانا قیام الدین قریشی ظفرآبادی، مفتی محمد بن ابوالبقا کرمانی لکھنوی، شیخ کمال الدین کڑوی، شیخ حسام الدین فتح پوری، شیخ حسام الدین بن خواجہ خضر مانک پوری، شیخ رکن الدین ہروی جون پوری، شیخ رکن الدین قریشی ظفرآبادی شیخ سارنگ چشتی لکھنوی، شیخ سعد الدین بجنوری لکھنوی، شیخ سعد اللہ لکھنوی، شیخ سعد اللہ کنتوری، شیخ شمس الدین اودھی، شیخ ابوالفتح بن شیخ عبد الحیٔ بن شیخ عبد المقتدر شریحی دہلوی جون پوری، شیخ احمد بن عمر (احمد عبد الحق) ردولوی، شیخ احمد حسینی مانک پوری، شیخ اسمٰعیل بن شیخ صفی الدین نعمانی ردولی، شیخ امین الدین لکھنوی، شیخ بدیع الدین مدار مکن پوری، شیخ بدھن علوی بہرائچی، شیخ جلال الدین بن اسمٰعیل مانک پوری، شیخ جمشید اسرائیلی راجگیر ی اودھی، شیخ حسام الدین بن نصر اللہ اصفہانی جون پوری، شیخ مشید بن شیخ محمد بن خضر جون پوری، شیخ محمد قدوائی دریابادی، شیخ مبارک بن حمید بنارسی، شیخ جہان شاہ احمد مانک پوری، مولانا خواجہ مانک پوری، مولانا عبد الملک جون پوری، مولانا الہ داد جون پوری وغیرہ۔

اس دور کی تصانیف

دیار پورب میں تصنیف وتالیف کا سلسلہ سلاطین شرقیہ کے دور میں جاری ہوا، جو آج تک قائم ودائم ہے، اور یہ علاقہ اب تک علمائے مصنفین سے معمور ہے، ہمارے علم وتحقیق میں اس دیار کے مصنفین میں سب سے پہلے عالم مولانا شرف الدین لاہوری متوفی ۸۰۰ھ کے بڑے صاحبزادے مولانا امیر صدرالدین ہیں، جو دوسرے شرقی سلطان مبارک شاہ کے وزیر تھے، ان کی تصانیف میں سے شرح کافیہ، حاشیہ شرح عضدی، اور حاشیہ تفسیر بیضاوی، مصنف تذکرۃ العلماء کی نظر سے گزری تھیں۔[1]

ان کے بعد ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے حسب ذیل کتابیں لکھیں، الارشاد، شرح کافیہ، البحر المواج، شرح اصول بزدوی، شرح قصیدہ بانت سعاد، شرح قصیدہ بردہ، رسالہ تقسیم علوم، مناقب السادات، ہدایۃ السعداء، بدیع البیان، جامع الصنائع، المصباح، عقیدۂ شہابیہ، رسالہ معارضہ، فتاویٰ ابراہیم شاہی، رسالہ طہارت زہاد، رسالہ افضلیت عالم بر سیّد۔

فرشتہ نے قاضی صاحب کی تصانیف کے بارے میں لکھا ہے، ”تصانیف مستحسنہ آن بزرگوار شہرت عام دارد[2] (ان بزرگوں کی قابل تعریف تصنیفات عام طور سے مشہور ہیں)

اور سبحۃ المرجان میں ہے

وَالّف کتباسارت بھا رکبان العرب والعجم ص ۳[3]	قاضی صاحب نے وہ کتابیں لکھیں جن کو عرب وعجم کے علمی قافلے اپنے ساتھ لے گئے۔

اہل علم ان کتابوں کو بہترین خط میں لکھ کر ایران وتوران اور روم وشام کے بادشاہوں کی خدمت میں بطور ہدیہ بھیجتے، ان میں سے اکثر سلاطین ان کتابوں کو سونے چاندی سے تول کر اس کو قاضی صاحب کی خدمت میں بطور انعام بھیجتے تھے۔[4]

---

[1] تذکرۃ العلماء ص ۱۲ [2] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۰۶ [3] سبحۃ المرجان ج ۲ ص ۳۹ [4] تذکرۃ العلماء ص ۱۴۔

سلطان ابراہیم کے دور میں کئی علماء نے اس کے نام سے معنون کر کے بلند پایہ کتابیں لکھیں، فرشتہ کا بیان ہے۔

”درعصرِ وے فضلائے ممالک ہندوستان و دانشمندان ایران توران کہ از آشوب جہاں پریشان خاطر بودند، بدارالامان جون پور آمدہ در مہد امن واماں غنودند وازخوان احسانِ اوذلہا برداشتہ بنام نامی او (چنانچہ بزبان قلم خواہد آمد) چندین کتب ورسائل پرداختند“ [1]	ابراہیم شاہ شرقی کے عہد حکومت میں ہندوستان کے فضلاء اور ایران وتوران کے دانشوروں نے خستہ حالی سے پریشان ہوکر جون پور کے دارالامن میں آکر پناہ لی اور اس کے خوانِ احسان سے لقمے اٹھائے اور ابراہیم شاہ شرقی کے نام سے کتابیں اور رسالے تصنیف کیے،

طبقات اکبری میں ہے وآں دار السلطنت از فرقدوم علماء دارالعلم گردیدو چندین کتب وسائل بنام او تصنیف شد، مثل حاشیہ ہندی و بحر المواج وفتاویٰ ابراہیم شاہی وارشاد وغیر ذالک [2]

قاضی نظام الدین حنفی گیلانی جون پوری نے متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں، جن میں فتاویٰ ابراہیم شاہیہ خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ فقہ حنفی کی یہ کتاب ایک سو ساٹھ کتابوں سے استفادہ کر کے لکھی گئی ہے، اس کا انداز تحریر فتاویٰ قاضی خاں کا ہے، کشف الظنون میں اس کو ”کتابٌ کبیرٌ من افخرِ الکتب“ لکھا ہے۔

سید اشرف جہانگیر سمنانی کچھوچھوی شرقی دور کے اجلۂ مشائخ واکابر علماء میں ہیں، ان کی تصانیف یہ ہیں اشرفیہ فی نحو، حاشیہ ہدایہ، الفصول فی اصول الفقہ، شرح عوارف المعارف، شرح فصوص الحکم، قواعد العقائد، اشرف الانساب، بحرالانساب، بحر الاذکار، فوائد الاشرف، اشرف الفوائد، بشارۃ الذاکرین، تنبیہ الاخوان، حجتہ الذاکرین، فتاویٰ اشرفیہ، تفسیر نور بخشی، اورادِ اشرفیہ، مرآۃ الحقائق، کنز الدقائق، رسالہ جواز سماع، البشارۃ المریدین، ارشاد الاخوان، رسالہ جواز لعن بریزید، لطائف اشرفیہ، ملفوظات اشرفیہ جامع نظام الدین غریب یمنی، دیوان اشعار۔

---

[1] تاریخ فرشتہ ج۲ص ۳۰۵ [2] طبقات اکبری ص ۵۲۹

مولانا علاء الدین جون پوری، قاضی شہاب الدین کے ارشد تلامذہ میں تھے، قاضی صاحب نے اسی شاگرد کے لئے شرح کافیہ لکھی تھی، انھوں نے فراغت کے بعد اپنے استاذ کی اس کتاب کا حاشیہ لکھا، اس کے علاوہ مولانا نے کئی کتابیں تصنیف کیں۔

مولانا عبدالملک جون پوری بچپن ہی سے قاضی شہاب الدین کی خدمت میں رہے، اور ان سے جملہ علوم کی تحصیل کی، انھوں نے بھی اپنے استاذ کی شرح کافیہ کا حاشیہ لکھا، اس کے علاوہ اور کتابیں بھی لکھیں۔

شیخ صفی الدین ردولوی قاضی شہاب الدین کے نواسے اور ان کے تلمیذ خاص ہیں ان کی متعدد تصانیف ہیں علم صرف میں دستور المبتدی اپنے صاحبزادے شیخ اسمٰعیل کے لئے لکھی تھی، غایۃ التحقیق کافیہ کی بسیط شرح ہے، اس میں انھوں نے اپنے نانا اور استاذ قاضی شہاب الدین کی شرح کافیہ کی تسہیل کی ہے، کشف الظنون میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔

مولانا شمس الدین خواجگی کڑوی حدیث و فقہ اور تصوف میں امتیازی شان رکھتے تھے، ان کی تصانیف میں کتاب المرید و المراد و کتاب الاربعین ہے، جو مشارق الانوار سے چالیس احادیث کا انتخاب ہے۔

شیخ حسام الدین مانک پوری نے تصوف میں انیس العاشقین لکھی، اور شیخ شہاب الدین مانک پوری نے ان کے ملفوظات ''رفیق العارفین'' کے نام سے جمع کیے ہیں جس میں ان کے ۱۲۱ مکاتیب بھی ہیں۔

شیخ سعد الدین خیر آبادی فقہ، اصول فقہ، نحو، عربیت اور تصوف کے زبردست عالم تھے، ان کی تصانیف میں شرح اصول بزدوی، شرح الحسامی، شرح کافیہ، شرح مصباح اور شرح رسالہ مکیہ ہے۔ یہ ان کے شیخ شاہ مینا لکھنوی کے ملفوظات کا مجموعہ ہے۔

شیخ محمد بن قاسم چشتی اودھی نے تصوف میں آداب السالکین نہایت مفید کتاب لکھی۔ شیخ کمال کڑوی کالو کے لقب سے مشہور ہیں، ان کی کئی تصانیف ہیں۔ ان میں ایک اورادِ کالو ہے، شیخ محمد بن ظہیر الدین عباسی کڑوی مدفون لکھنؤ حاجی الحرمین کے لقب سے مشہور ہیں ان کی متعدد

کتابیں ہیں جن میں ارشاد المریدین، معیار التصوف اور اساس الطریقت مشہور ہیں،

شیخ محمود بن حمید کنتوری نے عربی زبان میں الرسالۃ المحالیۃ فی معرفۃ المداریہ لکھی ہے۔

مولانا الٰہ داد جونپوری نے سلطان حسین شاہ کی خواہش پر ہدایہ اور اصول بزدوی کی شرح لکھی اور دونوں کے مقدمہ میں سلطان حسین کا ذکر کیا، سلطان نے اس کے صلہ میں ان کو نوازا، سلطان حسین خود بھی عالم و فاضل اور موسیقی کا بھی ماہر تھا، اس نے بعض نغموں اور راگوں میں تصرف کر کے دھرپت اور چٹکلہ کے نام سے نئی چیزیں پیدا کیں، اور موسیقی میں تحفۃ الہند کے نام سے ایک کتاب لکھی۔

مولانا صفی جونپوری نے سلطان حسین کے صاحبزادے کے لئے شرح کافیہ تصنیف کی اور سلطان نے ان کو شاہی خلعت سے نوازا۔

غرض نویں صدی میں دیار پورب سلاطین شرقیہ جونپور کی علم پروری اور علما نوازی کی وجہ سے ہر علم وفن کے علماء وفضلاء اور مشائخ و بزرگان دین کا ملجاو ماویٰ تھا اور قریہ قریہ میں مدارس اور خانقاہیں تھیں، جن میں درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور ارشاد و تلقین کا سلسلہ جاری تھا۔ اسی حالت میں زمانہ نے کروٹ لی اور جونپور کے سلاطینِ شرقیہ کا اقبال دہلی کے لودھی سلاطین کے مقابلہ میں ادبار سے بدل گیا، اور اس دیار میں لودھی سلطنت قائم ہوگئی۔

لودھی دور میں علم و علماء

آخری شرقی بادشاہ سلطان حسین نے ۸۸۱ھ میں دہلی کی لودھی سلطنت کے مقابلہ میں شکست کھائی اور جونپور کی سلطنت دہلی کی حکومت کے ماتحت آگئی جس میں تین لودھی سلاطین ہوئے ہیں۔

(۱) سلطان بہلول شاہ لودھی از ۸۵۵ھ تا ۸۹۴ھ (۲) سلطان سکندر شاہ بن بہلول شاہ لودھی از ۸۹۴ھ تا ۹۲۳ھ (۳) سلطان ابراہیم شاہ بن سکندر لودھی از ۹۲۳ھ تا ۹۳۲ھ دہلی

کے لودھی سلاطین میں دوسرے حکمران سلطان سکندر شاہ لودھی کی وہی حیثیت ہے۔ جو جونپور کے سلاطین شرقیہ میں سلطان ابراہیم شاہ کی تھی۔ اس کا اٹھائیس سالہ دور بہت خیر و برکت کا دور تھا۔ وہ بڑا عادل و منصف، متقی و پرہیزگار فرمانروا تھا۔ علماء و صلحاء سے عقیدت رکھتا تھا، ان کو شاہی دسترخوان پر بلاتا، ان کی علمی و دینی مجلسوں میں شریک ہوتا، مسجدوں اور مدرسوں میں جاکر ان کے درس میں شریک ہوتا اس نے بہت سی مسجدیں اور سرائیں، مدرسے اور خانقاہیں تعمیر کرائیں، سڑکیں اور راستے بنوائے پیداوار میں اضافہ کیا۔ ہندی کی کتابوں کے فارسی زبان میں ترجمے کرائے۔ ظہر کے بعد اور رات میں شاہی محل میں علماء سے علمی مذاکرہ کرتا، اور قرآن کریم کی تلاوت میں مشغول رہتا۔ اس کے بھائی باربک شاہ نے جب جونپور میں شورش برپا کی تو اس کو فرو کرنے کے لئے خود جونپور آیا، دوسرے لودھی سلاطین بہار اور بنگال کی مہمات کے سلسلہ میں جونپور آتے جاتے تھے، اور یہاں قیام کرتے تھے، انھوں نے ۸۸۱ھ سے ۹۳۲ھ تک پچاس اکاون سال یہاں حکومت کی، اس دور کے اکثر علماء و فضلاء مخضرم الدولتین، ہیں یعنی انھوں نے شرقی سلطنت اور لودھی سلطنت دونوں کا زمانہ پایا ہے، یا پھر لودھی کے بعد تیموری دور دیکھا ہے۔

پورب میں لودھیوں کے دور کے کئی آثار پائے جاتے ہیں، جن سے اس دیار سے ان کے تعلق کا پتہ چلتا ہے، سلطان سکندر لودھی نے اجودھیا میں لچھمن گھاٹ کے پاس ایک بلند ٹیکری پر خام قلعہ تعمیر کر کے دارالامارہ بنوایا، اور دریائے سرجو کے کنارے مسجد بنا کر اس میں جمعہ اور جماعت قائم کی، اس نے کہیں دیکھا یا سنا تھا کہ حضرت شیثؑ اور حضرت ایوبؑ کی قبریں دریا کے کنارے ٹیلہ کے پاس ہیں۔ اس لئے اس نے یہاں ان کی یادگار قائم کی۔[1]

بعض لوگ اس کو حضرت شیثؑ کی قبر سمجھتے ہیں، جس کی کوئی اصل نہیں ہے، پرگنہ نتھوپور (اعظم گڑھ) میں سپاہ کے بارے میں قدیم کاغذات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نام ابراہیم آباد ہے، یہاں سے سلطان ابراہیم لودھی کی فوج گزرتی تھی، اور ٹھہرتی بھی تھی، اس لئے اس کو سپاہ بھی کہتے ہیں، اسی کے قریب لدھوائی گاؤں ہے، جو لودھی کی بگڑی ہوئی شکل ہے، اس علاقہ میں بعض

[1] آئینہ اودھ ص ۲۴۱

لودھی امراء کی قبریں بھی ہیں، سکندر پور (بلیا) سلطان سکندر لودھی کے نام پر ہے، جہاں آج بھی لودھیوں کی یادگار رجوہی اور چمبیلی کے چمن کی شکل میں موجود ہے۔

اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ سکندر لودھی نے اپنے دور میں شاہان شرقی کے سارے آثار مٹادیئے تھے، اوران کی تعمیر کردہ مسجدوں کو بھی ویران کردینا چاہتا تھا، مگر مولانا صفی جون پوری کی سفارش سے اس ارادہ سے باز رہا، اوراس انقلاب میں جو علماء مصیبت میں گرفتار ہوگئے تھے، ان کو رہائی ملی اور سلطان نے ان سب کی قدر افزائی کی، جس سے علم وفضل کا چمن انقلاب کی خزاں سے محفوظ رہا۔ تذکرۃ العلماء میں ہے۔

" جون پور کے مشائخ اور مدرس حضرات جوقتل وغارت اورلوٹ مار کی مصیبت میں رہکر خوف وامید کی حالت میں تھے، مولانا صفی کے توسط سے سلطان سکندر لودھی کی خدمت میں پہونچ سکے اور مراحم خسروانہ سے نوازے گئے، اور تمام حضرات کے لوٹے ہوئے مال واسباب واپس کئے گئے اور ہرایک حسب حیثیت شاہی عنایت سے بہرہ ور ہوا۔[۱]

سلطان سکندر لودھی خود بھی محبّ العلم والعلماء بلکہ خادم العلم العلماء تھا، اس نے علماء جون پور کے ساتھ جو نیک سلوک کیا، یہ اس کی نیک طینت کا تقاضا بھی تھا، مولانا صفی کے واسطہ نے اس سونے پر سہاگہ کا کام کیا، لودھی غلبہ واستیلاء کے بحرانی دور میں مولانا موصوف کی ذات نے اس دیار میں علم وعلماء پر احسان عظیم کیا، اور بعد میں دیار پورب کے علماء سلاطین لودھی کی عنایت و توجہات کا بھی مرکز بنے چنانچہ شیخ عبدالرحمٰن لاہر پوری متوفی ۹۷۶ھ جنھوں نے اپنے والد کے انتقال کے بعد دہلی کے اساتذہ سے تحصیل وتکمیل کی تھی، فراغت کے بعد بارہ سال تک سلطان سکندر لودھی کے مقربین میں رہے۔ اوراپنی مفوضہ خدمات انجام دیکر پھر جون پور چلے آئے۔[۲]

مولانا الہ داد جون پوری آخری شرقی بادشاہ سلطان حسین کے مقربین میں تھے، انکے صاحبزادے شیخ بھکاری (نام غالباً عبداللہ تھا) لودھی عہد کے علمائے فحول میں تھےایک مرتبہ سلطان

[۱] تذکرۃ اعلماء ص۲۶و۲۷، [۲] نزہۃ الخواطر ج۴ ص۱۷۲،

وقت نے دہلی میں مجلس مناظرہ منعقد کرائی جس میں ایک طرف شیخ عبداللہ تلنی اور شیخ عزیز تلبنی تھے دوسری طرف مولانا الہداد جونپوری اور ان کے صاحبزادے شیخ بھکاری، فریقین میں سر دربار مناظرہ ہوا اور یہ فیصلہ ہوا کہ باپ بیٹے علوم و مسائل کی تنقیح میں مہارت رکھتے ہیں، اور ان کے مدمقابل تقریر میں آگے ہیں [1]

شیخ محمد بن منکن مصباح العاشقین ملانوی متوفی ۹۳۷ھ ایک مرتبہ دہلی تشریف لے گئے تو شہزادہ ابراہیم کو اس کے والد سلطان سکندر لودھی نے ان کا شاندار استقبال کرنے کا حکم دیا، چنانچہ شہزادہ نے پرتپاک خیر مقدم کیا، دوسرے دن خود سلطان سکندر لودھی نے شیخ سے نیاز حاصل کر کے شاہی مہمان بنایا۔ اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی یہ دیکھکر امراء و اعیان کی ایک جماعت نے بھی بیعت کی۔[2]

شیخ محمود بن شیخ حسام الدین مانک پوری متوفی ۹۰۵ھ (شاہ نتھن غازی پور) ایک مرتبہ سیر و سیاحت کرتے ہوئے، زمانیہ غازی پور تشریف لے گئے، اس وقت لودھی سلطنت کی طرف سے نصیر خاں لوہانی حاکم غازی پور تھا، وہ ان کی ظاہری و باطنی کمالات دیکھ کر ان کا معتقد اور ان کے حلقۂ بیعت و ارادت میں شامل ہوگیا۔ اور دہلی سے اجازت حاصل کر کے ان کو غازی پور کا میرِ عدل بنایا، اس عہدہ پر وہ مدت العمر رہے اور وہیں فوت ہوئے۔[3]

مولانا حسن بن طاہر جون پوری متوفی ۹۰۹ھ زبردست عالم اور راجہ حامد شاہ مانک پوری کے خلیفہ تھے، سلطان سکندر لودھی نے اپنے دور میں ان کو دہلی طلب کیا، مولانا اپنے اہل و عیال کے ساتھ دہلی جا کر محمد تغلق کے قلعہ میں کوشک بجے منڈل میں قیام پذیر ہوئے اور وہیں انتقال فرمایا۔[4]

اسی دور میں مشہور چشتی بزرگ خواجہ سید حامد شاہ مانک پوری متوفی ۹۰۱ھ کی ذات سے دیار مشرق خانوادہ حامدیہ چشتیہ کے علماء و مشائخ کا مرکز بنا، ان کے صاحبزادے راجہ سید نور متوفی ۹۲۱ھ نے سکندر لودھی کے دور میں انتقال فرمایا۔

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۳۴ [2] نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۳۱۹

[3] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۲۳ [4] تذکرہ علمائے ہند ص ۴۷

لودھی دور میں بھی دیار پورب میں علماء کی بڑی تعداد تھی، جن میں یہ حضرات خاص طور سے قابل ذکر ہیں، شیخ نظام الدین میران شاہ چشتی مانک پوری ۸۹۸ھ، سید احمد حسینی مانک پوری ۸۹۹ھ، راجہ سید حامد شاہ مانک پوری ۹۰۱ھ، مولانا بہاء الدین عمری جون پوری ۹۱۱ھ، مولانا الہداد حنفی جون پوری ۹۲۳ھ، راجہ سید نور مانک پوری ۹۲۱ھ شیخ حسن بن طاہر جون پوری ۹۰۹ھ شیخ احمد بن نظام الدین مانک پوری ۹۲۲ھ، مولانا خواجگی کڑوی ۸۹۸ھ، شیخ محمود بن حسام الدین مانک پوری (شاہ تھن غازی پوری) ۹۰۵ھ، شیخ نصیر الدین قلندر سمرقندی جون پوری نیگوی ۹۱۵ھ، شیخ قطب الدین بینا دل قلندر ۹۲۵ھ، قاضی احمد بن محمود نصیر آبادی ۹۳۵ھ، شیخ خاصہ بن خضر امیٹھوی ۹۲۲ھ، شیخ داؤد بن قطب بنارسی ۹۰۶ھ، شیخ عبد الصمد سائن پوری ۹۳۳ھ، مولانا عبد اللہ بن مولانا الہ داد جون پوری (مولانا بھکاری)، شیخ فخر الدین بجنوری لکھنوی ۹۱۰ھ، شیخ فرید الدین بنارسی ۹۰۶ھ وغیرہ وغیرہ ۔

تیسرا علمی دور

دیار پورب کا تیسرا علمی دور قیام سلطنت تیموریہ ۹۳۲ھ مطابق ۱۵۲۶ء سے ۱۱۳۰ھ مطابق ۱۷۱۸ء تک ہے۔ اس دوسو سالہ مدت میں ہندوستان کے مختلف دیار و امصار کی طرح دیار پورب میں بھی بہت سے علمی و دینی مرکز پورے انبساط و نشاط کے ساتھ اپنے اپنے حلقوں میں کام کرتے رہے، کہنا چاہیے کہ گذشتہ دونوں ادوار کے حسنات و برکات تیسرے دور میں پوری طرح کھل کر سامنے آ گئے تھے، اور اس دیار کے قصبات و قریات علم و علماء کی کثرت اور سرگرمی کی وجہ سے ہرات اور نیشاپور معلوم ہوتے تھے، اور اس دور کے پانچویں سلطان شہاب الدین محمد شاہجہاں کی زبان سے بے ساختہ یہ جملہ نکلا کہ "پورب شیراز ماست۔"

تیموری دور میں علم و علماء

اس سے پہلے لودھی دور مختصر ہونے کے ساتھ بڑا پُر فتن تھا، پورے ملک میں جگہ جگہ راجے، مہاراجے اور زمیندار سر اٹھا رہے تھے، آخر میں خود لودھی حکمرانوں میں اندرونی انتشار و خلفشار اور طوائف الملوکی کی حالت برپا تھی، آخری بادشاہ ابراہیم لودھی کے دور میں یہ سلطنت تقریباً دو حصوں میں تقسیم ہو چکی تھی اس کے بھائی جلال الدین لودی نے جونپور میں اپنی حکومت قائم کر لی تھی، اور ایسا معلوم ہونے لگا تھا کہ پچاس سال کے بعد جونپور میں شرقی سلطنت کی طرح ایک نئی سلطنت قائم ہونے والی ہے مگر سلطان ابراہیم لودی نے جلال الدین لودی سے جنگ کر کے

اسکو گوالیار بھاگنے پر مجبور کر دیا اور بعد میں گرفتار ہو کر قتل کر دیا گیا،

بھائی کے فتنے سے نجات پانے کے بعد سلطان ابراہیم لودی کو بابر سے مقابلہ کرنا پڑا۔ جس نے پانی بت کے میدان میں اسے شکست دے کر ۹۳۲ھ ۱۵۲۶ء میں تیموریہ سلطنت کی بنیاد رکھی، جسے مغل سلطنت بھی کہتے ہیں، دہلی پر تیموری قبضہ کے بعد دیارِ پورب بھی اس کے زیر تصرف آ گیا اور اسی دور سے گویا یہ علاقہ شیراز ہند بن گیا۔ تیموری سلطنت کے اقبال مند سلاطین جن کے دور میں علم وفن کی بہار شباب پر رہی، یہ ہیں: (۱) ظہیر الدین محمد بابر متوفی ۹۳۷ھ، ۱۵۳۰ء (۲) نصیر الدین محمد ہمایوں متوفی ۹۶۳ھ ۱۵۵۵ء (۳) جلال الدین محمد اکبر متوفی ۱۰۱۴ھ، ۱۶۰۵ء (۴) نورالدین محمد جہانگیر متوفی ۱۰۳۷ھ ۱۶۲۷ء (۵) شہاب الدین محمد شاہ جہاں متوفی ۱۰۹۸ھ ۱۶۶۳ء (۶) محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر متوفی ۱۱۱۸ھ ۱۷۰۷ء (۷) شاہ محمد معظم بہادر شاہ ۱۱۲۴ھ ۱۷۱۱ء (۸) محمد معزالدین جہاندار شاہ الخ۔

سلطان محمد عالمگیر کے بعد اگرچہ اس خاندان میں کئی بادشاہ گذرے ہیں مگر ان کی حیثیت دورِ خزاں کے بے رنگ وبو پھولوں کی ہے۔ ہر دورِ سلطنت میں دیارِ پورب پر اس کے کسی ایک بادشاہ نے خصوصی توجہ دے کر اسے گلزارِ علم بنایا۔

تیموری دَور میں دو بادشاہوں نے یہاں کے چمن کی رکھوالی کی، اور جس طرح تغلق دَور میں سلطان فیروز شاہ تغلق، شرقی دور میں سلطان ابراہیم شاہ شرقی اور لودھی دور میں سکندر شاہ لودی اس بارے میں نمایاں ہیں، اسی طرح تیموری دور میں یہ سہرا سلطان جہانگیر اور سلطان شاہجہاں دونوں کے سر ہے۔

واضح ہو کہ صوبہ الہ آباد اور صوبہ اودھ اور صوبہ عظیم آباد تینوں کے مجموعہ کو ملک پورب کہا جاتا تھا، اور تینوں علاقوں میں مسجدیں، مدارس اور خانقاہیں، اربابِ علم وفن اور علماء مشائخ سے آباد تھیں، البتہ ان میں صوبہ الہ آباد صوبہ اودھ تیموری عہد میں جداگانہ شان رکھتے تھے، پھر ان دونوں میں صوبہ اودھ کو نمایاں حیثیت حاصل تھی، پورے تیموری دور میں دیار پورب کا علمی سرگرمی کا نقشہ مولانا غلام علی آزاد نے ان الفاظ میں کھینچا ہے، ان کو اس دور کا آئینہ کہنا چاہیے۔

داما صوبہ اودھ وصوبہ الہ آباد خصوصیتے وارد کہ در ہیچ صوبہ نتوان یافت، چہ تمام صوبہ اودھ و اکثر صوبہ الہ آباد بہ فاصلہ پنج کردہ نہایت دہ کروہ تخمیناً آبادی شرفاء و نجباء است کہ از سلاطین و حکام وظائف و زمین مدد معاش داشتہ اند و مساجد و مدارس و خانقاہات بنا نہادہ و مدرسان عصر در ابواب علم برائے دانش پژوہان کشادہ وصدائے "اطلبوا العلم" درداده وطلبہ خیل خیل از شہر بہ شہری روند و ہر جا موافقت دست بہم داد بہ تحصیل مشغول می شوند، و صاحب توفیقان ہر معمورہ طلبہ علم را نگاہ می دارند، وخدمت این جماعت را سعادت عظمٰی می دانند صاحب قرانِ ثانی شاہ جہاں انار اللہ برہانہ می گفت، "پورب شیراز ماست"[1]	اودھ اور الہ آباد کے دونوں صوبے خصوصی حیثیت رکھتے ہیں جو کسی اور صوبہ میں نہیں مل سکتی ہے کیونکہ پورا صوبہ اودھ اور صوبہ الہ آباد کا اکثر علاقہ پانچ دس کوس کے فاصلہ میں شرفاء کی آبادی پر مشتمل ہے جو سلاطین و حکام کی طرف سے وظائف اور جاگیر رکھتے ہیں اور ان میں مسجدوں مدرسوں اور خانقاہوں کی کثرت ہے، ہر جگہ مدرسین اور معلمین طلبہ علوم کے لئے اپنے دروازے کھلے رکھتے ہیں اور ان کو علم کی دعوت دیتے ہیں، جس کے سبب طلبہ علوم جماعت در جماعت ایک بستی سے دوسری بستی میں آتے جاتے ہیں اور ہر جگہ سکون و اطمینان سے علم حاصل کرتے ہیں، ہر بستی کے مستطیع لوگ طالب علموں کا پورا پورا خیال کرتے ہیں اور ان خدمت کو سعادت عظمٰی سمجھتے ہیں اس لئے شاہجہاں بادشاہ کہا کرتے تھے کہ پورب ہمارا شیراز ہے۔

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مغل دور میں پورا ملک پورب بشمولیت صوبہ الہ آباد اور صوبہ اودھ وصوبہ عظیم آباد علم وعلماء سے معمور تھا، لیکن صوبہ الہ آباد اور اودھ کی علمی و دینی رونق کچھ اور ہی تھی، خاص طور سے صوبہ اودھ معدن علم وفن اور مرکز علماء وفضلاء تھا۔

آزاد بلگرامی کے اس بیان سے دیار پورب اور اطراف جون پور کی علمی و دینی سرگرمی اور

---

[1] مآثر الکرام ج ا ص ۲۲۱، ۲۲۲

مسلمانوں کے علمی و دینی ذوق و شوق کا پتا چلتا ہے، اور مولانا خیر الدین محمد جون پوری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مغل سلاطین و امراء اور شاہزادے اس دیار کی علمی سرگرمی سے کس قدر دلچسپی رکھتے تھے، اور علماء پورب سے ان کو کتنی عقیدت و محبت تھی وہ لکھتے ہیں۔

القصہ شہر جونپور از عہد سلطان فیروز شاہ تا آخر سلطنت محمد شاہ کہ خاتم السلاطین است، در ہر طبقہ مجمع و فضلاء و مرجع طلبہ بود، پیوستہ فرامین سلاطین بحکام جونپور جہت تعظیم و توقیر علماء و مشائخان می رسید، صدر، و بخشی جہت محافظت مدد معاش و حفظ مرتبہ آں بزرگان ماموری گردیدند، وقائع نگار کہ از حضور سلاطین جہت ترقیم سوانح جون پور مقرر می شدند، در ہر مدرسہ و خانقاہ حاضر شدہ کوائف ہر مدرسہ و خانقاہ دریافتہ می نوشتند بادشاہانِ عہد بعد ادراک مداخل و مخارج ہر مدرس و مشائخ بقدر حال وے در وظائف و اقطاعات او می افزودند۔ شاہزادہا و امراء کہ ازیں طرف می گذشتند صرف برائے استرضائے سلاطین معتقدانہ در ہر مدرسہ و خانقاہ حاضر می شدند و نذر فراواں می گذرانیدند۔[۱]

شہر جون پور سلطان فیروز شاہ کے عہد سے لیکر خاتم السلاطین محمد شاہ کی سلطنت تک ہر طبقہ کے فضلاء کا مجمع اور طلبہ کا مرجع تھا، علماء و مشائخ کی تعظیم و توقیر کے لئے سلاطین زمانہ کے فرامین حکام جون پور کے پاس پہونچا کرتے تھے، ان بزرگوں کے درجات و مراتب اور معاشی امداد کی حفاظت کے لئے صدر اور بخشی مقرر کئے جاتے تھے، جو قائع نگار سلاطین کی طرف سے جون پور کے حالات لکھنے پر مامور ہوتے تھے وہ ہر مدرسہ اور خانقاہ میں خود حاضر ہوکر ان کے حالات خود معلوم کرتے اور لکھتے تھے اور سلاطین ہر مدرس اور مرشد کی آمد و خرچ کی تفصیل معلوم کر کے انکے وظائف اور جاگیر میں بقدر ضرورت اضافہ کرتے تھے، نیز جو شاہزادے اور امراء اس دیار سے گزرتے تھے، بادشاہوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ہر مدرسہ اور خانقاہ میں حاضر ہوکر زیادہ سے زیادہ نذر پیش کرتے تھے۔

---

[۱] تذکرۃ العلماء ص ۵،

اس بیان کا لفظ لفظ بتا رہا ہے کہ تیموری سلاطین و امراء اور شہزادے اس دیار کے گلشن علم و فضل کو اپنی بے حساب محبت و عقیدت سے پر بہار رکھتے تھے، اور ان کے دور میں یہ علاقہ واقعی دار العلم و العلماء تھا، اب ہم ہر تیموری بادشاہ کے دور میں پورب خاص طور سے اودھ اور اطراف جونپور کی علمی سرگرمی کو بیان کرتے ہیں اور مختصر طور سے اس کا جائزہ لیتے ہیں، جس میں زیادہ مثالیں علماء و سلاطین کے باہمی تعلقات کی ہیں۔

سلطان محمد بابر

۹۳۲ھ ۱۵۲۶ء تا ۹۳۷ھ ۱۵۳۰ء

تیموری سلطنت کا بانی ومؤسس بابر شاہ جمادی الاخریٰ ۹۳۲ھ میں سلطان ابراہیم لودی کو قتل کر کے خود بادشاہ بنا، وہ کامیاب حکمراں اور سیاست داں ہونے کے ساتھ نہایت ستھرا علمی ذوق رکھتا تھا، اور علوم ومعارف کا قدر داں تھا، فارسی اور ترکی کا شاعر تھا، اس نے متعدد کتابیں لکھیں، تصوف کی ایک کتاب منظوم کی، تزک بابری لکھی اور فقہ حنفی میں مُبَیَّن کے نام سے ایک کتاب لکھی جس کی شرح شیخ زین الدین خافی نے مُبَیِّن کے نام سے تحریر کی، علاقہ ترکستان کے بعض مہاجرین سے معلوم ہوا ہے کہ یہ کتاب آج بھی تاشقند اور دیگر بلاد ماوراء النہر میں پڑھائی جاتی ہے، اس نے خطِ بابری ایجاد کیا اور اسی خط میں قرآن شریف لکھ کر مکہ مکرمہ روانہ کرتا تھا، پانچ سال حکومت کر کے جمادی الاولیٰ ۹۳۷ھ ۱۵۳۰ء میں فوت ہوا، بابر اور ہمایوں کے دور کے علماء مخضرم الدولیتن تھے یعنی انھوں نے لودی اور تیموری دونوں سلطنتوں کو پایا تھا، اور حکومتوں کے انقلاب وتغیرّ میں ان کی بزم علم ومشیخت برابر قائم رہی، ساتھ ہی بابر شاہ ان کی طرف سے غافل نہیں رہا، اور پورے ملک کے علماء ومشائخ کی طرح بلاد پورب کے اہل علم وفضل بھی بوقت ضرورت اس کی نگاہِ التفات کے مستحق بنے، چنانچہ مفتی آدم بن محمد گوپا مئوی متوفی ۱۰۰۱ھ کو بابر شاہ نے ایک گاؤں جاگیر میں دے کر معاش کی طرف سے بے فکر کر دیا تھا، مفتی آدم نے جونپور میں شیخ معروف بن عبدالواسع حسینی جونپوری سے علم طریقت کی تعلیم پائی اور گوپا مئو میں رہ کر افتاء وتدریس میں زندگی بسر کی، ابتداء ہی میں بابر شاہ نے ان کو جاگیر دے کر دینی اور علمی خدمت کے لئے فارغ کر دیا تھا۔[1]

[1] نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲

سلطان محمد ہمایوں

۹۳۷ھ ۱۵۳۰ء تا ۹۶۳ھ ۱۵۵۵ء

بابر کے بعد اس کا بیٹا ہمایوں بادشاہ ہوا، اس نے اوّلین فرصت میں جونپور کو محمود لودی کے قبضہ سے نکال کر اپنی سلطنت میں شامل کیا اور کہنا چاہیئے کہ اس کے بعد یہ علاقہ تیموری سلطنت کا باقاعدہ حصّہ بنا، اس مہم کے لئے ہمایوں خود جونپور گیا، ۹۴۶ھ میں بہار گیا، اور شیر خاں سے جنگ میں ناکام رہا، ۹۴۷ھ میں اس کے مقابلہ میں دوبارہ ہزیمت اٹھائی، اور لاہور، سندھ، ہرات، مشہد ہوتا ہوا قزوین جا کر طہماسپ شاہ صفوی سے مدد چاہی۔

اس وقت تک تیموری سلطنت پر پندرہ سال گزر چکے تھے، اور یہاں علماء و فضلا اور مدارس کی کثرت کا یہ حال تھا کہ ان کے تذکرہ سے شیراز و اصفہان کے علماء و فضلاء کا ستارۂ اقبال چمک اٹھا، مولوی خیر الدین محمد نے جونپور نامہ اور تذکرۃ العلماء میں ملا محمد اصفہانی کی کتاب سیر الملوک کے حوالہ سے لکھا کہ۔

شہنشاہ ایران طہماسپ مرحوم از سلطان الہند ہمایوں، در نخستین ملاقات از فضلائے جون پور پرسید، و بادراک کثرت و انبوہِ علماء دران دیار بر ویرانئ شہر شیراز متحیر گردیدہ ہماں روز کار پردازانِ سلطنت جہت تاسیس شیراز و تعظیم و توقیر علماء آں شہر فرمان داد، در شہر اصفہان وحوالی آں نیز مدارس و خانقاہات بنا نمود، و علماء	سلطان ہند ہمایوں سے شہنشاہ ایران طہماسپ نے پہلی ہی ملاقات میں فضلائے جون پور کے بارے میں سوال کیا، اور وہاں کے علماء کی کثرت کو معلوم کر کے شیراز کی ویرانی پر حیران رہ گیا اور اسی دن کارکنانِ سلطنت کو اس شہر کے مدرسوں کی تاسیس اور وہاں کے علماء کی تعظیم اور توقیر کا فرمان جاری کیا، اصفہان اور اس کے اردگرد کے مقامات میں بھی اس نے مدرسوں اور خانقاہوں کی تعمیر کر کے علماء کو درس وتدریس

رائعیم وتدریس طالبان مامور فرمود[1] پر مامور کیا تھا

دیار جونپور کی یہ علمی ودینی بہار شرقیوں اور لودیوں کے ادوار سے گزر کر تیموریوں کے دور میں آئی تو اس قدر پرکیف اور وجد آفرین تھی کہ قزوین وشیراز اور اصفہان تک اس کی نسیم جاں فزا پہونچی اور ان مقامات کے خزاں رسیدہ گلستانوں میں تازہ دم بہار آگئی، اس دوران میں حکومتوں کے تخت وتاج بدلتے رہے، مگر مدرسوں اور خانقاہوں کے خاک نشینوں کی بزم سجی رہی، ہمایوں کا بیشتر زمانہ حریفوں سے نبرد آزمائی میں گزر اتھا کہ اسے ایک بار ہندوستان چھوڑ کر ایران جانا پڑا، مگر اس کے علماء وفضلاء اپنے دارالامان اور دارالعلم میں پوری جمعیت خاطر کے ساتھ اپنے اعمال و وظائف میں مشغول رہے۔

ہمایونی دور میں دیار پورب میں کئی ایسے علماء ومشائخ آباد ہوئے جن کے خانوادوں میں صدیوں تک علم وفضل اور علماء وفضلاء کی رونق رہی، چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

میر علی عاشقان سرائے میری متوفی ۹۵۰ھ (میر سیّد علی بن قوام الدّین) اسی دور میں علاقہ سرہند کے مقام سوانہ سے آکر یہاں آباد ہو گئے، اور اپنے نام سے ایک بستی سرائے میر (اعظم گڑھ) بسائی جس کا اصل نام مرتضیٰ پور ہے، یہیں فوت ہوئے اور یہیں دفن کئے گئے ان کے خاندان میں مشیخت کا سلسلہ آخری دور تک چلتا رہا۔

اسی زمانے میں خانوادہ حامدیہ چشتیہ کے چشم وچراغ راجہ سید مبارک بن راجہ سید احمد مانک پوری متوفی ۲ رشوال ۹۶۵ھ نے مبارکپور (اعظم گڈھ) کو اپنے نام سے آباد کیا، اس خاندان کے مشائخ بھی مدتوں اس دیار میں رشد وہدایت کی خدمت انجام دیتے رہے۔

میر علی عاشقان سرائے میری کے مرید وخلیفہ شیخ مبارک بن خیر الدین ظفر آبادی نے ماہل میں بودو باش اختیار کر کے اس کے قریب خیر الدین پور گاؤں آباد کیا۔

میر علی عاشقان سرائمیری کے دوسرے مرید وخلیفہ قاضی حبیب اللہ بن احمد عثمانی اصفہانی گھوسی (اعظم گڑھ) کے قاضی مقرر ہوئے، جہاں وہ مدۃ العمر رہے، اور اُن کی اولاد میں کئی علماء پیدا ہوئے۔

---

[1] تذکرۃ العلماء ص ۹ وجون پورنامہ قلمی ص ۴ (دارالمصنفین اعظم گڑھ)

اسی دور میں چریا کوٹ (اعظم گڈھ) کا نام دینی وعلمی تاریخ کے صفحہ پر نظر آتا ہے، شیخ عبدالحق دہلویؒ نے اخبار الاخیار میں شیخ یوسف چریا کوٹی کا ذکر کیا ہے جو سلسلۂ شطاریہ کے درویش تھے، گیارہویں صدی میں ان کی اولاد دوآبہ کے درمیان آبادی تھی، اس کے بعد ہی سے چریا کوٹ حکمت وادب کا گہوارہ بنا اور آخری دور تک یہاں سے مشاہیر پیدا ہوتے رہے۔

ہمایونی دور میں قاضی خان ظفر آبادی متوفی ۹۷۰ھ علوم ظاہری وباطنی کے جامع تھے، شیخ حسن بن طاہر جونپوریؒ کے مرید وخلیفہ تھے، ان کی قناعت پسندی اور بے نیازی کا یہ حال تھا کہ سلطان ہمایوں نے ہر چند التماس کیا کہ کچھ نذرانہ اور عطیہ قبول کرلیں، مگر قاضی صاحب نے سلطانی پیش کش کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

از خدا خواہم واز غیر نخواہم ہرگز   کہ نیم بندۂ غیر ونہ خدائے دگرست

﴿ہم خدا سے مانگتے ہیں اور ہرگز کسی اور سے کچھ نہیں چاہتے، کیونکہ ہم نہ غیر کے بندے ہیں اور نہ کوئی دوسرا خدا ہے﴾

اور جب ان کے بڑے صاحبزادے شیخ عبداللہ کے نام معافی کا فرمان آیا، تو یہ کہہ کر انھوں نے بھی قبول نہیں کیا۔ پسر باید کہ بر متابعت پدر رود [1]

بیٹے کو چاہیئے کہ باپ کی پیروی کرے، شہنشاہ ہمایوں کے چھبیس سالہ دورِ سلطنت میں ایسی متعدد مثالیں کتابوں میں ملتی ہیں کہ اس دیار کے علماء وفضلاء ومشائخ پر نظر خسروانہ رہی اور اس نیک دل بادشاہ نے اُن سے نیازمندانہ تعلق رکھا۔

---

[1] تذکرۃ العلمائے ص ۱۶۶

سلطان محمد اکبر

۹۶۳ھ تا ۱۰۱۴ھ

ہمایوں کا بیٹا اکبر بھی اپنے بزرگوں کی طرح علماء ومشائخ کا قدردان اور علوم وفنون کا بڑا دل دادہ تھا، اس نے دینی انحراف وزیغ کے باوجود علم وفن کی خوب خدمت کی، پورب کے اربابِ علم وفضل کے ساتھ بہتر سلوک کیا اور انکی خدمت کو سعادت جانا،

مولانا الٰہ داد بن کمال الدین حسینی لکھنوی متوفی ۹۹۱ھ زبردست عالم ومدرس اور مفتی ومصنف تھے، ۹۸۰ھ میں خان زماں خان کی سرکوبی کی لئے اکبر جونپور گیا، راستے میں لکھنؤ آیا تو شیخ عبدالنبی گنگوہی کو بھیجا تاکہ وہ مولانا الٰہ داد سے مل کر ان کے علمی کمالات کا اندازہ لگائیں اور بادشاہ کو اس کی خبر دیں شیخ عبدالنبی نے واپس آکر اکبر سے ان کے علم وفضل کا تذکرہ کیا تو اس نے ملاقات کی لئے مولانا کو اپنے یہاں بلانا چاہا مگر اقلیم علم کے بادشاہ نے صاف انکار کردیا، بعد میں اکبر نے ان سے اس وقت ملاقات کی جب وہ نماز کیلئے مسجد میں تشریف لائے، اور افتاء کا عہدہ بہ اصرار پیش کیا جسے مولانا کو قبول کرنا پڑا۔[1]

قاضی کمال الدین بن یعقوب مانک پوری متوفی ۹۹۸ھ فقہ، اصول فقہ اور قضاء کے مشہور عالم تھے، اکبر نے ان کو لشکر کا قاضی بنایا، پھر ترقی کرکے پورے ملک کے قاضی القضاۃ بن گئے اور مدتوں اس عہدۂ جلیلہ پر رہ کر علیحدہ ہوئے، تو بنگال کے قاضی مقرر کئے گئے، اسی زمانہ میں محمد معصوم کابلی نے بنگال میں اکبر کے خلاف شورش برپا کی اور قاضی کمال الدین نے اس کا ساتھ دیا جس کی سزا میں اکبر نے ان کو گوالیار کے قلعہ میں قید کرنے کا حکم دیا، مگر وہاں پہونچنے سے پہلے ان کا انتقال ہوگیا۔[2]

راجہ سید مصطفٰے مانک پوری متوفی ۹۸۹ھ انھیں راجہ سید مبارک مانک پوری کے

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۴۳ [2] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۵۵

صاحبزادے ہیں جنھوں نے ہمایونی دور میں مبارک پور آباد کیا تھا، راجہ سید مصطفٰے اکبری عہد کے درباری علماء ومشائخ میں سے تھے، ۹۸۴ھ میں اکبر کا لشکر آگرہ سے مالوہ کی طرف گیا، جس میں دیگر علماء وفضلاء ومشائخ، شعراء اور ادباء کی طرح راجہ سید مصطفٰے بھی موجود تھے، گلزار ابرار کے مصنف محمد غوثی نے اس موقع پر ان سے نیاز حاصل کیا تھا۔[۱]

انھوں نے اپنے والد راجہ سید مبارک شاہ کا روضہ مانک پور میں اکبر کے زمانہ میں تعمیر کرایا تھا، تاریخی کتبہ میں اس کا خاص طور سے ذکر ہے۔ دوشعر یہ ہیں.

در زمانِ جلالِ دیں اکبر	کہ بداداش خدا جہاں بانی
روضۂ ساخت مصطفٰے راجی	کش چوں رضواں سزد بدربانی[۲]

﴿اللہ جلال الدین اکبر کی حکومت کو فروغ دے ،اسی دور میں مصطفٰے راجی نے ایک ایسا روضہ تعمیر کرایا جس کی دربانی رضوان کو زیب دیتی ہے﴾

شیخ جمال الدین ہانسوی کی اولاد میں شیخ ابراہیم دانشمند نبیرۂ شیخ اسمٰعیل کلاں محمد آباد گہنہ میں صاحب خوارق وکرامات بزرگ تھے، مرآۃ الاسرار میں ہے کہ اکبر نے تسخیر بنگالہ کی مہم پر جاتے ہوئے ان کی خدمت میں حاضری دی اور ان کی زبان سے نیک فالی کے الفاظ سنے۔[۳]

محمد نبی عباسی چریاکوٹی نے ان کا ذکر اپنے مرتبہ شجرۂ نسب میں اس طرح کیا ہے۔

حضرت مخدوم ابراہیم دانشمند آستانہ کہرائی منحلات قصبہ محمد آباد گوہنہ کہ مزار اقدس ہم ہمیں جا بر کنارِ چشمۂ ٹونس است ابن شیخ کمال نصر ابن مخدوم اسمٰعیل کلاں ابن شیخ محمد منور عرف شاہ چشتی ابن مخدوم بہاؤالدین سندھالوی الخ[۴]	حضرت مخدوم ابراہیم دانشمند جن کا مزار محلہ کھرائی قصبہ محمد آباد گوہنہ میں ٹونس ندی کے کنارے واقع ہے یہ شیخ کمال نصر بن مخدوم اسمٰعیل کلاں بن شیخ محمد منور عرف شاہ چشتی بن مخدوم بہاؤالدین سندھالوی کے لڑکے تھے۔

---

[۱] گلزار ابرار قلمی ص ۱۱۴ (سالار جنگ میوزیم حیدرآباد) [۲] گنج ارشدی قلمی ص ۱۰ (خانقاہ رشیدیہ جون پوری
[۳] مرآۃ الاسرار بحوالہ حدائق الیبان ص ۲۳۲ [۴] احسن الانساب بنوعباس چریاکوٹ قلمی ص ۱۴۰

مولانا شمس نور (شمس الدین بن نور الدین) جون پوری متوفی ۱۰۴۷ھ اپنے زمانہ کے مشاہیر علماء وفضلاء میں سے تھے، دیوان محمد رشید جونپوری کے ماموں اور استاد تھے، ملا محمود جونپوری نے بھی ان سے پڑھا تھا، اکبر نے مولانا شمس نور کو اپنے شاہزادے پرویز کی تعلیم پر مقرر کیا، اور انھوں نے الہ آباد جا کر یہ خدمت انجام دی، اس کے بعد اکبر نے مولانا کو جون پور میں عہدۂ قضاء دیا۔[۱]

قاضی الہ داد حنفی بلگرامی اور قاضی کمال عثمانی بلگرامی کے درمیان ۹۹۰ھ میں منصب قضاء پر تنازع ہوا، اور معاملہ اکبر کے دربار تک پہونچا، اس نے قاضی الہ داد کو بلگرام کا قاضی بنایا بعد میں جب معلوم ہوا کہ قاضی کمال یہاں کے خاندانی قاضی ہیں تو ان ہی کو یہ عہدہ دیدیا۔

شیخ محمد بن منّ اللہ سعدی کاکوروی متوفی ۱۰۰۲ھ تجوید وقرأت اور تصوف کے زبردست عالم تھے، فارسی میں شاطبیہ کی شرح لکھی تھی، اکبر ان کی بزرگی سے بہت متاثر تھا، اور گجرات سے گورکھپور جاتے ہوئے کاکوری میں ان کی خدمت میں حاضر ہو کر دعا کی درخواست کی، اور کچھ خراجی زمین جاگیر میں عطا کی،

شیخ عبد الواحد بن ابراہیم بلگرامی متوفی ۱۰۱۷ھ فضائل وکمالات اور عبادات وریاضات میں بے مثال عالم ہونے کے ساتھ کئی کتابوں کے مصنف تھے، اکبر نے کمال تعظیم وتکریم کے ساتھ ان کو طلب کر کے جاگیر عطا کی۔[۲]

---

[۱] تجلی نور [۲] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۳۶،

سلطان محمد جہانگیر

۱۰۱۴ھ تا ۱۰۳۶ھ

اکبر کا بیٹا جہانگیر تقریباً بائیس سال تک حکمران رہا، وہ اپنے باپ اکبر کے برخلاف صحیح العقیدہ تھا اور اکبری دور کے اثرات سے اس کا دماغ بہت جلدی صاف ہو گیا، اس سلسلہ میں حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمتہ اللہ علیہ کی ذات نے بڑا کام کیا، جہانگیر نے حدیث کی تعلیم شیخ محمد سعید ہرویؒ سے حاصل کی تھی، جو میر کلاں کے لقب سے مشہور تھے۔ نیز مفتی صدر جہاں پہانوی اس کے اساتذہ میں سے ہیں۔

مغل بادشاہوں کی طرح جہانگیر بھی ارباب فضل و کمال کا بڑا قدردان تھا اور دیار پورب کے علماء و فضلاء اور مشائخ سے عقیدت مندانہ تعلق رکھتا تھا۔

استاذ الملک ملا محمد افضل جونپوری متوفی ۱۰۶۲ھ اس دیار کے اساتذہ عظام میں سے تھے، ملا محمود جونپوری اور دیوان محمد رشید جونپوری جیسے فضلائے دہر کے استاد تھے۔ ان کے علم و فضل کا شہرہ دور دور تک تھا، یہ جہانگیر کا دور سلطنت تھا، جونپور کے وقائع نگار نے ملا محمد افضل کی علمی شہرت و مرجعیت کے بارے میں جہانگیر کو اطلاع دی تو اس نے ان کو استاذ الملک کا لقب دے کر جون پور کے شاہی مدرسہ کی مدرسی اور ساتھ ہی جاگیر کا پروانہ بھیجا مگر ملا صاحب نے اس کو قبول نہیں فرمایا۔ اور پوری زندگی تدریس میں توکل کے ساتھ بسر کی۔[۱]

شیخ عبدالرزاق امیٹھوی کے بھانجے شیخ جعفر بن نظام الدین امیٹھوی متوفی ۱۰۴۵ھ نے تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے بعد اپنے ماموں سے خرقۂ خلافت پہنا، اور بستی کے باہر ایک دیہات میں سکونت اختیار کی۔ جب جہانگیر کو ان کے علم و فضل اور مقام و مرتبہ کا علم ہوا تو اس نے مفتی صدر جہاں کی سفارش پر ان کو دو سو بیگھہ زمین کی جاگیر عنایت کی، جس میں شیخ جعفر نے مسجد

---

[۱] تذکرۃ العلماء ص ۴۴ و ۴۵، نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۴۰۵ و ۴۰۶۔

تعمیر کی، بعد میں اسی میں شیخ حسن سارنگ پوری نے ایک مدرسہ کی عظیم الشان عمارت بنائی جس میں طلبہ کے رہنے کے لئے کمرے بھی تھے۔

شیخ مصطفےٰ جونپوری اس دیار کے علمائے کبار میں سے تھے، ان سے چین قلیچ خان لاہوری نے تعلیم حاصل کی تھی، جب چین قلیچ خان جہانگیر کے خلاف بغاوت میں قتل کیا گیا تو شیخ مصطفےٰ بھی گرفتار ہوئے اور ۱۰۲۲ھ میں اجمیر میں جہانگیر کے سامنے پیش کئے گئے۔ اس نے شیخ محمد یوسف تتوی سندھی کو حکم دیا کہ شیخ مصطفےٰ سے معقولات کے دقیق مسائل میں مناظرہ کریں، چنانچہ دونوں بزرگوں میں ایک ہفتہ تک مباحثہ ومناظرہ کی مجلس گرم رہی، آخر میں شیخ محمد یوسف نے ان کے علم وفضل کا اعتراف کر کے جہانگیر سے ان کے بارے میں سفارش کی، جہانگیر نے شیخ مصطفےٰ کو نہ صرف معاف کر دیا بلکہ حرمین شریفین روانہ کیا، اور وہ حج وزیارت سے واپسی کے بعد جونپور میں آکر فوت ہوئے۔

مولانا علم اللہ بن شیخ عبدالرزاق امیٹھوی متوفی ۱۰۲۴ھ فقہ وحدیث اور عربیت کے مشہور عالم تھے، شیخ ابن حجر مکی سے حدیث پڑھی تھی، اور برہان پور میں سکونت پذیر تھے، عبدالرحیم بیرم خاں ان سے بے حد عقیدت رکھتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ ان کی صحبت میں رہتا تھا، ان کو عطایا دانعامات سے نوازتا تھا، اور دوسروں کے بارے میں ان کی سفارش سنتا تھا، حاکم برہان پور عادل شاہ بھی ان کے قدوم برہان پور کو غنیمت جان کر ان کی انتہائی تعظیم کرتا تھا۔ ایک مرتبہ مولانا علم اللہ اور ان کے داماد قاضی نصیر الدین کے درمیان ایک دینی مسئلہ میں شدید ترین اختلاف ہو گیا اور نوبت محضر نامہ تک پہونچ گئی، عبدالرحیم بیرم خاں نے اس قضیہ کو جہانگیر کے سامنے پیش کیا۔ اس نے خسر اور داماد کو لشکر میں طلب کیا اور معاملہ اس نتیجہ پر جا کر رفع دفع ہوا کہ قاضی نصیر الدین حجاز روانہ ہوئے، اور مولانا علم اللہ بیجا پور میں ابراہیم عادل شاہ کے یہاں چلے گئے، قاضی نصیر الدین حدیث کی ترجیح میں قیاس کے منکر تھے، اور حدیث "علماء امتی کا نبیاء بنی اسرائیل" کو موضوع بتاتے تھے، اس پر یہ ہنگامہ برپا ہوا تھا۔

سلطان محمد شاہجہاں

(۱۰۳۶ھ تا ۱۰۶۸ھ)

جہاں گیر کے بعد اس کے بیٹے شاہجہاں نے تقریباً بتیس سال حکومت کی اس کا طویل دور سلطنت علم و علماء کے حق میں بڑا پر بہار تھا، اس نے اپنے خاندان کی کئی بدعات اور مظالم ختم کر کے عدل و انصاف اور امن و امان کے ساتھ حکومت کی، مساجد و مشاہد تعمیر کیے، دور دراز سے علماء و فضلاء اور مشائخ اسکے دربار میں آئے، اور عزت و احترام کے مستحق ٹھہرے، اس کا زمانہ ہر اعتبار سے بہتر تھا، بلاد پورب میں علم و فن کی نشاۃ نو ہوئی، اور جون پور دار العلم، دار الامان اور دہلی ثانی کے القاب کے بعد شیراز ہند کے لقب سے یاد کیا گیا، آزاد بلگرامی نے لکھا ہے۔ شاہجہاں نے علاقہ پورب کو شیراز ہند کہہ کر افتخار کیا ''صاحب قران ثانی شاہجہاں ''انار اللہ برہانہ'' می گفت ''پورب شیراز ماست''۔[1] (صاحبقران ثانی شاہ جہاں فرمایا کرتے تھے پورب ہمارا شیراز ہے)

مولانا خیر الدین محمد نے اس بارے میں تاریخ شاہجہانی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ۔

حضرت صاحب قران شاہجہاں	صاحب قران شاہجہاں بادشاہ
بادشاہ شہر جونپور را شیراز ہندی	نے جونپور کو شیراز ہند کہہ کر
فرمود، وبدار العلم موسوم می نمود۔[2]	دار العلم کے نام سے موسوم کیا۔

شاہجہاں نہایت دیندار اور شریعت کا پابند تھا، پورے ھندوستان میں اَوامر اور نواہی کے اجراء میں کوشش کرتا تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد امراء و حکام کو اس بارے میں تاکیدی احکام دیتا تھا، جس کے نتیجہ میں بقول محمد صالح کنبوہ، متکفلانِ مہماتِ شرعی و متصدیانِ خدمات عرفی شرائط تفحص و تجسس بجا آرند'' یعنی شرعی امور کے ذمہ دار اور عام حکام اس کے احکام پر شدت کے مطابق عمل کرتے تھے، عمل صالح میں ان کی تفصیلات موجود ہیں، اور ایک جگہ تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ:۔

---

[1] مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۲۱ [2] تذکرۃ العلماء ص ۴ و ۵

وشبستانِ ہندرا از سرنو بہ پرتو چراغ شریعت محمدی نور آگیں ساختہ۔[1]	شاہجہاں نے شبستان ہند کو شریعت محمدی کے چراغ کی روشنی سے از سرنو منور کیا،

ان شرعی و دینی مہمات کے لئے علماء وفضلاء کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں، اور وہی قاضی ومحتسب وغیرہ بنائے جاتے تھے۔

ہمایونی دور کے شروع میں بنگال، بہار اور بلادِ پورب میں بہت انتشار پایا جاتا تھا، شاہجہاں نے اس کا خاتمہ کیا، ۱۰۴۱ھ میں پرتگیزیوں کے بڑھتے ہوئے اثرات کو ختم کرنے کے لئے حاکم بنگالہ خواجہ قاسم صفدر خان اور دیگر امراء و حکام کو حکم دیا، ہوگلی میں فرنگیوں نے طاقت جمع کر لی تھی، اور آس پاس کے راجوں اور زمینداروں کے قریات کو پٹہ اور رہن پر لیکر باشندوں کو عیسائی بنانا شروع کر دیا تھا، شاہجہاں نے ان کے خلاف سخت اقدام کرا کر شاندار فتح پائی۔ ۱۰۴۳ھ میں عبدالرحیم خان خاناں کے بیٹے لشکر شکن کو لکھنؤ کا فوجدار بنایا، جلوس کے دسویں سال ۱۰۴۶ھ میں بھوجپور (بہار) کے اطراف کے سرکش راجوں اور زمینداروں کی سرکوبی کے لئے شاہجہاں کے حکم سے عبداللہ خاں بہادر فیروز جنگ، باقر خاں نجم ثانی الہ آباد، اور فدائی خان زمیندار گورکھپور نے ان سب پر فوج کشی کی اور کئی ماہ کی شدید جنگ کے بعد فتح پائی، ۱۰۵۳ھ میں اعتقاد خاں، زبردست خاں، صوفی بہادر، اور عبداللہ نجم ثانی نے پلاموں (بہار) کے راجہ پرتاپ کو زیر کیا، ان واقعات کی تفصیل کے لئے محمد صالح کنبوہ کی کتاب "عمل صالح" ملاحظہ ہو۔

۱۰۴۶ھ میں بھی بھوجپور کی جنگ و فتح کے سلسلہ میں صوفی بہادر کا نام ملتا ہے عمل صالح میں ہے۔

"زبردست خان وصوفی بہادر حسب الامر سردار بفتح قلعہ کالا پور شتافتہ، بعد از محاصرہ یک ماہ آں را بہ کشش وکوشش تمام مسخر گردانیدند۔ ج ۲ ص ۱۸۲	اپنے سردار کے حسب الحکم زبردست خان وصوفی بہادر کالا پور کا قلعہ فتح کرنے کے واسطے گئے ایک مہینہ کے محاصرہ کے بعد قلعہ کو اپنی زبردست کوشش وکشش سے فتح کر لیا۔

غالباً اسی فوجی افسر صوفی بہادر کے نام پر سکٹھی پورہ صوفی بہادر کی بستی ہے، جواب مبارک پور

---

[1] عمل صالح ج ۱ ص ۱۹۷ مطبوعہ لاہور،

کا مغربی محلّہ ہے، اور پورہ صوفی کے نام سے مشہور ہے۔ راقم کے پاس اللہ خدائی، نامی کتاب کا قلمی نسخہ ہے۔ جسکے آخر میں ہے "تمام شد کارم نظام...... نسخہ اللہ خدائی۔ بپاس خاطر میاں عبدالرحیم بن والی ساکن سکٹھی پورہ صوفی بہادر" "نیز اس کتاب پر ایک تملیکی تحریر یوں ہے" جان محمد پسر عبدالواحد ساکن پورہ صوفی بہادر ۱۲۴۴ فصلی" دونوں تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ محلّہ اسی صوفی بہادر کے نام پر ہے، الّا یہ کہ کوئی دوسرا مشہور آدمی اسی نام کا رہا ہو۔ راجہ اعظم خاں بانی اعظم گڑھ کے بھائی راجہ عظمت خاں بانی عظمت گڑھ کے بیٹے راجہ مہابت خاں تھے ان کے بیٹے بابو صوفی بہادر تھے غالباً یہی صوفی بہادر ہیں جن کے نام پر پورہ صوفی بہادر ہے۔[1]

قصبہ مئو شاہجہانی دور میں خصوصی توجہ کا مستحق ٹھہرا، علامہ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ "کہتے ہیں کہ یہ قصبہ شہزادی جہاں آراء بنت شاہجہاں کی جاگیر میں تھا، اسی لئے اس کا نام جہان آباد رکھا گیا۔ شہزادی نے اپنے شوق سے یہاں کپڑے بننے والے کاریگروں کو جمع کیا، اور جامع مسجد بنوائی جس کے چاروں طرف طلبہ کے لئے حجرے تھے۔[2]

شاہجہاں اور اس کے وزراء، امراء اور حکام میں آصف خان، سعد اللہ خان شائستہ خاں، شہزادہ محمد شجاع وغیرہ شرقی علماء و فضلاء کو مغتنمات میں سے تصور کرتے تھے۔ اور اس دیار کے کئی علماء سلطانی دربار سے منسلک ہو کر مراحم خسروانہ و ملوکانہ سے حصہ پارہے تھے۔

معلوم ہو چکا ہے کہ سلطان ابراہیم شاہ شرقی نے شیخ محمد بن خضر کے صاحبزادے شیخ مشیّد کو پرگنہ محمد آباد میں کئی قریات جاگیر میں دئے تھے، اور بعد میں ان کا خاندان یہیں آباد ہو گیا، اسی میں ایک بزرگ مولانا حاجی ابوالخیر بن شیخ ابو سعید بھیروی متوفی ۱۰۵۹ھ ملا محمود جونپوری کے بہنوئی، اور معاصر تھے، وہ شاہجہانی دور کے پورب کے علمائے فحول میں شمار میں ہوتے تھے، اور شاہی دربار سے انکے تعلقات نہایت گہرے تھے۔ اوائل ہی میں ان کی علمی شہرت دہلی تک پہونچ گئی تھی۔ انھوں نے دہلی کا قصد کیا تو امیر الامراء نواب شائستہ خان نے ان کی آمد کو غنیمت جان کر بڑی عقیدت مندی اور گرمجوشی سے استقبال کیا اور ان سے حدیث، تفسیر اور تصوف کی تعلیم حاصل

---

[1] سرگزشت راجگان اعظمگڑھ قلمی [2] مقدمہ حیات شبلی ص ۵۷

کی، شائستہ خاں کی اس والہانہ عقیدت اور استفادہ کی وجہ سے شاہجہاں بھی مولانا ابوالخیر کی زیارت کا مشتاق ہوا اور ملکر بڑی خوشی کا اظہار کیا اور شائستہ خان کے مشورہ سے ہر چند چاہا کہ کوئی شاہی منصب یا جاگیر قبول کریں۔ مگر انھوں نے انکار کر دیا، نواب شائستہ خان کی والدہ نہایت نیک اور پارسا تھیں، ایک مرتبہ انھوں نے کمال عقیدت سے کچھ رقم سے مولانا کی خدمت کرنی چاہی مگر اس سے بھی انکار کر دیا، مولانا نے ۱۰۵۶ھ میں حج وزیارت کی دولت پائی، اس موقع پر نواب شائستہ خان نے عرض کیا کہ خادم کا جہاز حجاز آتا جاتا ہے، حکم دیں تو اس کے عملہ کو حکم کر دوں کہ آپ کو راحت وآرام کے ساتھ لیجائیں، اس پر مولانا نے کہا:۔

”وائے بر ہمت وے کہ در راہ دوست وسیلۂ غیر درمیان آرد“

اس کے حوصلۂ عشق پر افسوس ہوتا ہے کہ دوست سے ملنے کے لیے درمیان میں دوسرے کو ذریعہ بنا رہا ہے۔

ایک مرتبہ مولانا ابوالخیر شاہجہاں کے ساتھ سیالکوٹ میر صاحب کی خدمت میں گئے۔ شاہجہاں نے ان کی خدمت میں نذر پیش کی، میر صاحب نے مولانا ابوالخیر کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ اس ہدیہ کے زیادہ مستحق ہیں، انھوں نے محنت ومشقت سے علم حاصل کیا ہے“۔ یہ جملہ مولانا ابوالخیر کے دل پر تیر ونشتر کا کام کر گیا، اور دینی غیرت اور علمی حمیت سے مغلوب ہو کر ولید پور بھیرا میں آ کر گوشہ نشین ہو گئے۔[1]

مولانا ابو الخیر بھیروی کی تین شادیوں میں سے ایک شادی شیخ محمود قریشی بائسی مبارکپوری کی دختر سے ہوئی تھی، مگر اس سے کوئی اولاد نہیں ہوئی، شیخ صاحب بڑے رعب وداب کے رئیس اور بائیس گاؤں کے زمیندار تھے، اور ریاست زمینداری کی رقابت میں قتل کیے گئے۔

جہانگیر نے ملا محمد افضل جونپوری کو استاد الملک کے خطاب سے نوازا تھا، ان کے دو شاگردوں کو شاہجہاں نے عقیدت واحترام کی مسند پر بٹھایا، یہ دونوں شاگرد علم وفضل اور حکمت میں اتنے اونچے تھے کہ استاد الملک فرمایا کرتے تھے کہ، علامہ جرجانی اور علامہ تفتازانی کے بعد ایک عہد اور ایک شہر میں ان دونوں فضلاء کے جیسے ابتک دو فاضل جمع نہیں ہو سکے تھے، ایک دیوان محمد رشید

---

[1] مناقب غوثی باب ہشتم قلمی (دار المصنفین)

جونپوری متوفی ۱۰۸۳ھ اور دوسرے ملا محمود جونپوری متوفی ۱۰۶۲ھ ان دونوں فضلاء عصر کو شاہجہاں نے مراحم خسروانہ کے ذریعہ قدر دانی کرنی چاہی، مگر دیوان محمد رشید نے امراء وسلاطین کی طرف سے بے رغبتی و بے اعتنائی کے باعث یہ پیشکش قبول نہیں فرمائی، شاہجہاں نے ان کے اوصاف و کمالات اور علمی و دینی شہرت سنکر زیارت کی خواہش کی، اور ایک خاص وکیل کے ذریعہ فرمان بھیج کر ان سے دہلی آنے کی گزارش کی مگر دیوان صاحب نے حاضری سے معذوری ظاہر کر دی۔[1]

البتہ ملا محمود نے شاہی دربار سے منسلک ہو کر شاہجہاں کی تمنا پوری کی، ملا محمود جونپوری متوفی ۱۰۶۲ھ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ہندوستان میں اسلام کی آمد کے بعد سے حکمت وفلسفہ میں ان کی ٹکر کا کوئی عالم پیدا نہیں ہوا۔ ملا صاحب فراغت کے بعد تدریس و تعلیم اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے، چند دنوں میں ان کے علم و کمال کا شہرا جونپور کے مدرسہ کی چہار دیواری سے نکل کر دار الخلافہ کے شاہی دیوان میں گونجا اور شاہجہاں نے کمال عقیدت مندی سے دہلی بلا کر فضلائے شاہی میں شامل کر لیا، اور منصب سہ صدی ذات سے نوازا، اس سفر میں جب ملا صاحب دہلی پہونچے تو بادشاہ کے حکم سے وزیر سعد اللہ خاں نے جو خود زبردست عالم بھی تھے، استقبال اور پیشوائی کی خدمت انجام دی۔ اور جب ملا صاحب دربار میں پہونچے تو بادشاہ کے پہلو میں بٹھائے گئے، اس اعزاز و اکرام کے بعد ان کو جونپور روانہ کر دیا گیا، جہاں شاہی مدرسہ میں درس دیتے رہے، اور وقتاً فوقتاً دہلی جایا کرتے تھے، شاہجہاں بسا اوقات ان سے علمی مسائل میں استفادہ کرتا تھا، شاہزادہ محمد شجاع کی تعلیم کے لئے ان کو بنگال بھیجا، وزیر سعد اللہ خاں، نواب شائستہ خاں اور آصف خاں ملا صاحب کے خوشہ چینوں میں تھے، ایک مرتبہ بادشاہ نے دربار میں ایک ایرانی فاضل اکمج اور ملا صاحب میں مناظرہ کروایا، جس میں ملا صاحب کو کھلی کامیابی حاصل ہوئی اور بادشاہ نے ان کو خوب خوب نوازا، ایک مرتبہ شاہجہاں اور ملا صاحب لاہور گئے میر عبدالحکیم سیالکوٹی بھی ساتھ تھے، اس سفر میں حضرت میاں میر کی خدمت میں تینوں حضرات حاضر ہوئے اور میر صاحب کی ایک توجہ سے فضلاء شاہی دربار سے یکسو ہو گئے، ملا صاحب نے علم بلاغت میں الفرائد

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۱۹،

لکھ کر شاہجہاں کے نام سے معنون کی، اور نہایت علمی و ادبی انداز میں اس کا تذکرہ کیا۔

ملا رکن الدین بہریابادی غازی پوری ملا محمود جونپوری کے ہم سبق استاذ بھائی تھے، وہ بھی شاہجہانی امراء کے منظور نظر تھے، امیر الامراء نواب شائستہ خان اُن کا بڑا قدردان تھا، اور وہ اسی سے، منسلک تھے، ایک مرتبہ ملا رکن الدین دہلی سے غازی پور آئے اور نہایت اعلیٰ قسم کی کشمیری شال جو شائستہ خاں نے ان کو دی تھی، اپنے استاذ زادے ملا محمد صادق بن ملا شمس نور متوفی ۱۰۶۴ھ کی خدمت میں پیش کی، مگر ملا صادق نے یہ کہکر اسے قبول کرنے سے انکار کردیا،

من دلق را با طلسِ شاہان نمی خرم "فقیر را گلیم بس است لائقِ شان خود انمی انگارم"۔	میں بادشاہوں کے اطلس سے گدڑی کو نہیں خریدتا۔ فقیر کے لئے کمبل کافی ہے میں اپنی شان کے لائق نہیں سمجھتا

مفتی عبدالسلام دیوی متوفی ۱۰۴۷ھ دیوہ ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئے، مفتی عبدالسلام لاہوری سے تعلیم حاصل کر کے فقہ، اصول فقہ اور علم کلام میں یکتا ہوئے اور لاہور ہی میں تدریس و تعلیم کا سلسلہ جاری کیا، بعد میں شاہجہاں نے ان کو لشکر کا قاضی بنایا، اس منصب پر ایک زمانہ تک رہ کر خدمت انجام دی، پھر علیحدگی اختیار کر کے لاہور چلے گئے۔

قاضی محمد حسین جونپوری متوفی ۱۰۷۷ھ اپنے زمانہ کے مشہور ارباب علم و کمال میں سے تھے، شاہجہاں کی نگاہِ جوہر شناس نے انکو جونپور کا قاضی مقرر کیا تھا۔

مفتی مبارک بن مفتی ابوالبقاء جونپوری متوفی ۱۰۹۸ھ شاہجہانی دور کے مشاہیر علماء میں سے تھے، جونپور اور الہ آباد میں تحصیل علم کرنے کے بعد دہلی چلے گئے، اور وہاں سے مفتی جونپور کا پروانہ لیکر لوٹے۔

ملا محب اللہ الہ آبادی متوفی ۱۰۵۸ھ مشائخ چشتیہ میں میں بڑے مقام و مرتبہ کے بزرگ تھے، لاہور جا کر مفتی عبدالسلام لاہوری سے پڑھا، شیخ محمد میر اور سعد اللہ خاں ان کے ہم سبق تھے، جب شاہجہاں نے سعد اللہ خاں کو وزارت دی تو انھوں نے اپنے دونوں ساتھیوں کو یاد کیا۔ اوران کو شاہی منصب پر رکھنا چاہا، شیخ محمد میر نے زہد و تقوی کی وجہ سے درباری تعلق کو پسند نہیں کیا۔

اور مولانا محب اللہ کو سعد اللہ خاں نے الہ آباد کی نظامت کا عہدہ دیکر رخصت کیا، مگر ملازمت ان کے ذوق کے خلاف تھی اس لئے کچھ دنوں کے بعد اسے چھوڑ کر شیخ ابو سعید گنگوہیؒ کی خدمت میں چلے گئے اور ایک مدت تک ان کی خدمت میں رہ کر مشیخت کے مرتبہ کو پہونچے [1]

مفتی محمد صادق بن شیخ شمس نور جونپوری، متوفی ۱۰۶۸ھ شاہجہانی دور کے مشہور عالم و بزرگ تھے، ملا محمود جونپوری کے تلامذہ میں زہد و تقویٰ کے اعتبار سے بلند مقام کے مالک تھے۔ اور حکام وقت ان کا بے حد اعزاز کرتے تھے، ایک مرتبہ حاکم جونپور نواب اللہ وردی خان نے ایک غیر شرعی تحریر پر مفتی صاحب سے اپنی مہر ثبت کرنے کی گذارش کی، آپ نے صاف انکار کر دیا، نواب اللہ وردی خان سیر دریا کے بہانے سے ان کو کشتی میں سوار کر کے بیچ دریا میں لے گیا، اور ان سے کہا کہ کاغذ پر مہر لگانے کا اقرار کیجئے، ورنہ میں آپ کو دریا میں پھینک دوں گا، آپ نے فرمایا جبر و اکراہ کی حالت میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، اس کے بعد انگوٹھی نکال کر نواب کو دیدی، مگر نواب پر تقویٰ کا کچھ ایسا رعب چھایا کہ وہ مہر نہ لگا سکا، اور معذرت خواہ ہوا۔

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۳۲۳،

سلطان محمد عالمگیر

۱۰۶۸ھ تا ۱۱۱۸ھ

شاہجہاں کے بعد اس کے بیٹے عالمگیر نے تخت و تاج پایا۔ وہ عالم باعمل اور فقیری اور شہنشاہی کے جامع تھے، علم و فضل اور تقویٰ و طہارت کے ساتھ شرعی احکام میں بڑی احتیاط سے کام لیتے تھے اور علماء و فضلاء اور مشائخ کے قدردان تھے ان کے دور میں ہندوستان میں اسلامی علوم و معارف کو بڑا فروغ ہوا اور علماء کی خوب قدر و منزلت ہوئی، انھوں نے مستند و متدین ارباب علم کو جمع کر کے فتوی ہندیہ یا فتاویٰ عالمگیری مدوّن کرائی جو اسلامی فقہ پر پورے عالم اسلام میں اپنی نوعیت کا پہلا کام تھا، اس کتاب کو بعد کے ادوار میں اسلامی فقہ کی تدوین و ترتیب کے سلسلہ میں سنگ میل کہا جا سکتا ہے۔ عالمگیر کے پچاس سالہ دور سلطنت میں بلاد پورب بغداد و قرطبہ کی ہمسری کرتے تھے۔ مولوی خیرالدین محمد نے تذکرۃ العلماء[1] میں شیخ محمد ماہ جونپوری دیوگامی کے تذکرہ میں لکھا ہے:-

در واقعات عالمگیری مسطور است کہ	واقعات عالمگیری میں ہے کہ اورنگ زیب
اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ خود عالم	عالمگیر عالم باعمل اور عامل باعلم بادشاہ تھے، وہ
باعمل و عامل باعلم بود، قدردانی علماء	زیادہ سے زیادہ علماء کی قدردانی کرتے تھے،
بیش از بیش می نمود و از عہد شاہزادگی	شاہزادگی کے زمانہ سے ہی اس کا خیال رکھتے
منظور داشت تا جون پور مثل زمان	تھے کہ جون پور علماء فضلاء اور مشائخ کی کثرت
سلاطین شرقیہ از کثرت فضلاء و مشائخ	اور طلبۂ علوم کے انبوہ اور کاسبانِ فیوض کی
انبوہ و ہجوم طلبۂ علوم و کاسبانِ فیوض	زیادتی میں سلاطین شرقیہ کے زمانہ کی طرح رونق
رونق پذیر باشد، چوں بر سریر سلطنت	پذیر ہو، چنانچہ جب وہ بادشاہ ہوئے تو شہر

[1] تذکرۃ العلماء ص ۱۵۰

نشست بر تبلیغ واجب التبلیغ بناظم جون پور جهت ترقیم احوال مدرسان و مشائخان ایں شهر صادر گردانید، و سوانح نگاران و وقائع نویسان را احکام تهدید برائے تحقیقات کوائف بود و باش ایں گروه فرستادو القصه در عهد آنحضرت نمونه گلزار ارم شده در تمام شهر و قصبات و نواحی آں مدرسهائے قدیم تاسیس یافتند و بسے خانقاه و مدرسه تعمیر جدید شدند چنانچه در مفتی محلّه میر ابوالبقاء و میر مبارک، وملا محمد حفیظ و در محلّه شاه مدار مولانا میر نورالدین و در محلّه دریبه میر عبدالباری و در محلّه سپاه فرزندان شیخ محمود، هم چنان در هر محلّه جونپور مدرسه بود که دران مدرسے تعلیم فیوض طالباں می پرداخت و در هر کوچه خانقاه ہے که درویشے دراں کاسبان فیوض حق راره بری می ساخت [1]

جون پور کے مدرسین و مشائخ کے حالات لکھنے کا حکم ناظم جون پور کو دیا اور سوانح نگاروں اور وقائع نویسوں کو تاکید کی کہ وہ اس جماعت کی بود و باش کے بارے میں معلومات بہم پہونچائیں، القصہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد سلطنت میں جونپور گلزار ارم ہو گیا، شہر اور اطراف کے قصبات میں قدیم مدارس کی جدید تعمیر و تاسیس ہوئی اور بہت سے نئے مدارس اور خانقاہیں تعمیر ہوئیں چنانچہ مفتی محلّہ میں مدرسہ میر ابوالبقاء و مدرسہ میر مبارک اور مدرسہ ملا محمد حفیظ، محلّہ شاہ مدار میں مدرسہ مولانا نورالدین ، محلّہ دریبہ میں مدرسہ میر عبدالباری، محلّہ سپاہ میں مدرسہ فرزندان شیخ محمود قائم ہوئے، اسی طرح جونپور کے ہر محلّہ میں مدرسہ جاری تھا۔ ان مدرسوں میں مدرسین طلبۂ علوم کو درس دیا کرتے تھے اور ہر گلی میں خانقاہ تھی جس میں مرشدین بھی فیوض جاری رکھتے تھے۔

معلوم ہو چکا ہے کہ شاہجہاں اور امیر الامراء شائستہ خاں، مولانا ابوالخیر بھیروی کے قدر دانوں میں تھے، اور ان دونوں نے مولانا کی عزت اور احترام میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی، ان کے لڑکے شیخ اسمٰعیل بن شیخ ابوالخیر بھیروی، متوفی ۱۱۰۶ھ اپنے زمانہ کے مشہور صوفیاء و مشائخ میں سے

[1] تذکرۃ العلماء ص ۵۱

تھے، انھوں نے برہان پور میں میر سید شیر محمد سے تعلیم و تربیت پائی تھی، قیام برہان پور ہی کے زمانہ میں ان کی بزرگی کا شہرہ ہو گیا تھا۔ اس زمانہ میں شہزادہ عالمگیر اس علاقہ کے ناظم تھے، انھوں نے میر سید شیر محمد سے دہلی کی سلطنت کے لئے دعا کی درخواست کی، میر صاحب نے شیخ اسمٰعیل سے بھی رجوع کرنے کا اشارہ کیا، چنانچہ شہزادہ عالمگیر نے ان سے بھی دعا کی درخواست کی جب سلطنت مل گئی، تو سلطان عالمگیر نے میر سید شیر محمد کو لکھا کہ شیخ اسمٰعیل کو دہلی آنے پر راضی کریں، اس درمیان میں شیخ صاحب بھیرا واپس آ گئے تھے، میر صاحب نے سلطان کو صورت حال سے مطلع کیا، اس نے ناظم الہ آباد خانجہان کو لکھا کہ جیسے ہو سکے، شیخ اسمٰعیل کو ادب و احترام کے ساتھ اردوئے معلی میں پہونچایا جائے، ناظم الہ آباد نے بہت کوشش کی مگر شیخ صاحب اپنا آستانہ چھوڑنے پر راضی نہیں ہوئے، امیر الامراء نواب شائستہ خان شیخ ابوالخیر کی طرح انکے صاحبزادے شیخ اسمٰعیل سے بھی عقیدت رکھتا تھا، اور وقتاً فوقتاً ان کی خدمت میں حاضری دیا کرتا تھا۔

شیخ محمد واصل شمس پوری کا بیان ہے کہ میں جس زمانہ میں ناظم جون پور کے یہاں سپہ گری میں تھا، اتفاق سے دائرۂ لشکر محمد آباد گوہنہ پہنچا، یہاں سے شیخ اسمٰعیل کا آستانہ بھیرا بہت قریب تھا، ہم چند سپاہی شیخ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کی زیارت و دعا سے فیضیاب ہوئے۔

شیخ اسمٰعیل کے دوستوں میں دو بھائی قاضی نور اللہ گوپال پوری اور قاضی خوب اللہ گوپال پوری تھے، قاضی خوب اللہ کو راجہ عظمت خان نے بڑی قدر و منزلت کے ساتھ اپنے یہاں عظمت گڈھ (اعظم گڈھ) بلایا مگر کچھ دنوں کے بعد نا مساعد حالات کی بنا پر ان کا وظیفہ نہ دے سکا، جب شیخ اسمٰعیل کو قاضی خوب اللہ کی پریشانی کا حال انکے بھائی کے ذریعہ معلوم ہوا تو ان کے حق میں کلمۂ خیر کہا اور دعا کی۔ قاضی خوب اللہ عظمت گڈھ سے برداشتہ خاطر ہو کر تلاش معاش میں دہلی چلے گئے، جب بادشاہ عالمگیر کو ان کے علمی و دینی مرتبہ کا پتا چلا تو خصوصی توجہ کی۔[1]

مفتی نور اللہ بن شیخ معین بنارسی متوفی ۱۱۰۴ھ عہد عالمگیری میں بنارس کے قاضی و مفتی

---

[1] مناقب غوثی باب ہشتم قلمی

تھے، سلطان ان کا بڑا معتقد تھا، ان کے لئے مسجد اور خانقاہ تعمیر کرائی، محلہ دارانگر میں شہزادگی کے دور میں ایک شاندار سنگین مسجد بنوائی جو مسجد عالمگیری اور فوارہ کے نام سے مشہور ہے، اس کے بعد عالمگیر کے حکم سے مفتی صاحب کے لئے ایک عالیشان خانقاہ تعمیر ہوئی۔

مفتی نوراللہ کے صاحبزادے مولانا حافظ امان اللہ بنارسی متوفی ۱۱۳۳ھ بھی عالمگیر کی عنایت کا مرکز تھے، عالمگیر نے ان کو لکھنؤ کی صدارت عطا کی جب ان کے ہم سبق اور استاذ بھائی قاضی محبّ اللہ کو وہاں کا قاضی مقرر کیا، اور دونوں معاصر فضلاء میں علمی بحث ومباحثہ کی سرگرمیاں رہیں ۱۔

شیخ عبداللطیف بن عبدالہادی مٹھن پوری دیوان محمد رشید کے خلفاء میں سے تھے، ان کے صاحبزادے محمد راشد کے خسر تھے، ان کا وطن نظام آباد کے نواح میں مٹھن پور تھا، ان سے عالمگیر سے گہرے تعلقات تھے، اس نے رقعات میں ان کے متعلق "شیخ عبداللطیف قدس سرہ شریف می فرمود" لکھا ہے۔

اسی دور میں میر سید قیام الدین سگڑوی گورکھپوری متوفی ۱۱۲۸ھ دیوان محمد رشید کے مرید وخلیفہ بڑے زاہد وعابد اور مرتاض درویش تھے، وطن نواح سگڑی (اعظم گڈھ) میں تھا، مگر بعد میں گورکھپور میں قیام کیا، سبز پوش خاندان کا تعلق ان ہی سے ہے، ۲۸ رصفر ۱۱۲۸ھ کو انتقال کیا ۲۔

قاضی خلیل الرحمن گورکھپوری زبردست عالم اور نہایت نیک آدمی تھے خدائی خان والیِ گورکھپور نے ان کے بارے میں عالمگیر سے سفارش کی، سلطان نے ان کی طرف خصوصی توجہ کی اور شاہی عہدہ دیا، اور آخر میں گورکھپور کا حاکم بنایا۔

مولانا ابوالواعظ بن صدرالدین ہرگامی مشاہیر اہل علم میں سے تھے، عالمگیر نے ان سے تعلیم پائی تھی، اور فتاویٰ عالمگیری کے جامعین ومؤلفین میں ان کو بھی رکھا تھا۔

شیخ احمد بن عبداللطیف بلگرامی متوفی ۱۰۹۶ھ نہایت خوش خلق عالم ہونے کے ساتھ حساب وریاضی میں مہارت تامہ رکھتے تھے، عالمگیر کے حاکم مکرم خان نے ان کو مقام بھاسو کا حاکم

۱ سبحۃ المرجان ص ۷۸ وآثار الکرام ج ۱ ص ۲۱۲ ۲ سمات الاخیار ص ۶۴۔

بنایا تھا۔

شیخ پیر محمد سلونی متوفی ۱۰۹۹ھ نے اس دیار میں تبلیغ اسلام کر کے بہت سے سنیاسیوں کو دولت دین و ایمان سے مالا مال کیا بڑے بڑے علماء و فضلاء ان کے تلامذہ و مریدین میں تھے، عالمگیر نے ان کو کئی گاؤں جاگیر میں عطا کئے جو مدتوں ان کے خاندان میں باقی رہے،

قاضی علی اکبر حسینی الہ آبادی متوفی ۱۰۹۰ھ کو وزیر سعد اللہ خاں نے اپنے لڑکے لطف اللہ کا معلم بنایا، اور لطف اللہ نے ان سے بھرپور استفادہ کیا، پھر وزیر سعد اللہ خاں نے انکو عالمگیر سے ملایا، اور سلطان نے شہزادہ محمد اعظم کا معلم بنایا، بعد میں انکو لاہور کا قاضی بنا دیا، جہاں وہ باقی عمر رہے، قاضی علی اکبر بھی فتوائے عالمگیری کے جامعین و مولفین میں سے تھے۔

مولانا محمد صادق بن مفتی ابوالبقاء جونپوری کو عالمگیر نے شہزادہ محمد معظم کا معلم بنایا، اس نے ایک زمانہ تک مولانا سے استفادہ کیا، عالمگیر کے بعد جب محمد معظم بادشاہ ہوا تو اس نے اپنے استاذ کو جہانگیر نگر (ڈھاکہ) میں جاگیر عنایت کی وہ وہیں چلے گئے اور وہیں فوت ہو گئے۔

مفتی وجیہ الدین گوپامئوی متوفی ۱۰۸۳ھ کو عالمگیر نے فتوائے عالمگیری کی تدوین و تالیف کے سلسلے میں اعلیٰ عہدہ پر رکھا تھا، ان کی نگرانی میں علماء و فضلاء فتاوے مرتب کرتے تھے، اور خود انھوں نے اس کتاب کا کافی حصہ مدوّن کیا ہے۔

مولانا قطب الدین سہالوی شہید ۱۱۰۳ھ کی شہادت کے بعد ان کے صاحبزادے شیخ محمد سعید، عالمگیر کی خدمت میں پہونچے اور اپنے والد کی مظلومانہ شہادت اور ظالموں کی زیادتی کا ذکر کیا سلطان نے انکو لکھنؤ میں ایک فرنگی تاجر کی کوٹھی عطا کی جو بعد میں علمائے فرنگی محل کا مرکز بنی۔

مولانا احمد بن ابو سعید (ملا جیون) امیٹھوی متوفی ۱۱۳۰ھ مصنف نور الانوار و تفسیر احمدی دکن میں چھ سال تک عالمگیر کی فوج میں دینی خدمت انجام دیتے رہے، جب شاہ عالم بن عالمگیر دکن سے واپس ہوا تو مولانا نے اجمیر میں اس کا استقبال کیا، اور اسی کے ساتھ لاہور جا کر قیام کیا، اس کے انتقال کے بعد دہلی آکر فرخ سیر سے متعلق ہو گئے، عالمگیر سے ان کے تعلقات کے عجیب عجیب واقعات مشہور ہیں شیخ احمد بن ابو منصور گوپامئوی ملا جیون کی ارشد تلامذہ میں سے تھے،

فقہ، اصول فقہ اور عربیت میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ عالمگیر نے فتاوی عالمگیری کی تدوین وتالیف میں ان کو شریک کر کے روزانہ ایک روپیہ اور کچھ غلہ بطور وظیفہ کے مقرر کیا تھا۔

مولانا جلال الدین مچھلی شہری بھی فقہ اور اصول فقہ کے مشہور عالم تھے، عالمگیر نے ان کو فتاوی عالمگیری کی تدوین میں شریک کیا تھا، ایک روایت کے مطابق اس کی پہلی جلد انہی کی مرتب کردہ ہے۔

قاضی حبیب اللہ جونپوری متوفی ۱۰۵۰ھ عالمگیر کی طرف سے جونپور کے قاضی تھے، اس کے بعد ڈھاکہ کے قاضی بنائے گئے، جہاں پوری زندگی بسر کی، نہایت متقی اور بڑے دیندار عالم تھے، ڈھاکہ میں ایک شخص نے سب شیخین کیا تو اس کے قتل کا حکم دیا، حالانکہ وہاں کا حاکم بھی اس وقت اس کا ہم مذہب تھا، مگر اس کی پرواہ نہیں کی۔

شیخ سعد اللہ سلونی (۱۱۳۸ھ) شیخ پیر محمد سلونی کے نواسے تھے، حج وزیارت سے واپسی پر سورت میں قیام پذیر ہو گئے، عالمگیر نے ان کو جاگیر میں گاؤں عطاء کیے جن سے سالانہ آٹھ ہزار روپیہ کی آمدنی تھی عالمگیر ان کا بہت زیادہ احترام کرتا تھا، ان کے اشارے پر چلتا تھا، اور ان کی سفارش قبول کرتا تھا، ان کے خطوط کا جواب اپنے ہاتھ سے لکھتا تھا ایک مرتبہ شیخ سعد اللہ نے ایک حاکم کے بارے میں سفارش کی تو اس کا جواب عالمگیر نے اپنے ہاتھ سے نہیں لکھا، بلکہ دوسرے سے لکھوایا کہ آپ جیسے عالم دین کے لئے زیبا نہیں ہے کہ ظالموں کے بارے میں مجھے خطاب کریں شیخ سعد اللہ بارہ اماموں کی محبت وعقیدت کے لئے عالمگیر کو اکثر خطوط لکھا کرتے تھے، جب اس کا سلسلہ بہت زیادہ ہو گیا تو عالمگیر نے درباری علماء سے بطور اظہار واقعہ کہا کہ شیخ سعد اللہ اہل بیت کی محبت کے بارے میں مجھے برابر تاکیدی خطوط لکھتے رہتے ہیں، اور یہ صحیح بھی ہے، مگر اہل سنت والجماعت کے نزدیک امامت صرف بارہ ائمہ میں منحصر نہیں ہے، اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ عالمگیر دین کو تعلقات پر کس اہتمام کے ساتھ مقدم رکھتے تھے۔

مفتی شرف الدین لکھنوی متوفی ۱۱۳۳ھ کو عالمگیر کی طرف سے چہار صدی ذات کے منصب کے ساتھ بعض شرعی خدمات سپرد کی گئی تھیں، وہ محمد شاہ کے دور سلطنت تک اسی عہدہ پر رہے۔ اس کے بعد سہ ہزاری ذات کا اضافہ ہوا، اور خدائی خان کے نائب کی حیثیت سے کئی سال تک

رہے۔

مولانا شکر اللہ جنیدی جونپوری متوفی ۱۱۳۵ھ اپنے والد کے حکم و مشورہ سے عالمگیر کی خدمت میں بیجاپور گئے، عالمگیر نے ان کی آمد کو غنیمت جانکر شاہی عنایات سے نوازا۔

میر عبدالجلیل بلگرامی متوفی ۱۱۳۸ھ نے دکن جاکر عالمگیر سے ملاقات کی اس نے ان کو لاہور کے علاقہ گجرات کی بخشی گری اور وقائع نگاری پر مامور کیا، پھر سندھ کے علاقہ بھکر اور سیوستان میں اسی عہدہ پر رکھا، جہاں ۱۱۱۶ھ تک رہے اور فرخ سیر کے دور میں یہ عہدہ ان کے صاحبزادے سید محمد بن عبدالجلیل کے سپرد ہوا۔

قاضی عبدالصمد جون پوری فقہ کے ماہر تھے، دہلی جاکر فتوائے عالمگیری کی تدوین میں شریک ہوئے، پھر دکن میں ایک مقام کے قاضی مقرر کئے گئے، آخر میں لکھنؤ میں مقیم ہوئے عالمگیر نے کئی دیہات کی جاگیر عطا کی۔

مولانا عبدالہادی بلگرامی متوفی ۱۱۳۳ھ فراغت کے بعد عالمگیر کے شاہی لشکر میں گئے، اور اس نے ان کے علم و فضل کو دیکھ کر صوبہ الہ آباد میں ایک منصب دیکر ایک گاؤں جاگیر میں عنایت کیا۔

قاضی عصمت اللہ لکھنوی متوفی ۱۱۱۳ھ عالمگیری دربار سے منسلک رہے، پہلے مرادآباد کے حاکم مقرر کئے گئے، پھر دوسرے شہروں کی حکومت ملی۔

شیخ غلام محمد لکھنوی متوفی ۱۱۳۶ھ علمائے ربانی میں سے تھے، عالمگیر نے ان کو لشکر کا محتسب بنایا تھا، جہاں وہ بڑی مستعدی اور ذمہ داری سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی خدمت انجام دیتے تھے، عالمگیر نے ان کی ذمہ دارانہ زندگی دیکھ کر عہدۂ قضا پیش کیا مگر انھوں نے اسے قبول نہیں فرمایا۔

مولانا محمد اسعد سہالوی بڑے پایہ کے عالم تھے، عالمگیر نے ان کو برہان پور کا صدر بنایا تھا۔

شیخ محمد انور گوپامئوی متوفی ۱۱۱۰ھ شاہ جہاں کے دور میں تسبیح خانہ کے نگراں تھے، جب شاہ جہاں کے شاہزادوں میں سلطنت کے لئے کشمکش ہوئی تو یہ ملازمت چھوڑ کر وطن چلے آئے، اور عالمگیر کا دور سلطنت آیا تو ان کی خدمت میں امام غزالیؒ کا ایک رسالہ جو انہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا، پیش کیا، عالمگیر اس نادر علمی ہدیہ پر بہت خوش ہوا اور دریافت کیا کہ کیا آپ کے خاندان میں کوئی

شخص حکومت میں ملازمت کرتا تھا، شیخ محمد انور نے جواب دیا کہ ہمارے خاندان کے لوگ اللہ تعالیٰ کے ملازم تھے، بدقسمتی سے ایک میں حکومت کا ملازم تھا، یہ جواب عالمگیر کو بہت پسند آیا، اور اس نے بخشی کا دبیر مقرر کیا، شیخ محمد انور حج کو جانے لگے تو عالمگیر نے تین لاکھ کی رقم دی تاکہ فقرائے حرمین شریفین میں تقسیم کردی جائے شیخ صاحب نے سورت میں اس رقم سے چاول، اور کپڑے خرید کر جدہ میں اس کو فروخت کیا، جس سے نولاکھ کی رقم حاصل ہوئی اور حرمین شریفین کے حاجتمندوں میں تقسیم کی گئی۔

شیخ حنیف محمد کنتوری کو عالمگیر نے دکن میں مقام سنگمیر کی بخشی گری اور وقائع نگاری کا منصب دیا، جہاں وہ ایک زمانہ تک رہے، بعد میں خلدآباد روضہ کے قاضی ہوئے۔

شیخ غوث محمد کاکوری متوفی ۱۱۱۸ھ کو بھی عالمگیر نے فتاوے کی تالیف میں شریک کیا تھا، اس کی تکمیل کے بعد اودھ میں خراج کی وصولی پر مقرر کیا۔[1]

عالمگیری دور میں قاضی محمد صالح بن شیخ کمال الدین ساکن گجہڑا (مبارکپور) اس دیار کے قاضی تھے، انھوں نے ۱۰۹۹ھ میں یہاں ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کی جو عالمگیری مسجد کے نام سے مشہور ہے، اور اب خستہ ہورہی ہے، اس میں تین در تین گنبد اور دائیں بائیں دو مینارے ہیں، بیرونی فرش کے سامنے اوپر سنگِ موسیٰ کا ایک کتبہ ہے جس میں یہ اشعار بخط جلی کندہ ہیں۔

در زمانِ شاہ عالمگیر دیں پرور کزو   رونق دینِ محمد ہست افزوں از قیاس

شد بنا از فیضِ خورشید کرم للمتقین   مسجدے کز نور آن انجم نماید اقتباس

حاملانِ عرش گفتند از کمال کیست ایں   گفتم از ابن الکمال است وکمال حق شناس

رفعتِ شانش بہ بیت اللہ می نازد بہ فضل   ذرۂ اُوجش باوج آسماں کردہ اساس

سال تاریخش بہ پرسیدم ز پیر عقل گفت   از محمد صالح است ایں مسجد احسن اساس[2]

---

[1] ان واقعات کے لئے نزہۃ الخواطر، تجلی نور، مآثر الکرام، تذکرہ علمائے ہند وغیرہ ملاحظہ ہوں

[2] تذکرۂ علمائے مبارکپور ص ۸۴

عالمگیر کے بعد کے تیموری سلاطین

عالمگیر کے بعد تھوڑے وقفہ سے کئی بادشاہ گزرے ہیں، مگر مورخین نے محمد شاہ کو خاتم السلاطین لکھا ہے، کیونکہ ان بادشاہوں کی حکومت برائے نام تھی، اور ان کا دور اندرونی اور بیرونی انتشار و خلفشار سے مملو و مشحون تھا، علم و علماء کی محفلیں اجڑ رہی تھیں، اور مدرسوں اور خانقاہوں کا سکون واطمینان ختم ہو رہا تھا، بہت سے علماء ملک کے مختلف نوابوں اور رئیسوں کے وہاں چلے گئے، اور کچھ اب بھی دہلی سے منسلک رہے۔

پہلے گزر چکا ہے کہ مولانا محمد صادق جونپوری کو عالمگیر نے شہزادہ محمد معظم کا معلم بنایا تھا، جب محمد معظم کا دورِ سلطنت آیا تو اس نے جہاں گیر نگر (ڈھاکہ) میں ان کو منصب اور جاگیر سے نوازا،

مولانا غلام نقشبند گھوسوی، لکھنوی متوفی ۱۱۲۶ھ سے شاہ عالم نے نیاز مندانہ ملاقات کی اور ان کے ادب واحترام کا پورا پورا لحاظ رکھا۔

قاضی عبدالصمد چریا کوٹی متوفی ۱۱۷۱ھ اپنے والد کے حکم سے پرگنہ چریا کوٹ کے موروثی عہدۂ قضا کے لئے دہلی گئے، جہاں ارکانِ دولت اور علماء وفضلاء نے ان کے علم وفضل کا اعتراف کیا، اور محمد شاہ نے ان کو پرگنہ چریا کوٹ کا قاضی بنایا۔

شیخ ابوالنجیب امیٹھوی کو والئی لکھنؤ خدائی خان نے اپنے مقربین میں شامل کر کے ان کا وظیفہ مقرر کیا، جس سے وہ ایک مدت تک متمتع ہوتے رہے۔

قاضی تاج الدین دہلوی متوفی ۱۱۵۵ھ محمد شاہ کے دور سلطنت میں دہلی کے قاضی القضاۃ تھے۔

مولانا حمد اللہ سندیلوی مصنف شرح سلم نواب اودھ ابوالمنصو رصفدر جنگ کی سفارش سے احمد شاہ کے دربار میں باریاب ہوئے، اور بادشاہ نے ان کو فضل اللہ خاں کا خطاب دے کر کء

دیہات جاگیر میں عنایت کیے، اس کے بعد مولانا نے سندیلہ میں ایک بڑا مدرسہ تعمیر کیا۔

مولانا روح اللہ بلگرامی متوفی ۱۱۵۱ھ نے دہلی جا کر وزیر منعم خان سے ملاقات کی اور وہ آپ کے علم وفضل کا گردیدہ ہوگیا، مگر جلد ہی اس کا انتقال ہوگیا، تو مولانا سپردار خان کی طرف سے الہ آباد کے نائب حاکم مقرر کیے گئے، پھر نواب سربلند خاں نے ان کو سیالکوٹ اور جالندھر وغیرہ کے بارہ علاقوں کا حاکم بنایا، کچھ مدت کے بعد نواب تہور خان والی شاہ جہاں پور کے پاس رہے اس کے بعد نواب مظفر الدولہ کی طرف سے اودھ کے نائب حاکم ہوئے، پھر محمد خاں بنگش سے وابستہ ہو گئے، اور آخر میں برہان الملک کے ساتھ نادر شاہ سے جنگ میں شریک ہوئے۔

شیخ صدر جہاں صفی پوری فرخ آباد میں نواب فخر الدولہ سے وابستہ رہے۔ اور جب وہ ۱۱۸۵ھ میں قتل کر دیا گیا تو اپنے وطن صفی پور چلے آئے۔

مولانا عبداللہ بلگرامی متوفی ۱۱۳۲ھ نواب سربلند خاں کی خدمت میں پہونچے اس نے فوج میں عدل کا عہدہ دار بنایا، اور ۱۱۲۴ھ میں احمد آباد کی صدارت دی،

مولانا عسکری سندیلوی دہلی جا کر ابوالمنصور خاں صفدر جنگ سے وابستہ ہوئے۔ اس نے ان کو احمد شاہ کی خدمت میں پیش کیا، احمد شاہ نے ان کو خیر اللہ خاں کا لقب دے کر اودھ میں کئی دیہات کی جاگیر دی تاکہ مدرسہ بنائیں، چنانچہ مولانا موصوف نے دہلی سے واپس آ کر سندیلہ میں ۱۱۰۶ھ میں مدرسہ منصوریہ تعمیر کیا،

گذر چکا ہے کہ شیخ محمد بن عبدالجلیل بلگرامی متوفی ۱۱۸۵ھ فرخ سیر کے دور سلطنت میں اپنے والد کی جگہ بھکّر اور سیوستان میں بخشی اور وقائع نویس بنائے گئے تھے، اور جب نادر شاہ کا فتنہ برپا ہوا تو وطن چلے آئے۔ شیخ محمد اشرف بلگرامی متوفی ۱۱۶۵ھ تلاش معاش میں دہلی گئے۔ اور بہت دنوں تک محمد اعظم شاہ کے مصاحبین میں رہے، اس کے بعد مبارِزُ الملک اور صفدر جنگ سے وابستہ ہو گئے۔

قاضی محمد پناہ جونپوری اس وقت دہلی پہنچے جبکہ نادر شاہ حدود دہلی میں موجود تھا۔ محمد شاہ نے دہلی کے علماء کو بلایا تاکہ وہ نادر خان کے جلو میں آنے والے علماء سے مسئلۂ قتال میں مناظرہ

کریں اس نازک موقع پر علمائے دہلی نے قاضی محمد پناہ کو اپنا نمایندہ بنا کر آگے بڑھایا۔ اور انھوں نے نادر شاہی علماء وفضلاء کو مناظرہ میں خاموش کر دیا۔ نادر خان نے ان کی قابلیت دیکھ کر مستعد خان کا خطاب دیا۔ اس کے بعد محمد شاہ نے ان کو جونپور کا قاضی مقرر کیا۔

مولانا محمد شاکر لکھنوی متوفی ۱۲۳۳ھ نے شاہ عالم کے حکم سے قصیدہ بردہ کی شرح لکھی تھی اور اس کا صلہ پایا تھا۔

ان چند واقعات سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ دیار پورب کی جو علمی ودینی محفل سلطان فیروز شاہ تغلق کے عہد میں ۷۶۲ھ سے اب تک جمی ہوئی تھی، اور فیروزیوں، شرقیوں، لودیوں، اور تیموریوں کے انقلابات کا کوئی اثر اس پر نہیں پڑا تھا، اب اس میں ضعف واضمحلال آنے لگا، اور علماء وفضلاء بے حال و پریشان ہو کر مدرسوں اور خانقاہوں سے نکلنے پر مجبور نظر آنے لگے ۱۱۳۰ھ کے بعد دہلی کی مرکزیت طوائف الملوکی سے بدل گئی۔

اس بدامنی میں علمی مراکز بھی تباہی سے دوچار ہوئے، مدتوں کے جمے ہوئے مدرسے اکھڑ گئے۔ خانقاہیں ویران ہوگئیں اور علماء وطلبہ ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔ مؤرخین بغداد کی تباہی کو روتے ہیں، لیکن ہندوستان کی بربادی کی داستان اس سے کچھ کم دردناک نہیں ہے۔

چوتھا علمی دَور

دیار پورب کا چوتھا علمی دورنوابی اودھ کے قیام (۱۱۳۰ھ) سے اس کے خاتمے ۱۲۷۳ھ تک، کل ۱۴۳ سال کا ہے، اس زمانہ میں ملک میں بے حد انتشار تھا، دہلی کی مرکزی حکومت بہت کمزور ہوگئی تھی، شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے تخت پر محمد شاہ اور شاہ عالم جیسے نااہل اور عیش پسند بادشاہ بیٹھے تھے، جن کی حیثیت امراء اور وزراء کے ہاتھ میں کٹھ پتلی سے زیادہ نہ تھی، نادرشاہ کے ہاتھوں بادشاہ اور پایہ تخت کی جو درگت ہوئی اس سے مغل حکومت کی کمزوری و بے بسی بالکل عیاں ہو گئی، نادرشاہ کی واپسی کے بعد تورانی امراء کے مقابلہ میں ایرانی امراء کا دخل حکومت میں بڑھ گیا، اور سعادت علی برہان الملک وزیر الممالک ہو گئے، آگے چل کر اسی خاندان نے اودھ میں ایک نئی حکومت قائم کی، اس دور میں ان اطراف کی ساری علمی رونق سمٹ کر ایک مخصوص طبقہ میں محدود ہو کر رہ گئی، قدیم علمی و دینی خانوادے تباہ و برباد ہو گئے، ان کی جاگیریں اور معافیاں ضبط کر لی گئیں۔ وظائف بند کر دیئے گئے، اور مختلف طریقوں سے ان کو شیعہ بنایا گیا جس کے نتیجہ میں نیا علمی ماحول اور نئی مذہبی فضا قائم ہوئی:۔

نوابی اودھ میں حسب ذیل گیارہ حکمراں گذرے ہیں:۔

۱۔ نواب برہان الملک وزیر الممالک سعادت علی خاں نیشاپوری متوفی ۱۰/ذوالحجہ ۱۱۵۱ھ

۲۔ نواب ابوالمنصو رصفدر جنگ، داماد نواب سعادت علی خاں متوفی ۱۸/ذوالحجہ ۱۱۶۷ھ

۳۔ نواب شجاع الدولہ پسر صفدر جنگ متوفی ۲۸/ربیع الاول ۱۱۸۹ھ

۴۔ نواب آصف الدولہ پسر شجاع الدولہ متوفی ۱۲۱۰ھ

۵۔ نواب مرزا علی خاں پسر آصف الدولہ، معزول و اسیر بنارس ۱۲۱۲ھ

۶۔نواب سعادت علی خاں متوفی رجب ۱۲۲۹ھ

۷۔نواب غازی الدین حیدر پسر سعادت علی خاں متوفی ۲۸ ربیع الاول ۱۲۴۳ھ

۸۔نواب نصیر الدین حیدر پسر غازی الدین حیدر متوفی ۱۲۵۳ھ

۹۔نصیر الدولہ محمد علی شاہ برادر سعادت علی خاں متوفی ۱۲۵۸ھ

۱۰۔نواب امجد علی شاہ پسر محمد علی شاہ، متوفی ۱۲۶۴ھ

۱۱۔نواب واجد علی شاہ، معزول ۱۲۷۳ھ

یہ لوگ مذہباً شیعہ تھے، اور ان کے اثر سے اودھ میں شیعیت کو بڑا فروغ ہوا۔

ابتداء میں نوابیٔ اودھ کا طول گورکھپور سے قنوج تک ۳۲۰ کوس اور عرض شمال میں ہمالیہ پہاڑ سے الہ آباد تک ۲۱۵ کوس تھا، اس کی مشرقی حد صوبہ بہار، مغربی حد قنوج، شمالی حد کوہستان اور جنوبی حد مانک پور تک تھی، اس میں چار سرکاریں تھیں، (۱) سرکار گورکھپور (۲) سرکار بہرائچ (۳) سرکار خیر آباد (۴) سرکار لکھنؤ، پوری مملکت میں ۱۹۷ محال تھے، اور سالانہ آمدنی ۲۶ کروڑ روپیہ تھی [۱] مگر اس کی وسعت بعد میں سمٹتی گئی، تیسرا حکمراں نواب شجاع الدولہ پسر صفدر جنگ ۱۱۶۷ھ میں اودھ اور الہ آباد کا حاکم ہوا، اسی زمانہ میں محمد شاہ عالم نے بکسر کی جنگ میں شرائط صلح کی رو سے شہر غازی پور کو انگریزوں کے حوالہ کر دیا، اور چوتھے حکمراں نواب آصف الدولہ نے اپنے دور حکومت میں قرضہ کی ادائیگی میں غازی پور کے علاوہ جونپور، بنارس کے علاقے بھی انگریزوں کی تحویل میں دیدیے اور چھٹے حکمراں نواب سعادت علی کے دور میں لارڈ ولزلی سے صلحنامہ کی رو سے ۲ رجب ۱۲۱۶ھ (۱۰ نومبر ۱۸۰۱ء) میں چکلہ اعظم گڈھ، پرگنہ ماہل، پرگنہ مئو ناتھ بھنجن کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت میں شامل کرکے ضلع گورکھپور میں داخل کر دیا گیا [۲]

مذکورہ بالا معاہدہ سے انگریزوں نے یہ فائدہ اٹھانا چاہا کہ نواب سعادت علی خاں ۷۶ لاکھ روپیہ سالانہ ادا کرے نیز یہ کہ قلعہ انگریزوں کے حوالہ کیا جائے، جس میں دس ہزار انگریزی فوج رہے گی، نواب مذکور نے ان شرائط سے انکار کرکے تخت چھوڑنا چاہا، مگر لارڈ ولزلی اپنی ضد پر

---

[۱] حدیقۃ الاقالیم ص ۱۵۲ مطبوعہ نولکشور، [۲] اعظم گڑھ گزیٹیر ص ۱۲۲ ۱۹۱۸ء،

اڑا رہا، یہاں تک کہ مذکورہ بالا علاقے انگریزوں کے حوالے کرنے پڑے ان علاقوں سے اس زمانے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی سالانہ آمدنی ایک کروڑ ۳۵ لاکھ ۸ سو ۶۹ روپیہ ۱۲ آنے ۳ پائی تھی، جس میں اعظم گڑھ وغیرہ سے ۶۹۵۶۲۴ روپیہ ۷ آنے ۶ پائی حاصل ہوئے تھے، [۱] اس قسم کی تفصیلات ہمارے موضوع سے باہر ہیں البتہ ان سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ نوابانِ اودھ کا دور سیاسی اور ملکی حوادث وفتن سے پر تھا، انگریزوں کے ایسے ہوشیار حریف کی ریشہ دوانیوں کے باوجود یہ عیش وعشرت میں مدہوش تھے، کبھی خواب غفلت سے بیدار ہوتے تو شراب وکباب کے داغ مذہبی دلچسپیوں سے دھونے کی کوشش کرتے، مگر مذہب کی حقیقت تعلیمات پر عمل کے بجائے مذہبی مراسم کی نمائش سے عوام کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے، طاقتور حریف سر پر تھا، مگر اس ملت کو متحد رکھنے کے بجائے شیعیت کی تبلیغ سے سنیوں کو بیزار کر رہے تھے، اور اس میں بھی حکیمانہ طرز پر دعوت کے بجائے ترغیب وترہیب سے کام لیتے تھے، ان کی اس روش نے اودھ کی علمی زندگی کو تہس نہس کر دیا اور علماء ومشائخ کے پرانے خاندان تباہ ہوگئے۔

---

[۱] تاریخ اودھ مولوی نجم الغنی ج ۴ ص ۴۵

علم وعلماء کی تباہی

دیار پورب کی صبح بہار کی رنگین وحسین داستان مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے مزے لے لے کر سنائی ہے، اب انہی کی زبانی شام اودھ کی بے کیف کہانی بھی سنی چاہیے جو اسکے عینی شاہد بھی ہیں وہ لکھتے ہیں۔

وتا حدود ۱۱۳۰ھ ثلاثین ومأتہ والف ہنگامۂ علم وعلماء درین گل زمین گرمی داشت، تا آنکہ برہان الملک سعادت علی خان نیشاپوری در آغاز جلوس محمد شاہ حاکم صوبۂ اودھ شد، واکثر بلاد عمدۂ صوبۂ الہ آباد، نیز مثل دارالخیر جون پور وبنارس وغازی پور، وکڑہ مانکپور، وکوڑہ جہاں آباد، وغیرہا ضمیمۂ حکومت گردید، و وظائف وسیور غالات خانوادہائے قدیم وجدید یکقلم ضبط شد، وکار شرفاء ونجباء بہ پریشانی کشید، واضطراب و اضطرار معاش مردم آنجارا ازکسب علم باز داشتہ در پیشہ سپاہگری انداخت و رواج تدریس وتحصیل بان درجہ نہ ماند ومدارسے از عہد قدیم معدنِ علم وفضل بود یکقلم خراب افتاد، وانجمن ہائے اربابِ کمال پیشتر برہم خورد۔ انا اللہ وانا علیہ راجعون۔

۱۱۳۰ھ تک اس سرزمین رنگ وبو کی مٹی میں علم وعلماء کی گرمی باقی رہی، یہاں تک کہ محمد شاہ عالم کے آغاز جلوس میں برہان الملک سعادت علی خاں نیشاپوری صوبۂ اودھ کا حاکم ہوا تو اس نے صوبہ الہ آباد کے اکثر بڑے بڑے شہروں کو بھی جیسے دارالخیر جون پور، بنارس، غازی پور، کڑا مانک پور، کوڑا جہان آباد وغیرہ کو اپنی حکومت میں شامل کرکے قدیم وجدید خانوادوں کے وظائف اور جاگیریں اور معافیاں یکقلم ضبط کرلیں، جس کی وجہ سے شرفاء ونجباء نے بڑی پریشانی اٹھائی اور معاشی تنگی و پریشانی نے اس دیار کے لوگوں کو حصول علم سے باز رکھ کر پیشۂ سپاہ گری میں ڈال دیا اور تعلیم وتدریس کا رواج یوں ختم ہوگیا کہ جو مدرسے عہد قدیم سے معدنِ علم و فضل تھے بالکل ویران ہوگئے اور اکثر ارباب کمال کی محفلیں اجڑ گئیں، انا اللہ وانا الیہ راجعون،

وبعد ارتحال برہان الملک نوبت بہ خواہر زادہ او ابوالمنصور صفدر جنگ رسید، و وظائف واقطاعات بدستور زیر ضبط ماند، دور آخر عہد محمد شاہ ۱۱۵۹ھ تسع وخمسین و مائۃ والف صوبہ داری الہ آباد نیز بہ صفدر جنگ مقرر شد او تتمۂ وظائف آن صوبہ کہ تا حال از آفت ضبط محفوظ ماندہ بود بہ ضبط در آمد دور عہد احمد شاہ صفدر جنگ بہ پایۂ وزارتِ اعلیٰ صعود نمود، و نائب صوبہ کار برارباب وظائف تنگ تر گرفت و تا حین تحریر کتاب این دیار پامال و حوادث روزگار است لعل اللہ یحدث بعد ذالک امراً[1]

برہان الملک کے مرنے پر اس کے بھانجے ابوالمنصور صیدر جنگ کو یہاں کی حکومت ملی، اس کے دور میں بھی وظائف اور جاگیریں بدستور سابق ضبط رہیں، ۱۱۵۹ھ میں محمد شاہ عالم کے آخری عہد میں الہ آباد کی صوبہ داری بھی صفدر جنگ کے حوالہ کردی گئی تو جو وظائف ابتک باقی تھے وہ بھی نہ رہ سکے بلکہ سب کے سب ضبط کر لئے گئے، اور احمد شاہ کے دور میں صفدر جنگ وزیر اعلیٰ بنا تو نائب صوبہ دار نے وظیفہ یاب خاندانوں پر سختی کی اور اس کتاب مآثر الکرام کی تصنیف کے وقت (۱۱۸۰ھ) تک یہ دیار حوادث زمانہ سے پامال و برباد اور تباہ حال رہے، لعل اللہ یحدث بعد ذالک امراً،

اس متن کی شرح کے لئے دوسرے عینی شاہد اور اس تباہی و بربادی سے گزرنے والے مولوی خیرالدین محمد شیعی الہ آبادی جونپوری کا بیان کافی ہے، وہ اس دور کے سرد وگرم حالات سے دو چار ہوئے ہیں، جہاندار شاہ کی خدمت میں رہے ہیں، ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کی ہے، نواب آصف الدولہ کی دعوت پر لکھنؤ جا چکے ہیں، الہ آباد اور جون پور میں تعلیمی خدمت انجام دی ہے، انھوں نے تذکرۃ العلماء (تالیف ۱۲۱۴ھ) میں جون پور وغیرہ کی اہل علم وفضل کی تباہی و بربادی کا حال درج کیا ہے، ہم اس کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں، کہ محمد شاہ کے عہد سلطنت میں نواب برہان الملک سعادت علی خاں نیشاپوری صوبہ اودھ اور سرکاراتِ بنارس و جونپور کا حاکم ہوا، نواب مذکور صوبۂ اودھ کا انتظام کرنے کے بعد ۱۱۴۷ھ میں جون پور آیا، چونکہ اس شہر کے مشائخ، امراء و

[1] مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۲۲۔

حکام کی حاشیہ نشینی کے عادی نہیں تھے، اس لئے ان میں سے کوئی اس کے درِ دولت پر حاضر نہیں ہوا، ایک دن نواب، مخدوم الملک شیخ غلام غوث کی ملاقات کے لیے نکلا، اس وقت وہ ہاتھی پر سوار تھا، مخدوم الملک کی خانقاہ کے قریب ایک درخت تھا، جس کی شاخیں ہاتھی کے گذرنے میں حائل تھیں، شاخ کٹنے تک نواب وہیں پڑا رہا، اسے امید تھی کہ خود مخدوم الملک یا ان کا کوئی آدمی استقبال کے لئے آئے گا اور وہ اس کی معیت میں خانقاہ میں حاضری دے گا، مگر ایسا نہیں ہوا، اور نواب نے غیظ و غضب میں واپس آکر اپنے مصاحبوں سے کہا کہ اس کے علماء اور مشائخ مال داری کے نشہ میں خود کو بلکہ خدا کو فراموش کر چکے ہیں، پھر خیمہ میں جا کر حکم دیا کہ یہاں جتنے قدیم و جدید خانوادے ہیں، ان سب کی جاگیریں ضبط کر لی جائیں، چنانچہ اس کے بعد مشائخ اور مدرسین کی جاگیریں، مراعات اور طلبہ وفقراء کے سب وظیفے اور روزینے یک قلم موقوف کر دیئے گیے اور معاشی تنگی نے شہر کے باشندوں کو تحصیل علم سے روک دیا، دور دراز سے آئے ہوئے طالب علم دربدر دست نگر ہوکر پھرنے لگے مشائخ اور مدرسین طلب معاش میں خانقاہوں اور مدرسوں سے باہر نکل گئے، مدرسے ویران ہو گئے۔ اور خانقاہیں بوم وشغال کا خرابہ بن گئیں۔

اس تباہی و بربادی کے بعد مخدوم الملک شیخ غلام غوث بادشاہ کی خدمت میں دہلی گئے اور اُسے تمام حالات سے آگاہ کیا، بادشاہ نے مستحقین کی جاگیروں کی واگذاری کے لئے شاہی فرمان جاری کیا، مگر نواب برہان الملک نے جونپور کے علماء و مشائخ کے کبر و غرور کی داستان بادشاہ کو لکھ بھیجی اور لکھا کہ اس صورت میں سرکار جونپور کی مال گذاری میں سوا لاکھ کا نقصان ہو جائے گا، اور بادشاہ نواب کی ناراضگی کے خیال سے اس کام سے باز آگیا، البتہ صرف مخدوم الملک کی جاگیر کی واگذاری کرنی چاہی، مگر انھوں نے تنہا خوری پسند نہیں کی اور ان کی غیرت وحمیّت نے گوارا نہیں کیا کہ وہ اپنے شہر کے علماء مشائخ اور دیگر لوگوں کو نظر انداز کر کے صرف اپنا معاملہ درست کر لیں، کچھ دنوں کے بعد دہلی ہی میں ان کا انتقال ہو گیا،

نواب برہان الملک سعادت علی خاں کے مرنے پر ابو المنصور خاں حاکم ہوا، اس نے بھی ضلع جونپور کے غریبوں کے ساتھ وہی شیوۂ بیداد جاری رکھا بلکہ بقول شخصے ”ہر کہ آمد براں مزید نمود“ (جو

بھی آیا اس پر اضافہ کیا) والی بات ہوئی، اور اس کے نائب تمکین خاں خواجہ سرا نے اکثر منصب داروں کی جاگیریں ضبط کرلیں، نواب شجاع الدولہ کے دورِ حکومت میں ضبطی کی یہ بلا بہت زیادہ پھیل گئی، اور پورے ممالک محروسہ میں تمام خاص و عام یکساں طور پر اس کی زد میں آگئے، جب شجاع الدولہ کو انگریزوں کے مقابلہ میں شکست اور فرار کا منہ دیکھنا پڑا اور مسٹر مارتھ نوابی اودھ کی چاروں سرکاروں کے انتظام پر مامور ہوا تو اس نے تمام لوگوں کے وظیفے اور جاگیریں واپس کردیئے، مگر اسی سال لارڈ کلیف نے صلح و مصالحت کے بعد ان سرکاروں کو پھر نواب شجاع الدولہ کے حوالہ کردیا، اور اس کے کارپردازوں نے پھر وہی بیداد شروع کردی منصب دار بیچارے اپنی جاگیروں اور جائدادوں پر ابھی پوری طرح قبضہ بھی نہیں کر سکے تھے کہ پھر چھین لی گئیں، ۱۱۸۷ھ میں نواب شجاع الدولہ کے انتقال پر نواب آصف الدولہ حاکم ہوا تو اس نے مختار الدولہ کی وساطت سے ممالک محروسہ کے تمام اضلاع کے حکام کو غرباء کی جاگیروں کی واگزاری کا فرمان جاری کیا، مگر ایلچ خاں اس کارِ خیر سے مانع ہوا، اور طرح طرح کے حیلے بہانے سے آصف الدولہ کو باز رکھا اسی زمانہ میں مسٹر جان برسٹو کلکتہ سے لکھنؤ آیا، اور نواب کے کارپردازوں کا تماشا دیکھ کر چاروں سرکاروں کو ان کے عمل دخل سے نکال لیا۔

بنارس میں بھی اسی قسم کی صورت پیدا ہوئی وہاں کے حکام نے راجہ اجیت سنگھ کو خوش کرنے کے لیے مظلوموں پر توجہ نہیں دی، جس سے یہ جماعت مصیبت میں مبتلا رہی، آخر ۱۱۹۶ھ میں گورنر ہیسٹنگز نے کلکتہ سے بنارس آکر راجہ اجیت سنگھ کو اس کی بدکاری کے سبب ضلع بدر کیا، اور علی ابراہیم خاں کو حاکم عدالت مقرر کرکے کچھ لوگوں کی جاگیریں واپس کرائیں۔[1]

---

[1] تذکرۃ العلماء از صفحہ ۵ تا صفحہ ۱۸۔

شیعیت کی تبلیغ واشاعت

نوابانِ اودھ صرف شیعہ ہی نہیں تھے، بلکہ اس مذہب کے سرگرم داعی ومبلغ بھی تھے، جاگیروں کی ضبطی اور وظیفوں کی بندش میں ان کی اس تنگ نظری کو دخل ہے، جو خانوادہ شیعہ ہو جاتے ان کی جاگیریں بحال رہتی تھیں، عزاداری کے لئے بڑی بڑی جاگیریں اور معافیاں دی جاتی تھیں، مولانا عبدالحئی صاحب نے گل رعنا میں ایک مقام پر لکھا ہے کہ نواب آصف الدولہ نے لہو ولعب میں مشغول ہونے کے ساتھ مذہب تشیع کی اشاعت میں دل سے کوشش کی ان کے نائب حسن رضا خاں بھی مذہبی آدمی تھے، وہ بھی اس کوشش میں لگے رہتے تھے، ان کی کوشش سے ہزاروں خاندان سنی سے شیعہ ہو گئے اور ان کو جاگیریں ملیں، اور جو اپنی ضد پر قائم رہے ان کی جاگیریں جو شاہانِ مغلیہ کے وقت سے چلی آتی تھیں ضبط کر لی گئیں، شاہ علی اکبر چشتی مودودی کے مشورے اور ملا محمد علی فیض آبادی کی تحریک سے نواب حسن رضا خاں نے جمعہ وجماعت قائم کر کے سب سے پہلے مولوی سید دلدار علی نصیر آبادی کی اقتدا میں ۳/ رجب ۱۲۰۰ھ کو نماز ادا کی، یہ پہلا دن ہے کہ وسط ہند میں شیعوں نے اپنا جمعہ وجماعت علیحدہ کر لیا، اور نائب امام کی حیثیت سے مجتہدین کے ہاتھ میں زمام مذہب دی۔[1]

مولوی عبدالحق (بابائے اردو) نے بڑے محتاط انداز میں مآثر الکرام کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ ایک بات تاریخی حیثیت سے اس تذکرہ میں خاص طور پر قابل لحاظ ہے، وہ یہ کہ ان علماء و فضلائے بلگرام میں جن کا اس میں ذکر ہے، ایک بھی اہل تشیُّع میں سے نہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب شیعہ نے وہاں بعد کے زمانہ میں رواج پایا، اگر ان علماء میں سے بعض کی اولاد اب بھی وہاں باقی ہے اور مذہب شیعہ پر ہے، یا انکے نسب ناموں میں ان علماء کے نام نکلیں تو ہمارا خیال اور بھی قوی ہو جائے گا، یہ امر واقعی ہے کہ ادھر کی سلطنت نے خاص کر آس پاس کے اضلاع وقصبات

---

[1] گل رعنا ص ۱۵۳۔

پر اور بعض اوقات دور دراز کے مقامات پر بھی مذہبی طور سے خاص اثر ڈالا ہے، چنانچہ جونپور و دیگر مضافات لکھنؤ وغیرہ کے حالات پر نظر ڈالنے سے یہ امر پایہ تیقن کو پہونچ جاتا ہے، جب مذہب کی پشت پر حکومت ہوتی ہے، تو حالات اندیشہ ناک ہو جاتے ہیں، میرا اس سے ہرگز یہ مطلب نہیں، کہ سلطنت اودھ نے مذہب کے معاملہ میں کبھی جبر و تعدی سے کام لیا، بلکہ بات یہ ہے کہ جاہ طلبی اکثر لوگوں کی نیت کو جو اعتقاد کے کچے ہوتے ہیں ڈانواں ڈول کر دیتی ہے، ایسا ہر جگہ ہوا ہے اور یہی اودھ کے اکثر مقامات میں ہوا اور قصبہ بلگرام بھی اس کے اثر سے نہ بچا، معلوم ہوتا ہے کہ آزاد کے زمانہ میں اہل تشیُّع وہاں نہ تھے، اور اگر تھے تو خال خال، لیکن بعد کے زمانہ میں حکومت کے اثر سے اس کا قدم وہاں پہونچا۔ [1]

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بڑے بڑے سنی خانوادے جو کئی صدیوں سے علماء و فضلاء اور مشائخ کے مرکز تھے، نوابی اودھ کے دور میں شیعہ ہو گئے، اور جاگیر و جائداد کی ضبطی کے خوف یا لالچ کی وجہ سے ان کے اخلاف نے اپنے اسلاف کا مذہب ترک کر کے شیعیت اختیار کر لی، چنانچہ میر علی عاشقان سرائمیری کے خاندان والے اسی دور میں شیعہ ہوئے، نواب شجاع الدولہ نے بکسر کی لڑائی کے بعد صوبہ اودھ کی تمام معافیوں کی ضبطی کا حکم صادر کیا، تو سید امیر ماہ بہرائچی کی اولاد میں دو بھائی غلام محمد اور غلام رسول معافی کی بحالی کے لالچ میں آبائی مذہب کے بجائے شیعہ ہو گئے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نصف معافی بحال اور نصف ضبط ہو گئی، اس وقت سے بجائے اعراس کے تعزیہ داری کرنے لگے، نواب سعادت علی خاں کے زمانہ میں نصف معافی بھی ضبط ہو گئی، راجہ سید حامد شاہ مانک پوری کا خاندان سلاطین شرقیہ کے زمانہ سے جاگیردار تھا، گونڈہ میں چار پر گنے اور سلون میں دو پر گنے ان کی جاگیر میں تھے، فرخ سیر کے زمانہ سے خوب ترقی کرتے رہے، مگر نوابی اودھ کے آتے ہی ان پر زوال آیا، اس خاندان میں راجہ سیّد احمد ثانی بخوف ضبطی معافی تبدیل مذہب کر کے امامیہ ہو گئے۔ نیز ان کے تین لڑکوں میں سے دو شیعہ ہو گئے۔ [2] حافظ امان اللہ بنارسی نواب برہان الملک سعادت علی خاں کا نشانہ بنے، ان کو جو مراعات اور جاگیریں عالمگیر سے ملی تھیں، سب ضبط کر لی گئیں، اس

---

[1] مقدمہ مآثر الکرام ص ۱۴، [2] آئینہ اودھ ،

سلسلہ میں ان کو آخری عمر میں محمد شاہ کے پاس دلی جانا پڑا، ان کی اولاد بھی بعد میں شیعہ ہوگئی، شاہ ابوالغوث گرم دیوان بھیروی لہراوی نواب صفدر جنگ کے دور میں ۱۱۶۴ھ میں چکلہ اعظم گڑھ کے حاکم کے ظلم وزیادتی سے تنگ آکر نواب فضل علی خاں حاکم غازی پور کے پاس چلے گئے، اسی طرح بہت سے سنی نوابی اودھ کے دور میں شیعہ بنے یا بنائے گئے، اور جو اپنے مسلک پر اڑے رہے طرح طرح سے پریشان ہوئے، اور دوسرے دیار میں جاکر نوابوں، رئیسوں، راجوں زمینداروں کے علاوہ انگریزوں کے قائم کردہ مدرسوں اور سرکاری عدالتوں میں ملازمت اختیار کرنے پر مجبور ہوئے، یا پھر اپنے وطن میں غربت وافلاس کی زندگی پر قناعت کرکے اپنی سخت جانی سے علمی اور دینی مشاغل میں منہمک رہے، بلکہ حتی الامکان حالات کا مقابلہ کرتے رہے، مگر شیعیت کی تبلیغ واشاعت کا کام بہت منظم تھا، ہمدردی اور دلداری کے علاوہ مبلغین بھیجے گئے، مدرسہ اور امام باڑہ اور چوک تعمیر ہوئے تعزیہ داری کے لئے معافیاں دی گئیں، قصبہ مبارک پور میں اس سلسلہ کی کوششوں کے اجمالی بیان سے اس کا اندازہ ہوجائے گا، مولوی رمضان علی نے یہاں آکر ایک شاندار امام باڑہ نواب شجاع الدولہ کے دور ۱۲۰۹ھ میں تعمیر کیا، اور اس کے اندر چبوترہ اور پنجہ نواب سعادت خاں کے دور میں ۱۲۱۶ھ میں بنوایا، اس زمانہ میں ایسی شاندار عمارت اس دیار میں نہیں تھی، طغرے اشعار اور نقش ونگار سے مزین تھی، اسی میں ایک بڑا مدرسہ بھی جاری تھا، اسے مکان رمضان شاہ کہتے ہیں، اسی زمانہ میں شیخ سیف علی باہر سے یہاں آئے اور انھوں نے بھی تبلیغ واشاعت کے ساتھ امام باڑہ رمضان علی شاہ کے بمقابل بجانب جنوب ایک امام باڑہ تعمیر کیا، جو بعد میں منہدم ہوگیا، شیخ چراغ علی بھی اسی دور میں شیعیت کی تبلیغ کے سلسلہ میں اس قصبہ میں آئے، جنھوں نے قصبہ کے مغرب میں ایک پرفضا باغ میں شاہ کے پنجہ کے نام سے ایک عظیم الشان امام باڑہ تعمیر کیا، بازار میں قدم رسول نامی عمارت بھی اسی دور کی ہے، اس کے علاوہ کئی اور امام باڑے اس دور کے بنے ہوئے اب تک موجود ہیں۔

نواب سعادت علی خاں کے زمانہ میں یہاں سب سے پہلا شیعہ سنی فساد ہوا جس میں ایک شخص جان سے مارا گیا، اس وقت چکلہ اعظم گڑھ کا حاکم کاظم علی خاں پسر زین الدین خاں

کوڑے والا تھا، اس نے مقدمہ میں شیعوں کی طرفداری کی، اس کے بعد نواب سعادت علی خاں کے پاس فیض آباد میں مرافعہ ہوا مگر یہاں بھی انصاف کے بجائے طرفداری نے کام کیا، اور یہ معاملہ کسی طرح درہم برہم ہوا، اس کی تفصیل مولوی حسن علی فاروقی نے ''واقعات وحادثات مبارکپور'' میں درج کی ہے۔

عام مسلمانوں میں بے چینی

مغل سلطنت کا آخری دور سخت اضطراب اور بے چینی میں گزرا جس میں مسلمانوں کو مختلف مصائب وآلام سے دوچار ہونا پڑا، مرکز دہلی کی کمزوری، اندرونی و بیرونی یلغار، انگریزوں کا بڑھتا ہوا اقتدار، ملک میں خودمختاریوں کا زور، یہ سب ایسے حالات تھے جن میں مسلمانوں کی ملکی، سیاسی، علمی اور دینی قدریں بری طرح مجروح ہو رہی تھیں، خاص طور سے اہل علم اور ارباب دین و دیانت شدید ترین مشکلات میں مبتلا تھے، اور پورے ملک میں سخت بے چینی پائی جا رہی تھی، مرکز اور صوبے اپنی بے دست و پائی کی وجہ سے کچھ کرنا بھی چاہتے تو نہیں کر سکتے تھے، ان ہی حالات میں حضرت سید احمد بریلوی (ولادت سنہ ۱۲۰۱ھ شہادت سنہ ۱۲۴۶ھ) کی امارت وامامت میں مشہور دینی تحریک اٹھی جس کی مجاہدانہ سرگرمیوں میں بنگال سے لیکر سرحد تک کے علماء اور ارباب دین جان و مال سے شریک تھے، اس زمانہ میں نواب غازی الدین حیدر اور نواب نصیر الدین حیدر کی حکومت تھی، ایک مرتبہ جب کہ سید صاحب ٹیلہ پیر محمد شاہ لکھنؤ میں اپنے آدمیوں کے ساتھ فروکش تھے، وزیر معتمد الدولہ نے ان سے ملاقات کر کے پانچ ہزار کی رقم نذر کی خود نواب غازی الدین حیدر اس موقع پر سید صاحب سے ملنا چاہتے تھے، مگر بعض مجتہدوں نے حیلہ بہانہ کر کے ایسا نہیں کرنے دیا۔

نواب سعادت علی خاں کے دور میں چوک اور امام باڑہ کے جھگڑے میں ۱۹؍اپریل سنہ ۱۸۱۳ء سنہ ۱۲۲۹ھ کو مبارکپور (اعظم گڑھ) پر باہر کے کئی ہزار بلوائیوں اور فسادیوں نے حملہ کیا اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں شدید ترین جنگ ہوئی جس میں ۳۵۔۳۶ مسلمان شہید ہوئے اور تقریباً

تین سو بلوائی مارے گئے، اور آخر میں نو رات نو دن تک مبارک پور کے مسلمان لوٹے اور جلائے گئے، مگر ان مظلوموں کی دادرسی نہ ہوسکی، اس کی تفصیل "واقعات و حادثات مبارکپور" میں موجود ہے۔

اس کے بعد نواب واجد علی شاہ کے آخری دور میں اجودھیا کی بابری مسجد اور ہنومان گڑھی کا جھگڑا اٹھا، مسجد پر مہنتوں اور بیراگیوں نے قبضہ کرلیا تھا۔ اس کے خلاف علماء کی قیادت میں صدائے احتجاج بلند ہوئی اور نواب واجد علی شاہ اور ان کے حکام مسجد کی واگذاری کا وعدہ کرتے رہے، مگر مان سنگھ کمانڈر بارلو، اور بیراگیوں کے دباؤ کی وجہ سے آخر تک کچھ نہ کرسکے، مجبوراً شاہ غلام حسین اور مولوی محمد صالح نے عزم جہاد کرکے علمِ محمدی قائم کیا، اور ایک معرکہ میں مولوی محمد صالح سمیت ۶۹ مسلمان شہید ہوئے، اس حادثۂ فاجعہ کے بعد مولانا امیر علی امیٹھوی کی امارت وقیادت میں مسجد کی واگذاری کے لئے جہاد کی تیاری ہوئی، آخر کار ۲۶/صفر ۱۲۷۲ھ میں ۱۴ مسلمان اپنے امیر مولانا امیر علی امیٹھوی کے ساتھ مقام شجاع گنج[1] میں شہید ہوئے، اور انگریزی فوج نے ان سب کو بھون کر رکھدیا، اس حادثہ فاجعہ کے دوسرے ہی سال ۱۲۷۳ھ میں انگریزوں نے واجد علی شاہ کو گرفتار کرکے مٹیا برج کلکتہ بھیج دیا، اور ۷/فروری ۱۸۵۶ء/(۱۲۷۳ھ) میں کرنل اوٹرم نے پورے اودھ پر قبضہ کرکے ایسٹ انڈیا کمپنی کو دیدیا۔

علمی قدردانی اور علماء نوازی

ان نامساعد حالات کے باوجود نوابان اودھ کے دور میں دیار پورب علم وعلماء کی رونق سے محروم نہیں رہا، مذہب شیعہ کے علماء اور ادارے پورے نشاط اور انبساط کے ساتھ علمی اور مذہبی مشاغل میں مصروف رہے، اور نوابانِ اودھ کی طرف سے ان کی پوری مدد ہوتی رہی، اس دور میں اس مذہب کے بڑے بڑے علماء وفضلاء اور مجتہدین پیدا ہوئے، جن کی علمی شہرت ایران وعراق اور قم وکاشان تک پہونچی، نیز دیگر ممالک کے شیعی علماء وفضلاء نے حکومت اودھ میں رہ کر نہایت قدرو

[1] موجودہ بھلسر

منزلت پائی، بہت سے سنی علماء بھی تنگ حالی کے باوجود اپنے کام میں صبر و قناعت کے ساتھ مصروف رہے، اور جرأت سے کام لیکر مدارس قائم کئے، اور عام مسلمانوں کے تعاون سے علمی و دینی فضا بحال رکھی، اس دور میں ایک خاص بات یہ ہوئی کی قدیم خانوادوں کی جاگیروں اور معافیوں کی ضبطی کے نتیجے میں قدرتی طور سے علم و فن ان کے حلقۂ اثر اور دائرۂ اقتدار سے نکل کر پسماندہ اور پیشہ ور طبقوں میں داخل ہوگیا، ان لوگوں نے اپنے زیر اہتمام مدرسے جاری کئے، اپنے طور پر پڑھنے پڑھانے کا انتظام کیا، اور اپنے تعاون سے عمومی مدرسوں میں تعلیم و تعلم کا سلسلہ قائم کیا، ورنہ اس سے پہلے عام طور پر شرفاء و نجباء کے مکانوں پر یہ کام ہوتا تھا، اور کمزور اور پسماندہ طبقوں کے لیے تحصیل علم کے مواقع بہت محدود تھے، ہمارے دیار میں عوامی مدرسوں کی موجودہ رونق اسی صورتِ حال کا نتیجہ ہے ع وَمَصَائِبُ عند قَومٍ عِندَ قَومٍ فَوائِدٗ۔ ﴿کسی قوم کی مصیبت دوسری قوم کیلئے مفید ہوتی ہے﴾

اس دور میں دوسری خاص بات یہ ہوئی کہ شیعہ سنی مسائل و مباحث پر جانبین سے کثرت سے کتابیں لکھی گئیں، اور دونوں کے اختلافات نکھر کر سامنے آگئے، بڑے بڑے مناظرے اور مباحثے ہوئے، اور عام مسلمانوں کو ان کی وجہ سے معلومات حاصل ہوئیں، مولانا غلام علی آزاد نے اس دور کے بارے میں بجا طور سے لکھا ہے۔

باوجود ایں خرابی بار واج علم خصوصاً معقولات بہ کیفیتے کہ آنجا است در قلمرو ہندوستان ہیچ جانیست، ہنوز علمائے فحول جلوہ طراز اندو بہ اصول اقصیٰ مراتب کمال ممتاز، باصد جہاں کدورت باز ایں خرابہ جائے است "[1]	باوجود اس خرابی بسیار کے اس علاقہ میں علم خصوصاً معقولات کا رواج اس طرح ہے کہ پورے ہندوستان میں کسی اور جگہ نہیں ہے، ابھی تک علمائے فحول، مسند علم پر جلوہ طراز رہ کر مراتب کمال کی انتہائی بلندی پر ممتاز ہیں،

شیعہ مذہب قبول کرنے والوں کے لئے نئے نئے مدرسے جاری کئے گئے، اور جگہ جگہ

---

[1] مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۲۳،

معلمین و مدرسین بھیجے گئے، چنانچہ مبارک پور میں مولوی رمضان علی کے مدرسے کا ذکر آ چکا ہے، یہ بہت بڑا مدرسہ تھا، جہاں کئی عالم و فاضل درس دیتے تھے، مولوی علی حسن فاروقی نے ''واقعات و حادثات مبارکپور'' میں ۱۸۱۳ء کی جنگ کے بیان میں لکھا ہے کہ اس امام باڑہ کے تین طرف بہت خوش قطع سائبان تھے، اور اس میں ایک بڑے متبحر عالم و فاضل بے مثل بنام مولوی نثار علی مرحوم ساکن قصبہ سرائمیر برادر چچازاد شیخ جان علی صاحب مرحوم خوشنویس علوم عربی و فارسی کا درس دیتے تھے، اور اسی امام باڑے میں قیام پذیر تھے، مولوی نثار علی بعد میں اسمٰعیلی مذہب قبول کر کے اس فرقہ کے داعی و مبلغ بن گئے تھے، ۱۸۱۳ء کی جنگ میں یہ اور مولوی محمد نشان اور میر محمد حسین بھی مقتول ہوئے، قصبہ میں شیعہ مذہب کا ایک اور مدرسہ لالن مہتر کے امام باڑے میں تھا، جس میں مولوی بشارت علی ساکن فیض آباد درس دیتے تھے،[1] ان مدارس کے علاوہ بہت سے مدرسے وجود میں آ گئے، جن میں ہر فرقہ کے طلبہ پڑھتے تھے، اس زمانہ میں سنی طلبہ شیعہ علماء اور شیعہ طلبہ سنی علماء سے ادب اور معقولات کی کتابیں پڑھا کرتے تھے۔

خود دارالسلطنت لکھنؤ میں فرنگی محل کا مدرسہ قدیم زمانہ سے اہل سنت کی مرکزی درس گاہ تھا، جس کا فیض پورے ہندوستان میں جاری تھا، سنیوں کی طرح شیعہ طلبا بھی اس سے فیض یاب ہوتے تھے، مگر افسوس کہ نوابی اودھ میں اس کی علمی و دینی مرکزیت کو زوال و انتشار نے چاروں طرف سے گھیر لیا، اور اس کی عظمت خاک میں مل گئی، ملک العلماء بحر العلوم مولانا عبدالعلی فرنگی محلی متوفی ۱۲۲۵ھ کو تعزیہ داری کے جھگڑے میں جان کے خوف سے خرابی بسیار کے بعد وطن کو خیر باد کہنا پڑا۔ اور وہ شاہ جہاں پور، رام پور، اور بہار (بردوان) کی خاک چھانتے ہوئے، ارکاٹ اور مدراس میں نواب والا جاہ محمد علی خاں کے وہاں پہونچے اور عزت و احترام کے ساتھ وہاں پوری زندگی درس افادہ میں بسر کی اسی طرح اس خانوادہ کے دوسرے عالم ملا محمد حسن فرنگی محلی متوفی ۱۲۹۹ھ کو شجاع الدولہ ہی کے دور میں وطن چھوڑ کر رام پور میں سکونت پذیر ہونا پڑا ان کی درس گاہ کے دو طالب علموں کو شیعہ سنی کے نام پر لڑا کر قتل و غارت کا بازار گرم کیا گیا اور ملا محمد حسن کو جان کے خوف

[1] واقعات و حادثات مبارکپور قلمی ص ۱۷، ۲۳

سے لکھنؤ چھوڑنا پڑا۔

ان واقعات وحقائق کے باوجود نوابانِ اودھ نے علم وعلماء کی قدر ومنزلت اور سرپرستی بھی کی، اور شیعہ علماء کی طرح بہت سے سنی علماء کو بھی نوازا، ان کے عیب کے ساتھ ان کے ہنر کا تذکرہ بھی بہت ضروری ہے۔ ع

عیب منجملہ بگفتی ہنرش نیز بگو

اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں مولانا حمد اللہ شیعی سندیلوی متوفی ۱۱۶۰ھ کو نواب ابوالمنصور صفدر جنگ کی قدر دانی اور سفارش سے احمد شاہ بادشاہ نے فضل اللہ خاں کا خطاب دیکر کئی گاؤں کی جاگیر دی، اور انھوں نے سندیلہ میں بہت بڑا مدرسہ قائم کیا، اسی طرح ان کے صاحبزادے مولوی عسکر علی سندیلوی کو نواب مذکور نے احمد شاہ کے مقربین میں داخل کیا، اور بادشاہ نے ان کو خیر اللہ خاں کا خطاب دیکر کئی گاؤں جاگیر میں عطا کئے، انھوں نے بھی سندیلہ میں مدرسۂ منصوریہ کے نام سے مدرسہ قائم کیا۔

مشہور شیعی عالم اور مجتہد سید دلدار حسین نصیر آبادی متوفی ۱۲۳۵ھ نے نواب آصف الدولہ اور وزیر حسن رضا خاں کے یہاں بے پناہ مقبولیت اور وجاہت پائی، وزیر نے ان کو اپنے لڑکوں کا معلم بنا کر گراں قدر مشاہرہ سے نوازا اور جب وزیر مذکور نے شیخ علی اکبر صوفی فیض آبادی کے مشورہ سے نواب آصف الدولہ کو جمعہ و جماعت کے قیام پر راضی کیا تو سید دلدار حسین کو امامت کے لئے منتخب کیا، ان کے صاحبزادے مولوی باقر کو نواب امجد علی شاہ نے منصف الدولہ کا خطاب دیکر عدالت کا افسرِ اعلی بنایا، اور وہ آخر تک اسی عہدہ پر قائم رہے مہاراجہ رتن سنگھ متوفی ۱۲۶۷ھ کا باپ مالک رام نواب آصف الدولہ کے دور میں لکھنؤ میں افسر توپ خانہ تھا، رتن سنگھ نے اپنے آبائی مذہب پر رہتے ہوئے عربی، فارسی، ترکی، سنسکرت زبان کے ساتھ ساتھ ریاضی، ہیئت، انشاء اور شاعری میں مہارت حاصل کی، نواب غازی الدین حیدر نے ان کو منشی الملک کا خطاب دیکر اپنے دیوان کا میر منشی بنایا، وہ نواب محمد علی شاہ کے دور تک اسی عہدہ پر رہے، اور نواب مذکور نے ان کو فخر الدولہ، دبیر الملک، مہاراجہ رتن سنگھ ۱۲۶۴ھ میں مسلمان ہو گئے اور تین سال کے بعد انتقال کیا،

مولانا علی اکبر شاہ فیض آبادی متوفی ۱۲۱۰ھ شیخ قطب الدین مودودی چشتی کی نسل سے اپنے زمانہ کے مشہور چشتی صوفی تھے، اور تفضیلی مذہب رکھتے تھے، یعنی سنی ہونے کے باوجود حضرت علیؓ کو حضرات شیخینؓ سے افضل مانتے تھے، وہ اودھ کے حکمرانوں اور امیروں کے یہاں بے پناہ مقبولیت رکھتے تھے، نواب آصف الدولہ اور وزیر حسن رضا خاں ان کے خاص معتقدوں میں سے تھے، دونوں ان کی خدمت میں حاضری دیتے تھے، اور ان کے مشوروں پر عمل کرتے تھے، حکیم گونگے مرزا محمد علی لکھنوی متوفی ۱۲۶۲ھ اس دور کے مشہور طبیب وحکیم تھے، اصول کے ایسے پابند تھے کہ علاج ومعالجہ میں کسی چھوٹے بڑے کی پرواہ نہیں کرتے تھے، ایک مرتبہ نواب نصیر الدین حیدر سخت بیمار پڑا اور حکیم صاحب کا علاج شروع کیا، مگر پرہیز میں لاپرواہی کرتا تھا، حکیم صاحب کو اس کی خبر ملی تو علاج بند کر دیا، نواب نے دوسرے اطباء کی طرف رجوع کیا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا، آخر کار نواب نے حکیم صاحب کے پاس آدمی بھیج کر معذرت کی، حکیم صاحب نے علاج کرنے سے انکار کر دیا، نواب نے ایک شاہی افسر کو بھیجا، مگر کام نہیں چلا، حتیٰ کہ وزیر حاضر ہوا، مگر حکیم صاحب اپنی ضد پر اڑے رہے، نواب نے مجبور ہو کر کہلا بھیجا کہ اگر اب بھی آپ علاج سے انکار کریں گے تو شدید مرض کے باوجود کسی طرح سے خود مجھے آپ کی خدمت میں حاضر ہونا پڑے گا، اس کے بعد حکیم صاحب نے یہ کہہ کر دوبارہ علاج شروع کیا کہ بادشاہ کی حکومت عوام کے جسم پر ہوتی ہے اور میری حکومت دل پر ہے، میں اگر جنگل میں چلا جاؤں تو لوگ میرے گرد جمع ہو جائیں گے،

مولانا سید مرتضیٰ حسینی لکھنوی متوفی ۱۲۵۰ھ انگریزی حکومت کے ملازم تھے، اسی سلسلہ میں کچھ دنوں لکھنؤ سے جا کر کلکتہ میں مقیم رہے، وہاں سے واپس ہو کر نواب سعادت علی خاں کے زمانہ میں لکھنؤ کے مفتی بنائے گئے، اس سے پہلے نواب غازی الدین حیدر کے دور میں انھوں نے حضرت سید احمد بریلویؒ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، مولانا جعفر حنفی بریلوی متوفی ۱۲۳۲ھ نہایت دیندار، عبادت گزار اور بزرگ عالم تھے، نواب سعادت علی خاں نے ان کو رائے بریلی سے لکھنؤ کے عہدۂ قضاء کے لئے طلب کیا، مگر مولانا نے صاف انکار کر دیا،

مفتی ابراہیم حنفی بنارسی متوفی ۱۲۵۴ھ نوابانِ اودھ کے دور میں شہر لکھنؤ کے مفتی تھے،

ساتھ ساتھ درس وتدریس کا مشغلہ بھی جاری رکھتے تھے،

مولانا احمد بن یعقوب انصاری سہالوی مشہور عالم وفقیہ تھے،نواب سعادت علی خاں کے زمانہ میں لکھنؤ میں عہدۂ قضاء پر فائز ہوئے ،اورنوب مذکورزندگی بھراسی عہدہ پر رہے،

مولانا جعفرعلی کسمنڈی متوفی ۱۲۸۴ھ نے لکھنؤ میں مفتی ظہور اللہ انصاری فرنگی محلی سے پڑھ کر دہلی میں شاہ عبدالعزیز صاحب "محدث سے تعلیم حاصل کی، پھر لکھنؤ آکر امراء وحکام سے منسلک رہےاورایک مقام کے حاکم بنائے گئے،

مولانا حکیم حیدر حسین بریلوی متوفی ۱۲۵۷ھ مخدوم عادل الملک جونپوری کی نسل سے تھے،وہ نوابانِ اودھ کےمقربین میں سے تھےاورراۓ بریلی کے حاکم بنائے گئے،

مفتی خلیل الدین کاکوروی متوفی ۱۲۷۸ھ ریاضی کے مشہور عالم تھے، ابتداء میں کانپور کے مفتی بنے ،اس کے بعد نواب سعادت علی خاں نے ان کو رصدگاہ بنانے کا کام سپرد کیا مگر نواب کے انتقال کی وجہ سے یہ کام رک گیا ،نواب غازی الدین حیدر نے اپنے زمانہ میں ان کو کلکتہ کی سفارت پرمقرر کر کے پانچ سوروپیہ مشاہرہ دیا،

مفتی علی کبیر مچھلی شہری متوفی ۱۲۶۹ھ نے فنون عقلیہ وریاضیہ حاصل کرنے کے بعد دہلی جا کر حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب سے حدیث پڑھی ، بعد میں امراؤ حکام سے منسلک ہوکر بڑی مقبولیت پائی ،اوراپنے خاندان والوں کی سفارش کر کے ان کو بڑے بڑے عہدے دلوائے ،اسی طرح اور بہت سے اہل علم وفضل کونوبانِ اودھ کے دور میں قدرومنزلت ملی۔

(۲)

ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی

اسلامی تاریخ میں بہت سے علماء اپنے علم وفضل اور شاندار علمی کارناموں کی وجہ سے بڑے بڑے القاب وخطابات سے یاد کئے گئے ہیں، مگر ان میں سے تین اقلیم علم ودانش کے بادشاہ قرار دیے گئے ہیں، ایک مشہور حنفی امام وفقیہ شیخ علاء الدین ابو بکر بن شیخ مسعود کاشانی متوفی ۵۸۷ھ صاحب البدائع والصنائع ان کا لقب ملک العلماء تھا، دوسرے امام ابو محمد اعز الدین عبد العزیز بن عبد السلام سلمی شافعی متوفی ۶۶۰ھ ان کو ان کے مجددانہ کارنامہ کی وجہ سے سلطان العلماء کا لقب دیا گیا، تیسرے ہندوستان کی مشہور عہد آفرین وعہد ساز شخصیت قاضی شہاب الدین دولت آبادی متوفی ۸۴۸ھ ان کو بھی ملک العلماء کے لقب سے ملقب کیا گیا۔

ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی علوم وفنون میں امامت وعبقریت کا مقام رکھتے تھے، اور شریعت وطریقت کے درمیان واسطۃ العِقد تھے، اور اپنے دور میں عالم اسلام کے مصنفین کبار میں شمار کیے جاتے تھے، ان کے علمی کمالات وخصوصیات کی وجہ سے ملک العلماء ان کے نام کا جز بن گیا۔

واقعہ یہ ہے کہ ملک العلماء اپنے علم کے تنوع میں عہد آفرین وانجمن ساز تھے، جنھوں نے جون پور کی شرقی سلطنت کے دور میں دیار پورب کے قریہ قریہ میں علم ومعرفت کی شمع فروزاں کی جس کی روشنی سے پورا ہندوستان منور ہوا،

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتو آں   ہر کجا می نگرم انجمنے ساختہ اند

شرقی سلطنت کے حدود یعنی صوبہ اودھ، صوبۂ الہ آباد، اور صوبۂ عظیم آباد میں بادشاہت تو سلطان ابراہیم شاہ شرقی کی تھی، مگر حکمرانی ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی تھی،

اس دور کے امراء وسلاطین اور علماء ومشائخ سب نے ان کی عبقریت کا اقرار کیا، اہل بصارت کی طرح اہل بصیرت نے ان کے علمی و دینی حسن و جمال کا اعتراف کیا، اور دانشوروں کی طرح دیدہ دروں نے ان کی جناب میں تشکر و امتنان کا ہدیہ اور ادب و احترام کا نذرانہ پیش کیا، ان کی شخصیت ہر طبقہ کے لئے پرکشش تھی پھر یہ عقیدت ان کے ساتھ ختم نہیں ہوگئی، بلکہ بعد کے تذکرہ نگاروں نے بھی ان کے ساتھ بڑی عقیدت ومحبت کا مظاہرہ کیا، اسی عقیدت کا مظہر یہ بھی ہے کہ ان کی وفات کے تقریباً ساڑھے پانچ سو سال کے بعد ان ہی کے دیار علم وفضل کا ایک بے بضاعت عقیدت مند اور عجب کیا کہ ان ہی کے سلسلہ درس اور تدریس کا ایک ادنیٰ طالب علم آج ان کی خدمت میں یہ گلہائے عقیدت پیش کر رہا ہے۔

(۱) ہمارے علم میں ملک العلماء قاضی القضاۃ شہاب الدین دولت آبادی کا سب سے قدیم تذکرہ لطائف اشرفی میں ہے، جو حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی متوفی ۸۰۸ھ کے ملفوظات وحالات کا مجموعہ ہے، اور جسے ان کے مرید خلیفہ شیخ نظام الدین غریب یمنی نے جمع کیا ہے، ملک العلماء سید صاحب کے اجلّ خلفاء میں ہیں اور شیخ نظام الدین ان کے معاصر اور خواجہ تاش ہیں، اس لئے لطائف اشرفی میں ملک العلماء کے جو علمی وروحانی حالات درج ہیں وہ نہایت مستند ومعتبر ہیں اندرانی قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب ملک العلماء کی زندگی میں لکھی گئی ہے، اس لئے بھی اس کا تذکرہ ہر اعتبار سے نہایت معتمد وموثّق ہے،

(۲) حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی متوفی ۹۴۵ھ نے انوار العیون فی اسرار المکنون میں جو کہ حضرت شیخ احمد عبد الحق ردولوی متوفی ۸۳۷ھ کے ملفوظات واحوال میں ہے، سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے دربار میں ملک العلماء اور شیخ احمد عبد الحق کی ملاقات کے ضمن میں نہایت شاندار الفاظ والقاب میں ملک العلماء کا تذکرہ ہے، ملک العلماء شیخ عبد القدوس کے جد مادری ہوتے ہیں ان کے دادا شیخ صفی الدین ردولوی شیخ ملک العلماء کے نواسے تھے،

(۳) محمد قاسم نے تاریخ فرشتہ سنہ تالیف ۹۹۸ھ میں آپکے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے، اس میں قاضی صاحب کے سلطان ابراہیم شرقی کے عقیدت مندانہ اور

جذباتی تعلقات کے ذکر کے ساتھ ان کی تصانیف کا ذکر بھی ہے، اور خاندانی حالات پر روشنی پڑتی ہے

(۴) حضرت مولانا شاہ عبد الحق محدث دہلوی متوفی ۱۰۵۲ھ کی کتاب اخبار الاخیار (سنہ تالیف ۹۹۹ھ) میں قاضی صاحب کا مستقل تذکرہ ہے، اور ان کے حالات سے زیادہ ان کی تصانیف کا تذکرہ و تعارف ہے، اور دوسرے اصحاب تراجم کے ضمن میں بھی قاضی صاحب کے بارے میں مفید باتیں ملتی ہیں، جن سے ان کی زندگی پر اچھی خاصی روشنی پڑتی ہے، یہ کتاب ہندوستان کے علماء و مشائخ کے حالات کا مستند ترین ماخذ ہے۔

(۵) اخبار الاصفیاء (قلمی) میں شیخ افضل محمد تمینی انصاری اکبر آبادی متوفی ۱۰۰۳ھ کے صاحبزادے شیخ عبد الصمد انصاریؒ نے قاضی صاحب کے ذاتی حالات مختصراً لکھے ہیں، اور ان کی کتاب بحر مواج اور مناقب السادات کے بارے میں تفصیل سے کام لیا ہے، اور شیخ محمد بن عیسی کے جونپوری کے تذکرہ میں قاضی صاحب اور مولانا فقیہ حیرتی کے درمیان ایک مباحثہ کا ذکر کیا ہے جو سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے دربار میں ہوا تھا۔

(۶) ملا کاتب چلپی متوفی ۱۰۶۷ھ نے کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون میں قاضی صاحب کی متعدد تصانیف اور انکی شروح حواشی کا ذکر کیا ہے، جن سے ان کی کتابوں کی شہرت و مقبولیت کا پتہ چلتا ہے۔

مذکورہ بالا چھ کتابیں قاضی صاحب کے حالات کا قدیم اور اصل ماخذ ہیں، بعد کی کتابوں میں ان کے بارے میں جو کچھ ملتا ہے وہ ان ہی کی کتابوں سے ماخوذ و منقول ہے، البتہ ان میں سے بعض کتابوں میں دوسرے تراجم کے سلسلہ میں قاضی صاحب اور ان کے متعلقین و متوسلین کے مزید حالات بھی ملتے ہیں، خاص طور سے (۷) تذکرۃ العلماء (۸) تذکرۃ علماء ہند (۹) نزہۃ الخواطر (۱۰) سبحۃ المرجان فی آثار الہندوستان (۱۱) مآثر الکرام (۱۲) مرآۃ الاسرار (قلمی (۱۳) مشکوۃ نبوۃ (۱۴) خزینۃ الاصفیاء (۱۵) تجلی نور اور (۱۶) برکات الاولیاء میں بھی قاضی صاحب کا ذکر ہے، مگر عام طور سے اس میں کوئی نئی بات نہیں ملتی ہے، صرف پرانی باتوں کو دہرایا گیا ہے، اس مضمون کی ترتیب کے سلسلہ میں مندرجہ بالا کتابیں ہمارے سامنے ہیں، اوپر کی چھ کتابیں اصل ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں، باقی معاون ہیں۔

علماء مشائخ معاصرین اور مورخین کی نظر میں

اقلیم علم وفن کے جس کج کلاہ کا تذکرہ ہونے والا ہے، اس کی شان وشوکت کا اندازہ ان لفظوں سے کیا جاسکتا ہے، جو اس کے بارے میں معاصرین اور بعد کے سوانح نگاروں کے زبان و قلم سے نکلے ہیں، اس سے قاضی صاحب کے علمی مرتبہ کا پتہ چلتا ہے۔ جس شاگرد کے بارے میں مولانا عبدالمقتدر دہلوی جیسے فاضلِ روزگار نے فخریہ انداز میں یہ کہا ہو، وہ آگے چل کر کیا ہوا ہوگا؟

پیش من طالب علمے می آید کہ پوست او علم و مغز او علم، و استخوان او علم است، و ازیں طالب علم قاضی شہاب الدین می خواست[1]	میرے سامنے ایک ایسا طالب علم آرہا ہے جس کا گوشت پوست اور مغز و استخوان علم ہی علم ہے اور اس سے مراد قاضی شہاب الدین ہیں

استادی شاگردی کی تاریخ میں یہ الفاظ یادگار ہیں اور رہیں گے۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ جس طالب علم کے ذوقِ طلب کا یہ حال تھا، بعد میں اس کا علمی مقام کیا رہا ہوگا۔

اس طالب علم کے مقامِ علم وفضل کا اعتراف اس کے شیخ و مرشد اور اپنے زمانہ کے مشہور روحانی بزرگ اور عالم و مصنف حضرت سید اشرف سمنانی متوفی ۸۰۸ھ نے ان گرانقدر الفاظ میں کیا ہے:۔

در ہندوستان ایں مقدار فضیلت در کسے کم دیدہ ایم[2]	ہم نے قاضی شہاب الدین جیسی فضیلت و بزرگی ہندوستان کے اندر کسی دوسرے میں کم دیکھی ہے،

ایک دوسرے موقع پر ان کی جامعیت کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں:۔

برادر اعزو ارشد، جامع العلوم قاضی شہاب الدین نور اللہ قلبہ بانوار الیقین۔	برادر اعزو ارشد جامع قاضی شہاب الدین کے قلب کو اللہ تعالیٰ ایمان و یقین کے انوار سے منور کرے۔

---

[1] اخبار الاخیار ذکر قاضی عبدالمقتدر ص ۱۴۸ مطبع مجتبائی دہلی قدیم [2] لطائف اشرفی ج ۲ ص ۱۰۶ نصرت المطابع دہلی

ایک جگہ ان کی علمی برتری کو اس انداز میں بیان فرمایا ہے:۔

ہر چند برادر قدوۂ علمائے روزگار روزبدۂ	مسلم ہے کہ میرے بھائی! آپ اس زمانہ کے علماء
فضلائے ہر دیار است [1]	کے پیشوا اور ہر مقام کے فضلاء کے خلاصہ ہیں۔

سید اشرف سمنانی کے خلیفہ و خادم اور قاضی صاحب کے برادرِ روحانی شیخ نظام الدین غریب یمنی نے اپنے اس معاصر عالم کو ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے جن سے ان کے علمی مقام و مرتبہ کا بھی اندازہ ہوتا ہے:۔

امام روزگار، وہمام دیار قاضی شہاب الدین	امام وقت، پیشوائے دیار، علمائے کبار کے
کہ مقتدائے علمائے فحول و پیشوائے	مقتداء اور اصول و فروع کے بلغاء و فصحاء
بلغائے فروع و اصول است ،	کے رہبر قاضی شہاب الدین۔

دوسری جگہ اس امام روزگار اور ہمام دیار کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے:

وے مہین خلفائے ولایت مآب، و بہترین	قاضی صاحب سید اشرف کے اجل خلفاء
ندمائے اصحاب اند، جامع بودہ میانِ علوم	اور افضل اصحاب میں سے ہیں وہ علوم
ظاہری و باطنی، صاحب معاملات	ظاہری و باطنی کے جامع و معاملات ایمانی و
یقینی و جامع واردات دینی شدہ بود،	ایقانی اور وارادات دینی و اسلامی کے نقطۂ
تشرع بسیار داشت، ریاضات	اتصال ہیں، شریعت کے معاملہ میں بہت
شدیدہ و مشاہدات جدیدہ کشید کہ	زیادہ بیدار ہیں، ریاضاتِ شدیدہ اور
اشرف خلافت و اجازت یافتہ [2]	مشاہداتِ جدیدہ میں اس قدر جدوجہد کی کہ
	اشرف ترین خلافت و اجازت پائی ہے۔

سید اشرف سمنانی کے ایک دوسرے مرید و خلیفہ اور قاضی صاحب کے معاصر اور برادر روحانی شیخ واحدی نے انکے اقلیم علم کی وسعت کا ذکر ایک قطعہ میں اس طرح کیا ہے۔

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۶۳ ذکر سید اشرف، [2] لطائف اشرفی ج ا ص ۴۱۰،

لشکرِ علم تو بہ تیغِ زباں   از عجم تا عرب گرفتہ دیار

چوں گرفتی عراقِ عربیت   فارسی را بہ واحدی بگزار

﴿ تیرے علم کا لشکرِ تیغِ بیان کے ساتھ عجم سے عرب تک کے تمام شہر و دیار میں پہونچا جب تم نے عربیت کے عراق کو اپنے قبضے میں لے لیا ہے تو فارسی کو واحدی کے لئے چھوڑ دو۔ ﴾

اس قطعہ میں شیخ واحدی نے غالباً حافظ شیرازی کے اس شعر کو پیش نظر رکھا ہے۔

عراق و پارس گرفتی بشعر خود حافظ   بیا کہ نوبتِ بغداد و وقتِ تبریز است

حضرت شیخ فتح اللہ اودھی متوفی ۸۲۱ھ نے قاضی صاحب کے علم و فضل کا یہ اعتراف کیا کہ اپنے مسترشد خاص شیخ محمد بن عیسیٰ جون پوری کو ظاہری علوم کی تحصیل و تکمیل کے لئے ان ہی کے پاس بھیجا، شاہ صاحب لکھتے ہیں۔

شیخ محمد بن عیسیٰ نے اپنے پیر شیخ فتح اللہ اودھی کے اشارہ پر ایک مدت تک ملک العلماء قاضی شہاب الدین کی شاگردی کی۔[۲]

قاضی صاحب کے بارے میں ان کے معاصرین کے خیالات اس کا ثبوت ہیں کہ ان کی نگاہ میں قاضی صاحب کا کیا مقام تھا۔ بعد کے علماء و فضلاء اور اہل نظر نے قاضی صاحب کی جلالتِ شان اور علمی جامعیت کا اعتراف کیا ہے، حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی متوفی ۹۴۴ھ نے ایک موقع پر گرانقدر خطابات والقابات سے یاد کیا ہے۔

صدر العلماء بدر الفضلاء استاد الشرق   مخدوم قاضی شہاب الدین نور اللہ مرقدہٗ

والغرب، عالم ربانی، نعمان ثانی، مخدوم   صدر العلماء، بدر الفضلاء، استاد الشرق

قاضی شہاب الدین لہریا نور اللہ مرقدہ۔[۳]   والغرب عالم ربانی اور نعمان ثانی تھے،

شیخ عبدالقدوسؒ حضرت امام اعظم ابو حنیفہ نعمان بن ثابت کی نسل سے تھے، اور قاضی صاحب شیخ عبدالقدوس کے پرنانا ہوتے ہیں۔

شاہ عبدالحق صاحب محدث دہلوی متوفی ۱۰۵۲ھ قاضی صاحب کے علم و فضل کے بارے

---

[۱] ایضاً ج ۲ ص ۱۰۶   [۲] اخبار الاخیار ص ۱۷۵،   [۳] انوار العیون ص ۳۴۳ گلزار محمدی لکھنؤ ۱۲۹۵ھ،

میں لکھتے ہیں۔

شہرت او صافش مستغنی است از شرح	ان کے اوصاف وکمال کی شہرت وناموری شرح بیان
اگر چہ درزمان او دانشمندان بودہ اند	سے مستغنی ہے،ان کے زمانہ میں ان کے شرکاء درس
کہ استادان و شریکان او بودہ ، اما	اوراساتذہ میں بہت سے علماء موجود تھے،مگر اللہ تعالی
شہرت و قبولے کہ حق تعالی ادرا عطا	نے جوشہرت وقبولیت قاضی صاحب کوعطا فرمائی تھی
کرد ہیچ کس رااہل زمان اونکرا۔[1]	،ان میں سے کسی کواس سے نہیں نوازا تھا،

شیخ عبدالصمد بن شیخ افضل محمد انصاری لکھتے ہیں:

صیتِ کمالات او و آوازہ دریافتش	ان کے کمالات کا شہرہ اور ان کے علم کا
برتر ومشہورتر ازان ست کہ نگاشتہ قلم	آوازہ اس سے بالاتر ہے کہ قلم کی رنگین
بدائعً نگار آید ، الحق در ہندوستان	بیانی کا مرہون منت ہو ، حق یہ ہے کہ
چنونے کم بظہور آمدہ ، دانش رسمی	ہندوستان میں قاضی صاحب جیسے کم علماء
راپیش مولانا خواجگی و قاضی عبد	پیدا ہوئے ہیں ، رسمی علوم مولانا خواجگی
المقتدر شریحی اندوختہ کاخ سخنوری	اور قاضی عبدالمقتدر سے حاصل کر کے اپنے
رااساس بلند نہاد، وگلشن علم را آب	علم کا قصر معلی تعمیر کیا ، اور گلشن علوم کو فطری
یاریٔ فطرت اعلی طراوت بخشیدہ بر	صلاحیت کی آبیاری سے تروتازگی بخشی اور
علماء روزگار چیرہ دست آمدہ۔[2]	اپنے زمانہ کے علماء پر فوقیت لے گئے۔

علامہ غلام علی آزاد بلگرامی متوفی ۱۲۵۰ھ نے سبحۃ المرجان میں اپنے محتاط اور جچے تلے الفاظ میں قاضی صاحب کے بارے میں لکھا ہے۔

ففاق علی اقرانہ و سبق	اپنے اقران و معاصرین پر فائق ہوکر اپنے
اخوانہ فزین مسنداً	تمام دوستوں سے آگے بڑھ گئے اور درس و
لافادۃوفاق البرجیس فی	افادہ کی مسند کو زینت بخشی اور سعادت وفیض

[1] اخبارالاخیار ص ۱۷۵ [2] اخبارالاصفیاء ورق ۶۰ قلمی،

افاضۃ السعادۃ ا ھ — پہونچانے میں برجیس پر بھی سبقت لے گئے۔

اور مآثر الکرام میں لکھا ہے:

عمدۂ دانشمندانِ ہنداست وشہرۂ بلاد عرب و عجم..... اگر چہ دران عہدِ دانش مندانِ دیگر نیز فائق عصر بودند، اما طالع شہرتے کہ او یافت احدے رامسیّر نہ گشت، وآثارے کہ ازو برصحیفۂ روزگار باقی ماند از دیگرے پیدا نیست ۲	وہ دانشورانِ ہند میں قابل اعتماد ہیں ان کا شہرہ عرب وعجم میں ہے ان کے زمانہ میں اگر دوسرے اہل علم لائق و فائق تھے مگر جو شہرت ان کو ملی کسی دوسرے کو نہیں مل سکی اور ان کے جو علمی آثار باقی رہے ان کی مثال دوسرے اہل علم کے یہاں نہیں ملتی ہے،

خزینۃ الاصفیاء میں ہے:۔

درعلوم ظاہری طاق و برموزِ باطنی شہرۂ آفاق بود، قلم وزبان را طاقت آں نیست کہ تحریر و تقریر او صافش پرواز و در عہد خود قبولے عظیم یافت۔۳	آپ علوم ظاہری میں مردِ زمانہ اور رموزِ باطنی میں شہرۂ آفاق تھے، زبان وقلم میں آپ کے اوصاف وکمالات کے لکھنے اور بیان کرنے کی طاقت نہیں ہے، اپنے زمانہ میں عظیم مقبولیت کے مالک تھے۔

صاحبِ مشکوٰۃ النبوت نے قاضی صاحب کے لئے یہ الفاظ استعمال کئے ہیں۔

آن مردے آزادے، آں فرداونادے مقتدائے وقت قاضی شہاب الدین است رحمۃ اللہ علیہ گویند شہرتے وقبولیتے کہ حق تعالیٰ اوراعطا کردہ ہیچ کس راازاہل زمانِ اونکرد ۴	وہ مردآزادوفردزمانہ، مقتدائے وقت قاضی شہاب الدین رحمۃ اللہ علیہ ہیں کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو مقبولیت ان کو فرمائی تھی ان کے اہل زمانہ میں کسی کو نہیں دی تھی۔

مولانا خیر الدین محمد جونپوری نے تذکرۃ العلماء (مصنفہ ۱۲۱۶) میں قاضی صاحب

---

۱ سبحۃ المرجان ص ۳۹ طبع ممبئی۔ ۲ مآثر الکرام ج ۱ ص ۱۸۸ مطبع مفید عام آگرہ ۱۳۲۸ھ
۳ خزینۃ الاصفیاء ج ۲ ص ۳۹۰ مطبع ثمر ہند لکھنو ۴ مشکوٰۃ النبوۃ ص ۲۲۱ قلمی

کے بارے میں لکھا ہے:

از اکابر طبقہ سلطان ابراہیم شرقی یکے قاضی شہاب الدین دولت آبادی است مقتدائے فضلائے، و پیشوائے علماء، معدنِ عقلیات، مخزن نقلیات، مسند دانشمندان ہندو شہرۂ بلاد عرب و عجم بود۔[1]	سلطان ابراہیم شرقی کے دور کے اکابر علماء میں سے ایک قاضی شہاب الدین دولت آبادی ہیں جو فضلاء کے مقتدیٰ، علماء کے پیشواء، علوم عقلیہ کی کان، علوم نقلیہ کا خزانہ، ہندوستان کے ارباب علم و دانش کے لئے سند اور عرب و عجم میں مشہور تھے۔

صاحبِ تجلی نور شاہ عبدالحق صاحب کے الفاظ نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

پیش او جملہ علوم حاضر، داد بجمیعِ علوم ماہر بود ازیں جہت ملک العلماء لقب گشت[2]	ان کے سامنے تمام علوم متحضر ہوتے تھے اور وہ تمام علوم میں ماہر تھے اسی لئے ان کو ملک العلماء کا لقب دیا گیا۔

سب سے آخر میں صاحب نزہۃ الخواطر نے ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

الشیخ الإمام الکبیر العلامة قاضی القضاة ملك العلماء ....کان غایةً فی الذکاء وسیلان الذهن و سرعة الادراك و قوة الحفظ وشدة الانهماك فی المطالعة والنظر فی الکتب لاتکاد نفسه تشبع من العلم والعلم ولا تروی من المطالعة و لا تمل من الاشتغال ولا تکل من البحث[3]۔	شیخ امام کبیر، علامہ قاضی القضاۃ ملک العلماء ذکاوت و تیزی ذہن میں درجۂ کمال رکھتے تھے۔ سرعت فہم، قوت حافظہ مطالعہ میں انہماک اور کتب بینی سے ان کو سیری و سیرابی نہیں ہوتی تھی، اور نہ علمی مشاغل اور بحث و نظر سے کبھی تھکتے اور گھبراتے تھے۔

---

[1] تذکرۃ العلماء ص۱۲ مطبوعہ الطافی پریس کلکتہ ۱۳۵۲ھ [2] تجلی نور ج۲ ص۲۴۔

[3] نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۱۹

آئندہ سطور میں اسی قدوۂ علماء روزگار، زبدۂ فضلائے ہر دیار، امام روزگار، ہمام دیار، جامعِ علوم ظاہری و باطنی صدر العلماء، بدر الفضلاء، استاذ الشرق والغرب، عالم ربّانی، نعمانی ثانی علوم ظاہری میں طاق، رموز باطنی میں شہرۂ آفاق مقتدائے وقت، مقبولِ خاص و عام، ماہرِ جملہ علوم، مرشد محقق، مصنف، ملک العلماء قاضی القضاۃ، مخدوم شیخ شہاب الدین دولت آبادی کا ذکر مقصود ہے، جس نے مدرسہ کی شورش میں خانقاہ کا سکون اور خانقاہ کی خاموشی میں مدرسہ کا ہنگامہ برپا کیا۔

نام ونسب اور آبائی وطن

آپ کا نام احمد، لقب شہاب الدین اور والد کا نام عمر، لقب شمس الدین ہے۔ والد کے لقب سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے مشاہیر علماء میں تھے۔ حیرت کی بات ہے کہ ہندوستان کے ملک العلماء کا نام ونسب بھی تذکرہ نگاروں نے پورا نہیں لکھا ہے، اور کسی کتاب میں سلسلۂ نسب نہیں ملتا، کشف الظنون میں ہے۔ شہاب الدین احمد بن شمس الدین بن عمر الہندی الدولۃ آبادی'' اور دوسری جگہ یوں ہے شہاب الدین احمد بن عمر [۱] ''سبحۃ المرجان اور مآثر الکرام میں ہے۔'' شہاب الدین بن شمس الدین بن عمر الزاولی الدولتہ آبادی، [۲] اخبار الاصفیاء میں یوں ہے۔'' شہاب الدین بن عمر الزاولی الدولت آبادی الغزنوی'' [۳] اور نزہۃ الخواطر میں ہے،'' احمد بن عمر الزاولی، قاضی القضاۃ، ملک العلماء شہاب الدین بن شمس الدین الدولۃ آبادی۔ [۴] ہماری تحقیق میں آپ کا نام شہاب الدین احمد بن شمس الدین عمر ہے۔ بعض کتابوں میں جو شمس الدین کے بعد'' بن عمر'' ہے اسے صرف'' عمر'' ہونا چاہئے۔

زاولی اور غزنوی کی نسبت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا آبائی وطن زابلستان کا شہر غزنین تھا، تاریخ فرشتہ میں اس کی تصریح موجود ہے، اصل او راز غزنین ست'' [۵] زابل یا زابلستان ایک وسیع وعریض علاقہ کا نام ہے جو بلخ اور طخارستان کے جنوب میں واقع ہے، اس کو زابل یا زابلستان

---

[۱] ج ا ص ۸۶ و ۲۵۰ طبع انقرہ [۲] ص ۳۹ و ج ا ص ۱۸۸، [۳] ورق ۲۰

[۴] ج ۳ ص ۲۰ [۵] ج ۲ ص ۳۰۶،

بھی کہتے تھے، [1] غزنین یا غزنہ اسی کا دارالسلطنت تھا۔ غزنین اپنے زمانہ کا سب سے بڑا شہر تھا، جو خراسان اور ہندوستان کے درمیان حد فاصل تھا،[2] آج کل یہ شہر افغانستان میں واقع ہے۔ زاولی اسی زابلستان یا زابل کی طرف نسبت ہے، جس میں باء کو واؤ سے بدل دیا گیا ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہؓ نے ۳۰ھ میں سجستان کی فتوحات کے سلسلہ میں مقام بست کے بعد زابل کو صلح و معاہدہ کے ذریعہ فتح کیا تھا، مگر معاہدہ کے شرائط نرم تھے۔ اس لئے تھوڑے ہی دنوں کے بعد مقامی باشندوں نے بغاوت اور سرکشی اختیار کی تو حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہؓ نے رخج کی فتح کے بعد اسے دوبارہ فتح کیا، اس مرتبہ بہت سے قیدی مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔[3] اس کے بعد زابلستان بھی عجم کے دیگر ممالک کی طرح اسلامی قلمرو میں آ گیا، اس کا مرکزی شہر غزنین سلطان محمود غزنوی اور دوسرے سلاطین غزنویہ کے دور میں بغداد و قرطبہ کی ہمسری کرتا تھا، جہاں عالمِ اسلام کے ہر طبقہ کے باکمال علماء و فضلاء موجود تھے، بغداد کے بعد غزنین مدتوں ہندوستان میں اسلامی علوم و فنون کا مورد و مصدر رہا، اور جہاں کے بہت سے باکمال خاندان اور افراد نے یہاں آ کر دہلی کو دوسرا غزنین بنا دیا۔

آباء و اجداد غزنین سے دہلی میں

اسی غزنین سے ہندوستان آنے والوں میں ملک العلماء قاضی شہاب الدین کا خاندان بھی تھا، یہ خاندان کس زمانہ میں یہاں آیا؟ معلوم نہیں ہو سکا، سلطان شہاب الدین غوری نے قطب الدین ایبک کو ہندوستان میں اپنا نائب مقرر کیا، اس کے بعد سے غزنین اور دہلی کا علمی اور ثقافتی رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ اور وہاں کے ارباب علم و فن یہاں آنا شروع ہو گئے تھے۔ ہو سکتا ہے اسی دور میں قاضی صاحب کے آباء و اجداد بھی یہاں آئے ہوں۔ یا اسکے بعد اس پُر آشوب دور میں

---

[1] معجم البلدان ج ۴ ص ۳۶ طبع مصر [2] معجم البلدان ج ۶ ص ۲۸۹۔

[3] فتح البلدان ص ۳۸۶ و ۳۸۸ طبع مصر

ہزاروں خاندان کی طرح اس خاندان نے بھی غزنین کو خیر باد کہا ہو جب کہ وسط ایشیاء کا امن وامان مغلوں کی غارت گری سے ختم ہو چکا تھا۔ چنگیزی فتنہ کی ابتداء ساتویں صدی کے شروع میں ۶۱۶ھ سے ہوئی اور ۶۵۰ھ کے حدود تک پورا عالم اسلام اس آگ میں جلتا رہا مگر یہ آگ سندھ تک آ کر رک گئی تھی ۔ اور ہندوستان اس سے محفوظ رہا تھا، غالب گمان ہے کہ اسی پر آشوب زمانہ میں یہ خاندان بھی دہلی میں آ کر آباد ہو گیا تھا۔ اور قاضی صاحب کے تمام تذکرہ نگاروں کی تصریح کے مطابق ان کی پیدائش اور نشو ونما دولت آباد اور دہلی میں ہوئی، حتی کہ موجودہ صدی کے تذکرہ نگار صاحب ''تذکرۂ علمائے ہند'' نے بھی لکھا ہے کہ '' دردولت آباد متولد شد'' (ص ۸۸) مگر معلوم نہیں کیسے انھوں نے قاضی صاحب کے نواسے شیخ صفی الدین بن شیخ نصیر الدین کے ذکر میں لکھ دیا ہے کہ قاضی صاحب بذات خود غزنین سے ہندوستان آئے ۔

بالجملہ شیخ نظام الدین جد صاحب ترجمہ با پسر خود نصیر الدین ازمرز بوم غزنین باتنے چند در حادثہ ہلاکوں خاں بعہد دولت علاء الدین خلجی رو بہ ہندوستان نہادہ مدتے در دہلی قیام ورزید و در فترات مشکور قاضی شہاب الدین بن شمس الدین دولت آبادی ہم ازاں دیار وارد دہلی گشت و بزمرۂ تلامذہ قاضی عبد المقتدر مباہی گردید[1]

شیخ نظام الدین اپنے صاحبزادے اور دوسرے چند لوگوں کے ساتھ ہلاکو خاں کے فتنہ میں غزنین سے ہندوستان چلے آئے یہ علاء الدین خلجی کا عہد سلطنت تھا، اور ایک مدت تک دہلی میں قیام کیا، ان ہی حوادث میں قاضی شہاب الدین بن شمس الدین دولت آبادی بھی اس دیار سے دہلی آئے اور قاضی عبد المقتدر کے شاگردوں کے زمرہ میں داخل ہو گئے۔

جو تمام تذکرہ نویسوں کے بیانات اور خود مصنف تذکرۂ علمائے ہند کی تصریح کے بھی خلاف ہے، صحیح یہ ہے کہ قاضی شہاب الدین نہیں بلکہ ان کے آباء واجداد میں سے کوئی بزرگ ہندوستان آئے تھے اور قاضی صاحب کی ولادت اور نشو نما یہیں دولت آباد میں ہوئی تھی، اس

[1] تذکرۂ علمائے ہند ص ۹۶ طبع نول کشور۔

بارے میں دو رائیں ہیں کہ یہ مقام دہلی سے متعلق تھا یا دکن کا دولت آباد تھا۔ پہلا قول یہ ہے کہ دولت آباد دکن مراد ہے، تاریخ فرشتہ میں تصریح ہے کہ ''درد دولت آباد دکن نشو ونما یافت'' (ج ۲ص ۳۰۶) دوسرا قول یہ ہے کہ دولت آباد دہلی میں پیدا ہوئے اخبار الاصفیاء میں ہے کہ ''زادگاہ او دولت آباد دہلی ست'' (ورق ۶۰) سبحۃ المرجان میں ہے ''ولد القاضی بدولت آباد دہلی (ص ۳۹) مآثر الکرام میں ہے ''مولد او دولت آباد دہلی است (ج ۱، ۱۸۸ص) نزہۃ الخواطر میں یہی ہے (ج ۳ص ۲۰) تذکرۂ علمائے ہند میں صرف دولت آباد ہے (ص ۸۸) یہ عجیب بات ہے کہ قاضی صاحب کے کسی تذکرہ نویس نے ان کی نسبت دہلی اور جونپور نہیں لکھی ہے، حالانکہ ان کی پوری زندگی ان ہی دونوں مقامات میں گزری ہے۔

سنہ ولادت کسی کتاب میں درج نہیں ہے، اور نہ اس کی طرف کوئی اشارہ ملتا ہے، البتہ تذکرہ علمائے ہند (ص ۷) اور نزہۃ الخواطر (ج ۳ص ۳۱) میں ہے کہ قاضی صاحب کے نواسے شیخ صفی الدین کے صاحبزادے شیخ ابوالمکارم اسمٰعیل کی ولادت ۱۲ ربیع الثانی ۸۹۷ھ میں ہوئی۔ اگر شیخ ابوالمکارم اسمٰعیل اپنے والدین کی پہلی اولاد تھے تو ان کے والد شیخ صفی الدین کے نانا قاضی شہاب الدین کی عمر ۸۹۷ھ میں کم وبیش چالیس سال رہی ہوگی، اس حساب و اندازہ سے خود قاضی صاحب کی ولادت حدود ۸۵۰ھ میں ہوئی ہوگی۔

پیدائش اور تعلیم

قاضی صاحب کی پیدائش بہر حال آٹھویں صدی کے وسط میں ہوئی تھی۔ اس زمانہ میں دہلی میں تغلق خاندان حکمراں تھا، مگر اندرونی بدانتظامی کی وجہ سے ملک میں جگہ جگہ نئی طاقتیں سر اٹھا رہی تھیں، چنانچہ ۷۴۸ھ میں دکن میں بہمنی سلطنت کا قیام ہوا ۷۹۳ھ میں سلاطین گجرات نے اپنی حکومت کھڑی کر لی، ۷۸۴ھ میں جونپور میں شاہان شرقیہ نے شرقی سلطنت قائم کر لی، اسی طرح ۷۷۱ھ میں کشمیر میں الگ حکومت بن گئی، اور ہندوستان میں یہ ابتری پھیلی ہوئی تھی کہ وسطِ ایشیا سے ۷۷۱ھ میں امیر تیمور گورگاں کی فتوحات کا ہلاکت خیز سیلاب امنڈا اور دیکھتے ہی دیکھتے سمرقند،

ماوراء النہر، ترکستان، خوارزم، کاشغر، بلخ، خراسان، ماژندران، طبرستان، غزنین، استرآباد وغیرہ میں تباہی مچاتا ہوا شام وحلب میں داخل ہو گیا، ۸۰۱ھ میں یہ سیلاب سندھ اور پنجاب کی طرف بڑھا، اور قتل غارت کرتا ہوا۔ جمادی الاولیٰ ۸۰۱ھ میں دہلی میں پہونچ گیا اور امیر تیمور نے دہلی میں قتل وغارت کا ایسا بازار گرم کیا کہ سلطان ناصر الدین اس کی تاب نہ لاکر گجرات چلا گیا اور اس کے وزیر اقبال خان نے برن میں پناہ لی۔

اس پر آشوب دور میں بھی دہلی کی علمی و دینی رونق بدستور قائم رہی دانشوروں کی تعلیم گاہیں اور مشائخ کی خانقاہیں پوری دل جمعی کے ساتھ اپنے کام میں مصروف تھیں مگر ۸۰۱ھ میں تیمور کی تباہ کاریوں سے یہ مدرسے بھی ویران اور خانقاہیں سونی ہوگئیں، دہلی کی علمی و دینی اور روحانی محفلیں اجڑ اجڑ کر جونپور، گجرات، دکن اور کشمیر وغیرہ میں جمنے لگیں اور علماء وفضلاء اور مشائخ قافلہ درقافلہ دہلی سے باہر جانے لگے اسی پُر آشوب زمانہ میں قاضی صاحب نے آنکھ کھولی اور دہلی میں نشو ونما اور تعلیم پائی۔

دہلی میں اودھ کے علماء ومشائخ

آپ کے بچپن اور طالب علمی کے زمانہ میں اگر چہ دہلی کا امن وامان وسکون واطمینان خواب وخیال ہو رہا تھا۔ پھر بھی وہاں ہر علم وفن کے سر آمدگانِ روزگار موجود تھے خاص طور سے دیار پورب کے اودھی علماء مشائخ دہلی میں علمی و روحانی فضا قائم کیے ہوئے تھے، اور کفرستان اودھ کے ان ایمانی چراغوں سے شہر دہلی کے بام و در روشن تھے، قاضی صاحب نے ان ہی علماء ومشائخ کے سلسلہ تلمذ میں داخل ہو کر ان سے اکتساب فیض کیا، اس وقت شیخ الاسلام فرید الدین شافعی اودھی کے تلامذہ اور تلامذہ کے تلامذہ دہلی کی مسندِ درس وتدریس اور بزم ارشاد وتلقین سے علوم ومعارف کی سوغات تقسیم کر رہے تھے، ان ہی بزرگوں سے قاضی صاحب نے تحصیل وتکمیل کی یہاں ان کا مختصر ذکر مناسب ہوگا۔

شیخ الاسلام فرید الدین اودھی آٹھویں صدی میں اودھ کے شیخ الاسلام تھے، ان کا شمار اس

دور کے نامور علماء میں ہوتا تھا، اودھ سے دہلی تک ان کے علم و فضل کی دھوم تھی، اور تشنگانِ علم و معرفت اس آبِ حیات سے سیراب ہو رہے تھے، ان کے تلامذہ و مسترشدین میں اودھ کے بزرگ شیخ شمس الدین محمد بن یحیٰ اودھ اور شیخ علاء الدین نیلی اودھی خاص طور سے شہرت رکھتے تھے۔

شیخ شمس الدین محمد بن یحیٰ نے شیخ الاسلام فریدالدین سے اکتسابِ فیض کرنے کے ساتھ دہلی میں مولانا ظہیرالدین بھکری کی شاگردی اختیار کی اور پھر وہیں پوری زندگی درس و تدریس، ارشاد و تلقین اور عبادت و ریاضت میں گزار دی، حضرت نظام الدین اولیاء کے اجلّ خلفاء میں سے تھے۔ ان کی تصانیف میں شمس المعارف اور شرح مشارق الانوار کے نام ملتے ہیں ان کی علمیت و مقبولیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ:

از مشاہیر علماء دہلی گشت، و بیشتر مردم شہر در تلمذ بوے انتساب می کردند و بآن نسبت مفتخر و مبتہج بودند[1]

شیخ شمس الدین دہلی کے مشاہیر علماء میں سے ہو گئے اور شہر دہلی کے اکثر علماء نے ان سے نسبت تلمذ کر کے اسے اپنے فخر و خوشی کا باعث سمجھا۔

زندگی بھر مجرد رہے، علماء و مشائخ دونوں ان کا احترام کرتے تھے، ان کے شاگرد خاص شیخ نصیرالدین محمود اودھی نے ان کی علمیت کا اظہار اس شعر میں کیا ہے۔

سألت العلم: من احیاك حقا — فقال العلمُ: شمس الدین یحیٰ

﴿ میں نے علم سے پوچھا کہ تجھ کو کس نے زندہ کیا تو علم نے جواب دیا کہ شمس الدین یحیٰ نے ﴾

شیخ شمس الدین سلطان محمد بن تغلق کے عہد ۷۴۷ھ میں دہلی میں فوت ہوئے، ان کے تلامذہ میں شیخ نصیرالدین محمود بن یحیٰ بن عبداللطیف اودھی علم و معرفت کی بزم میں ”چراغ دہلی“ کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔ بڑے پایہ کے عالم و مدرس ہیں، قاضی عبدالمقتدر سے ابتدائی تعلیم پائی تھی، پھر شیخ شمس الدین محمد بن یحیٰ اودھی سے علمی و روحانی فیض و برکات حاصل کر کے دہلی میں مولانا عبدالکریم شروانی اور مولانا افتخار الدین گیلانی کی شاگردی اختیار کی اور چالیس سال کی عمر میں اودھ سے دہلی چلے گئے، اور حضرت نظام الدین اولیاء سے خلافت حاصل کی۔ شیخ نصیرالدین اور ان کے تلامذہ علوم شرعیہ کی تعلیم و تدریس میں خاص شہرت رکھتے تھے، ان کی اس

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۸۶۔

خصوصیت کا ذکر شاہ عبدالحق صاحب نے قاضی عبدالمقتدر کے حال میں کیا ہے۔

''وہ ہمیشہ درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے، اور شیخ نصیر الدین محمود اور ان کے اکثر خلفاء کا یہی طریقہ تھا، وہ طالب علموں کو علم میں مشغولیت اور شریعت کی حفاظت اور پاسداری کی تاکید کیا کرتے تھے، ان کا قول تھا کہ ایک شرعی مسئلہ میں غور و فکر کرنا ایسی ہزار رکعت نفل نماز سے افضل ہے جس میں شائبۂ ریا ہو۔[1]

شیخ نصیر الدین ۷۵۷ھ میں فوت ہوئے ان کے تلامذہ میں قاضی عبدالمقتدر شریحی کندی، مولانا خواجگی، شیخ محمد بن یوسف گیسودراز، شیخ علاء الدین سندیلوی، اور شیخ علاء الدین اندی وغیرہ ہیں ان میں قاضی عبدالمقتدر اور مولانا خواجگی دونوں بزرگ قاضی شہاب الدین کے اساتذہ و شیوخ میں ہیں۔

مولانا عبدالمقتدر بن رکن الدین شریحی کندی تھانیسر میں پیدا ہوئے اور دہلی میں پروان چڑھے انھوں نے شیخ الاسلام فرید الدین اودھی کے خرمنِ علم و فضل سے خوشہ چینی کی اور ان کے تلمیذ رشید شیخ شمس الدین محمد بن یحیٰ اودھی سے ابتدائی کتب درسیہ پڑھیں، جس زمانہ میں قاضی عبدالمقتدر ان سے تعلیم حاصل کررہے تھے، ان کے تلمیذ شیخ نصیر الدین محمود اودھی کی خدمت میں آیا جایا کرتے تھے اور بعض علمی مسائل پر ان سے گفتگو کرتے تھے جس سے شیخ نصیر الدین کو قاضی عبد المقتدر کی جودت طبع اور علمی صلاحیت و قابلیت کا اندازہ ہوا، اور انھوں نے ان کو تحصیل علم کی طرف خصوصی توجہ دلائی بعد میں قاضی عبدالمقتدر نے ان سے تفسیر، کشاف اور اصول بزدوی پڑھی، اور ان ہی کی بیعت و خلافت سے اپنی روحانی بزم سجائی، قاضی عبدالمقتدر اپنے دور میں دہلی کی جامع ترین شخصیت تھے، علومِ نقلیہ اور عقلیہ کے ماہر تھے، ادب، فصاحت و بلاغت اور جودت طبع میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے، ان کا قصیدہ نعتیہ لامیہ جو قصیدۂ الامیۃ العجم کے معارضہ میں ہے، ان کی قادر الکلامی، فصاحت، بلاغت، ادبیت اور شاعری کے ذوق لطیف پر شاہد عدل ہے جس کے دو ابتدائی اشعار یہ ہیں:۔

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۴۸،

یا سائق الظعن فی الاسحار والاصل سلّم علی دار سلمی وابک ثم سل
عن الظباء التی من دابہا ابداً صید الاسود بحسن الدلّ والنجل

قاضی عبدالمقتدر نے اپنے استاد کے طریقہ پر پوری زندگی علوم شرعیہ اور فنون ادبیہ و عقلیہ کی تدریس میں بسر کی اور ۷۹۱ھ میں دہلی میں فوت ہوئے، قاضی شہاب الدین کو ان کی نگاہ کیمیا اثر نے ملک العلماء بننے کی استعداد بخشی اور ان کے دوسرے اساتذہ وشیوخ کے مقابلہ میں قاضی عبدالمقتدر نے ان پر خاص توجہ کی۔

شیخ نصیر الدین اودھی کے دوسرے شاگرد وخلیفہ مولانا خواجگی دہلوی ہیں جو قاضی صاحب کے دوسرے مربی ومرشد اور معلم ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ قاضی صاحب کی شخصیت سازی میں ان دونوں استاذوں کی توجہ نے بڑا کام کیا اس میں کوئی تیسرا نظر نہیں آتا۔ مولانا خواجگی نے دہلی کی علمی فضا میں آنکھ کھولی، اور شیخ نصیر الدین سے فیض اٹھایا، اور مولانا معین الدین عمرانی سے بھی تعلیم حاصل کر کے جو اپنے وقت میں فقہ، اصول فقہ، نحو، عربیت، علم کلام، منطق اور فلسفہ میں دہلی کے مشہور عالم و مدرس مانے جاتے تھے۔ فراغت کے بعد اپنے استاد و شیخ نصیر الدین اور انکے بزرگوں کے طریقہ پر درس وتدریس میں مشغول ہوگئے، اور اسی میں دہلی میں پوری زندگی بسر کردی اور آخر میں تیموری فتنہ میں دہلی کی تباہی سے پہلے ہی کالپی چلے گئے، اور وہیں ۸۰۹ھ میں فوت ہوئے۔ اس سفر میں قاضی شہاب الدین بھی ان کے ساتھ تھے، مگر کچھ دنوں کے بعد انھوں نے جونپور کا رخ کیا۔

قاضی صاحب کے اساتذہ میں صرف مولانا عبدالمقتدر اور مولانا خواجگی کے نام لئے جاتے ہیں، یہ دونوں شیخ نصیر الدین محمود اودھیؒ چراغ دہلی کے واسطہ سے شیخ الاسلام فرید الدین اودھی اور ان کے تلمیذِ خاص شیخ شمس الدین اودھی کے علمی وروحانی سلسلہ کے ترجمان اور نمائندے تھے، نیز قاضی صاحب مولانا خواجگی کے اجل خلفاء میں سے رتھے، اس اودھی سلسلۂ علم ومعرفت کی وجہ یہ تھی کہ اس میں علوم شرعیہ اور فنون نقلیہ وعقلیہ کا رواج عام تھا، اور اس کے مشائخ وعلماء درس وتدریس کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف کی خدمات بھی انجام دیتے تھے، اس لئے قاضی صاحب پر

بھی یہی رنگ غالب ہوا، اور انھوں نے مشیخت سے زیادہ علمیت کے انداز میں زندگی بسر کی ۸۰۱ھ کے بعد جب جون پور آئے تو یہاں سید اشرف جہانگیر سمنانی متوفی ۸۰۸ھ کی صحبت و خلافت نصیب ہوئی ان میں بھی علم و معرفت دونوں کا اجتماع تھا، لیکن علمیت کے مقابلہ میں مشیخت کا رنگ غالب تھا، علوم اسلامیہ کے مختلف موضوعات پر ان کی تصانیف ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ محدث، مفسر، فقیہ، مفتی، مورخ اور علوم عقلیہ کے بھی بڑے عالم تھے، اس کی تفصیل بعد میں آئے گی۔

مولانا خواجگی اور قاضی عبدالمقتدر سے تلمذ

قاضی شہاب الدین نے سب سے پہلے مولانا عبدالمقتدر کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، استاذ کی پہلی ہی نگاہِ کیمیا اثر نے شاگرد کے مسِ خام کو کندن بنا دیا، وہ اپنے اس شاگرد کے علمی ذوق وشوق، طلب و جستجو اور قابلیت و استعداد کو فخریہ انداز میں بیان کرتے تھے۔

پیش من طالب علمے می آید کہ پوست او علم و	میرے پاس ایک ایسا طالب علم آ رہا ہے
مغز او علم، و استخوان او علم است وازیں	جس کا چمڑا، ہڈی اور مغز سب علم ہی علم ہے
طالب علم قاضی شہاب الدین را علیہ	اور اس سے ان کی مراد قاضی شہاب الدین
الرحمۃ می خواست ۱	تھے۔

استاذ کے ان تاثرات سے شاگرد کی علمی لگن کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، اس بنا پر شفیق استاد ہونہار شاگرد کی تعلیم کے ساتھ ان کی تربیت کا بھی پورا خیال رکھتے تھے، اس سلسلہ میں اخبار الاخیار نے مناقب الصدیقین کے حوالہ سے یہ واقعہ نقل کیا ہے، قاضی شہاب الدین کو کہیں سے تھوڑا سا سونا مل گیا، جسے وہ بحفاظت گھر لے آئے، اور تنہائی میں جا کر اپنی والدہ سے کہا کہ اسے کہیں گھر میں اندر ہی دفن کر دینا چاہیے، مولانا عبدالمقتدر کو اس واقعہ کی خبر لگ گئی، چنانچہ جب قاضی صاحب درس میں حاضر ہوئے تو ان سے فرمایا۔

---

۱ اخبار الاخیار ص ۱۹۱ ذکر قاضی عبدالمقتدر، و مآثر الکرام ج ۱ ص ۱۸۸۔

شما در خیال گور کر دن زر ید یا علم کجا — تم سونا دفن کرنے کے خیال میں ہو بھلا علم
پردازید؟[1] — کے ساتھ یہ کیسے نبھ سکتا ہے۔

قاضی صاحب کی طالب علمی کے زمانہ کے یہی دو واقعات ملتے ہیں جن سے طلب علم میں ان کے انہماک کا اندازہ ہوتا ہے، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ان کے معاشی حالات اچھے نہ تھے۔ اس واقعہ کے سلسلہ میں ان کی والدہ ماجدہ کا ذکر آ گیا ہے، مگر والد ماجد کا ذکر نہیں ملتا، یہ بھی معلوم نہیں کہ اپنے ہونہار فرزند کی تعلیم و تربیت میں ان کا کتنا ہاتھ تھا، اور وہ اس وقت بقید حیات بھی تھے یا نہیں؟

فراغت کے بعد دہلی میں تعلیم و تدریس

قاضی صاحب نے تحصیل و تکمیل کے بعد دہلی میں کس قسم کی زندگی بسر کی؟ اس کے ذکر سے بھی کتابیں خاموش ہیں، مگر قرائن اور واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے تعلیمی و تدریسی مشغلہ اختیار کیا تھا، اور ان کے درس سے کئی نامور شاگرد پیدا ہوئے، جن میں ان کے تین نواسے شیخ صفی الدین، شیخ فخر الدین اور شیخ رضی الدین مشہور ہیں، ان میں سے دو نے قیام دہلی ہی کے زمانہ میں شہرت و ناموری حاصل کر لی تھی، شیخ رضی الدین ردولی میں عہدۂ قضاء پر فائز ہوئے اور شیخ صفی الدین ردولی آ کر سید اشرف جہانگیر سمنانی کے مرید و خلیفہ ہوئے، اور اپنے صاحبزادے ابو المکارم اسمٰعیل کو بھی جو ۱۲؍ ربیع الثانی ۸۹۷ھ کو ردولی میں پیدا ہوئے تھے، سید اشرف جہانگیر سمنانی کی ارادت میں دے دیا۔

ہمارا یہ دعویٰ عام تذکرہ نگاروں کے بیان کے خلاف ہے، اس لئے اس کے ثبوت کے لئے کسی قدر تفصیل کی ضرورت ہے۔ تذکرہ علمائے ہند میں شیخ صفی الدین بن شیخ نصیرلدین بن نظام الدین کے حال میں ہے کہ جب دہلی میں مغلوں کا فتنہ شروع ہوا تو بعہد سلطان ابراہیم شاہ شرقی قاضی شہاب الدین اور شیخ نظام الدین دہلی سے جونپور چلے آئے، قاضی صاحب کی ایک دختر

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۴۱

تھی جس کا نکاح شیخ نصیر الدین بن نظام الدین سے کر دیا۔ اس سے تین لڑکے پیدا ہوئے، صفی الدین، فخر الدین اور رضی الدین اور سب کے سب اپنے نانا قاضی شہاب الدین سے علوم متداولہ حاصل کر کے متبحر عالم ہوئے، شیخ صفی الدین نے فراغت کے بعد علوم متعارفہ کے پڑھنے پڑھانے کا کام شروع کیا، اور عربی و فارسی میں بہت سی شرحیں اور متن میں کتابیں لکھیں، پھر ایک مدت تک درس و تدریس کی خدمت انجام دے کر شیخ کی تلاش میں ردولی آگئے، اس زمانہ میں سید اشرف سمنانیؒ بھی وہاں تشریف لائے تھے، جب شیخ صفی الدین ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے ان کو دیکھتے ہی بڑھ کر استقبال کیا، اور اپنے پاس بٹھایا اور شیخ صفی الدین کو اسی وقت سلسلۂ چشتیہ نظامیہ میں داخل کر کے خرقۂ خلافت عطا فرمایا، اس زمانہ میں ان کے چھوٹے بھائی شیخ رضی الدین ردولی میں قاضی تھے۔ اس لئے شیخ صفی الدین نے بھی وہیں اقامت اختیار کر لی۔[1]

نیز صاحبِ ''تذکرہ علمائے ہند'' شیخ صفی الدین کے صاحبزادے شیخ ابوالمکارم اسمٰعیل کے حال میں لکھتے ہیں،

شیخ ابوالمکارم اسمٰعیل بن شیخ صفی الدین ردولی ۱۲ ربیع الثانی ۷۸۹ھ میں پیدا ہوئے، ابھی چالیس دن ہی کے تھے کہ ان کے والد نے ان کو سید اشرف جہانگیر سمنانی کی خدمت میں پیش کیا، سید صاحب نے ان کو دیکھ کر فرمایا یہ بچہ بھی میرا مرید ہے۔[2]

نزہۃ الخواطر میں بھی شیخ صفی الدین کے سید اشرف جہانگیر سمنانی سے خلافت حاصل کرنے اور ان کے صاحبزادے شیخ ابوالمکارم اسمٰعیل کے ۱۲ ربیع الثانی ۷۸۹ھ میں پیدا ہونے کی تصریح موجود ہے۔[3]

ان تصریحات سے یہ نتائج نکلتے ہیں:۔

(۱) شیخ نصیر الدین بن شیخ نظام الدین کی شادی قاضی شہاب الدین کی صاحبزادی سے جونپور آنے سے بہت پہلے دہلی میں ہوگئی تھی، اور قاضی صاحب کے تینوں نواسے وہیں پیدا ہوئے اور وہیں اپنے جد مادری سے تحصیل و تکمیل کی۔

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۹۶، [2] تذکرہ علمائے ہند ص ۷ [3] نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۹۰ و ص ۳۱

(۲) قاضی صاحب کے ساتھ ان کی لڑکی، داماد اور نواسوں کے جونپور آنے سے پہلے ان کے نواسے شیخ رضی الدین ردولی کے قاضی مقرر ہو کر وہیں مقیم ہو گئے، ان ہی ایام میں بڑے نواسے شیخ صفی الدین بھی شیخ کی تلاش میں ردولی آئے اور سید اشرف سمنانی سے مرید ہونے کے بعد اپنے چھوٹے بھائی قاضی رضی الدین کے ساتھ ردولی میں بس گئے، اور یہیں ان کے صاحبزادے ابوالمکارم اسمٰعیل ۷۸۹ھ میں پیدا ہوئے جو بچپن ہی میں سید اشرف کی نسبت سے مشرف ہو گئے۔

(۳) اس طرح قاضی صاحب اور اور انکے نواسوں کے دہلی سے ترکِ وطن کر کے ۸۰۱ھ میں یا اس کے بعد جونپور آنے سے پہلے ہی یہ دونوں نواسے حدود جونپور میں آباد اور متاہل ہو چکے تھے۔ اور ان کو سید اشرف جہانگیر سمنانی سے تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ اس تعلق سے خود قاضی صاحب اور سید اشرف سمنانی میں قیام دہلی کے زمانہ ہی میں موانست قائم ہو چکی تھی۔ جو آگے چل کر علمی و روحانی تعلق کا باعث بنی، اور جونپور میں اسکی تجدید ہوئی۔

(۴) تذکرۂ علمائے ہند کی عبارت سے واضح طور پر یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ قاضی صاحب کی دختر کا نکاح شیخ نصیر الدین بن نظام الدین کے ساتھ جون پور آنے کے بعد ہوا۔ اور ان کے تینوں نواسے اور شیخ ابوالمکارم اسمٰعیل جونپور میں پیدا ہوئے اور انھوں نے یہیں اپنے نانا سے تعلیم حاصل کی، مگر ایہام ضرور ہوتا ہے، غالباً اسی لئے بعض تذکرہ نویسوں نے ان حضرات کی پیدائش اور تعلیم و تربیت جونپور میں بیان کی ہے، نزہۃ الخواطر میں قاضی رضی الدین کے بارے میں ہے،

"ولد ونشأ بجونپور وقرأ العلم علیٰ جده لامه الشهاب"[۱] — جون پور میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے اور اپنے نانا قاضی شہاب الدین سے پڑھا۔

حالاں کہ وہ قاضی صاحب وغیرہ کے جونپور آنے سے بہت پہلے ردولی میں عہدۂ قضاء پر مامور ہو چکے تھے۔ اسی طرح شیخ فخر الدین کے بارے میں بھی یہ تصریح محل نظر ہے کہ ولد ونشأ بجونپور وقرأ العلم علیٰ جده لامه الشهاب[۲] تینوں نواسوں کا اپنے نانا سے تعلیم حاصل کرنا مسلم ہے، مگر ان سب کی پیدائش اور تعلیم و تربیت کا جونپور میں آنے

[۱] نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۷۱ [۲] نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۱۱۵،

کے بعد ہونا صحیح نہیں ہے، بلکہ یہ سب مراحل دہلی میں طے ہو چکے تھے۔ اور وہیں انکی شہرت ہو چکی تھی۔ یہ زمانہ مشرقی دنیائے اسلام کے لئے بڑا پر آشوب تھا، اس سے ایک صدی پہلے تاتاریوں نے جو تباہی و بربادی برپا کی تھی عالم اسلام میں ابھی اس کے اثرات باقی ہی تھے کہ ۷۷۱ھ میں تیموری فتنہ نے سر اٹھایا، اور وہ وسط ایشیا کو روندتا ہوا ۸۰۱ھ میں دہلی میں داخل ہو گیا۔ اس کی یورش سے دہلی ہر وقت خطرات کی زد میں رہتی تھی، اور یہاں کے باشندے بڑی بے اطمینانی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ یہی زمانہ قاضی شہاب الدین کے دینی اور علمی میدان میں آنے کا ہے، ظاہر ہے کہ جس پر آشوب دور میں پرانی علمی اور روحانی محفلوں کو ہر آن ویرانی کا خطرہ ہو اس میں کسی نئی درسگاہ کو مرکزیت و مرجعیت حاصل ہونا مشکل تھا۔ مگر قاضی صاحب نے ان ہی ناسازگار حالات میں اتنی شہرت و ناموری حاصل کی کہ جونپور کے مشرقی دیار تک میں ان کے علم و فضل کا شہرہ گونج رہا تھا، جس سے سلطان ابراہیم کے دربار میں ان کو بڑا عروج حاصل ہوا۔

فتنۂ تیموری میں دہلی سے کالپی کی طرف روانگی

قاضی صاحب کے ایک استاد مولانا عبد المقتدر دہلی کی تباہی سے پہلے ۷۹۱ھ میں وصال فرما چکے تھے۔ اور دوسرے استاد مولانا خواجگی بقید حیات رہ کر افادہ و ارشاد میں مصروف تھے کہ ان کے روحانی برادر اور شیخ نصیر الدین اودھی چراغ دہلی کے مرید و خلیفہ سید محمد بن یوسف گیسو دراز نے خواب دیکھا کہ تیموری فتنہ کا سیلاب دہلی تک آگیا ہے۔ سید محمد صاحب کشف و کرامت بزرگ تھے۔ مولانا خواجگی نے جب ان کا یہ خواب سنا تو فتنہ سے چند ماہ یا چند روز پہلے ہی دہلی سے کالپی کے لئے روانہ ہو گئے قاضی صاحب کو استاذ و شیخ کی جدائی گوارا نہ ہوئی۔ کیونکہ مولانا عبد المقتدر کی وفات کے بعد یہی ان کی علمی و روحانی زندگی کے مربی رہ گئے تھے۔ نیز دہلی کے حالات علم اور اہل علم کے بارے میں تیزی سے ناسازگار ہوتے جا رہے تھے۔ اس لئے قاضی صاحب بھی مولانا خواجگی کے ہمراہ کالپی روانہ ہو گئے، یہ ۸۰۱ھ کی بات ہے، مولانا خواجگی نے کالپی میں رخت سفر

ڈال دیا، اور مستقل سکونت اختیار کر لی، یہاں تک کہ اسی مقام میں سات آٹھ سال کے بعد ۸۰۹ھ میں وصال فرمایا، مگر قاضی صاحب کو کالپی کی آب و ہوا راس نہیں آئی۔ اور اس پیکرِ علم کے مزاج نے دہلی کی طرح یہاں بھی اطمینان و سکون کی فضا نہیں پائی، اس لئے دیارِ پورب کا رخ کیا اور جونپور آ گئے، اس واقعہ کو تمام تذکرہ نگاروں نے بیان کیا، مگر کسی نے کالپی میں قاضی صاحب کی اقامت کی تصریح نہیں کی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قاضی صاحب کالپی رواروی کی حالت میں گئے اور فوراً ہی وہاں سے واپس ہو گئے۔ اس کی بھی تصریح نہیں ملتی ہے کہ قاضی صاحب کالپی سے پھر دہلی واپس گئے ہوں اور وہاں سے جونپور آئے ہوں اخبار الاصفیاء میں ہے:۔

در سنہ ہشت صد ہجری کہ صاحبقران بہند	۸۰۰ھ میں جبکہ امیر تیمور صاحبقران نے
چالش فرمود، او ہمراہ استاد خود مولانا	ہندوستان کا رخ کیا، قاضی شہاب الدین اپنے
خواجگی کہ خلیفۂ نصیر الدین محمود اودھی	استاذ مولانا خواجگی کے ہمراہ اپنے وطن دہلی
است، از وطن گاہ بر آمد، مولانا خواجگی	سے نکل گئے، مولانا خواجگی نے کالپی میں
در کالپی آرام گزید، و وے بجونپور آمدہ	آرام کیا، اور قاضی صاحب نے جون پور آ کر
علم توقف برزد، وکوس شہرت فروکوفت[1]	اقامت اختیار کی اور شہرت و ناموری پائی۔

اس میں قاضی صاحب کے مولانا خواجگی کے ساتھ نکلنے کی تصریح ہے، مگر ان کے کالپی جانے کی تصریح نہیں ہے البتہ دوسری کتابوں میں ان کا کچھ دنوں کے لئے کالپی جانا صراحت کے ساتھ مذکور ہے، سبحۃ المرجان میں ہے۔

خرج القاضی شهاب الدین	قاضی شہاب الدین اپنے
صحبة استاذه الی کالپی فاقام	استاذ کی معیت میں کالپی گئے،
مولانا خواجگی بکالپی وذهب	مولانا خواجگی تو وہیں رہ گئے،
القاضی الی دارالحبور جونپور	مگر قاضی صاحب جون پور چلے
ص ۳۹	گئے۔

[1] اخبار الاصفیاء ورق ۶۰

''تذکرہ علمائے ہند'' میں بھی ہے کہ قاضی شہاب الدین اپنے استاذ مولانا خواجگی کے ہمراہ دہلی سے کالپی گئے، مولانا خواجگی نے تو کالپی میں ہی اقامت اختیار کرلی، اور قاضی صاحب جون پور چلے گئے۔[1]

مولانا خواجگی عمر کا زیادہ حصہ دہلی میں درس وتدریس میں گزار چکے تھے، اس لئے ان کو کالپی کا گوشہ راس آگیا، اور چندسال وہاں ترک وتجرید اور عبادت وریاضت میں گزار کر ۸۰۹ھ میں دنیا سے رخصت ہوگئے، مگر ان کے جواں عزم وجواں ہمت شاگرد کو یہاں کام کرنے کے مواقع وامکانات کم نظر آئے اس لئے وہ اپنے استاذ کو کالپی میں چھوڑ کر جونپور چلے آئے۔

کالپی سے جونپور میں آمد

اس وقت جونپور شاہانِ شرقیہ کے حسنِ انتظام، علم دوستی اور ارباب علم وفضل کی قدر دانی میں دہلی ثانی تھا، اور دہلی کی تباہی کے بعد وہاں کی ساری علمی ودینی رونق کھنچ کر جون پور میں چلی آئی تھی، خصوصاً سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے تخت نشین ہونے کے بعد ۸۰۴ھ میں دیار پورب دیارِ علم وعلماء بن گیا، اور یہاں کے قریات وقصبات علم وفضل کے گہوارے ہوگئے تھے، قاضی نصیرالدین دہلوی جونپوری، شیخ ابوالفتح بن عبدالحئی بن مولانا عبدالمقتدر شریحی دہلوی جون پوری، شیخ نصیرالدین بن نظام الدین غزنوی دہلوی جونپوری، مولانا قیام الدین دہلوی ظفرآبادی اور شیخ محمد بن عیسٰی دہلوی جونپوری دہلوی وغیرہ فتنۂ تیموری کے بعد دہلی سے جون پور چلے آئے تھے، ان ہی ایام میں قاضی شہاب الدین بھی دہلی سے کالپی گئے اور وہاں سے جونپور آگئے، شاہ عبدالحق کی ایک عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی صاحب کالپی سے دہلی آئے پھر یہاں سے جونپور تشریف لے گئے، شیخ ابوالفتح شریحی کندی کے ذکر میں لکھا ہے کہ ابتداء میں شیخ ابوالفتح دہلی میں تھے، امیر تیمور کے فتنہ میں دوسرے اکابر کے ہمراہ جونپور چلے آئے اس واقعہ سے قاضی شہاب الدین بھی دہلی سے اس جگہ پہنچے۔[2]

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۸۸ [2] اخبار الاخیار ص ۱۷۰۔

قاضی صاحب کے ساتھ انکی صاحبزادی، داماد شیخ نصیر الدین اور انکے والد شیخ نظام الدین غزنوی بھی مع دیگر اہل خانہ کے دہلی سے جونپور آ کر مستقل طور سے آباد ہو گئے، قاضی صاحب کے دونوں نواسوں قاضی رضی الدین اور شیخ صفی الدین کے پہلے ہی سے ردولی میں سکونت اختیار کر لینے کی تصریح گزر چکی ہے، علماء ہند میں ہے:۔

جب دہلی میں مغل حادثہ رونما ہوا تو بعہد سلطان ابراہیم شاہ شرقی، قاضی شہاب الدین اور شیخ نظام الدین دہلی سے جونپور چلے آئے[1]

سلطان ابراہیم شاہ شرقی کی استدعاء پر قاضی صاحب کے مستقل طور سے جون پور آنے سے پہلے بھی دونوں میں دوستانہ تعلقات و روابط تھے، اور سلطان اس زمانہ میں بھی قاضی صاحب اور انکے استاذ قاضی عبد المقتدر شریحی متوفی ۷۹۱ھ پر جان چھڑکتا تھا، اس دور کا ایک واقعہ سننے کے قابل ہے، صاحب تذکرۃ العلماء نے مناقب الصدیقین کے حوالے سے لکھا ہے کہ قاضی عبد المقتدر نے اپنے شاگرد قاضی شہاب الدین کی تمنا پر اور سلطان ابراہیم شاہ شرقی کی ملاقات کے شوق میں جونپور کا قصد فرمایا، قاضی شہاب الدین صدہا علماء وفضلاء اور ہزارہا طلبہ کو لیکر استقبال کو نکلے، اور سلطان کے حسب الحکم تمام شاہزادے اور ارکان دولت شاہی شان وشوکت کے ساتھ ان کی پیشوائی کو چلے، خود سلطان بھی بارہ کوس تک آیا، جب سلطان نے قاضی شہاب الدین کو قاضی عبد المقتدر کی رکاب میں پا پیادہ چلتے ہوئے دیکھا تو وہ بھی شاہی گھوڑے سے اتر پڑا، اور قدم بوسی کی، پھر اصطبل شاہی سے تین خاص گھوڑے لائے گئے، سلطان نے قاضی عبد المقتدر کا ہاتھ پکڑ کر ایک گھوڑے پر سوار کیا، اور قاضی شہاب الدین دوسرے گھوڑے پر سوار ہو کر قاضی عبد المقتدر کے ساتھ ساتھ چلے اور تیسرے گھوڑے پر خود سلطان سوار ہوا، راستہ میں اگر کوئی تنگ گلی آجاتی تو خود پیچھے ہو جاتا اور دونوں بزرگوں کو آگے کر دیتا تھا۔ شاہی حکم کے مطابق جلوخانہ سے ایوان شاہی تک انواع واقسام کے عمدہ طلاباف کپڑے پا انداز کے طور پر راستہ میں بچھائے گئے، قاضی عبد المقتدر کی سواری دربار تک پہونچی تو سلطان نے خود گھوڑے کی رکاب تھام کر ان کو اتارا اور مسند شاہی پر

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۹۶۔

بٹھایا، اور قاضی شہاب الدین کے ساتھ خدمت گزاری میں کھڑا رہا، اس موقع پر سلطان شاہزادوں اور حرم سرا کی بیگمات اور دیگر ارکان سلطنت کی طرف سے جو ہدایا وتحائف قاضی عبد المقتدر کو پیش کئے گئے، ان کی قیمت ایک لاکھ روپے سے زیادہ تھی، قاضی عبد المقتدر ایک سال تک جونپور میں پورے اعزاز کے ساتھ مقیم رہے، ہفتہ میں ایک دن محفل وعظ منعقد ہوتی تھی جس میں سلطان ابراہیم تمام شہزادوں اور بیگمات اور ارکان دولت کے ساتھ برابر حاضر رہتا تھا ان محفلوں میں صدہا کفار شریک ہوکر مشرف بہ اسلام ہوتے تھے، اور حاضرین پر رقت کا عالم طاری ہوتا تھا اور لوگ زار وقطار روتے تھے اس طرح ایک سال رشد وہدایت میں گزارنے کے بعد قاضی عبد المقتدر نے سلطان ابراہیم سے کہن سالی اور پیری کا عذر کر کے رخصت چاہی اور سلطان کی خواہش پر اپنے صاحبزادے شیخ عبد الواحد کو جونپور میں چھوڑ کر دہلی تشریف لے گئے اور وہیں ۷۹۱ھ میں فوت ہوئے۔[1]

اس واقعہ سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ سلطان ابراہیم ان دونوں بزرگوں کا کس قدر معتقد تھا، اور ان کے جونپور میں مستقل طور سے سکونت پذیر ہونے کا کیسا خواہش مند تھا، اسی درمیان میں قاضی عبد المقتدر کا دہلی میں وصال ہوگیا تو قاضی شہاب الدین کی ذات کو مغتنم سمجھ کر اپنی سلطنت کو زینت دی۔

قاضی صاحب اور ان کے متعلقین کے مستقل طور سے جونپور آنے کی صحیح تاریخ معلوم نہیں، صرف اتنا معلوم ہے کہ اس وقت سلطان ابراہیم شرقی کی سلطنت قائم ہوچکی تھی اور سید اشرف جہانگیر سمنانی بقید حیات تھے، سلطان ابراہیم بن خواجہ جہاں شرقی کی حکومت اس کے بھائی سلطان مبارک شاہ شرقی کے بعد ۸۰۴ھ میں شروع ہوئی، اور سید اشرف سمنانی کا وصال ۸۰۸ھ میں ہوا، اسی درمیان میں قاضی صاحب جونپور تشریف لائے تھے، یہ وہ زمانہ تھا کہ دہلی کی بربادی کے نتیجہ میں جونپور آباد ہورہا تھا، اور ہند و بیرون ہند کے علماء، فضلاء، مشائخ اور دانشوروں کے قافلے یہاں چلے آرہے تھے، طبقات اکبری میں اس دور کے جونپور کا نقشہ یہ درج ہے کہ "سلطان

[1] تذکرۃ العلماء ص ۷۱۔

مبارک شاہ شرقی کے مرنے پر جب سلطان ابراہیم شرقی سریر آرائے سلطنت ہوا تو امن وامان کی فضا میں عوام اور خواص نے سکون کا سانس لیا، اور جو علماء و مشائخ آشوب زمانہ سے پریشان تھے، جون پور چلے آئے وہ اس زمانہ میں دارالامان تھا، اور شرقی سلطنت علماء کی کثیر تعداد کے آنے سے دارالعلوم بن گئی، [۱] تاریخ فرشتہ نے اس دور کا نقشہ یوں کھینچا ہے کہ'' آشوب زمانہ کے مارے ہوئے ہندوستان کے اطراف واکناف کے لوگ جونپور چلے آئے تھے، یہاں ہر ایک کو اس کے مرتبہ کے مطابق اعزاز حاصل ہوا، علماء، مشائخِ سادات اور خدام وغیرہ ہر طبقہ کے اعیان اس طرح جمع ہوگئے کہ جونپور دہلی ثانی کہلانے لگا۔ لوگوں نے سلطان ابراہیم شاہ شرقی کی ذات کو غنیمت سمجھ کر حیات دوروزہ کو اس نشاط وانبساط سے بسر کیا کہ شاہ سے لیکر گدا تک خوش اور مطمئن تھے، اور غم واندوہ اس دیار سے اپنا بوریا بستر باندھ چکا تھا۔ [۲]

سلطان ابراہیم شاہ شرقی کی قدردانی اور جونپور میں اقامت

بعض بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ خود ابراہیم شاہ شرقی نے قاضی صاحب کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دی تھی، جو قرین قیاس بھی ہے، قاضی صاحب کی علمی شہرت قیام دہلی کے زمانہ میں عام ہوچکی تھی، ان کی درسگاہ کے دو فضلاء جو ان کے نواسے بھی تھے، ردولی میں موجود تھے، ایک عہدۂ قضاء پر مامور تھے، اور دوسرے درس وتدریس میں نام پیدا کر کے طریقت میں سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ سے منسلک ہوگئے تھے، ان کے علاوہ قاضی صاحب کے جو احباب ومعاصرین اور شرکائے درس جون پور آچکے تھے، انھوں نے بھی ان کی شہرت وقابلیت کا تذکرہ کیا ہوگا، خصوصاً قاضی نصیر الدین گنبدی جو قاضی صاحب کے استاذ مولانا عبدالمقتدر کے مشہور تلامذہ میں تھے، اور شیخ ابوالفتح شریحی جو مولانا عبدالمقتدر کے پوتے اور ان کے فیض یافتہ تھے، ان کی آمد سے جونپور میں قاضی صاحب کے علم وفضل کا چرچا ہوا ہوگا۔ ان کے کمالات سن کر سلطان ابراہیم نے قاضی صاحب کو دعوت دی ہوگی۔ تجلی نور میں ہے، مولانا خواجگی نے کالپی کو وطن بنایا اور قاضی

---

[۱] طبقات اکبری ص ۵۲۸ طبع نولکشور ، [۲] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۰۶،

شہاب الدین سلطان ابراہیم شاہ شرقی کی طلب پر جونپور تشریف لائے [1]

سلطان ابراہیم شاہ شرقی نے جس عقیدت اور قدر و منزلت کے ساتھ قاضی صاحب کا استقبال کیا وہ اس کی دعوت سے کہیں بڑھ کر تھا، سبحۃ المرجان میں ہے۔

فاغتنم السلطان ابراھیم الشرقی والی جون پور وروده و نظر سقاه اللہ سحائب الاحسان و زوده و عظمه بین الکبراء ولقبه بملک العلماء [2]	والی جون پور سلطان ابراہیم شرقی نے قاضی صاحب کی آمد کو غنیمت سمجھا اور اپنے امرائے دولت اور کبرائے مملکت میں ان کو بلند مقام دیکر ملک العلماء کے خطاب سے ملقب کیا۔

اور مآثر الکرام میں اسی کا ترجمہ یوں درج ہے،

و قاضی جانب جونپور رفت سلطان ابراہیم شرقی اشرق اللہ ضریحہ مقدم اور ا مغتنم دانستہ لوازم قدر شناسی افزون از وصف بجا آورد، و بہ خطابِ ملک العلمائی بلند آوازہ ساخت۔ [3]	اور قاضی صاحب جون پور تشریف لے گئے سلطان ابراہیم شاہ شرقی اللہ ان کی قبر کو روشن کرے، ان کی تشریف آوری کو غنیمت جان کر حد سے زیادہ ان کی قدر شناسی کی اور ملک العلماء کے لقب سے ان کی شہرت بڑھائی۔

اور مولانا خیر الدین محمد جونپوری نے تذکرۃ العلماء میں قاضی صاحب کے جونپور آنے اور سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے استقبال کرنے کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

سلطان ابراہیم شرقی نے قاضی صاحب کے کالپی میں آنے کی خبر سنتے ہی اہل علم سفیروں کو ہدایا و تحائف دیکر ان کی خدمت میں روانہ کیا اور ان کی تشریف آوری کی تمنا ظاہر کی۔ قاضی صاحب استاذ کی ہدایت اور سلطان کی دعوت پر فضلاء و طلبا کی ایک جماعت لیکر جون پور تشریف لائے اور سلطان نے بیان سے باہر ان کی قدر و منزلت کا اہتمام کیا ملک العلماء کے خطاب سے ان کو شہرت دی، اور اپنی جامع مسجد (اٹالہ مسجد) کے پہلو میں ان کے لئے خاص مدرسہ اور شاہانہ

---

[1] تجلی نور ج ۲ ص ۳۳ جادو پریس جون پور [2] سبحۃ المرجان ص ۳۹، [3] مآثر الکرام ج ا ص ۱۸۸،

مکاتبات سے ہوا ہے۔[1]

اور تذکرہ علمائے ہند میں ہے۔

سلطان ابراہیم شرقی قدوم قاضی مغتنم شمرده وبا اعزاز وتعظیم تمام پیش آمدش واورا به ملک العلماء ملقب کرد[2]

سلطان ابراہیم شاہ شرقی نے قاضی صاحب کی تشریف آوری کو غنیمت جانا اور انکا بے پناہ اعزاز واحترام کیا اور ان کو ملک العلماء کا لقب دیا

تاریخ فرشتہ اور تجلی نور میں اسی واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے

"سلطان در تعظیم وتوقیر او بسیاری کوشید ودر مجلس خود برکرسی نقره جای داده قاضی القضاة کرد"[3]

سلطان ابراہیم شاہ شرقی نے ان کی بہت زیادہ عزت افزائی فرمائی اور اپنے دربار میں چاندی کی کرسی پر جگہ دی اور قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) مقرر کیا

مگر لطائف اشرفی میں ہے کہ ملک العلماء کا لقب قاضی صاحب کو سید اشرف جہانگیر سمنانی نے اس وقت دیا تھا، جب ان کو خرقہ خلافت سے نوازا تھا[4] ہوسکتا ہے کہ سید صاحب کے عطا کردہ لقب کو سلطان ابراہیم شاہ نے سرکاری حیثیت دیدی ہو۔

قاضی صاحب نے جونپور کے محلہ خواجگی میں سکونت اختیار فرمائی اور یہیں اپنا مکان اور مدرسہ بنوایا۔ تجلی نور میں ہے کہ

"مولانا شہاب الدین در جونپور محلہ خواجگی قیام پذیرفت وبعد فوت متصل آں محلہ دروازہ جنوبی مسجد اٹالہ مدفن یافت" (ج ۲ ص ۳۷)

مولانا قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے جون پور کے محلہ خواجگی میں سکونت اختیار کی اور وفات کے بعد اسی محلہ کی اٹالہ مسجد کے جنوبی دروازہ کے بغل میں دفن ہوئے

یہ معلوم نہیں کہ پہلے سے ہی یہ مقام اور محلہ خواجگی کے نام سے آباد ومشہور تھا، یا قاضی صاحب نے یہاں سکونت اختیار کرنے کے بعد اپنے استاذ ومرشد مولانا خواجگی کے نام پر اس محلہ کا

---

[1] تذکرۃ العلماء ص ۱۳[2] تذکرہ علمائے ہند ص ۸۸ [3] تجلی نور ج ۲ ص ۲۔

[4] لطائف اشرفی ج ۱ ص ۱۰۱

نام رکھا، جو صورت بھی ہو یہاں قاضی صاحب کی سکونت اپنے شیخ و استاذ سے عقیدت و محبت اور نسبت کا پتہ دیتی ہے۔

دریں دیار ازاں سرخوشیم کہ گاہے نسیم بوئے تو ام زیں دیار میں آید

﴿میں اس دیار میں اس وجہ سے خوشی محسوس کرتا ہوں کہ کبھی کبھی مجھے اس دیار سے تیری خوشبو ملتی ہے﴾

قاضی صاحب جونپور میں کیا رونق افروز ہوئے کہ دیار پورب کے علمی و روحانی سلسلہ کی وہ تمام دولت جو دہلی میں لٹ رہی تھی، سمٹ سمٹا کر پھر پورب میں آ گئی، اور آٹھویں صدی میں اودھ کی جو روشنی دہلی کے میناروں پر ہو رہی تھی وہ نویں صدی کے شروع ہوتے ہی جونپور کی فصیلوں پر ہونے لگی، جس سے دیار پورب کے بام و در چمک اٹھے، اس طرح اس دیار کی متاعِ علم و فن پھر اسی دیار میں لوٹا دی گئی۔ ھذہٖ بضاعتنا رُدّت الینا

قاضی صاحب کو سارا علمی و روحانی سرمایہ شیخ الاسلام فرید الدین اودھی اور ان کے تلامذہ شیخ شمس الدین اودھی اور شیخ نصیر الدین اودھی سے ملا تھا۔ ان کے دونوں استاذ و مرشد عبد المقتدر اور مولانا خواجگی اسی دبستانِ علم و معرفت کے فضلاء میں تھے، اس لئے آپ نے بھی اس خانوادہ کی روایات کے مطابق جون پور میں درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری کیا۔

قاضی وسادۂ افادۂ و درس بجونپور مزین قاضی صاحب نے جونپور میں درس و افادہ کی مسند کو
فرمود و بہ تصنیفِ کتب مصروف گردید[۱] زینت دی اور کتابوں کی تصنیف کا شغل اختیار کیا۔

اس وقت جونپور میں متعدد نو وارد علماء و فضلاء کی درس گاہیں تدریسی و تعلیمی خدمات انجام دے رہی تھیں۔ قاضی صاحب کے شرکائے درس اور قاضی عبد المقتدر کے تلامذہ میں ان کے پوتے شیخ ابو الفتح اور شیخ نصیر الدین کے حلقہ ہائے درس خاص طور سے مرجع بن رہے تھے، مولانا فقیہ حیرتی کا حلقۂ درس الگ قائم تھا، ان حضرات کے علاوہ دوسرے علماء و فضلاء بھی تعلیم و تعلم میں مصروف تھے، ان ہی میں قاضی صاحب نے بھی اپنا حلقہ قائم کیا، اور تھوڑے ہی دنوں میں علماء اور مشائخ دونوں طبقوں میں ان کی درسگاہ کی افادیت و اہمیت کا عام چرچا ہو گیا، چنانچہ شیخ فتح اللہ اودھی نے اپنے تلمیذ رشید شیخ محمد بن

[۱] تذکرہ علمائے ہند ص ۸۸۔

عیسیٰ کو قاضی صاحب ہی کے پاس بھیج کر علوم شرعیہ وظاہریہ کی تحصیل وتکمیل کرائی، پھر کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ بعد میں اکثر علماء وفضلاء نے درس وتدریس سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور آخر میں صرف قاضی صاحب کا مدرسہ باقی رہ گیا تھا یا چند اور مدارس رہ گئے تھے، جن میں ان کے مدرسے کو اہمیت و خصوصیت حاصل تھی، قاضی صاحب کی تدریسی خدمات کے ذکر میں اس کی تفصیل آئے گی۔

علمائے وقت کے حسد کی ایک روایت

قاضی صاحب کے جون پور تشریف لانے پر ان کا شاہانہ استقبال اور بڑا اعزاز واکرام ہوا۔ سلطان ابراہیم شاہ شرقی اور امرائے دولتِ شرقیہ نے پر جوش استقبال اور علماء ومشائخ نے اپنی خوشی کا اظہار کیا، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اعزاز واکرام نے قاضی صاحب کے حاسد بھی پیدا کردیے اور اخبار الاصفیاء میں ہے کہ:۔

آوردہ اند کہ علمائے وقت را پیمانہ حسد لبریز شد شمہ ازاں بمولانا نوشت مولانا ایں دو بیت سعدی در جوابش نگاشت	بیان کیا جاتا ہے کہ علمائے وقت کے حسد کا پیمانہ لبریز ہوگیا تو قاضی صاحب نے اشارۃً مولانا کو لکھا ہے، مولانا نے اس کے جواب میں سعدی کے دو اشعار لکھ بھیجے۔

اے پیش ازاں کہ در قلم آید ثنائے تو — واجب براہل مشرق ومغرب دعائے تو

اے در بقائے ذاتِ تو نفع جہانیاں — باقی مباد آن کہ نخواہد بقائے تو

مآثر الکرام اور تذکرۃ العلماء میں بھی یہ روایت تقریباً ان ہی الفاظ میں موجود ہے۔[1]

سلطان ابراہیم شاہ کی عقیدت وفریفتگی

سلطان ابراہیم شاہ شرقی بڑا نیک دل، علم پرور، علماء نواز اور خدا پرست فرمانروا تھا، اسے علماء ومشائخ سے بڑی عقیدت ومحبت تھی۔ ان کی خدمت اور تعظیم وتکریم میں اپنی سعادت سمجھتا تھا،

---

[1] اخبار الاصفیاء ورق ۶۰، مآثر الکرام ج ۱ ص ۱۸۸ و ص ۱۸۹، تذکرۃ العلماء ص ۱۴۔

اس نے اپنے چالیس سالہ دورِ حکومت میں قاضی صاحب کو سر آنکھوں پر رکھا۔

فرشتہ کا بیان ہے:۔

سلطان ابراہیم در تعظیم و توقیر او بسیاری کوشید، و در وزہائے متبرک در مجلس او برکرسی نقرہ می نشست،	سلطان ابراہیم شاہ شرقی نے قاضی شہاب الدین کی خوب قدر و منزلت کی اور تبریک و تحسین کے دنوں میں انھیں چاندی کی کرسی پر بٹھاتا تھا

فرشتہ ہی کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ قاضی صاحب زیادہ بیمار پڑ گئے، سلطان ابراہیم کو خبر ہوئی تو مزاج پرسی اور عیادت کے لئے ان کے گھر پر حاضر ہوا اور مزاج پرسی اور اظہار محبت و تعلق کے بعد پانی سے بھرا ہوا پیالہ منگایا اور اسے قاضی صاحب کے سر کے گرد گھمایا اور یہ کہکر اس کا پانی پی گیا کہ:۔

بار خدایا ہر بلائے کہ در راہ او باشد نصیب من گرداں، واو را شفا بخش،	خداوند! ہر وہ مصیبت جو قاضی صاحب پر آنے والی ہو اسے میرے نصیب میں ڈال دے اور ان کو شفا بخش دے

تخت و تاج اور علم و دانش کی تاریخ میں یہ واقعہ یادگار رہے گا کہ سلطان ابراہیم ملک العلماء کے لئے اپنی جان تک قربان کرنے پر آمادہ ہوگیا، جو قاضی صاحب کے علم وفضل و کمال کے اعتراف اور علماء وفضلاء سے سلطان کی محبت وعقیدت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ فرشتہ نے اس واقعہ پر سلطان کے بارے میں یہ تاثر ظاہر کیا ہے:۔

ازیں جا عقیدۂ آں صاحبِ تخت و تاج نسبت بعلمائے شریعت محمد ﷺ معلوم می تواند کرد، تاچہ غایت بود	اس واقعہ سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اس صاحبِ تخت و تاج بادشاہ کو شریعت محمدی کے علماء سے کس درجہ عقیدت تھی۔

قاضی صاحب کو بھی سلطان سے کچھ کم محبت نہ تھی، اگر سلطان ان پر جان چھڑکتا تھا تو بقول فرشتہ قاضی صاحب نے اس پر جان چھڑک ہی دی اور اس کے بعد زیادہ دنوں زندہ نہ رہے،

قاضی شہاب الدین نیز با سلطان عصر موافقت کردہ چنداں از فوت شاہ ابراہیم شاہ شرقی مغموم	قاضی شہاب الدین نے بھی سلطان کا پورا پورا ساتھ دیا، سلطان ابراہیم شاہ

گشت کہ در ہماں سال یعنی اربعین وثمانمائیہ بعالم قدس تشریف برد، والبقاء للملک المعبود بعضے گویند کہ بدو سال بعد از فوت سلطان ابراہیم طاہر روحش در ۸۴۲ھ اثنی واربعین وثمانمائیۃ بروضہ رضوان پرواز کرد [1]	شرقی کے انتقال پر وہ اس قدر غمگین ہوئے کہ اسی سال ۸۴۰ھ میں رحلت فرما گئے اور بعض کہتے ہیں کہ اس کے دو سال کے بعد ۸۴۲ھ میں ان کا طائرِ روح باغ جنت کو پرواز کر گیا۔

قاضی صاحب سلطان ابراہیم کی قدر دانی پر شاہی دربار میں تشریف لے جاتے تھے، اور خود سلطان بھی بالالتزام ہر جمعہ کو آپ کی خدمت میں حاضری دیتا اور قاضی صاحب اور ان کے طلبہ کو شاہانہ لطف وکرم سے نوازتا تھا، تذکرۃ العلماء میں ہے۔

ہمیشہ بعد نماز جمعہ بمدرسۂ او حاضری شد، ونذور بقاضی، وعطایا بطلبۂ علوم می بخشید [2]	سلطان ابراہیم ہمیشہ نماز جمعہ کے بعد قاضی صاحب کے مدرسہ میں حاضر ہوکر آپ کو نذر پیش کرتا اور طلبہ کو نوازتا تھا۔

بیوی کے انتقال کے بعد قاضی صاحب تجرد کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ہر چند سلطان ابراہیم کی تمنا تھی کہ آپ شادی کرلیں اور متاہل زندگی گزاریں، مگر آپ اسے قبول نہیں کرتے تھے، مگر ایک وقت آیا کہ قاضی صاحب خود اس کی ضرورت محسوس کرنے لگے، اور ضرورت بشری و خواہش نفسی، یکسوئی و فارغ البالی میں خلل انداز ہونے لگی تو خود ہی سلطان کے سامنے اس خواہش کا اظہار کیا اور یہ قطعہ لکھ کر ایک باندی چاہی۔

این نفس خاک کہ آتشِ سزائے اوست — بر باد گشت لائق بے آب کردن است
یک کس چنان فرست کہ پا بر سرم نہد — ریزد ہمہ منّی وتکبّر کہ در من است

﴿یہ نفس خاک جس کی سزا آگ ہے، برباد ہوگیا اور یہ بے عزت کرنے کے لائق ہے۔ ایک ایسے کو بھیج دیجئے جو میرے سر پر اپنا پیر رکھے اور میرے تمام غرور وتکبر کو ملیا میٹ کر ڈالے﴾

قاضی صاحب کی اس طلب وخواہش پر سلطان بے انتہا خوش ہوا اور ایک حسین باندی مع

---

[1] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۰۶ [2] تذکرۃ العلماء ص ۱۳،

لوازم خانہ داری کے آپ کے گھر روانہ کردیا۔ اس واقعہ کو نقل کر کے صاحب تذکرۃ العلماء نے لکھا ہے۔

ازیں جا مرتبہ او راتواں دریافت [1] اس سے قاضی صاحب کا مرتبہ معلوم کیا جاسکتا ہے۔

قاضی صاحب اور سلطان ابراہیم میں قلبی تعلق کا یہ نتیجہ تھا کہ سلطان ان سے تمام علمی و دینی امور و معاملات اور افراد و رجال کے بارے میں مشورہ کیا کرتا تھا، اور ان کو پوری شرقی سلطنت کا قاضی القضاۃ بنا دیا تھا، اور ان ہی کے مشورہ سے قضاۃ کا تقرر کرتا تھا، حاجتمندوں کے بارے میں قاضی صاحب کی سفارش کا خاص خیال رکھتا تھا، سید اشرف سمنانی جیسے بزرگ تک سلطان سے اپنے متوسلین و متعلقین کی سفارش میں قاضی صاحب کو وسیلہ بناتے تھے، سلطان کی علم دوستی کا ایک مظاہرہ یہ بھی تھا کہ کبھی کبھی دربار میں قاضی صاحب اور دوسرے علماء کے درمیان مباحثہ و مناظرہ کی دینی و علمی محفلیں منعقد کیا کرتا تھا، اس طرح ملک العلماء کا علمی دربار سجا تا تھا۔ ان دونوں شاہ و گدا یعنی سلطان الشرق اور ملک العلماء کے تعلقات پہلے دن سے لیکر آخری دن تک یکساں شگفتہ رہے، چالیس سالہ مدت میں ان میں ذرا بھی فرق نہیں آیا، اس سے دونوں کے ظرف و حوصلہ اور تعلقات کی گہرائی کا پتہ چلتا ہے ان دونوں کا تذکرہ لازم و ملزوم بن گیا ہے، جو صرف الحبُّ للہ کا نتیجہ ہے۔

حضرت سید اشرف سمنانی کی عنایات و توجہات

قاضی شہاب الدین کو ملک العلماء قاضی القضاۃ بنانے میں بادشاہ کی مرحمت خسروانہ کے ساتھ ملک العلماء کے قلندرانہ فقر کو بھی بڑا دخل ہے، اور نہیں کہا جاسکتا کہ ان دونوں میں سے کس کا پلہ بھاری ہے، قاضی صاحب جس زمانہ میں یہاں آئے حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ متوفی ۸۰۸ھ کا آخری زمانہ تھا، ان کی مقبولیت و شہرت اپنے کمال عروج پر تھی، سید صاحب سمنان میں پیدا ہوئے، اور وہیں مروجہ علوم و فنون کی تکمیل کی پھر ترک و تجرید اختیار کر کے عالمِ اسلام کی سیر

[1] تذکرۃ العلماء ص ۱۴۔

وسیاحت فرمائی اور علم وعرفان کے ہر خرمن سے خوشہ چینی کر کے آخر میں ہندوستان آئے، اور سندھ میں شیخ جلال الدین بخاری سے، بہار میں شیخ شرف الدین منیری سے اور بنگال میں شیخ علاء الدین لاہوری وغیرہ سے کسب فیض کر کے جونپور آئے جہاں شرقی سلطنت کی بدولت ہر قسم کا امن وسکون تھا، یہیں روح آباد عرف کچھوچھہ نامی مقام پر سکونت اختیار فرمائی اور ارشاد و تلقین کے ساتھ تصنیف وتالیف میں مشغول ہو گئے، آپ شیخ وقت ہونے کے ساتھ نامور عالم و مصنف بھی تھے، ان کی جامعیت کا اندازہ ان کی تصانیف سے ہوتا ہے۔ تفسیر میں نور بخشیہ، فقہ میں حاشیہ ہدایہ فتاویٰ اشرفیہ، حاشیہ فصول مختصر اصول فقہ، نحو میں رسالہ اشرفیہ، علم کلام میں قواعد العقائد، ادب میں دیوانِ اشعار، تاریخ وانساب میں بحر الانساب اور اشرف الانساب کے علاوہ ارشاد وتلقین اور سلوک وتصوف میں ان کی متعدد معیاری تصانیف ہیں جن سے ان کی علمی استعداد وقابلیت کا پتہ چلتا ہے۔ قاضی شہاب الدین اور سید اشرف میں یہی علمی ذوق وجہ اشتراک ثابت ہوا۔ جب دونوں ملے تو ایسا معلوم ہوا کہ ایک مکتب فکر کے دو عالم مل گئے ہیں، فرق صرف یہ تھا کہ سید صاحب پر مشیخت کا رنگ غالب تھا، اور قاضی صاحب پر علم وفن کا مگر دونوں ہم ذوق وہم فکر تھے، قاضی صاحب کے نواسے شیخ صفی الدین ردولوی کو سید صاحب سے بہت پہلے سے روحانی نسبت حاصل تھی، ان کے صاحبزادے ابو المکارم اسمٰعیل کو بھی سید صاحب سے بیعت وارادت کا تعلق تھا، اس لئے قاضی صاحب اور سید صاحب میں پہلے سے ایک گونہ روحانی وعلمی تعلق قائم ہو چکا تھا، جس نے نئے دور میں مرشد ومسترشد کی نسبت اختیار کر لی تعجب ہے کہ قاضی صاحب اور سید صاحب کے گوناگوں تعلقات اور ان کی بیعت وخلافت کا تذکرہ کسی تذکرہ نگار نے نہیں کیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ کسی کی نظر سے لطائف اشرفی کی وہ تصریحات نہیں گزر سکیں جن میں دونوں بزرگوں کے احوال وکوائف اور سید صاحب کی قاضی صاحب پر خاص توجہات وعنایات کا ذکر ہے۔ صرف شاہ عبد الحق صاحب محدث دہلوی نے سید صاحب کے ایک مکتوب کے پیش نظر قاضی صاحب کو ان کا معاصر بتایا ہے، اور سید صاحب کے ذکر میں انکے بائیسویں مکتوب کو درج کیا ہے۔

سید اشرف کا ایک خط ان کے معاصر قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے نام ہے جو تحقیقات غریبہ پر مشتمل ہے، غالباً قاضی صاحب نے سید صاحب کو فرعون کے ایمان کے بارے میں خط لکھا تھا جس کی طرف فصوص الحکم میں اشارہ ہے۔	اور المکتوب ست مشتمل بر تحقیقات غریبہ با قاضی شہاب الدین دولت آبادی معاصر بود غالباً قاضی ازوے تحقیق ایمان فرعون کہ در فصوص اشارتے بداں واقع شدہ است کردہ بود او دریں باب بوے مکتوبے نوشت [۱]۔

صاحب تذکرہ علمائے ہند نے بھی اخبار الاخیار سے یہی عبارت نقل کردی ہے [۲]۔ حالانکہ ان دونوں بزرگوں میں معاصرت سے بڑھ کر مرید و مرشد اور محبت و مودت کا رشتہ قایم تھا، سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے بعد سید اشرف سمنانی ہی قاضی صاحب کے خاص قدردان و مداح رہ گئے تھے۔ اور قاضی صاحب کو بھی ان سے ارادت و خلافت کی نسبت سے بڑا گہرا تعلق تھا۔ اس حقیقت کا اظہار صرف لطائف اشرفی سے ہوتا ہے، جو سید صاحب کے ملفوظات و حالات میں نہایت مستند کتاب ہے اور جسے ان کے خادم و خلیفہ شیخ نظام الدین غریب یمنی معاصر قاضی شہاب الدین نے لکھا ہے، اس کی تالیف غالباً قاضی صاحب کی زندگی میں ہوئی ہے، ہم اس سلسلہ کی ضروری باتیں لطائف اشرفی سے نقل کرتے ہیں، ان کے بغیر قاضی صاحب کا ذکر جمیل نامکمل رہے گا۔

قاضی صاحب کی سید اشرف سے پہلی ملاقات

جونپور میں سید صاحب اور قاضی صاحب کی پہلی ملاقات اس طرح ہوئی کہ ایک مرتبہ سید اشرف صاحب اپنے خدام و احباب کے ساتھ روح آباد (کچھوچھہ) سے جونپور تشریف لائے اور سلطان ابراہیم شاہ شرقی کی جامع مسجد میں قیام فرمایا سلطان کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے اپنی عادت کے مطابق آپ کی زیارت کے لئے حاضری کا ارادہ کیا مگر قاضی شہاب الدین نے سلطان سے کہا کہ سید اشرف کے بارے میں مشہور ہے کہ بڑے پایہ کے بزرگ ہیں ان کے مزاج سے

---

[۱] اخبار الاخیار ص ۱۶۱ و ۱۶۲ [۲] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۳۔

واقفیت نہیں ہے بہتر ہے کہ پہلے ان سے مل کر ان کا طور وطریقہ معلوم کیا جائے، سلطان نے اس رائے سے اتفاق کیا، چنانچہ قاضی صاحب علماء کی ایک جماعت کے ساتھ سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے سید صاحب اس وقت ظہر کی نماز ادا کر کے اوراد و وظائف میں مشغول تھے، جب ان کو معلوم ہوا کہ کچھ لوگ ملاقات کے لئے آرہے ہیں تو دریافت فرمایا کہ کون آرہا ہے؟ خدام نے عرض کیا:۔

قاضی شہاب الدین کہ منسوب بجمیع علوم و مشہور بہمہ فنون شدہ است۔ ایشانند۔	یہی وہ قاضی شہاب الدین ہیں جو تمام علوم وفنون میں مشہور اور ان سب میں ماہر ہیں۔

یہ سن کر سید صاحب ان کے استقبال کے لئے بڑھے، قاضی صاحب سید صاحب کو آتا دیکھ کر پالکی سے اتر پڑے اور اپنے ہمراہی علماء وفضلاء کو ہدایت کی کہ اس ملاقات میں کوئی شخص نہ اپنی برتری ظاہر کرے اور نہ کوئی علمی سوال چھیڑے، کیونکہ:۔

کہ در حسن جبین سید نور ولایت می تابد	سید صاحب کی پیشانی کے حسن وجمال میں ولایت کا نور چمکتا ہے۔

سید صاحب نے نہایت ادب واحترام سے قاضی صاحب کو بٹھایا، دونوں میں مختلف موضوعات پر دیر تک گفتگو رہی اسی اثنا میں منع کرنے کے باوجود قاضی صاحب کے بعض ساتھیوں نے درسیات اور علم کلام کی بعض بحثیں چھیڑ دیں، اس مجلس میں سید صاحب کے مرید شیخ ابوالوفا خوارزمی بھی موجود تھے، جو تمام علوم وفنون میں کمال رکھتے تھے، انھوں نے اس بحث پر ایسی جامع تقریر فرمائی کہ تمام حاضرین مطمئن ہوگئے۔

قاضی صاحب نے سید صاحب سے کہا کہ آج سلطان ابراہیم آپ کی زیارت کے لیے حاضر ہونے والے تھے، مگر اس خادم نے چاہا کہ پہلے خود شرف زیارت حاصل کرلے، انشاء اللہ کل سلطان حاضر خدمت ہوں گے، اس کے جواب میں سید صاحب نے فرمایا:

نزدیک فقیر شما از سلطان بسیار بہتر اید اگر می آید ہم حاکم اند۔	فقیر کے نزدیک آپ کا مرتبہ سلطان سے بہت بلند ہے اگر سلطان آئے تو بادشاہ وقت ہے اسکو اختیار ہے۔

ملاقات کے بعد قاضی صاحب اپنی جماعت کے ساتھ رخصت ہو گئے، ان کے جانے کے بعد سید صاحب نے احباب سے ان کے بارے میں یہ تاثرات ظاہر فرمائے۔

در ہندوستان ایں مقدار فضیلت در کسے کم دیدہ ایم	ہندوستان میں اس قدر فضیلت رکھنے والے علماء ہم نے بہت کم دیکھے ہیں۔

دوسرے دن سلطان ابراہیم اپنے حشم و خدم اور امرائے دولت کے ساتھ سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، جب مسجد کے دروازے پر پہنچا تو قاضی صاحب کو خیال ہوا کہ سلطانی خدم و حشم سے سید صاحب کو کلفت ہوگی۔ اس لیے صرف بیس امراء و علماء کے ساتھ سلطان نے سید صاحب سے ملاقات کی۔ اس زمانہ میں سلطانی فوج قلعہ چنار کا محاصرہ کیے ہوئے تھی، سید صاحب نے فتح کی بشارت دی اور جب سلطان رخصت ہونے لگا تو سید صاحب نے اس کو اپنی خاص مسند عنایت فرمائی، جس سے سلطان بے حد خوش ہوا، اور دربار میں پہونچنے کے بعد سید صاحب کے متعلق یہ تاثرات ظاہر کیے۔

چہ سید یست عالی جناب و مقاصد مآب الحمد للہ در ہندوستان چنیں مردم در آمدہ اند	سید صاحب کس قدر عالی مرتبہ اور با مقصد بزرگ ہیں، اللہ کا شکر ہے کہ ہندوستان میں ایسے آدمی آگئے ہیں۔

اس واقعہ کے تیسرے دن قلعہ چنار کی فتح کی خوشخبری آئی سلطان نے دوبارہ حاضر ہو کر سید صاحب کو اس کی اطلاع دی اور عرض کیا کہ میں تو حضرت میر کو دستِ ارادت دے چکا ہوں، البتہ خادم زادے آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونگے، چنانچہ اسی دن دو تین شاہزادے سید صاحب سے مرید ہوئے، اور نذر پیش کی جسے آپ نے قبول نہیں فرمایا۔ شہزادوں نے جونپور میں مستقل قیام کرنے پر اصرار کیا، آپ نے ان کی دلجوئی کے لئے ارشاد فرمایا۔

از دیار سلطان بیرون نخواہیم رفت	ہم سلطان کی مملکت کے باہر نہیں جائینگے۔

سلطان ابراہیم سید صاحب کی ان باتوں سے بہت پر امید اور خوش ہوا اور سید صاحب نے بھی دو مہینے سے زیادہ جونپور میں قیام فرمایا اور وہاں کے اکابر و اصاغر آپ سے مستفید و

مستفیض ہوئے، اس مدت میں قاضی شہاب الدین کی عقیدت و محبت سید صاحب سے اس قدر بڑھ گئی کہ پابندی سے دوسرے تیسرے دن ان کی خدمت میں حاضری دیتے رہے، اور اپنی تصانیف کا ایک ایک نسخہ سید صاحب کی خدمت میں پیش کیا آپ نے ان کو قبول کر کے ان کی تحسین و تعریف فرمائی اور بہترین تاثرات کا اظہار فرمایا، الارشاد فی النحو کو زیادہ پسند کیا اور فرمایا۔

گویند کہ سحر از ہندوستان راست آمدہ ، کہتے ہیں کہ جادو ہندوستان سے نکلا ہے،
غالباً ایں راست سحر بود وہ جادو غالباً یہی کتاب ہے۔

بدیع البیان کو جو کہ علم معانی و بیان میں ہے قبول فرما کر اس کی تحسین فرمائی فارسی تفسیر بحر المواج کے بارے میں فرمایا،

سخن خالی از اطالتے نیست اس کی بحثیں طوالت سے خالی نہیں ہیں

اور جامع الصنائع کے متعلق جو فارسی زبان میں بدائع و صنائع پر ہے ارشاد ہوا۔

حضرت قاضی دریں فن ہم دست زدہ اند قاضی صاحب نے اس فن میں بھی ہاتھ مارا ہے

سید صاحب کے ان الفاظ کا مجلس پر بہت اثر ہوا۔ اس مجلس میں شیخ واحدی بھی موجود تھے، انھوں نے اسی وقت سید صاحب کی مدح میں ایک قصیدہ پڑھا اسے سنکر قاضی صاحب اور سید صاحب نے ایک دوسرے کو دیکھا اور تبسم فرمایا، اور سید صاحب نے قاضی صاحب سے مخاطب ہو کر کہا۔

چوں ہمہ از علوم سر بردہ اید ، فارسی را بشیخ آپ تمام علوم میں ماہر و کامل ہیں فارسی
گذارید زبان کو شیخ واحدی کے لئے چھوڑ دیجئے۔

اور شیخ واحدی نے یہ درخواست پیش کی۔

لشکر علم تو بہ تیغ بیان از عجم تا عرب گرفتہ دیار
چوں گرفتی عراق عربیت فارسی را بواحدی بگذار

﴿تیرے علم کا لشکر تیغِ بیان کے ساتھ عجم سے عرب تک کے تمام شہر و دیار میں پہونچا جب تم نے عربی عراق کو اپنے قبضے میں لے لیا ہے تو فارسی کو واحدی کے لئے چھوڑ دو۔﴾

اس سفر میں معاملہ یہیں تک رہا جب سید صاحب دوسری بار جونپور تشریف لے گئے تو

قاضی صاحب کو خرقۂ خلافت عطا فرما کر ہدایہ کا ایک خصوصی نسخہ عنایت کیا، (غالباً ہدایہ کا یہ نسخہ سید صاحب کے حواشی سے مزین تھا)۔[1]

سید صاحب سے ارادت وخلافت

سید صاحب کے دوبارہ جون پور تشریف لانے اور قاضی صاحب کو خلافت سے سرفراز کرنے کی تفصیل شیخ نظام الدین غریب نے یوں بیان کی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت قدوۃ الکبریٰ نے جونپور کی جامع مسجد میں نزول فرمایا، اس وقت خدام و مخلصین میں شیخ کبیر، قاضی رفیع الدین اودھی، (شاید یہ شیخ رضی الدین قاضی ردولی اور قاضی شہاب الدین کے نواسے ہوں) شیخ ابوالمکارم (غالباً یہ قاضی صاحب کے نواسے شیخ صفی الدین کے صاحبزادے شیخ ابوالمکارم اسمٰعیل ہیں) اور خواجہ ابوالوفا خوارزمی ساتھ تھے، ان ہی ایام میں ایک مرتبہ سید صاحب پر وجد وحال کی کیفیت طاری ہوئی اور اسی عالم میں یہ شعر ان کی زبان پر آیا۔

دلش چوں بحر عماں جوش کردہ　　دو گوہر ریختہ خاموش کردہ

﴿اس کا دل سمندر کی طرح جوش کرتا ہے　دو موتی گرا کر خاموش کر دیتا ہے﴾

پھر فرمایا۔

الناس کلّھم عبد لعبدی	تمام لوگ میرے (بندے کے بندے ہیں) یعنی غلام کے غلام ہیں

حاضرین جو سید صاحب کے حال وقال سے واقف تھے، یہ جملہ سن کر اس خیال سے خاموش رہے کہ بہت سے علمائے ظاہر جو اسرار باطنی سے واقف نہیں ہیں اگر وہ اس جملہ کو سن لیں گے تو اباء وانکار کی روش اختیار کریں گے۔ کچھ دنوں کے بعد حاجی صدر الدین نامی ایک عالم نے ایک موقع پر سید صاحب کے اس جملہ کو نقل کیا۔ اسے سن کر بعض لوگوں نے اعتراض کیا اور اس کی تحقیق کے پیچھے لگ گئے۔ شدہ شدہ یہ بات میر صدر جہاں اور قاضی شہاب الدین تک پہنچی، قاضی

[1] لطائف اشرفی ج ۲ ص ۱۰۵، ۱۰۶

صاحب نے کہا کہ وجد و کیف کی باتوں پر غور و فکر کرنا مناسب نہیں۔ معلوم نہیں یہ بات کس عالم میں اور کس انداز میں کہی ہے۔ یہ بزرگ بہت بلند حال اور بڑے باکمال ہیں۔ مجھے تو ان کے برابر کوئی شخص نظر نہیں آتا یہ سن کر ایک شخص نے کہا کہ یہ شہر متجر علماء اور قابل فخر فضلاء اور اربابِ دانش سے معمور ہے تعجب ہے کہ کوئی شخص یہاں آکر ایسی بات کہدے اور اس سے سوال و جواب نہ کیا جائے بالآخر طے پایا کہ میر صدر جہاں محمود بھیّہ (بھیّا نامی ایک طالب علم کو سید صاحب کی خدمت میں بھیج کر اس جملہ کا مطلب معلوم کریں کرائیں، یہ طالب علم سخت کلام اور درشت خو تھا، اس لئے قاضی شہاب الدین نے کہا کہ محمود بھیّہ (بھیا) مشائخ کے آداب سے واقف نہیں ہے۔ مبادا وہ کوئی ایسی بات کردے جو سید صاحب کے خلاف طبع ہو اس لئے کل میں خود جا کر مناسب انداز میں بات کروں گا، چنانچہ دوسرے دن قاضی صاحب سید صاحب کی خدمت میں پہنچے اس وقت آپ اپنے حلقۂ احباب و مریدین میں تشریف فرما تھے۔ قاضی صاحب کی آمد کی خبر سن کر حسب عادت استقبال کیا اور تکریم و تعظیم کے ساتھ بٹھایا رسمی بات چیت کے بعد بعض فقہی مسائل پر گفتگو ہوتی رہی اس سے قاضی صاحب کے ساتھیوں کو سید صاحب سے انس پیدا ہو گیا، اور ان کے مخالف جذبات سرد پڑ گئے، باتوں باتوں میں قاضی صاحب نے کہا کہ کل یہاں کے بعض علماء نے میر صدر جہاں کے سامنے آپ کا ایک جملہ نقل کیا ہے جو ظاہری اعتبار سے مبہم ہے اس کے بارے میں کیا ارشاد ہے، سید صاحب نے برجستہ فرمایا۔

مفہوم دے در غایت آسان است	اس جملہ کا مطلب نہایت آسان ہے کلمۃ الناس الیٰ
کہ کلمۃ الناس الی آخرہ بالف ولام	آخرہ الف ولام سے شروع ہوا ہے اور الف ولام عہد
مصدر شدہ، والف ولام برائے	کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، چنانچہ میں نے اسی
عہد نیز آمدہ است زیرا کہ اگر مردم	سے اپنا جملہ شروع کیا، کیوں کہ اس زمانہ کے عام
روزگار بندۂ ہواؤ ہوس اند حق	لوگ اپنے ہواؤ ہوس کے بندے ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے
تعالیٰ ہوائے نفسانی مارا بندہ ومحکوم	میری ہوائے نفس کو میرا محکوم اور غلام بنایا ہے، چونکہ تمام
من ساختہ است چوں اہل عالم	لوگ ہوائے نفس کے بندے اور غلام ہیں اس لئے

محکوم ہوائے نفسانی شدند گویا بندگان بندۂ من اند ، محکوم محکوم من آمدند باعتبار کثرت احکام نفسانی

میرے بندے کے بندے ہیں ، یعنی لوگ ہوائے نفس کے غلام ہیں اور ہوائے نفس میرا غلام ہے نفسانی خواہشوں کے بارے میں عام بات یہی ہے ۔

اس توضیح وتشریح سے قاضی صاحب اوران کے تمام رفقاء مطمئن ہوکر خوشی خوشی واپس چلے گئے ۔[1]

شیخ نظام الدین غریب یمنی کا بیان

اس واقعہ کے بعد سید صاحب نے قاضی صاحب کو اپنی خلافت سے نوازا ، اور دونوں بزرگوں کے درمیان اور روحانی دونوں نسبتیں مکمل ہوگئیں بہتر ہے کہ یہ داستان سید صاحب کے خلیفہ اور قاضی صاحب کے معاصر شیخ نظام الدین غریب یمنی ہی کے الفاظ میں سنی جائے ،

امام روزگار ہمام دیار قاضی شہاب الدین کہ مقتدائے علمائے فحول و پیشوائے بلغائے فروع واصول است ، از خلفائے ولایت پناہ وہدایت دست گاہ حضرت ایشانند دراں حین کہ از زبانِ مبارک در بلدۂ جونپور حرسہا اللہ عن الکسور بحالتے شگرف و کیفیتے اشرف ''الناس کلہم عبد لعبدی'' برآمد ، و جماعت از علمائے متعصب بہم آمدہ بود ، از حضرت قاضی خدمتے شائستہ و ملازمتے بائستہ شدِ الباس خرقہ کردند و بخطاب ''ملک العلماء'' مخاطب کردند ، دے مہین

امام روزگار ہمام دیار ، مقتدائے علمائے فحول پیشوائے بلغائے فروع واصول قاضی شہاب الدین حضرت سید اشرف سمنانی کے خلفاء میں سے ہیں جس زمانہ میں سید صاحب کی زبان سے جون پور میں بحالت سکر یہ کلمہ نکل گیا تھا ''الناس کلہم عبد لعبدی'' اور علماء کی ایک جماعت ان کے خلاف تیار ہوگئی تھی ، تو اس وقت قاضی صاحب کی طرف سے نہایت شائستہ انداز میں خدمات ظاہر ہوئیں اور سید صاحب نے ان کو خرقۂ خلافت پہنایا اور ملک العلماء کا لقب دیا ،

[1] لطائف اشرفی ج ۱ ص ۲۰۷ و ۲۰۸

خلفائے ولایت مآب و بہترین ندماء واصحاب اند، جامع بودہ میان علوم ظاہری و باطنی، صاحب معاملات یقینی و جامع وارداتِ دینی شدہ بود تشرع بسیار داشت ، ریاضت شدیدہ و مشاہدات جدیدہ کشید کہ اشرف خلافت و اجازت یافتہ[1]

قاضی صاحب سید صاحب کے اجل خلفاء اور افضل اصحاب و مریدین میں سے ہیں علوم ظاہری و باطنی اور معاملات ایمانی وواردات دِینی کے جامع ہیں ، شریعت کے سخت پابند تھے ، ریاضاتِ شدیدہ و مشاہدات جدیدہ میں اس قدر کوشش کی کہ اشرف ترین خلافت واجازت سے مشرف ہوئے۔

ان تصریحات سے سید صاحب اور قاضی صاحب کے باہمی علمی اور روحانی تعلقات کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے، اس سلسلہ میں یہ تصریحات بڑی نادر اور مفید ہیں۔

سید صاحب کا مکتوب قاضی صاحب کے نام

شاہ عبدالحق صاحب نے اخبار الاخیار میں سید صاحب کا جو مکتوب بست و دوم درج کیا ہے، اس کے اقتباسات سے اچھی خاصی معلومات ملتی ہیں، ہم ان کو یہاں نقل کرتے ہیں، عام طور سے اسی مکتوب کو سید صاحب اور قاضی صاحب کی معاصرت کی دلیل مانا جاتا ہے، اس کے خاص الفاظ اور عبارتوں سے قاضی صاحب سے سید صاحب کی محبت کا اندازہ ہوتا ہے، اس مکتوب کی ابتدا ان القاب اور دعائیہ کلمات سے ہوتی ہے،

” برادر اعز ، ارشد ، جامع العلوم قاضی شہاب الدین نور اللہ تعالیٰ قلبہ بانوار الیقین ، دعائے درویشانہ، وثنائے برکیشانہ از درویش اشرف قبول فرمایند

معززترین بھائی، نہایت صالح، جامع العلوم قاضی شہاب الدین اللہ تعالیٰ یقین کے انوار سے آپ کے دل کو منور کرے درویش جیسی دُعا اور عقیدت مند جیسی ستائش درویش اشرف سے قبول فرمائیں

[1] لطائف اشرفی ج ۱ ص ۴۱۰

اس کے بعد ہے کہ آپ کا خط جس میں چند باتیں درج ہیں پہنچا، آپ نے فصوص الحکم کے مبحث سے فرعون کی نسبت جس استفسار کے جواب کا تقاضا کیا ہے، وصول ہوا، جاننا چاہئے کہ فصوص میں الخ

اس کے بعد فصوص الحکم کی عبارت کی وضاحت ہے، پھر اپنی اور قاضی صاحب کی حیثیت کے متعلق لکھا ہے:

ہر چند آن برادر قدوۂ علمائے روزگار و زبدۂ فضلائے ہر دیار است، اما بہ عنایت الٰہی لا متناہی واز التفات ایں طائفہ علیّہ وتوجہات ایں زبدۂ سنّیہ شربے از مشرب صوفیہ و طربے از منصب باطنیہ دارد، وایں را از اعلیٰ ترین دولت واحریٰ ترین رفعت تصور کند۔	ہر چند کہ برادر قدوۂ علمائے زمانہ اور زبدۂ فضلائے ہر دیار ہیں، مگر اللہ تعالیٰ کی عنایت لامتناہی، اور اس مقدس گروہ کی توجہ التفات سے بندہ نے بھی اس مصفّیٰ سے کچھ گھونٹ پیئے ہیں اور منصب باطنی سے ذوق لطیف پایا ہے اور اس نعمت کو سب سے بڑی دولت اور سب سے زیادہ اقبال مندی تصور کرتا ہے۔

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ جناب نتیجۃ المشائخ شیخ رضی جو کہ اس مکتوب کے ساتھ جا رہے ہیں، غالبًا اپنے کسی احتیاج کے سلسلہ میں سلطان ابراہیم سے کچھ معروضات کریں گے، آپ کے برادرانہ مکارم اخلاق سے توقع ہے کہ بمقتضائے ادخال السرور فی قلب المومن کالبحر و سائر العبادات کالقطر اور بفحوائے من اغبرت قدماه فی سبیل الله حرم الله جسده من ؟ (علی) النّار،

جہاں تک ممکن ہو ان کے معاملہ میں سعی بلیغ سے دریغ نہ فرمائیں گے، چونکہ اس دیار کے درویش اور دور و نزدیک کے پریشان خاطر اصحاب سمجھتے ہیں کہ اس فقیر اور جناب عالی کے درمیان خصوصی نسبت و تعلق ہے، اس لئے ضرورت پڑتی ہے کہ گاہے گاہے اوقات شریفہ کا نقصان

ہو، امید ہے کہ اس بارے میں معذور قرار دیں گے، والسلام [1]

اس آئینہ میں قاضی صاحب کے فضل وکمال کی صحیح تصویر نظر آتی ہے، اور ان کے مقام و مرتبہ کا پتا چلتا ہے،

قاضی صاحب اور ان کے معاصر علماء ومشائخ

سلاطین شرقیہ جونپور میں سلطان ابراہیم شاہ شرقی کا چالیس سالہ دورِ حکومت ہر اعتبار سے سلطنت شرقی کا دورِ زرین تھا، زراعت کی ترقی، رعایا پروری، علم دوستی، علماء نوازی، احکام شرعیہ کا اجراء، زہد واتقاء اور عدل وانصاف کے جو اوصاف سلطان ابراہیم شاہ میں تھے، اس کی نظیر کسی دوسرے شرقی بادشاہ میں نہیں ملتی، حکومت کے ان برکات کے ساتھ ساتھ ملک العلماء قاضی شہاب الدین کے علم وفضل کا سلسلہ الگ اپنا کام کرتا رہا، اور تخت وتاج کے سایہ میں علمیت ومشیخت کی حکمرانی اس طرح قائم تھی کہ دیارِ پورب سیف وعلم اور علم وقلم کی مملکت بن گیا تھا، شہر آشوب دہلی کے نتیجہ میں جون پور علماء وفضلاء اور مشائخ سے معمور ہو گیا تھا، اور مختلف مکاتب علم وفکر کے علمائے اعیان واعلام یہاں موجود تھے، جن میں علوم وفنون کے اساتذہ، عقل ودانش کے جہابدہ اور مشیخت و طریقت کے عباقرہ سب ہی شامل تھے، قاضی صاحب اسی انجمن کے صدر نشین تھے، ان میں علم و معرفت کی جامع شخصیت تھی، اس لئے عالمانہ شان کے ساتھ مشائخانہ وقار بھی تھا۔ شریعت کے امور ومعاملات میں سختی نے ان کے مقام کو اور بھی بلند کر دیا تھا۔ عام طور سے ہر طبقہ کے علماء ومشائخ سے ان کے تعلقات نہایت خوشگوار تھے اور ان کی علمی ودینی بالادستی کو سب ہی تسلیم کرتے تھے، مگر کچھ ایسے معاصرین بھی تھے، جن سے کبھی کبھی تصادم بھی ہو جاتا تھا، بعض لوگ سجدۂ تعظیمی کے نام پر شریعت کے مزاج کے خلاف عمل کرتے تھے، شاہ بدیع الدین مدار کا طریقہ نہایت قابل اعتراض تھا۔ کبیر ہندی کے افکار، اسلام کے عقائد سے میل نہیں کھاتے تھے اس لئے قاضی صاحب کو ان کا شدید احتساب کرنا پڑتا تھا، بعض اہل علم ومعاصرین سے فقہی وکلامی مسائل پر بحث ہوتی تھی، ان

[1] اخبار الاخبار ص ۱۶۲ و ۱۶۳ ذکر سید اشرف سمنانی

کے مقام و منصب کے لئے ضروری تھا، وہ ملک العلماء اور قاضی القضاۃ تھے، شرقی سلطنت نے ان کو شریعت کے تحفظ کا ذمہ دار بنایا تھا، اگر وہ ان امور میں تعلقات کا لحاظ اور مداہنت کا مظاہرہ کرتے تو اپنے فرض میں کوتاہی کرتے اس لئے انھوں نے اپنے فرائض کی ادائیگی میں پوری مستعدی سے کام لیا۔ وہ اپنے ذہن و مزاج کے اعتبار سے بہت بلند انسان تھے۔ اپنے تلامذہ تک سے بوقت ضرورت استفادہ کرنے میں ان کو عار نہ تھا۔ شاہی دربار میں عظمت و رسوخ کے باوجود، ہر شخص کے مرتبہ کا پورا لحاظ رکھتے تھے، اہل علم کی حاجت روائی ان کا محبوب مشغلہ تھا، سلطان سے ان کی سفارش کرنے میں مشہور تھے، طلبہ پر شفقت کا یہ حال تھا کہ ان کے لئے مستقل طور سے کتابیں لکھا کرتے تھے، ان کی استعداد و صلاحیت کے ابھارنے میں ہر طرح کی مدد کرتے تھے۔ شریعت میں سختی کے باوجود مشائخ کی بعض باتوں کو حتی الامکان اچھے معنوں میں محمول کرتے۔ علماء و مشائخ کے درمیان غلط فہمیوں کو دور کرتے تھے۔ غرض قاضی صاحب نے چالیس سال تک سلطان ابراہیم کے ساتھ ساتھ دینی علوم کے درس و تصنیف اور علماء و مشائخ میں اس طرح زندگی بسر کی کہ واقعی ملک العلماء معلوم ہوتے تھے۔ وہ شرقی سلطنت کے پورے دور میں اپنی جامعیت، افادیت، تدریسی و تصنیفی خدمت اور شان و وقار میں منفرد تھے، اور یہ اوصاف و کمالات مجموعی طور سے ان ہی کا حصہ تھے۔

حضرت شیخ احمد عبدالحق ردولوی سے شاہی دربار میں ملاقات

حضرت شیخ احمد عبدالحق ردولویؒ متوفی ۸۳۷ھ رحمۃ اللہ علیہ ابراہیمی دور کے بلند پایہ شیخ اور عبّاد و زہاد میں تھے، انوار العیون میں ان کی اور قاضی صاحب[1] کی ملاقات کا تذکرہ ان الفاظ میں ہے:۔

[1] آگے چل کر قاضی صاحب کو اور شیخ احمد عبدالحق کی اولاد میں ارادت اور قرابت دونوں کا تعلق ہو گیا تھا، قاضی شہاب الدین کے نواسے شیخ صفی الدین کے پوتے شیخ عبدالقدوس گنگوہی شیخ احمد عبدالحق کے پوتے شیخ محمد کے مرید اور خلیفہ ہوئے، اور شیخ عارف احمد بن شیخ احمد عبدالحق کی صاحبزادی ان سے منسوب ہوئیں۔

ایک مرتبہ شیخ العالم سلطان ابراہیم شاہ کی ملاقات کو گئے، اس وقت دربار میں صدر العلماء بدر الفضلاء، استاذ الشرق والغرب، عالمِ ربانی، نعمانِ ثانی مخدوم قاضی شہاب الدین لہریا نور اللہ مرقدہ بھی موجود تھے۔ دونوں حضرات دینی و علمی گفتگو میں مصروف ہو گئے۔ اثنائے گفتگو میں شیخ العالم نے معرفت و طریقت کی کوئی بات فرمائی جسے سن کر قاضی صاحب نے کہا کہ ہم اہل ظاہر آپ کے علم الٰہی تک پہنچنے سے قاصر ہیں۔ شیخ العالم نے فرمایا۔

ارے تو بیچارہ لہریا باشی، ترا ازیں حال وازیں مقال چہ خبر؟	ارے تو بے چارہ لہریا ہے تجھ کو اس حال و مقال کی کیا خبر؟

قاضی صاحب نے بے چوں و چرا آپ کی بات مان لی، دربار میں میر صدر جہاں بھی موجود تھے، لوگوں نے یہ واقعہ ان سے بیان کیا تو میر صاحب نے کہا کہ مخدوم قاضی شہاب الدین! جس وقت شیخ اور سلطان کی ملاقات ہو آپ یہ تمنا نہ کریں سلطان ہم کو، آپ کو اور جملہ شاہی انتظامات و معاملات کو علی حالہ باقی رکھے گا، بلکہ ان کی موجودگی تک کوئی نظام اپنی جگہ نہیں رہے گا، شیخ موصوف ان کے ارباب کمال اور اصحاب حال میں سے ہیں کہ ان کی نظر اکسیر کا حکم رکھتی ہے اور مس خام کو کندن بنا دیتی ہے، قاضی صاحب یہ باتیں سن کر سوائے اس کے کچھ نہ بولے کہ ''راست'' (درست ہے)۔

مشائخ کرام کے ادب و احترام اور ان کے حال و قال کی رعایت کے سلسلے میں حضرت سید اشرف سمنانی کا واقعہ تفصیل سے گذر چکا ہے ان کے ایک جملہ الناس ''کلھم عبد لعبدی'' پر جونپور میں کیا ہنگامہ برپا ہو رہا تھا، مگر قاضی صاحب نے اسے کس حسن و خوبی سے فرو کیا، اگر قاضی صاحب کی سلامتی طبع درمیان میں نہ ہوتی تو معلوم نہیں علماء و مشائخ کا یہ معاملہ کہاں تک طول کھینچتا۔

علمی وقار کا لحاظ اور قاضی صاحب اور سید اجمل میں تکرار

قاضی صاحب کے معاصرین میں سلطان ابراہیم کے وزیر صدر جہاں سید اجمل نہایت بزرگ تھے، ایک مرتبہ دربار میں ان سے اور قاضی سے تقدیم و تاخیر کے بارے میں تکرار ہو گئی،

قاضی صاحب کے سامنے علم کے وقار کا سوال پیدا ہوگیا، انھوں نے سید اجمل سے فرمایا کہ میری علمیت معلوم و متیقن ہے، اور آپ کی علویت مشکوک و مشتبہ ہے اس لئے آپ کے مقابلہ میں مجھ کو آگے رہنا چاہئے، اور مجھ کو ترجیح حاصل ہے، بعد میں قاضی صاحب نے اس موضوع پر ایک رسالہ بھی لکھا، جس میں مشکوک و مشتبہ نسبتِ علویت کے مقابلہ میں معلوم و متیقن علمیت کو افضل و راجح ثابت کیا مگر جب اس کی خبر انکے استاذ کو ہوئی تو وہ خفا ہو گئے۔

استاذ قاضی شہاب الدین را ایں معنی	قاضی شہاب الدین کے استاذ کو ان کی یہ
از وے ناخوش آمد و مزاج از وے منحرف	بات ناپسند معلوم ہوئی، اور ان کی طرف
گشت[۱]	سے مزاج میں برگشتگی پیدا ہوگئی۔

قاضی صاحب کو اسکی خبر ہوئی تو انھوں نے استاذ کی خفگی دور کرنے کے لئے ''مناقب السادات'' کے نام سے ایک رسالہ تحریر فرمایا، جس میں سادات کی افضلیت بیان کر کے سابقہ خیال سے رجوع فرمایا، اور عذر و معذرت پیش کی،[۲]

یہاں استاذ سے مراد سید اشرف جہانگیر سمنانی ہیں جو سادات اور اہل بیت سے اس درجہ عقیدت و محبت رکھتے تھے کہ اہل سنت والجماعت کے محتاط مسلک کے علی الرغم یزید پر لعنت کے جواز میں ایک کتاب لکھی ہے۔

سید اور عالم کی افضلیت و مفضولیت کی بحث سراسر علمی اور تحقیقی ہے، اسے عقائد سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس لئے قاضی صاحب نے اپنے ایک بزرگ اور مخدوم کے احترام میں اپنی رائے و تحقیق سے رجوع کر کے عالمانہ اخلاق اور تواضع و فروتنی کا ثبوت دیا خود خواجہ صدر جہاں سید اجمل بھی شریعت و طریقت کے علوم و معارف کے جامع اور ورع و تقویٰ میں بہت آگے تھے، اپنے زمانے کے مستند مشائخ اولیاء میں سے تھے سلطان ابراہیم ان سے بڑی عقیدت رکھتا تھا، اور ان ہی کی خاطر دریا کے کنارے نہایت ہی خوبصورت مسجد بنوائی تھی، جو آج بھی جھجھری مسجد کے نام

---

[۱] اخبار الاخیار ص ۱۷۶ [۲] تجلی نور ج ۱ ص ۵۰، اعظم المطابع جون پور ۱۸۸۹ء

سے مشہور ہے، حتیٰ کہ سلطان ان کی خانقاہ کے قریب دفن کیا گیا،

سید اجمل بزرگ ہونے کے باوجود علم میں قاضی صاحب سے کم درجہ کے تھے، اسی لئے قاضی صاحب ان کی کم علمی کے مقابلہ میں اپنی عالمیت کو فوقیت دیتے تھے۔

قاضی نصیر الدین سے قاضی صاحب کی علمی التماس

قاضی نصیر الدین گنبدیؒ متوفی ۸۱۷ھ قاضی شہاب الدین کے استاذ بھائی ہیں، دونوں نے دہلی میں مولانا عبدالمقتدر سے تعلیم حاصل کی تھی، قاضی نصیر الدین نے فراغت کے بعد دہلی میں مسند درس بچھائی مگر فتنۂ تیموری میں وہ بھی جون پور چلے آئے، اور سلطان ابراہیم شاہ کی طرف سے یہاں کے قاضی مقرر ہوئے، اس عہدہ کے ساتھ درس و تدریس کا مشغلہ جاری کیا، اسی زمانہ کا واقعہ ہے کہ قاضی شہاب الدین نے حواشی کافیہ لکھ کر قاضی نصیر الدین کی خدمت میں بھیجے اور خواہش کی کہ اسے اپنے یہاں داخل درس کرلیں، تاکہ دوسرے علماء میں بھی اسے مقبولیت ہو قاضی نصیر الدین نے اسے دیکھ کر یہ رائے دی۔

خوب نوشتہ اند، احتیاج درس گفتن مانیست	خوب کتاب لکھی ہے، اس کو میرے درس کی حاجت نہیں ہے،

شاہ عبدالحق صاحب نے اس کی وجہ ان کی باطنی اشغال کی مصروفیات یا بحث و مباحثہ سے بچنے کا خیال بتایا ہے، وجہ جو بھی ہو اس سے قاضی شہاب الدین کی بے نفسی کا کمال ظاہر ہوتا ہے کہ ملک العلماء قاضی القضاۃ اور مقرب بادشاہ سلطان نے ایک دوست سے ایک خواہش ظاہر کی اور ان کے انکار پر کوئی ناگواری ظاہر نہیں کی، یہ ان کا علمی انکسار اور اپنے معاصر عالم کا احترام تھا وہ چاہتے تو اپنی کتاب پوری شرقی سلطنت میں داخل درس کرا سکتے تھے۔ یہ عجیب بات ہے کہ قاضی صاحب کی تصانیف میں جس قدر شہرت و مقبولیت اس کتاب کو حاصل ہوئی وہ کسی کتاب کو نصیب نہیں ہوئی۔

قاضی نظام الدین کے ساتھ حسن سلوک

قاضی نظام الدین غزنوی جونپوری غزنی میں تحصیل علم کر کے جب ہندوستان آئے تو اس زمانہ میں سلطان ابراہیم شاہ کی علم پروری اور علماء نوازی کا شہرہ عام تھا، اس لئے وہ بھی جون پور چلے آئے، یہاں قاضی شہاب الدین سے ملاقات ہوئی، قاضی صاحب نے ان کا فضل وکمال دیکھ کر سلطان ابراہیم کے مقربین میں شامل کرا دیا، سلطان نے ان کو مچھلی شہر کا قاضی مقرر کیا، ۸۷۵ھ میں فوت ہوئے، ان کی اولاد مچھلی شہر اور دوسرے علاقوں میں خوب پھلی پھولی، ان میں بڑے بڑے علماء ومشائخ پیدا ہوئے[1]

قاضی صاحب اپنے معاصرین کے علم وفضل کا بھرپور اعتراف کرتے تھے، اور ان کی تحقیق پر پورا پورا اعتماد رکھتے تھے، ان کا یہ وصف قاضی نظام الدین صاحب کے بارے میں بہت مشہور تھا، اور کسی مسئلہ میں ان کی تحقیق دیکھتے تو بنا تردد اسے مان لیتے تھے، صاحب تجلی نور نے لکھا ہے کہ قاضی نظام الدین علوم دینیہ میں اس قدر بلند پایہ تھے کہ ملک العلماء قاضی شہاب الدین اپنی منفردانہ علمی شان کے باوجود کسی استفتاء پر اپنی مہر ثبت نہیں کرتے تھے، اور نہ ہی وہ استفتاء علماء کے نزدیک معتبر ہوتا تھا، جب تک کہ قاضی نظام الدین کا دستخط اس پر نہ ہوتا[2]

قاضی نظام الدین کے اسی جوہر قابل کو دیکھ کر ملک العلماء نے سلطان سے ان کے بارے میں سفارش کی، اور ان کے علمی ودینی مقام کے مطابق ان کا اعزاز کیا۔ علماء ومشائخ کی خدمت اور ان کی مدد کے سلسلے میں سید اشرف سمنانی کے اس مکتوب کا ذکر ضروری ہے، جس میں سید صاحب نے شیخ رضی کے بارے میں قاضی صاحب سے سفارش فرمائی ہے کہ وہ سلطان سے ان کے معاملہ میں گفتگو کریں اور گاہے گاہے ایسے معاملات میں ان سے خدمت لی جائے گی، یہ پورا مکتوب اوپر گزر چکا ہے۔

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۱۷۶ [2] تجلی نور ج ۲ ص ۴۱

مولانا فقیہ حیرتی سے مباحثہ

قاضی صاحب کے معاصرین میں مولانا فقیہ حیرتی منقولات ومعقولات کے زبردست عالم تھے، درس وتدریس کا مشغلہ تھا، بیسیوں بار اصول بزدوی کا درس دے چکے تھے، ایک بار قاضی صاحب اور مولانا حیرتی کے درمیان ایک علمی مسئلہ پر مباحثہ ہوا، جس میں قاضی صاحب کو کامیابی ہوئی، اس موقع پر بھی قاضی صاحب نے اپنی علمی فروتنی اور اپنے تلامذہ کے فضل کے اعتراف کا مظاہرہ فرمایا، اخبار الاصفیاء کی روایت کے مطابق اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک مرتبہ سلطان نے طے کیا کہ کل قاضی شہاب الدین اور مولانا فقیہ حیرتی سر دربار مباحثہ ومناظرہ کریں اور اس مناظرہ میں جو عالم غالب ہوگا وہی دربار کا صدر نشین ہوگا، اتفاق سے مولانا فقیہ حیرتی کے کئی تلامذہ اس وقت جونپور میں موجود تھے، جو ان کو علمی مدد پہنچا سکتے تھے، اور قاضی صاحب علم تازہ اور حوصلہ بلند رکھنے کے باوجود تنہا تھے، اس لئے کچھ متفکر تھے، خیال آیا کہ اپنے پرانے شاگرد شیخ محمد بن عیسیٰ کے پاس چلنا چاہیے، جو علم وروحانیت کے جامع ہیں، اور ترک وتجرید کی زندگی اختیار کر چکے ہیں، چنانچہ ان کے پاس جاکر فرمایا کہ ہمارا شاگرد اس وقت ہمارے کام نہیں آئے گا تو کب آئے گا؟ تم نے تو کتابوں کی دنیا سے کنارہ کشی کر کے کنج تنہائی اختیار کر لی ہے، اس لئے باطنی توجہ سے کام لو،

وگفت شاگرد اگر درچنیں روز گار	فرمایا شاگرد اگر ایسے حالات میں کام نہ آئے گا
بکار نیاید، بچہ کار آمد، وچوں تو آتش	تو کس کام کا۔ اور جب تم نے کتابوں کو آگ
در اوراق زدہ کُنج خمول گزیدہ	لگا کر تنہائی اختیار کر لی ہے اس لئے اپنی باطنی
بارے توجہ باطن خود دریغ ندادی	توجہ سے دریغ نہ کرو (اور میری مدد کرو)

شیخ محمد بن عیسیٰ نے عرض کیا حضرت آپ کا علم خود آپ کی مدد کرے گا، آج رات کو کتابوں کے صندوق میں ہاتھ ڈالیے، جو کتاب پہلے ہاتھ میں آجائے اسی کا مطالعہ کیجئے، اس کا دیکھنا کافی ہوگا، اور آپ کو کامیابی ہوگی،

شیخ محمد گفت امشب دست در صندوق کن دہر کتابے کہ بدست آید مطالعہ فرما، ہمچناں در کتاب کافی ست، ونصر ازتست [1]	شیخ محمد بن عیسیٰ نے عرض کیا کہ آج رات میں کتابوں کے صندوق میں ہاتھ ڈالئے اور جو کتاب ہاتھ لگے مطالعہ فرمایئے اور آپ کے لئے کتاب کا اتنا ہی مطالعہ کافی ہے۔ انشاء اللہ آپ کو فتح ہوگی

استاد نے شاگرد کے کہنے پر عمل کیا تو انہی کی کتاب الارشاد ہاتھ میں آئی، اس لئے ابتدا میں تامل ہوا، پھر شیخ محمد بن عیسیٰ کی ہدایت کے مطابق اس کا مطالعہ شروع کیا، اتفاق سے ایک مشکل مقام آگیا، جو دو گھنٹے میں حل ہوا، پھر اصول بزدوی کا مطالعہ کیا، قاضی صاحب کا خیال تھا کہ مولانا حیرتی اس کتاب کو تقریباً بیس بار پڑھا چکے تھے، ہوسکتا ہے کہ اسی کتاب کا کوئی مسئلہ زیر بحث آجائے، دوران مطالعہ اس میں بھی ایک مشکل مقام آیا، جو صبح ہوتے ہوتے حل ہوا، دوسرے دن دربار میں علماء وفضلا جمع ہوئے اور سلطان ابراہیم کے سامنے دونوں میں مناظرہ ومباحثہ ہوا، جس میں قاضی صاحب منصور ومظفر ہوئے [1]، یہ واقعہ بھی قاضی صاحب کے عالمانہ اخلاق کا آئینہ دار ہے، اگرچہ آپ جملہ علوم وفنون کے فاضل اور مصنف تھے، مگر جب آزمائش کا وقت آیا تو اپنے علم پر مغرور نہیں ہوئے اور اپنے شاگرد سے علمی تعاون کے طالب ہوئے، قاضی صاحب نے اسی شاگردِ عزیز کے لئے شرح اصول بزدوی لکھی تھی۔

شیخ ابوالفتح سے علمی وکلامی مباحثے

شیخ ابوالفتح بن عبدالحیٔ بن عبدالمقتدر شریحی کندی متوفی ۸۵۸ھ، قاضی صاحب کے استاد کے پوتے ہیں، جودت طبع اور تبحر علمی میں دادا کے جانشین تھے، فتنہ تیموری میں وہ بھی جونپور چلے آئے تھے، ان میں اور قاضی صاحب میں اکثر فقہی وکلامی مسائل میں بحث ومناظرہ ہوتا تھا،

قاضی شہاب الدین در اصول کلامیہ وفروع فقہیہ بے ہمتا بود۔"	قاضی شہاب الدین اصول علم کلام اور فقہی علوم وفروع میں بے مثال تھے۔

[1] اخبار الاصفیاء ورق ۷۰

دونوں ایک ہی میدان کے مرد تھے، مختلف فیہ مسائل میں دادِ تحقیق دیا کرتے تھے، اسی سلسلہ میں ایک مرتبہ زباد (بلی نما ایک جانور سے نکلا ہوا خوشبودار مادہ) کی طہارت ونجاست کی بحث چل پڑی، شیخ ابوالفتح ناپاک اور نجس مانتے تھے، اور قاضی صاحب طہارت کے قائل تھے، انھوں نے اس پر ایک رسالہ بھی لکھا جس میں زباد کی پاکی اور طہارت ثابت کی یہ بحث اتنی بڑھی کہ تلخی کی نوبت آ گئی۔

واولاد او بعضے سخنان از وے دریں بحث نقل می کنند، معلوم می شود کہ بر شیخ طریقہ موالی از طعن و تشنیع خصم غالب بود، وتحمل کہ آنہا ہم درایام بحث بسبب بعضے از عوارض عارض شدہ باشد، یادر انجا تیتے نیز درست دادہ باشد واللہ اعلم[1]

شیخ ابوالفتح کی اولاد نے زباد کی طہارت و نجاست کی بحث میں ان کی بعض باتیں بیان کی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ شیخ پر دشمن کے طعن و تشنیع سے دوستوں کا طریقہ غالب تھا۔ گمان یہ ہے کہ بحث و مباحثہ کے دنوں میں جو معارضے واقع ہوئے وہ بھی اس جگہ درست رہے ہوں۔

خلاف شرع امور پر احتساب ونکیر

قاضی صاحب جس علمی و روحانی سلسلہ سے منسلک تھے، اس کے بزرگوں کے نزدیک شریعت اصل تھی، خود قاضی صاحب اس معاملہ میں بڑے سخت تھے، اور بقول اپنے ایک معاصر کے "تشرع بسیار داشت" کی صفت سے مشہور تھے، وہ خود بھی صاحب عرفان تھے، اور روحانی طرق و سلاسل کا احترام کرتے تھے، مگر شریعت کے معاملہ میں کسی شخص اور روحانی سلسلہ سے ایسی مفاہمت نہیں کرتے تھے، جو مذہبی عقائد و اعمال کے خلاف ہو، اور ہر خلاف شریعت امر کی شدت سے مخالفت کرتے تھے، اور اس بارے میں کسی کی پروانہیں کرتے تھے، اور اپنے شاگردوں اور متوسلوں کو لیکر مقابلہ پر آ جاتے تھے، اسی لئے قاضی صاحب کے احتساب سے بچنا بڑا مشکل تھا۔

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۷۰۔

شیخ رکن الدین کے سجدۂ تعظیمی پر شدید احتساب

شیخ رکن الدین ہروی جونپوری متوفی ۸۷۴ھ ابراہیمی دور میں دہلی سے جونپور آئے، طریقت کی تعلیم شیخ تاج الدین جھونسوی سے حاصل کی تھی، جب شیخ جلال الدین بخاری جونپور آئے تو ان سے بھی کسب فیض کیا اور ان کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی اور معاملہ یہاں تک پہونچا کہ ان کے مریدین ان کو سجدۂ تعظیمی تک کرنے لگے، اور وہ ان کو روکتے نہ تھے، اس لئے قاضی شہاب الدین نے ان کی عنایت اور مقبولیت کی کوئی پروا نہ کی اور نہ ان سے سخت باز پرس اور احتساب کیا، اور شریعت کے مقابلہ میں شیخ رکن الدین کی مشیخت کی مطلق پروا نہ کی، ایک مرتبہ شیخ رکن الدین سے ایک خلاف شرع حرکت صادر ہوئی اس کی خبر سے قاضی صاحب کا مزاج سخت برہم ہوا، اور اپنے شاگرد شیخ عبدالملک عادل کو بھیج کر یہ پیغام دیا کہ وہ اپنے مریدوں میں توحید کا بیان اور سجدہ کی ادائیگی شرعی طور سے کریں کرائیں، ورنہ ان کے شہر بدر کرنے کا حکم دیا جائے گا، شیخ عبدالملک عادل ایک جماعت لیکر شیخ رکن الدین کے یہاں پہونچے مگر وہاں جاکر ان پر عجیب کیفیت طاری ہوگئی اور شیخ رکن الدین کے معتقد ہوگئے، اس خبر سے قاضی صاحب کو بڑا رنج ہوا اور کوتوال شہر نصرت خان کو پروانہ لکھا کہ وہ جاکر شیخ رکن الدین کو شہر بدر کا حکم دے، مگر کوتوال مذکور بھی ان کے پاس جاکر خوش اعتقاد ہوگیا اور واپس آکر سلطان ابراہیم سے عرض کیا کہ شیخ رکن الدین کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے اسی میں مصلحت ہے، یہ سنکر سلطان ابراہیم نے بھی چشم پوشی کی۔[۱]

کبیر ہندی پر سخت نکیر

کبیر ہندی کے بہت سے خیالات شریعت کی رو سے قابل قبول نہیں ہیں بلکہ ان کی شخصیت بھی مختلف فیہ ہے وہ ابراہیمی دور میں تھے ایک مرتبہ کبیر شیخ رکن الدین سے ملنے کے لئے آئے، قاضی صاحب کے تلامذہ کو معلوم ہوا تو ہجوم کر دیا اور شیخ رکن الدین نے ان کو اپنی حفاظت میں شہر سے باہر کر دیا۔[۲]

---

[۱] تجلی نور ج اص ۲۰، ۳۳ [۲] نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۱۶۹

شاہ مدار کا انکار پھر اقرار

اس دور میں شیخ بدیع الدین مدار مکن پوری متوفی ۸۴۴ھ کی شخصیت بھی بڑی پر اسرار اور مختلف فیہ تھی، ان کے ابتدائی احوال وخیالات غیر اسلامی تھے، اوران کا ظاہر سخت قابل اعتراض تھا، اس لئے قاضی صاحب ابتدا میں ان کی مشیخت و بزرگی کے منکر تھے، حالانکہ شاہ مدار ان کے مرشد سید اشرف سمنانی کے معاصر وہم سفر رہ چکے تھے، جب شاہ مدار نے قاضی صاحب کے شکوک دور کردیے، اس وقت وہ ان کے قائل ہو گئے، شاہ عبدالحق صاحب نے شاہ مدار اور قاضی صاحب کی معاصرت اور تعلق کا تذکرہ صرف اتنا کیا ہے۔

مکتوبے او مردم ہست کہ گویند شاہ مدار آں را بجانب قاضی شہاب الدین نوشتہ بود [۱]

ان کا ایک خط "مردم" نام سے ہے، کہتے ہیں کہ شاہ مدار نے اسے قاضی شہاب الدین کو لکھا تھا

اور اخبار الاصفیاء میں ہے، قاضی شہاب الدین ابتدا میں شاہ مدار کے منکروں میں تھے مگر آخر میں ان کے معتقد ہو گئے۔ ایک مرتبہ قاضی صاحب نے شاہ مدار سے پوچھا کہ اس حدیث "العلماء ورثۃ الانبیاء" میں کن علماء کی طرف اشارہ ہے شاہ مدار نے کہا وہ علماء مراد ہیں، جنھوں نے ظاہری تعلیم کی طرف رخ نہیں کیا، اور علم لدنی میں کامیابی حاصل کی کیونکہ میراث کسب سے نہیں ملا کرتی۔ [۲]

ملا عبدالقادر بدایونی نے بھی اس خط وکتابت کا تذکرہ کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قاضی صاحب نے شاہ مدار کو لکھا کہ کیا حدیث العلماء ورثۃ الانبیاء کی رو سے مجھے وارث انبیاء کہہ سکتے ہیں؟ شاہ مدار نے جواب دیا کہ نہیں وارث کو وراثت بغیر جد وجہد کے ملتی ہے اور آپ نے دودِ چراغ اور محنت شاقہ سے چند وہمی نقوش حاصل کئے ہیں، رسول ﷺ کے وارث وہ فقراء ہیں جنھوں نے علم الٰہی بنا کسب کے وھبی طور سے پایا ہے۔ [۳]

دوسری جگہ لکھا ہے کہ میں نے ذمہ داروں سے سنا ہے کہ شاہ مدار کی صحبت سلطان ابراہیم

---

[۱] اخبار الاخیار ص ۱۶۰ [۲] اخبار الاصفیاء ورق ۵۵، [۳] نجات الرشید ص ۱۷۳

شرقی اور ملک العلماء سے راس نہیں آسکی اس لئے شاہ مدار نے مجبوراً مکن پور میں اقامت اختیار کی ا!

جب تک شاہ مدار کے ظاہری احوال قاضی صاحب کے سامنے تھے، ان کے منکروں میں رہے، مگر بعد میں جب افہام وتفہیم اور خط وکتابت کے ذریعہ اصل حقیقت معلوم ہوگئی اس وقت قاضی صاحب ان کی مشیخت کے قائل ہوئے۔

شعروشاعری

قاضی شہاب الدین شعروشاعری کا بھی اچھا ذوق رکھتے تھے، قاضی عبدالمقتدر جیسے فصیح و بلیغ اور ادیب وشاعر کی شاگردی اور ہم نشینی نے ان میں شعروسخن کا بڑا ستھرا ذوق پیدا کر دیا تھا۔ شاہ عبدالحق صاحب نے لکھا ہے'' وسلیقہ شعر نیز دارد'' اور صاحب خزینۃ الاصفیاء لکھتے ہیں، '' درفن شعر نیز مہارت تام داشت'' لیکن ان کے اشعار نہیں ملتے، اس کی وجہ یہ ہے کہ قاضی صاحب کا اصل میدان درس وتدریس اور تصنیف و تالیف تھا۔ شعر و شاعری سے صرف ذوق کی حد تک تعلق تھا۔ انھوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی، شاہ عبدالحق صاحب نے ان کا ایک قطعہ نقل کیا ہے۔[٢]

جونپور کا دوبارہ علمی و دینی ماحول اور تدریسی خدمات

تحصیل علم سے فراغت کے بعد ایک زمانہ تک قاضی صاحب دہلی میں درس وتدریس کی خدمت انجام دیتے رہے، جب ۸۰۱ھ میں تیموری فتنہ کے زمانہ میں کالپی چلے گئے، مگر وہاں کی فضا آپ کے حق میں سازگار نہیں تھی، اس لئے جون پور چلے آئے، اور باقی عمر یہیں درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں بسر کی یہ علاقہ صدیوں سے علم وفضل اور روحانیت ومشیخت کا گہوارہ تھا، اور پورب کے دیار میں شاہانہ شرقیہ جون پور کے بہت پہلے تغلقوں کے دور سے کڑا مانک پور اور اودھ

ا ص ۱۴۸، ٢ اخبار الاخیار ص ۱۷۶

(اجودھیا) سے علم وروحانیت کے چشمے پھوٹ رہے تھے، جونپور سے متصل اودھ کی سرزمین سے آٹھویں صدی میں کئی سرآمدگان روزگار اٹھے، جن کے علمی غلغلہ اور روحانی روشنی سے پورا ہندوستان معمور ومنور تھا، یہ روشنیاں دہلی کے میناروں سے پورے ملک کو منور کررہی تھیں، قاضی شہاب الدین نے دہلی میں ان ہی اساتذہ ومشائخ سے علم ومعرفت کی تکمیل وتحصیل کی تھی۔ شیخ الاسلام فرید الدین اودھی، مولانا بدرالدین اودھی، شیخ جلال الدین اودھی، شیخ جمال الدین اودھی، شیخ زین الدین اودھی، شیخ فتح اللہ اودھی، شیخ نصیرالدین محمود بن یحیٰ اودھی، چراغ دہلی وغیرہ اسی سرزمین کے فرزند تھے جن میں سے اکثر دہلی چلے گئے اور وہیں سے ان کے علمی وروحانی فیوض عام ہوئے اسی طرح کڑا مانک پور اور دوسرے قصبات علم وفضل اور علماء وفضلاء کے مرکز تھے، پھر جب ۷۹۶ھ میں ملک سرور خواجہ جہاں نے جونپور میں شرقی سلطنت قائم کی تو یہاں کے گلستانِ علم و فضل میں بہار آگئی، دلّی پر تیمور کے حملہ کے بعد یہاں کے بہت سے اہل علم جون پور آگئے، اسی طرح اودھ اور پورب کے علمی ودینی فیوض وبرکات دہلی سے اپنے وطن میں لوٹ آئے اور جون پور دلّی ثانی بن گیا۔ تیموری فتنہ میں بہت سے علماء ومشائخ اور ان کے خانوادے دہلی سے جون پور آئے، اور اپنے اپنے انداز میں کام پر لگ گئے، مگر حق یہ ہے کہ ان میں قاضی شہاب الدین نے جو شہرت و ناموری حاصل کی وہ کسی کے حصہ میں نہیں آئی، اور اس میں ان کا کوئی معاصر شریک وسہیم نہیں ہے۔

اس دور میں جونپور میں متعدد علمائے فحول کی درسگاہیں جاری تھیں، مگر آہستہ آہستہ ان درسگاہوں کی افادیت میں کمی آتی گئی اور حالات میں کچھ ایسی تبدیلی آئی کہ علماء کا ذوق روحانیت و مشیخت کا رنگ اختیار کرنے لگا، بڑے بڑے علماء اور اساتذہ مدرسوں کی بھیڑ بھاڑ سے نکل کر خانقاہوں کی پرسکون فضا میں قال کے بجائے حال سے مانوس ہو گئے، اس سے جونپور کی اکثر درسگاہیں ختم ہوگئیں، مگر اس زمانہ میں بھی شہاب الدین کا مدرسہ پوری شان کے ساتھ چلتا رہا ان کے بعد بھی ان کا فیض جاری رہا، ان کے شاگرد رشید شیخ عبدالملک جونپوری متوفی ۸۹۷ھ اس کے صدر مدرس ہوئے اور ان کے فیض یافتگان میں درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کا سلسلہ برابر جاری رہا، قاضی نصیرالدین گنبدی متوفی ۸۱۷ھ جب دہلی سے جون پور آئے تو سلطان ابراہیم

نے ان کو جون پور کا قاضی بنایا وہ درس وتدریس میں بھی شہرت رکھتے تھے، مگر جلد ہی انھوں نے ترک وتجرید کی زندگی اختیار کر لی، اوران کا علمی فیض بند ہو گیا۔

مولانا شیخ فتح اللہ اودھی متوفی ۸۲۱ھ مدتوں دہلی میں درس دے چکے تھے، جون پور آنے کے بعد یہ سلسلہ ختم کر کے ارشاد وتلقین میں مصروف ہو گئے، اور اپنے مرید خاص شیخ محمد ابن عیسٰی کو جو دہلی سے نئے نئے جونپور آئے تھے، قاضی صاحب کے پاس بھیج کر ان کی تعلیم مکمل کرائی،

مولانا قاضی تاج الدین ظفر آبادیؒ متوفی ۸۳۱ھ فقرائے کبار میں اور ظفر آباد کے قاضی تھے، ابتدا میں درس وتدریس کا مشغلہ تھا، بعد میں اس کو ترک کر کے زہد وعبادت میں منہمک ہو گئے،

مولانا حسام الدین جونپوری متوفی ۸۴۰ھ نے عہد ابراہیمی میں ایک زمانہ تک تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا، بعد میں وہ بھی اس سے الگ ہو گئے، اور شاہ بدیع الدین مدار سے طریقۂ مداریہ حاصل کر کے ان کی صحبت اختیار کی۔

مولانا قیام الدین ظفر آبادیؒ متوفی ۸۱۷ھ دہلی کے علماء فحول میں تھے، ظفر آباد آنے کے بعد تعلیم وتدریس میں مشغول ہوئے، اور مدتوں یہ خدمت انجام دیتے رہے مگر آخر میں ترک وتجرید اور زہد وقناعت کا گوشہ پسند کیا۔

مولانا نور الدین ظفر آبادی، متوفی ۸۲۶ھ، بڑے عالم وفاضل تھے، اور تدریسی مشاغل میں زندگی بسر کرتے تھے پھر مشائخ کا طریقہ اختیار کر لیا اور درس وتدریس چھوڑ کر قلتِ طعام قلتِ منام اور قلتِ کلام پر کاربند ہو گئے۔ یہ غور کرنے کی بات ہے کہ شہر آشوب دہلی کے اثرات کی وجہ سے جونپور کے علماء وفضلاء کا رجحان ترک وتجرید کی طرف ہو گیا تھا، تو دوسرے مقامات کا کیا حال رہا ہوگا۔ مگر یہ صورتِ حال وقتی اور ہنگامی تھی۔ اس کے بعد پھر علوم وفنون کے گلشن میں بہار آ گئی اور ایک صدی کے اندر پھر دیارِ پورب شیرازِ ہند بن گیا، اور یہ ان چند درسگاہوں کا فیض تھا جو اس دور میں بھی جونپور میں پورے نشاط کے ساتھ علوم وفنون کی تعلیم واشاعت میں سرگرم تھیں اور ان کے اساتذہ وتلامذہ علم وفن کے قصرِ معلّی کے سپاہی بن کر اس کی حفاظت کر رہے تھے۔ ان میں قاضی شہاب الدین اور ان کے تلامذہ سب سے آگے تھے۔ جن کا علمی سلسلہ تعلیم وتدریس اور تصنیف وتالیف کے میدان میں اپنے

اسلاف کے طریقہ پر کام کرتا رہا،

قاضی صاحب نے جونپور آتے ہی محلہ خواجگی میں اپنا مدرسہ قائم کر کے تعلیم شروع کر دی تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری کیا، اور بقول شاہ عبدالحق دہلوی اگر چہ قاضی صاحب کے زمانہ میں بہت سے علماء و فضلاء اور دانشور موجود تھے، جن میں ان کے اساتذہ و شرکائے درس بھی شامل تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے جو شہرت و مقبولیت ان کو عطا فرمائی ان میں سے کسی کو نصیب نہ ہوئی، بقول شیخ عبدالقدوس گنگوہی وہ استاذ الشرق و الغرب مانے گئے۔ اور بقول صاحب سبحۃ المرجان ''فزیّن القاضی مسند الافادۃ وفاق البرجیس فی افاضہ السعادۃ'' اور بقول صاحب تذکرہ علمائے ہند'' قاضی وسادۂ افادہ و درس بجونپور مزیّن فرمود و تبصنیف کتب مصروف گردید''

تلامذہ

اس طرح قاضی صاحب نے ابراہیمی دور میں چالیس سال سے زیادہ علم و فن اور دین کی خدمت کی اور اپنے پیچھے کارناموں کا وسیع سلسلہ چھوڑا ظاہر ہے کہ جس عالم نے دہلی میں درس دیا پھر جون پور میں مسند تدریس بچھائی اور پچاس ساٹھ سال تک اسی مشغلہ میں جس کی زندگی گزری، اس کے تلامذہ، منتسبین اور اس کی درس گاہ کے فیض یافتہ علماء و فضلاء کی تعداد بہت زیادہ ہوگی، مگر افسوس ہے کہ ان میں سے صرف چند لوگوں کے بارے میں قاضی صاحب سے تلمذ کی تصریح کتابوں میں ملتی ہے، جن کو ہم یقین کے ساتھ ان کے تلامذہ میں شمار کر سکتے ہیں۔ ان میں سرفہرست ان کے تین نواسے ہیں، جنھوں نے دہلی کے زمانۂ قیام میں ان سے تعلیم حاصل کی تھی۔ ان کے جن تلامذہ کے تلمذ کی تصریح موجود ہے ان کے مختصر حالات یہ ہیں۔

شیخ صفی الدین ردولویؒ

حضرت شیخ صفی الدین بن شیخ نصیر الدین بن شیخ نظام الدین غزنوی دہلوی ردولویؒ دہلی میں پیدا ہوئے ان کے دو بھائی شیخ رضی الدین اور شیخ فخر الدین تھے، یہ تینوں قاضی شہاب الدین

کے نواسے اور ان کے خصوصی تلامذہ میں ہیں، فتنۂ تیموری کے بعد شیخ صفی الدین اور ان کے بھائی اپنے خاندان کے ساتھ دہلی سے جون پور چلے آئے اس خاندان کا قاضی شہاب الدین سے خصوصی رشتہ تھا، اور علم و فضل میں بھی ممتاز تھا اس لئے سلطان ابراہیم شاہ شرقی نے اسے مرحمتِ خسروانہ سے نوازا شیخ صفی الدین نے دہلی میں اپنے نانا قاضی شہاب الدین سے علوم وفنون کی تحصیل و تکمیل کی۔ اس کے بعد سید اشرف سمنانی سے طریقت کی تعلیم حاصل کر کے ان کے محبوب ترین خلیفہ ہوئے، اور انھوں نے بھی اپنے نانا کی طرح فراغت کے بعد درس و افتاء اور تصنیف کا مشغلہ اختیار کیا کافیہ کی شرح غایۃ التحقیق ان کی مشہور تصنیف ہے، جس میں اپنے نانا کی شرح کافیہ کو شروح کافیہ میں بہترین کتاب بتایا ہے، اور اس کی بڑی تعریف کی ہے چلپی نے کشف الظنون میں غایۃ التحقیق کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کی دوسری مشہور کتاب علم صرف میں دستور المبتدی ہے، جسے اپنے صاحبزادے شیخ ابو المکارم اسمٰعیل کے لئے لکھا تھا۔ شیخ صفی الدین علم و حکمت میں یکتائے زمانہ اور شریعت کے جامع تھے، ۱۳؍ ذیقعدہ ۸۱۹ھ میں فوت ہوئے، اس وقت ان کے نانا بقید حیات تھے۔

ان کے صاحبزادے شیخ ابو المکارم اسمٰعیل ۷۹۸ھ میں پیدا ہوئے، اس وقت ان کا خاندان دہلی میں آباد تھا، سید اشرف سمنانی نے ان کو بچپن ہی میں اپنے حلقہ ارادت میں شامل کر لیا تھا۔ والد نے ان کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ کی، بڑے ذہین وطباع تھے، تقریباً سولہ سال ہی کی عمر میں علومِ مروجہ کی تحصیل سے فراغت حاصل کر کے درس و افادہ میں مشغول ہو گئے، ۸۱۹ھ میں اپنے والد شیخ صفی الدین کے وصال کے بعد ان کے جانشین ہوئے، اور تقریباً چالیس سال تک اپنے فیوض و برکات سے خلق اللہ کو مستفیض کرنے کے بعد ۱۱؍ ربیع الاول ۸۶۰ھ میں وفات پائی۔

شیخ ابو المکارم اسمٰعیل کے چار صاحبزادے تھے اور سب کے سب عالم و فاضل اور بزرگ تھے جن میں زیادہ مشہور شیخ عبد القدوس بن شیخ ابو المکارم اسمٰعیل بن شیخ صفی الدین بن شیخ نصیر الدین گنگوہیؒ متوفی ۹۴۵ھ ہیں، جو حضرت شیخ احمد عبد الحق ردولوی کے پوتے ہیں، شیخ محمد بن عارف کے مرید اور خلیفہ ہیں آپ نے شیخ احمد عبد الحق کے ملفوظات و احوال کو انوار العیون فی اسرار المکنون میں

جمع کیا ہے، ان کے علاوہ شیخ ابو المکارم اسمٰعیل کے تین صاحبزادے شیخ عبدالصمد، شیخ عزیز اور شیخ حبیب عرف مخدوم مٹھن تھے، یہ سب اپنے والد سے علم و معرفت حاصل کر کے ان کے خلیفہ ہوئے۔ ان ہر سہ حضرات کا تعلق سلسلۂ چشتیہ نظامیہ سے تھا، اور شیخ عبدالقدوس نے سلسلۂ چشتیہ صابریہ سے منسلک ہو کر گنگوہ ہی میں سکونت اختیار کی۔ ۱؎

قاضی رضی الدین ردولویؒ

انھوں نے بھی اپنے نانا قاضی شہاب الدین سے جملہ علوم و فنون حاصل کئے اور اپنے اسلاف کے طرز پر درس تدریس کی زندگی بسر کی، سلطان ابراہیم شاہ شرقی نے ان کو ردولی کا قاضی بنایا، اسی لئے انھوں نے وہیں مستقل بود و باش اختیار کر لی۔ اس زمانہ میں ان کے بڑے بھائی شیخ صفی الدین مرشد کامل کی تلاش میں ردولی گئے۔ وہاں سید اشرف سمنانی سے ملاقات ہوئی سید صاحب نے ان کو اپنے حلقۂ ارادت و خلافت میں لے لیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ شیخ رضی الدین سید اشرف کی وفات ۸۰۸ھ سے پہلے ہی ردولی کے قاضی بنائے جا چکے تھے، اور اس سے چند سال پہلے ان کے والد اور نانا دہلی سے جون پور آ گئے تھے، اور ان کی پیدائش اور تعلیم و تربیت کے تمام مراحل دہلی میں ہی گزر چکے تھے، اور نزہۃ الخواطر کی یہ تصریح ان کے بارے میں صحیح نہیں ہے کہ وہ جون پور میں پیدا ہوئے، اور وہیں نشو نما پائی، اور اپنے نانا قاضی شہاب الدین سے تحصیل علم کر کے ایک مدت تک ان کی خدمت میں رہے۔ ۲؎

واقعہ یہ ہے کہ قاضی رضی الدین کی ولادت، نشو و نما اور نانا سے تحصیل علم کے تمام مراحل قیام دہلی کے زمانہ میں طے ہو چکے تھے۔

شیخ فخر الدینؒ ردولوی

شیخ صفی الدین اور شیخ رضی الدین کے حقیقی بھائی اور قاضی شہاب الدین کے نواسے ہیں،

۱؎ اخبار اخیار، تذکرہ علمائے ہند، نزہۃ الخواطر، ۲؎ نزہۃ الخواطر جلد ۳ ص ۱۷۱

انھوں نے بھی اپنے بھائیوں کی طرح اپنے نانا کی خدمت میں رہکر علوم وفنون کی تحصیل وتکمیل کی تذکرۂ علمائے ہند میں تینوں بھائیوں کے بارے میں تصریح ہے۔

''دہر یکے بخدمت قاضی شہاب الدین جد مادری خود باکتساب علوم متداولہ دانشمند ومتجر شدند''

ان میں سے ہر ایک اپنے نانا قاضی شہاب الدین کی خدمت میں علوم مروجہ کی تعلیم حاصل کر کے زبردست عالم اور دانشور ہوئے۔

شیخ فخر الدین کے بارے میں بھی ''نزھة الخواطر'' کی یہ تصریح کہ

ولد ونشأ بجونپور [1]

(جون پور میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو نما پائی) محل نظر ہے

شیخ محمد بن عیسیٰ جونپوریؒ

جون پور کے علمائے کبار اور مشائخ عظام میں ظاہری وباطنی کمالات میں جامع شخصیت رکھتے تھے، وطن دہلی تھا، تیموری فتنہ میں حدود ۸۰۱ھ میں جونپور چلے آئے، اس وقت ان کی عمر صرف سات آٹھ سال کی تھی، اسی عمر میں پہلے شیخ ابوالفتح جونپوری کی صحبت میں رہے، اس کے بعد شیخ فتح اللہ اودھی کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوگئے، جو اودھ کے رہنے والے تھے، اور دہلی میں درس وتدریس کی خدمت انجام دے چکے تھے، مگر جونپور آنے کے بعد اس مشغلہ سے کنارہ کش ہوگئے تھے، اس لئے انھوں نے اپنے اس کمسن مسترشد کو مشورہ دیا کہ وہ قاضی شہاب الدین کی درس گاہ میں داخل ہوکر علوم شرعیہ کی تکمیل کریں۔ ایک روایت میں ہے کہ ان کے والد نے قاضی صاحب کے پاس بھیجا۔

نہایت ذہین وذکی تھے، اس لئے قاضی صاحب نے بھی ان کی طرف خصوصی توجہ فرمائی، اور اسی شاگرد عزیز کے لئے اصول بزدوی کی شرح تا بحث امر تحریر فرمائی، قاضی صاحب ان سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے،

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۹۶ ونزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۱۱۵

شیخ محمد بن عیسیٰ تکمیل کے بعد درس و تدریس میں مشغول ہوئے مگر بعد میں اس کو ترک کر کے اپنے شیخ و مرشد فتح اللہ اودھی کی صحبت میں رہے، اور علائق دنیا سے علاحدہ ہو گئے، اور عبادت و ریاضت کی دنیا آباد کی۔ قاضی شہاب الدین کو اپنے اس شاگرد کی ولایت و کرامت پر بڑا ناز و اعتماد تھا۔ ایک بار مولانا فقیہ حیرتی سے مناظرہ کے سلسلہ میں ان کی خصوصی توجہ چاہی تھی،[1]

سلطان ابراہیم شاہ اور ان کا لڑکا سلطان محمود شاہ ان کا بے حد معتقد تھا، دونوں بادشاہوں نے بار بار خدمت کرنی چاہی مگر انھوں نے ہمیشہ استغناء اور بے نیازی ظاہر کی دوسرے امراء و حکام کے ہدایا و تحائف بھی قبول نہیں کرتے تھے، اسی سلسلہ میں یہ اشعار پڑھا کرتے تھے،

من دلقِ خود باطلس شاہان نمی دہم	من فقرِ خود بملکِ سلیماں نمی دہم
از رنج فقر در دلِ گنجے کہ یافتم	ایں رنج را براحتِ شاہاں نمی دہم

﴿میں بادشاہوں کے ریشمی کپڑے (اطلس) کے بدلے میں اپنی گدڑی نہیں دے سکتا۔ میں اپنے فقر کو سلیماں علیہ السلام کے ملک و حکومت سے نہیں بدل سکتا۔ رنج فقیری کی وجہ سے میرے دل میں ایک خزانۂ عظیم ہے اس لئے میں بادشاہوں کی راحت لے کے اس رنج کو نہیں دے سکتا۔﴾

آپ کا معمول تھا کہ نماز جمعہ محلّہ دریبہ کی مسجد خالص مخلص میں ادا کرتے تھے۔ ایک دن سلطان محمود نے آپ کی پیرانہ سالی کے پیشِ نظر عرض کیا کہ اگر حکم ہو تو خانقاہ کے قریب مسجد تعمیر کر دی جائے؟ آپ نے فرمایا بہت اچھی نیت ہے چنانچہ اس کے بعد سلطان محمود شرقی نے جامع مسجد (جامع الشرق) کی تعمیر کا آغاز کیا، اور سلطان حسین شاہ شرقی نے اتمام کو پہونچایا، اسی عظیم الشان اور پرشکوہ مسجد کے پیچھے دو تین گلی کے بعد آپ کا مزار ہے،

حضرت شیخ محمد بن عیسیٰ ۱۴؍ ربیع الاول سنہ ۸۷۰ھ میں فوت ہوئے،

ان کے تلامذہ میں شیخ بہاء الدین عمری جونپوریؒ متوفی ۹۱۱ھ بڑے مرتبہ کے عالم و بزرگ ہیں، شیخ محمد بن عیسیٰ سے تعلیم حاصل کر کے سید راجہ حامد شاہ مانک پوری سے طریقت کی تعلیم و تربیت پائی، اور نو سال تک ان کی خدمت میں رہے، اس کے بعد حرمین شریفین میں تیس سال تک

[1] ص ۱۷۸ کتاب ہذا ملاحظہ فرمائے،

زہد وتقویٰ علم وفضل کی زندگی بسر کی۔ مکہ مکرمہ کے علماء ومشائخ سے حدیث اور طریقت میں کسب فیض کیا، اور کتب احادیث سے خصوصی شغل وشغف رکھا، ارشاد السالکین ان کی مشہور کتاب ہے۔

شیخ محمد بن عیسیٰ کے دوسرے مشہور شاگرد شیخ مبارک ارزانی بنارسیؒ متوفی ۹۸۰ء ہیں، جو علم حدیث میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ ان کو دینی وعلمی مرتبہ کے ساتھ دنیاوی جاہ وجلال بھی حاصل تھا۔ شیر شاہ سوری اور اس کے لڑکے سلیم شاہ سوری کے عہد حکومت میں وزارت کے عہدہ پر فائز رہے، مدارج الاخبار ان کی مشہور تصنیف ہے، جس میں مشارق الانوار کی حدیثوں کو ترتیب دیا ہے۔[1]

مولانا عبدالملک عادل جونپوریؒ

نواب عماد الملک وزیر سلاطین شرقیہ کے صاحبزادے ہیں، جون پور میں پیدا ہوئے، بچپن ہی میں قاضی شہاب الدین کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور اٹھارہ سال کی عمر میں علوم متداولہ سے فراغت پاکر یکتائے زمانہ ہوئے، اور اپنے استاذ کے جانشین بنے، اور ان کے طریقہ پر درس وتدریس وافتاء اور تصنیف وتالیف کا سلسلہ جاری رکھا، قاضی شہاب الدین کی وفات کے بعد ان کے مدرسہ کے صدر المدرسین اور جانشین بنائے گئے، اور پچاس سال تک تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد ۱۲ ربیع الاول ۸۹۷ھ میں فوت ہوئے۔

تجلی نور میں ہے کہ آپ قاضی صاحب کے راسخ ومرتاض شاگردوں میں سے تھے، بڑے ذہین وطباع تھے۔

جس وقت وہ سن شعور کو پہنچے قاضی شہاب الدین نے اپنی خوشی وخواہش سے ان کی تعلیم وتربیت پر توجہ کی، اور چند سال میں ابتداء سے انتہاء تک پہنچا دیا۔

ایک دن شیخ عبدالملک عادل نے قاضی صاحب کی شرح کافیہ پر حاشیہ لکھ کر ان کی

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۷۰، تجلی نور ج ۱ ص ۲۲، ۲۳، تذکرۃ العلماء ص ۲۱، تذکرہ علمائے ہند ص ۲۰۵۔

خدمت میں پیش کیا، قاضی صاحب نے اسے دیکھ کر مسرت کا اظہار کیا اور فرمایا ''علم قاضی بر سفینۂ عادل آمد'' اس دن سے شیخ عبدالملک عادل قاضی صاحب کے مقرب ترین شاگرد قرار پائے۔

شیخ الہ داد بن عبداللہ جونپوریؒ

مولانا عبدالملک عادل کے تلامذہ میں شیخ الہ داد بن عبداللہ جونپوریؒ متوفی ۹۲۳ھ زبردست عالم و فاضل اور باخدا بزرگ تھے، سید راجہ حامد مانک پوری کے مرید وخلیفہ تھے، انھوں نے بھی اپنے اسلاف واساتذہ کے طریقہ پر فراغت کے بعد درس افتاء اور تصنیف کا مشغلہ اختیار کیا اپنے استاد الاستاذ قاضی شہاب الدین کی شرح کافیہ پر بہترین حواشی لکھ کر ان کی شرح وتعلیق کی، نیز ہدایہ، اصول بزدوی اور تفسیر مدارک التنزیل کے شروح وحواشی لکھے ان کی شرح کافیہ کو قبول عام حاصل ہوا۔ اپنے زمانہ میں جونپور کے مشہور اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔ ان کے صاحبزادے شیخ بھکاری عہد لودھی کے علمائے فحول میں تھے۔ ایک مرتبہ سلطان وقت نے دہلی میں مناظرہ کی محفل منعقد کی، جس میں ایک طرف عبداللہ تلبنی اور شیخ عزیز تلبنی تھے اور دوسری طرف شیخ الہ داد اور ان کے صاحبزادے شیخ بھکاری تھے، سردربار مناظرہ کے بعد معلوم ہوا کہ شیخ الہ داد اور شیخ بھکاری علوم و مسائل کی تنقیح میں ماہر ہیں اور ان کے مدمقابل دونوں علماء تقریر میں آگے ہیں [1]

مولانا قطب الدین ظفرآبادیؒ

مولانا سید قطب الدین ابوالغیب بن سید نورالدین ابومحمد بن سید اسدالدین آفتاب ہند ۸۰۲ھ میں ظفرآباد میں پیدا ہوئے، حفظ قرآن کے بعد ابتدائی کتابیں اپنے والد شیخ نورالدین حنفی حسینی واسطی سے پڑھیں، اس زمانہ میں قاضی شہاب الدین کی علمی وتدریسی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر تھا، اور دور دور سے تشنگانِ علم ان کے چشمۂ علم پر آکر سیراب ہو رہے تھے، شیخ قطب الدین نے بھی قاضی صاحب کی خدمت میں اس طرح حاضری دی کہ پھر کسی دوسری

[1] اخبار الاخیار ص ۱۹۱، تجلی نور ج ۲ ص ۳۸، تذکرہ علمائے ہند ص ۲۵، ۳۳

درس گاہ کا رخ نہیں کیا، اور تمام کتب درسیہ اور علوم متداولہ کی تکمیل چار سال تک ان ہی کی شاگردی میں رہ کر تجلی نور میں ہے کہ آپ کے والد نے بقیہ علوم وفنون کی تکمیل کے لئے قاضی شہاب الدین ملک العلماء کی خدمت میں بھیجا آپ سادگی اور کم سخنی میں مشہور تھے، قاضی صاحب نے ان کی صلاحیت دیکھ کر کمال آرزومندی سے ان کی تعلیم وتربیت میں کوشش کی، اوران کی تعظیم وتوقیر میں کوئی کمی نہیں کی، دوسرے یہ دیکھ کر سخت متعجب ہوئے بلکہ آپس میں چہ می گوئیاں کرنے لگے، جب قاضی صاحب کو خبر لگی تو طلبہ سے کہا کہ تم لوگوں کو کیا معلوم؟ یہ لڑکا صفات وکمالات کا جامع اور علوم صوری ومعنوی سے آراستہ ہے، آگے چل کر سرآمدِ فضلائے دہر وزبدۂ کملائے وقت ہوگا، اس وقت اِس کے کمالات کا آفتاب درخشاں نہیں ہے، اور اسے خود معلوم نہیں ہے کہ میں کیا ہوں اور کیا ہونے والا ہوں اور اس کی تھیلی میں ٹھیکری ہے یا لعل شب چراغ ہے، آخر یہی ہوا اور چار سال گزرتے گزرتے تمام علوم وفنون میں درجہ کمال کو پہونچ کر قاضی صاحب کے ممتاز شاگردوں میں شمار ہوئے۔ اس کے بعد اپنے والد سے طریقت حاصل کر کے حج وزیارت سے مشرف ہوئے، نہایت متواضع، خوش اخلاق اور عابد وزاہد عالم وبزرگ تھے، ان کی ذات سے بہت سے بندگان خدا کو فیض ملا ۲۰؍جمادی الاخریٰ ۸۶۹ھ میں ظفر آباد میں فوت ہوئے۔[۱]

مولانا علاء الدین جونپوریؒ

نواب عماد الملک وزیر سلاطین شرقیہ کے چھوٹے لڑکے اور شیخ عبد الملک عادل کے بھائی ہیں، اور عطاء الملک لقب ہے جونپور کے مشاہیر علماء واساتذہ میں شمار کئے جاتے تھے۔ انھوں نے ایک مدت تک قاضی شہاب الدین کی خدمت میں رہکر مروّجہ علوم وفنون حاصل کئے،

تجلی نور میں ہے کہ تحصیل علم سے فارغ ہوگئے، اور درس وافتاء کے ساتھ تصنیف وتالیف کا مشغلہ اختیار کیا، ان کی تصانیف میں اپنے استاذ قاضی شہاب الدین کی شرح کافیہ کی شرح بھی ہے، استاذ نے اپنے عزیز شاگرد کے لئے جو کتاب لکھی شاگرد نے اس کی شرح لکھ کر حق شاگردی ادا کرنے کی کوشش کی، جون پور میں فوت ہوئے۔[۲]

---

[۱] تجلی نور ج ۲ ص ۳۹ و ص ۱۲ و ص ۱۳ [۲] تجلی نور ج ۲ ص ۳۹

قاضی سماء الدین جون پوری

قاضی شہاب الدین کے سلسلہ تلامذہ میں قاضی سماء الدین جون پوری بھی شامل ہیں جنھوں نے قاضی صاحب کے تلامذہ سے تحصیل علم کی تھی، اور اپنے زمانہ کے اعلم العلماء اور سلطان حسین شاہ شرقی کے استاذ تھے، بعد میں سلطان مذکور نے اپنا وزیر بنا کر قتلغ خاں کا لقب دیا تھا، ۸۸۳ھ میں جب سلطان حسین شاہ اور سلطان بہلول لودھی میں مقابلہ ہوا تو مولانا سماء الدین سلطان حسین کے ہمراہ تھے، سلطان بہلول لودھی نے ان کو گرفتار کر کے دہلی میں قید کیا، ۸۹۴ھ تک ان کے زندہ رہنے کی تصریح ملتی ہے [1]

تصانیف

قاضی شہاب الدین تدریسی خدمات کے ساتھ تصنیفی کارناموں میں بھی اپنے اقران و معاصرین میں خاص شہرت رکھتے ہیں، انھوں نے مختلف علوم وفنون میں ایسی معیاری کتابیں لکھیں جو آٹھویں صدی کے اسلامی ہند کی یادگار بن گئیں، صاحب تذکرۃ العلماء نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ قاضی صاحب کی تصانیف بہت زیادہ ہیں، ان کے حکم سے لوگ ان کی تصانیف بہترین خط میں لکھ کر ایران، توران، روم اور شام کے بادشاہوں کی خدمت میں بطور ہدیہ کے روانہ کرتے تھے، اور ان میں سے اکثر سلاطین بطور انعام و اکرام کے ان کتابوں کو سونے چاندی سے تول کر اپنے خادموں کے ذریعہ قاضی صاحب کی خدمت میں پیش کراتے تھے۔ [2]

ان کے ہر تذکرہ نگار نے ان کی تصنیفی خدمات کا خاص طور سے ذکر و اعتراف کیا ہے، اور ان کی کتابوں کا تعارف کرایا ہے۔ سب سے پہلے قاضی صاحب کے شیخ و مرشد سید اشرف سمنانی جو خود بھی زبردست عالم و مصنف تھے ان کی تصانیف کی داد دی ہے شاہ عبد الحق صاحب محدث دہلوی نے ان کی کئی تصانیف کا شاندار الفاظ میں تعارف کرایا ہے، فرشتہ نے لکھا ہے۔

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۹۶ و نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۱۱۵ [2] تذکرۃ العلماء ص ۱۴

''تصانیف مستحسنہ مفیدہ آن بزرگوار شہرت عام دارد''	انکی بہتر ومفید کتابیں عام طور سے مشہور ہیں۔

اس کے بعد چند خاص کتابوں کے نام درج کئے ہیں؛[1]

سبحۃ المرجان میں ہے

والف کتباً سارت بھا رکبان العرب و العجم (۳۹ ء)	قاضی صاحب نے وہ کتابیں لکھیں، جن کو عرب وعجم کے علمی قافلے اپنے ساتھ رکھتے تھے۔

خزینۃ الاصفیا میں ہے ''تصانیف وتوالیف عالی دارد (ج ۱ ص ۳۹۰) تذکرہ علمائے ہند میں ان کی تصنیفی خدمات کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے۔ '' قاضی وسادۂ افادہ ودرس بجونپور مزین فرمود، وبہ تصنیف کتب مصروف گردید''

اور بعض کتابوں کا نام بھی لکھا ہے، کسی مصنف کی کتابوں کا قبولِ عام اس کی زندگی ہی میں حاصل ہونا بڑی سعادت کی بات ہے، اور یہ سعادت قاضی صاحب کو حاصل تھی، چنانچہ ان کی حیات ہی میں ان کی کتابوں کو ہند و بیرونِ ہند کے علماء نے پڑھا، پڑھایا، ان کی شرحیں لکھیں ان کے اقتباسات سے اپنی کتابوں کو زینت دی، اور ان کے ساتھ خصوصی اعتناء کیا۔

قاضی صاحب کے تدریسی و تصنیفی جوہر قیام جونپور کے بعد ظاہر ہوئے، دہلی کے زمانۂ قیام میں اس کا کوئی نشان نظر نہیں آتا، چنانچہ ان کے تذکرہ نگاروں نے ان کی تصانیف کو جونپور کے زمانۂ قیام کی خدمات میں شمار کیا ہے، حالانکہ اس سے پہلے بھی قاضی صاحب چند کتابیں لکھ چکے تھے، خصوصاً الارشاد، بدیع البیان، جامع الصنائع اور بحر المواج کے بارے میں یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ وہ قیام دہلی کے زمانہ میں لکھی گئی تھیں، کیونکہ قاضی صاحب نے دہلی سے جونپور آنے کے بعد چند سال کے بعد ان کتابوں کو سید اشرف جہانگیر سمنانی متوفی ۸۰۸ھ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔

مختلف کتابوں سے آپ کی حسب ذیل تصانیف معلوم ہوسکی ہیں۔

---

[1] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۰۶

(۱) الارشاد فی النحو (۲) حواشی کافیہ (۳) بدیع البیان (۴) جامع الصنائع (۵) بحرالمواج (۶) شرح اصول بزدوی تا بحث امر (۷) رسالہ در تقسیم علوم (۸) مناقب السادات (۹) المصباح (۱۰) فتاویٰ ابراہیم شاہی (۱۱) عقیدۂ شہابیہ (۱۲) شرح قصیدہ بانت سعاد (۱۳) شرح قصیدہ بردہ (۱۴) رسالہ معارضہ (۱۵) ہدایۃ السعداء (۱۶) رسالہ در طہات زباد (۱۷) رسالہ در افضلیت عالم بر سیّد (۱۸) ایک کتاب تفسیر میں۔ مولانا خیرالدین جونپوری متوفی ۱۲۱۶ھ نے لکھا ہے کہ قاضی صاحب کی تصانیف میں شرح کافیہ، ارشاد، بدیع المیزان، بحرالمواج، شرح اصول بزدوی، شرح قصیدہ بانت سعاد، اور رسالہ مناقب السادات اس ضلع میں مشہور ہیں اور موئف کی (میری) نظر میں آچکی ہیں [۱] ان کتابوں کا مختصر تعارف یہ ہے،

الارشاد فی النحو

علم نحو میں اس نام کی متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں مگر قاضی صاحب کی کتاب کو جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ کسی اور الارشاد کے حصہ میں نہیں آئی۔ ملک اور بیرون ملک میں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا، اس کی اہمیت و افادیت کو سب سے پہلے سید اشرف سمنانی نے ان شاندار الفاظ میں ظاہر فرمایا۔

"اینکہ می گویند کہ سحر از ہندوستان راست — کہتے ہیں کہ جادو ہندوستان سے نکلا ہے تو
آمدہ غالباً ایں راست سحر" [۲] — شاید وہ جادو یہی کتاب ہے

شاہ عبدالحق صاحب نے لکھا ہے:۔ وارشاد در نحو کہ در وے تمثیل در ضمن تعبیر الزام نمودہ و ترتیب جدید اختیار فرمودہ است، نیز متنے است لطیف و بے نظیر و قریں [۳]

تاریخ فرشتہ میں ہے:۔ و متن ارشاد کہ در نحو کہ بصلح المثال است [۴]

سبحۃ المرجان میں ہے:

---

[۱] تذکرۃ العلماء ص ۱۵ [۲] لطائف اشرفی ج ۱ ص ۱۰۶ [۳] اخبار الاخیار ص ۱۷۵،

[۴] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۰۶

والارشـــاد وھو متن فــی النحو التزم فیه تمثیل المسألة فی ضمن تعریفھا[1]	ارشاد علم نحو کا متن ہے اس میں ہر مسئلہ کی تعریف کے ضمن میں اس کی مثال کا التزام کیا ہے ،

مآثر الکرام میں ہے:۔"وارشاد متن در علم نحو کہ تمثیل مسئلہ در ضمن تعبیر التزام کرد، وطرزے تازہ بروئے کار آوردہ"[2]

کشف الظنون میں ہے:۔

والارشـــاد متـــن لـــهٔ فـــی الـنـحـو تعمّق فی تھذیبیه کل التعمق و تانق فی ترتیبه حق التّانق اولـه الـحـمدُ لله کما یحبُ ویرضی[3]	ارشاد علم نحو میں ایک متن ہے جس کی تہذیب و تنقیح میں قاضی صاحب نے بڑا اہتمام کیا ہے، اور ترتیب میں کمال دکھایا ہے، اس کی ابتدا الحمد اللہ کما یحبُ ویرضیٰ سے ہوئی ہے،

صاحب خزینۃ الاصفیاء نے لکھا ہے:۔

"دوم کتاب ارشاد کہ در علم نحو بے عدیل"[4]

اس کتاب کی افادیت واہمیت کے پیش نظر ہند اور بیرون ہند کے مشاہیر نے اس کے شروح وحواشی لکھے چنانچہ علمائے ہند میں مولانا شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی متوفی ۹۹۸ھ نے اس کی ایک شرح لکھی تھی، سبحۃ المرجان میں ان کی تصانیف کے ذکر میں لکھا ہے،

شـرح الارشـاد لـلـقـاضـی شـھـاب الـدین الدولت آبادی فی الـنـحـو[5]	علامہ اجیہ الدین علوی کی تصانیف میں الارشاد فی نحو مولفہ قاضی شہاب الدین کی شرح بھی ہے،

تذکرہ علمائے ہند میں بھی شیخ وجیہ الدین علوی کی اس شرح کا ذکر ہے[6] اس کا نسخہ

---

[1] سبحۃ المرجان ص ۳۹، [2] مآثر الکرام ج ا ص ۱۸۹، [3] کشف الظنون ج ا ص ۱۸۶ [4] خزینۃ الاصفیاء جلد ا ص ۳۹۰ [5] سبحۃ المرجان ص ۴۵، [6] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۵۰۔

خطیہ جامع مسجد ممبئی میں اچھی حالت میں ہے جس پر یہ عبارت درج ہے۔

از کتب خانہ سرکار شیخ حامد بن عبدالمجید الگجراتی غفو اللہ ذنو بہا اور بعدہ اللھم اجعلنی حامداً محمودا ۱۰۸۲ھ نیز یہ عبارت ہے ''من عواری الفقیر الی اللہ فاضل بن الشیخ حامد کان اللہ لہما''

اور دوسری مہر یہ ہے:۔

''مدرسہ محمدی محروسہ احمد آباد ۱۲۶۱ھ''

اور تیسری مہر یہ ہے:۔

''بہادر شیخ ۱۱۹۳ھ''

باہر کے علماء میں مشہور محشی ابوالفضل خطیب گازرونی نے ارشاد کی ایک شرح لکھی ہے، جس کا تذکرہ کشف الظنون میں ان الفاظ میں ہے۔

وعلی متن الھندی شرح ممزوج للفاضل العلامۃ ابی الفضل الخطیب الکازرونی المحشی [1]	قاضی شہاب الدین ہندی کے متن الارشاد پر علامہ ابوالفضل خطیب گازرونی نے اس طرح شرح لکھی ہے کہ متن اور شرح کی عبارتیں ملی جلی ہیں

خطیب گازرونی نے قاضی صاحب کی شرح کافیہ پر بھی حواشی لکھے ہیں، تذکرہ علمائے ہند کے مصنف نے ارشاد کا ایک نسخہ مولانا مفتی علی کبیر مچھلی شہری کے کتب خانہ میں دیکھا تھا، (ص ۸۸) اس کا ایک قلمی نسخہ لائڈن کی لائبریری میں موجود ہے[2]

بدیع البیان

اس کا نام بعض کتابوں میں بدیع المیزان درج ہے عربی میں علم بیان اور بلاغت میں نہایت جامع متن ہے، اس زمانہ کے ذوق کے مطابق اس کی عبارت مسجع و مقفی ہے، اسے بھی قاضی

---

[1] کشف الظنون ج ۱ ص ۱۸۶ [2] المنجد فی العلوم والآداب ص ۳۷۱

صاحب نے سید اشرف سمنانی کی خدمت میں پیش کیا تھا، اور آپ نے اس کو پسند فرمایا تھا،[۱]
شاہ عبدالحق صاحب اس کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

''بدیع البیان نیز متنے است در علم بلاغت	بدیع البیان بھی ایسی جامع ہے کہ علم
دریں جا مقید بسجع شدہ است'' [۲]	بلاغت اس میں بند ہے اور یہ مسجع ہے

صاحبِ سبحۃ المرجان نے اس کا نام بدیع المیزان بتایا ہے اور لکھا ہے،

وبديع الميزان دهو متن فى فن	بدیع المیزان فن بلاغت کی جامع کتاب
البلاغته بعبارات مسجعه [۳]	ہے اس کی عبارت مسجع ہے

اور مآثر الکرام میں لکھا ہے،

' و بدیع المیزان متن درفن بلاغت کی	بدیع المیزان فن بلاغت کی جامع کتاب
عبارت مسجعہ دارد [۴]	ہے اس کی عبارت مسجع ہے

صاحب خزینۃ الاصفیاء نے اسے اپنے فن میں لاثانی کتاب بتایا ہے، ''سیوم بدیع البیان در علم بلاغت لاثانی است'' [۵]

تفسیر بحر مواج

فارسی میں کئی جلدوں میں قرآن مجید کی تفسیر ہے، اس کی تہذیب و تنقیح نہیں ہوسکی اور تسوید کے بعد کسی سبب سے تبییض کی باری نہیں آئی اس لئے اس میں حشو و زوائد رہ گئے، سید اشرف سمنانی نے اسے دیکھ کر کہا تھا، سخن خالی از اطالتے نیست [۶] (یہ مطول کتاب ہے)
شاہ صاحب نے اس کے متعلق یہ تفصیل لکھی ہے:۔

''بحر مواج تفسیر قرآن مجید کردہ بعبارت	بحر مواج، فارسی میں قرآن کی مفصل تفسیر
فارسی، دردے بیان ترکیب و معنی فصل در	ہے اس میں فصل در فصل ترکیب و معنی کو

---

[۱] لطائف اشرفی جلد ۲ ص ۱۰۶ [۲] اخبار الاخیار ص ۱۷۵، [۳] سبحۃ المرجان ص ۳۹ [۴] مآثر الکرام ج ۱ ص ۱۸۹ [۵] خزینۃ الاصفیاء جلد ۱ صفحہ ۳۹۰ [۶] لطائف اشرفی ج ۲ ص ۱۰۶

فصل وادہ است، ددرین جانیز برائے سجع	بیان کیا ہے اور اس میں کوشش کر کے مقفی
تکلفے کردہ است، قابل اختصار و تنقیح و	عبارتیں لکھی ہیں تہذیب و تنقیح اور اختصار
تہذیب است [1]	کے لائق ہے

شاہ صاحب کے انداز بیان اور تفصیلی تعارف سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب ان کی نظر سے گذری تھی صاحب خزینۃ الاصفیاء نے لکھا ہے۔ ''بحر مواج تفسیر قرآن کہ بعبارت فارسی نہایت مقبول [2]'' صاحب الاصفیاء نے اس کتاب کے بارے میں قاضی صاحب کا ایک خواب نقل کیا ہے کہ زمانہ تصنیف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کتاب کو بے حد پسند فرمایا اور قاضی صاحب کو اس کی جلد از جلد تکمیل کی تاکید فرمائی اس لئے قاضی صاحب نے تعمیل ارشاد میں بعجلت تمام کتاب مکمل کی۔

اس واقعہ کے آخر میں لکھا ہے

اختتام تفسیر ہماں بود، واجزاے حیاتش از	جس وقت تفسیر ختم ہوئی اسی وقت ان کی
شیرازۂ بدن پراگندہ شدہ ہماں [3]	حیات کا شیرازہ بکھر گیا۔

حالاں کہ بحر مواج قاضی صاحب کی ابتدائی تصانیف میں سے ہے، انھوں نے اسے ۸۰۸ھ سے پہلے سید اشرف سمنانی کی خدمت میں پیش کیا تھا اور اس کے تقریباً چالیس سال بعد فوت ہوئے خزینۃ الاصفیاء کے علاوہ قاضی صاحب کے کسی تذکرہ نگار نے یہ منامی واقعہ بیان نہیں کیا ہے۔

تفسیر البحر المواج کو ہندوستان میں علم تفسیر کا پہلا مفصل تصنیفی سرمایہ سمجھا جاتا ہے مگر اب تک اس کا مکمل نسخہ دستیاب نہیں ہو سکا ہے، اور نہ ہی کسی کتب خانہ میں اس کا پتہ چلتا ہے، مگر حکومت پاکستان کے ترجمان ''ماہنامہ فکر و نظر'' اسلام آباد ماہ رمضان المبارک ۱۳۹۵ھ مطابق اکتوبر ۱۹۷۵ھ میں کتب خانہ فاضلیہ کے چند نوادر کے عنوان سے اس کے فارسی مخطوطات پر ایک معلوماتی مقالہ شائع ہوا ہے، جس میں تفسیر البحر المواج کے بارے میں نہایت قیمتی معلومات درج

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۷۵ [2] مآثر الکرام ج ۱ ص ۱۸۹ [3] خزینۃ الاصفیاء جلد ۱ صفحہ ۳۹۱

ہیں، یہ کتب خانہ ٹیکسلا اور حسن ابدال کے علاقہ پنج کٹھ'' میں واقع ''گڑھی افغاناں'' نامی گاؤں میں ہے اس میں اس نادر اور قیمتی کتاب کا کامل قلمی نسخہ موجود ہے، پورا بیان یہ ہے۔

البحر المواج و السراج الوہاج ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی (م ۲۵ رجب ۸۴۹ھ/ ۱۴۴۵ء) کی مشہور تفسیر قرآن ہے۔ سلطان شمس الدین ابوالمظفر ابراہیم شاہ کے عہد (۸۰۴ھ۔ ۸۴۴ھ) میں لکھی گئی تھی، اور ابراہیم شاہ کے نام معنون ہے مکمل تفسیر تا حال طبع نہیں ہوئی، صرف چار ابتدائی سورتیں طبع ہوئی ہیں۔ تفسیر البحر المواج والسراج الوہاج (بحر مواج) کے مخطوطات دنیا کی اکثر لائبریریوں میں موجود ہیں مگر کسی معروف کتب خانے میں مکمل نسخہ نہیں ہے۔

پنجاب یونیورسٹی ذخیرۂ شیرانی میں پہلی دو جلدیں ہیں (رک: فہرست مخطوطات شیرانی جلد اول ص ۱) اسلامیہ کالج پشاور کی لائبریری میں سورۂ الحمد سے سورۂ توبہ اور سورۂ ص سے سورۂ والناس تک موجود ہے، لباب المعارف العلمیۃ ج اول ابتدائی آٹھ پاروں پر مشتمل ایک نسخہ قاضی اللہ بخش قریشی ساکن جلال پور پیر والا کے کتب خانہ میں محفوظ ہے (رک: نمائش نوادرات و مخطوطات جشن ملتان) بیرون پاکستان انڈیا آفس لائبریری لندن، بانکی پور پٹنہ اور ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کلکتہ میں نامکمل نسخے ہیں، انڈیا آفس لائبریری میں سورۂ الحمد سے سورۂ کہف تک کا حصہ ہے سورۂ مریم سے سورۂ والناس تک کے اجزاء ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کلکتہ کی لائبریری میں محفوظ ہیں، پنجاب یونیورسٹی شعبۂ تاریخ کے استاد اور مشہور محقق پروفیسر محمد اسلم صاحب نے بڑی تگ و دو کے بعد دونوں جگہوں سے دونوں حصوں کی مائیکرو فلمیں لی ہیں، پاکستان بھر میں غالباً مکمل نسخہ کی ایک یہی فلم ہے جو پروفیسر موصوف کے پاس ہے۔

یہ تفسیر کتب خانہ فاضلیہ میں تین جلدوں میں موجود ہے، چند اوراق افتادہ ہیں نسخہ نہایت خوشخط اور صاف ہے۔ نام کاتب اور تاریخ درج نہیں، البتہ تیسری جلد کے آخر میں ایک مہر ''شلر خاں ولد فتح خاں ۱۳۰۰ھ'' پڑھی جاتی ہے۔

جامع الصنائع

یہ کتاب فارسی میں علم بدائع وصنائع میں ہے سید اشرف سمنانی نے اسے دیکھ کر کہا تھا،

حضرت قاضی دریں فن ہم وست زدہ اند[1] قاضی صاحب اس فن میں بھی بازی مارلے گئے

پھر اپنے متوسل خاص شیخ واحدی کے بارے میں جو فارسی زبان کے زبردست شاعر تھے ،قاضی صاحب سے فرمایا،

''چوں ہمہ از علوم سر بردہ آید، فارسی را بشیخ گزاریدٗ آپ تمام علوم کے ماہر ہیں فارسی شیخ واحدی کے لئے چھوڑ دیجئے

شاہ صاحب نے اس کے بارے میں لکھا ہے۔

''ودر صنائع نیز رسالہ فارسی دارد''[2] (اور علم صنائع میں بھی ایک رسالہ فارسی زبان میں لکھا ہے

اور صاحبِ خزینۃ الاصفیاء نے لکھا ہے''ششم رسالہ در تقسیم صنائع (ج ا ص ۳۹۱)

حواشی کافیہ

یہ کتاب شرح کافیہ، شرح ہندی اور حاشیہ ہندی کے ناموں سے بھی مشہور ہے، علم نحو کے مشہور متن کافیہ ابن حاجب کی عربی میں نہایت مفید شرح ہے۔ اُسے قاضی صاحب نے اپنے لائق ترین شاگرد مولانا علاء الدین عمری جون پوری کیلئے تحریر کیا تھا، اوران کوان کا درس بھی دیا تھا، قاضی صاحب کواس کتاب کی اہمیت وافادیت کا خاص خیال تھا، اورانھوں نے اسے اپنے خواجہ تاش اور معاصر عالم قاضی نصیر الدین کی خدمت میں بھیجا، جو اس زمانہ میں درس وتدریس کا مشغلہ رکھتے تھے، اور یہ خواہش کی کہ آپ اس کتاب کو اپنے یہاں داخل درس کرلیں تو دوسرے علماء بھی اعتناء کریں گے، قاضی نصیر الدین نے قاضی صاحب کی خواہش تو پوری نہیں کی، مگراس کی داددی کہ

[1] اخبار الاصفیاء ورق ۶۰

خوب نوشتہ اند احتیاج درس گفتن نیست[1]	آپ نے خوب لکھا ہے نصاب میں شامل ہونے کی محتاج نہیں ہے

اس کے بعد قاضی صاحب کی تمنا یوں پوری ہوئی ، اور ان کی زندگی ہی میں یہ کتاب مقبول ہوکر داخل درس ہوئی، کئی علماء نے اس کی شرحیں اور حواشی لکھے، شاہ عبدالحق صاحب لکھتے ہیں :۔

"از تصنیفات او یکے حواشی کافیہ است کہ در لطافت و متانت بے عدیل واقع شدہ دہم حالت حیات او مشہور عالم گشتہ"[2]	ان کی تصانف میں ایک حواشی کافیہ ہے۔نہایت سنجیدہ اور علمی کتاب ہے اور ان کی زندگی میں ہی شہرت پا گئی۔

صاحبِ مشکوٰۃ نے بھی اسی کتاب کی تعریف وہ توصیف میں شاہ صاحب کے یہ الفاظ استعمال کئے ہیں۔[3]

فرشتہ نے لکھا ہے کہ" حاشیہ کافیہ کہ مشہور است بحاشیۂ ہندی"[4]

صاحبِ سبحۃ المرجان نے اسے قاضی صاحب کی مشہور ترین تصنیف قرار دیا ہے ،

والحواشی علیٰ کافیۃ النحو وھی اشھر تصانیفہ[5]

اور مآثر الکرام میں ہے:۔

از تصانیف قاضی حواشی کافیہ درحین حیات او مشہور آفاق گشتہ[6]	قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی کتاب حواشی کافیہ ان کی زندگی میں ہی مشہور زمانہ ہوگئی۔

اس کتاب کی سب سے پہلی شرح قاضی صاحب کے اسی شاگرد رشید نے لکھی، جس کے لئے انھوں نے تحریر فرمایا تھا، چنانچہ مولانا علاء الدین جون پوری نے فراغت کے بعد اس پر مفصل حاشیہ لکھا۔اس کے بعد قاضی صاحب کے تلمیذ التلمیذ مولانا الہ داد جون پوری نے اس کا حاشیہ لکھا، بیرون ہند کے شارحین میں مولانا ابوالفضل خطیب گارزونی ، شیخ غیاث الدین منصور، اور شیخ توقانی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں کشف الظنون میں شروح کافیہ کے بیان میں ہے۔

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۷۶ [2] اخبار الاخیار ص ۱۷۵ [3] مشکوٰۃ النبوۃ قلمی ۲۳۱،

[4] تاریخ فرشتہ ج۲ ص ۳۰۶ [5] سبحۃ المرجان ص ۳۹ [6] مآثر الکرام ج ۱ ص ۱۸۹

وشرحها شهاب الدين احمد بن	شہاب الدین عمر بن ہندی متوفی
عمر الهندی المتوفی ۸۴۹ھ تسع	۸۴۹ھ نے کافیہ کی شرح لکھی ،
وار بعين وثمانمائة ، و عليه حاشية	جس پر مولانا میاں الہ داد
لمولانا الفاضل ميان......	جونپوری کا حاشیہ ہے ، نیز اس
(الـه داد لجانبوری) وعلى شرح	شرح ہندی پر توقانی ، گازرونی اور
الهندی حاشيةللتوقانی وللكازرونی	غیاث الدین منصور کے حواشی
ولغياث الدين منصور[1]	ہیں ۔

تجلی نور میں ہے کہ جب شیخ عبدالرحمٰن جامیؒ نے کافیہ کی شرح لکھی ، اور قاضی صاحب نے اسے ملاحظہ کیا ، تو فرمایا کہ '' ملا جامی خلاصہ شرح ہندی مانوشت ''[2] جو بظاہر صحیح معلوم نہیں ہوتا کیوں کہ حضرت شیخ عبدالرحمٰن جامی کی وفات ۸۹۷ھ میں ہوئی اور ان سے تقریباً چالیس پہلے قاضی صاحب کی وفات ہوچکی تھی ۔

رسالہ در تقسیم علوم

یہ رسالہ فارسی میں تھا ، اخبار الاخیار (۱۷۵) مآثر الکرام میں ہے '' رسالہ فارسی در تقسیم علوم و صنائع (ج ا ص ۱۸۹) خزینۃ الاصفیاء (جلد ا ص ۳۹۱) تذکرہ علمائے ہند (ص ۸۸) میں اس کا نام رسالہ در تقسیم علوم درج ہے ، سبحۃ المرجان میں بھی اس کا تذکرہ ہے ، نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ تعریفاتِ سید جرجانی کے طرز پر یہ کوئی کتاب ہوگی ، جس میں علوم وفنون کی تعریف و تقسیم کا بیان ہوگا ۔

---

[1] کشف الظنون ج ا ص ۲۵۰ [2] تجلی نور ج ا ص ۳۴ ،

رسالہ درطہارتِ زباد

قاضی صاحب کی تصانیف کی فہرست میں اس نام کی کوئی مستقل کتاب نہیں ہے، البتہ ان کے اور شیخ ابوالفتح کے درمیان فقہی بحث ومناظرہ کے سلسلہ میں اس کا ذکر ملتا ہے چنانچہ حضرت شاہ صاحب نے شیخ ابوالفتح کے تذکرہ میں قاضی شہاب الدین سے ان کے مباحثہ کے ذکر میں لکھا ہے۔

وقاضی بطہارتِ اومی رفت، وانچہ دے در بعضے رسائل کہ دریں مبحث تالیف کردہ و نوشتہ است"[1] الخ	قاضی شہاب الدین زباد کے پاک ہونے کے قائل تھے اور انھوں نے بعض رسالوں میں اس موضوع پر بھی کہا اور لکھا ہے

زباد یعنی کچے نافۂ مشک کو قاضی صاحب پاک اور شیخ ابوالفتح ناپاک مانتے تھے، اس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

رسالہ افضلیتِ عالم برسیّد

اس کتاب کا نام بھی قاضی صاحب کی مستقل تصانیف میں نہیں ملتا، صرف مناقب السادات کی تصنیف کے سلسلہ میں اس کا پتہ چلتا ہے شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ سید اجمل اور قاضی صاحب کے درمیان دربار میں تقدیم وتاخیر کے معاملہ میں تکرار ہوگئی قاضی صاحب نے کہا،

علمیت ما مشخص ومتیقن است وعلویت شما مشکوک، پس مارا تقدیم وترجیح برشما ثابت باشد ودرین باب رسالہ نوشت[2]	میرا عالم ہونا ثابت ومعلوم ہے اور تمہارا علوی ہونا مشکوک ہے، تم پر میری فضیلت اور برتری ثابت ہے، اس سلسلہ میں انھوں نے رسالہ لکھا ہے۔

---

[1] اخبارالاخیار ص ۱۷۰ [2] اخبارالاخیار ص ۱۷۶

اس رسالہ کی تصنیف پر قاضی صاحب کے ایک استاذ ناراض ہو گئے اس لئے انھوں نے اپنے قول سے رجوع کر کے مناقب السادات لکھی، صاحب خزینۃ الاصفیاء نے اس رسالہ کو کتاب کے نام سے یاد کیا، اور لکھا ہے۔

'ازیں سبب کتابے درذکرفضیلت علماء برسادات تصنیف کردہ، ودراں کتاب درج کرد کہ فضیلت علماء بسبب علم کہ ہست در عالم اظہر است وفضیلت علویت سادات موہوم کہ اثبات آن بسا مشکل''	اپنے استاد کی خفگی دور کرنے کے لئے انھوں نے علمائے سادات کی فضیلت میں کتاب لکھی اور اس میں کہا کہ علم کے سبب علماء کی جو فضیلت ہے وہ لوگوں پر ظاہر ہے اور علوی سادات کی فضیلت موہوم ہے کہ اس کو ثابت کرنا اور دکھانا کافی مشکل ہے

پھر لکھا ہے کہ قاضی صاحب نے بعد میں اس کتاب کو دریا برد کر دیا۔

''وکتابے کہ تصنیف کردہ بود در دریا انداخت وبجائے آن در مناقب سادات رسالہ تالیف کرد''[1]	اپنی لکھی ہوئی کتاب دریا برد کر دی اور اس کی جگہ پر سادات کی تعریف میں رسالہ تالیف فرمایا،

شرح اصول بزدوی

فخر الاسلام علی بن محمد بزدوی حنفی متوفی ۴۸۲ھ رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب الاصول فی الفقہ، اصول فقہ پر نہایت مشہور اور جامع کتاب ہے، مگر الفاظ وعبارات میں اجمال وابہام کی وجہ سے سخت مشکل ہے اس لئے بہت سے علماء وفقہاء نے اس کے شروح وحواشی لکھے،

آٹھویں صدی میں جو مشکل پسندی کا دورِ شباب ہے، اس کے شروح وحواشی کا زور تھا اور اصول بزدوی خود ہندوستان میں بہت رواج پذیر تھی، جون پور میں قاضی صاحب کے معاصر مولانا فقیہ حیرتی اس رموز ونکات کے خصوصی ماہر اور مشہور مدرس تھے، اور بیسیوں بار اس کا درس دے چکے

---

[1] خزینۃ الاصفیاء ج ۱ ص ۳۹۱

تھے، قاضی صاحب نے اپنے تلمیذ عزیز شیخ محمد بن عیسیٰ جونپوری کی خاطر اصول بزدوی کی ایک بحث امر تک تحریر فرمائی تھی۔ شاہ صاحب شیخ محمد بن عیسیٰ کے حال میں لکھتے ہیں۔ '' شرح اصول بزدوی کہ قاضی تا بحث امر بتقریب او نوشتہ است'' (ص ۱۷۵) مآثر الکرام میں ہے ''وشرح بر اصول بزدوی تا بحث امر (ج ۱ ص ۱۸۹) اور صاحب تذکرہ علمائے ہند نے بھی تقریباً یہی لکھا ہے، (ص ۲۰۵)

شرح قصیدہ بانت سعاد

قصیدہ بانت سعاد وہ مشہور و مبارک قصیدہ ہے جسے حضرت کعب ابن زہیرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں پیش کیا تھا اور آپ نے خوش ہو کر ردائے مبارک عطا فرمائی تھی اہل دل علماء و داد باء نے مختلف انداز میں اس کی شرحیں لکھی ہیں، قاضی صاحب نے بھی ایک شرح تحریر کی ہے جو بقول صاحب سبحۃ المرجان شرح بسیط علی قصیدۃ بانت سعاد یعنی قصیدہ بانت سعاد کی مفصل شرح ہے، (ص ۳۹)

مآثر الکرام میں بھی اس کا تذکرہ ہے۔ 'وشرح طویل بر قصیدۂ بانت سعاد' (ج ۱ ص ۱۸۹)

تذکرہ علمائے ہند میں بھی اس شرح کا ذکر ہے (۸۸) یہ شرح مصدق الفضل کے نام سے ۱۳۲۳ھ میں دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدر آباد سے طبع ہو کر شائع ہو چکی ہے، اس کے کل صفحات ۲۳۸ ہیں

شرح قصیدہ بردہ

حضرت شیخ بوصیریؒ کا قصیدہ بردہ نعت و منقبت رسول اللہ ﷺ میں بڑا پر اثر اور والہانہ قصیدہ ہے اور عباد و علماء کو اس سے خاص شغف رہا ہے، اس کے بہت سے معارضے، تضمینیں اور شروح و حواشی لکھے گئے، قاضی صاحب نے بھی اس کی ایک شرح لکھی ہے۔

نزہۃ الخواطر (ج ۳ ص ۲۰) میں اس کی تصریح موجود ہے،

عقیدۂ شہابیہ

یہ کتاب کلام و عقائد میں ہے، اس کا تذکرہ فرشتہ نے ان الفاظ میں کیا ہے،

''و رسالہ عقیدۂ شہابیہ نیز از مؤلفاتِ اوست'' رسالہ عقیدہ شہابیہ بھی ان کی تصانیف میں سے ہے،

نزہۃ الخواطر میں بھی اس کا ذکر ہے غالباً فارسی زبان میں کوئی مختصر سا رسالہ ہوگا۔[1]

فتاوائے ابراہیم شاہی

قاضی صاحب نے اپنے قدرداں اور محسنِ علم و فن سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے نام پر یہ کتاب عربی میں لکھی تھی، جس میں فقہی مسائل و فتاوے درج تھے، تاریخ فرشتہ (جلد۲ص ۳۰۶) تذکرہ علمائے ہند (ص ۸۸) میں اس کا نام فتاوی ابراہیم شاہی ہے مگر تجلی نور (جلد۲ص۳۴) میں ہے ''اصول ابراہیم شاہی بعربی نوشتہ'' اس میں نام کے اختلاف کے ساتھ اس کے عربی زبان میں ہونے کی تصریح ہے :۔

واضح رہے کہ سلطان ابراہیم شاہ کے نام پر فتاوی ابراہیم شاہیہ'' نامی ایک کتاب قاضی احمد بن محمد جونپوری نے بھی لکھی ہے، جس کے بارے میں صاحب کشف الظنون نے لکھا ہے کہ فتاوی قاضی خاں کے طرز کی کتاب ہے، اور ۱۶۰ کتبِ فقہیہ سے ماخوذ و مرتب ہے۔ قاضی احمد بن محمد جونپوری سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے زمانہ میں گجرات سے جونپور آئے سلطان نے ان کو عنایاتِ شاہانہ سے نوازا، عہدۂ قضاء پیش کیا، قاضی احمد نے اس کے شکرانہ میں سلطان کے نام پر یہ کتاب لکھی طبقات اکبر نے قاضی شہاب الدین کی کتاب فتاویٰ ابراہیم شاہی وغیرہ کو عہد ابراہیمی کی زریں یادگار بتایا ہے

وچند کتب و رسائل بنامِ او تصنیف شدہ، مثل چند کتب و رسائل ابراہیم شاہ شرقی کے نام

---

[1] تاریخ فرشتہ ج ۲ص ۳۰۶ و نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۲۰

حاشیہ ہندی، و بحر المواج، و فتاوی ابراہیم شاہی و ارشاد و غیرہا۔	سے لکھے گئے مثلاً حاشیہ ہندی، بحر المواج، فتاوی ابراہیم شاہی اور ارشاد وغیرہ

مصباح

اس کتاب کا تذکرہ صرف تاریخ فرشتہ (ج ۲ ص ۳۰۶) میں ہے، مگر یہ نہ معلوم ہو سکا کہ کس فن اور کون سی زبان میں ہے۔

معافیہ

اس کتاب کا تذکرہ صاحب کشف الظنون نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

المعافیہ للشیخ شہاب الدین بن شمس الدین بن عمر الد ولت آبادی الهندی ذکر هافی آخر ارشاده [۲]	معافیہ قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی کتاب ہے، انھوں نے اس کا تذکرہ الارشاد کے آخر میں کیا ہے

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود صاحبِ کشف الظنون نے اس کتاب کو نہیں دیکھا تھا، غالباً یہ عربی زبان میں علم نحو میں مختصر رسالہ رہا ہوگا۔

مناقب السادات

قاضی صاحب کی یہ وہی مشہور کتاب ہے جسے انھوں نے ایک موقع پر عالم کو سید پر افضلیت دینے کے بعد اس قول سے رجوع کر کے تحریر کیا تھا جیسا کہ اس کی تفصیل گذر چکی ہے۔

اس کتاب کو اہل علم میں قبول تام حاصل ہوا، اور انھوں نے اس سے استفادہ کیا چنانچہ صمصام الدولہ شاہنواز خان متوفی ۱۱۷۱ھ نے اپنی مشہور کتاب مآثر الامرا (سنہ تالیف ۱۱۵۵ھ تا ۱۱۶۰ھ) میں امیر الامرا سید حسین علی خاں کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ قاضی شہاب الدین

---

[۱] طبقات اکبری ص ۵۲۸ [۲] کشف الظنون ج ۲ ص ۴۵۸

ملک العلماء قدس سرہ مناقب السادات میں لکھتے ہیں کہ صحیح النسب سید کے لئے ضروری ہے کہ وہ خلق محمدی، سخاوتِ ہاشمی اور شجاعت حیدری کا نمونہ ہو اور یہ لازمی ہے کہ صحیح النسب سید ان خوبیوں میں خاص امتیاز رکھتا ہو، اگر کبھی نفس امارہ سے مجبور ہو کر کسی گناہ کا مرتکب ہوتا ہے تو آخر کار کوئی ایسا سبب پیدا ہو جاتا ہے جس کے ذریعہ اس کو نجات اخروی حاصل ہو جاتی ہے" اس بات کی صداقت دونوں بھائیوں (قطب الملک عبداللہ خاں اور انکے چھوٹے بھائی امیر الامرا سید حسین علی خاں) کے حالات سے ہوتی ہے کہ وہ دونوں اس دنیا سے مظلوم گئے اور شہید ہوئے۔[1]

ہدایۃ السعداء

یہ کتاب فارسی میں تھی جس میں غالبًا وعظ و نصیحت اور اخلاقیات سے متعلق مضامین تھے اس کا تذکرہ نزہۃ الخواطر میں ہے۔

ایک اور تفسیر

قرآن پاک کی آیت فسُحقاً لا صحاب السّعیر کی تفسیر میں کوئی کتاب لکھی تھی، اس کا پتہ کشف الظنون کی اس عبارت سے چلتا ہے،

كتاب عرف الورىٰ فى نصرة الشيخ	عرف الوریٰ فی نصرۃ الشیخ الہندی
الهندى لمحمد بن ابراهيم الحلبى	نامی کتاب محمد ابراہیم حلبی المعروف بہ
المعروف بابن الحنبلى ، المتوفى	ابن حنبلی متوفی ۱۷۱ھ کی تصنیف ہے،
سنة احدى و سبعين تسعمائة، وهو	جس میں عبداللطیف مشہدی کا رد ہے
رسالة فى ردعلىٰ عبد اللطيف	مشہدی نے قاضی شہاب الدین کی
المشهدى لما ردّ على الشيخ شهاب	ایک کتاب کا رد لکھا تھا جسے انھوں نے
الدين احمد الهندى فى تاليفه علىٰ	آیت فسحقا لاصحاب

[1] ترجمہ مآثر الامراء ج ا ص ۳۱۵، مرکزی اردو بورڈ لاہور

قولہٖ تعالیٰ فسحقاً لاصحاب السّعیر کی تفسیر میں لکھا تھا۔

السّعیر

اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی صاحب نے اس آیت کی تفسیر میں کوئی کتاب لکھی تھی، جس کا رد شیخ عبداللطیف مشہدی نے لکھا، اور مشہدی کے رد اور قاضی صاحب کی تائید میں شیخ محمد ابراہیم حلبی نے کتاب لکھی اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ قاضی صاحب کی تصانیف عالم اسلام میں کس قدر مقبول و متداول تھیں، اور ان کی بعض کتابوں پر علمائے اسلام میں جواب اور جواب الجواب کا سلسلہ چلتا تھا، اور اس میں مستقل کتابیں لکھی جاتی تھیں۔

وفات

قاضی صاحب نے درس و تدریس افتاء اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ پوری زندگی علوم اسلامیہ کی خدمت میں بسر کی، اور دہلی، کالپی اور جونپور ہر جگہ ان کا فیض جاری رہا، مگر جون پور میں ان کی زندگی کا تقریباً چالیس سالہ دینی و علمی دور حاصلِ زندگی ہے، اور ان کے جوہر یہیں آکر کھلے، ان کے حالات کا بیشتر حصہ اسی دیار سے تعلق رکھتا ہے، قاضی صاحب کی وفات ۲۵/رجب ۸۴۸ھ یا ۸۴۹ھ میں جون پور میں ہوئی اور اپنے محلّہ خواجگی میں دفن کئے گئے، اخبار الاخیار اور خزینۃ الاصفیاء اور تذکرۃ العلماء میں ۸۴۸ھ ہے اور اخبار الاصفیاء اور سبحۃ المرجان، مآثر الکرام کشف الظنون، تذکرہ علمائے ہند، برکات الاولیاء اور نزہۃ الخواطر میں ۸۴۹ھ درج ہے۔

مآثر الکرام، تذکرہ علمائے ہند اور نزہۃ الخواطر میں ۲۵/رجب کی تصریح ہے البتہ برکات الاولیاء میں ۲۵/شوال ہے اس سلسلہ میں فرشتہ کا بیان سب سے جداگانہ ہے وہ لکھتا ہے کہ سلطان ابراہیم سے قاضی صاحب کو اس قدر محبت تھی کہ سلطان کی وفات کے غم میں (اس کی وفات ۸۴۰ھ میں ہوئی) وہ بھی عالم قدس میں تشریف لے گئے، اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ سلطان ابراہیم کی وفات کے دو سال کے بعد ۸۴۲ھ میں ان کا طائر روح روضۂ رضوان کی طرف پرواز کر گیا۔[1]

---

[1] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۰۶

تذکرۃ العلماء میں ہے

’’وفات او در ۸۴۸ھ ہشت صدو چہل و ہشت ہجری رونمودہ در بلدۂ جون پور جانب جنوبی مسجد سلطان کہ اکنوں بمسجد اٹالہ شہرت دارد مدفون گردید‘‘[1]	ان کی وفات ۸۴۸ھ میں ہوئی جونپور میں جنوبی سرے پر مسجد سلطان میں دفن کئے گئے جس کو اب اٹالہ مسجد کے نام سے شہرت حاصل ہے

اور تجلی نور میں ہے کہ

مولانا شہاب الدین در جونپور بمحلہ خواجگی قیام پذیر رفت، و بعد مدّت متصل آن محلہ و دروازۂ جنوبی مسجد اٹالہ مدفن یافت، ہنوز قبرش سنگین اندر احاطۂ مشن اسکول موجود است، بہ سبب دارید زمانہ نشان مکانات و مدرسہ مولانا بے نشان گشتند و، اولاد ایشان ہم باقی نماندہ‘‘[2]	مولانا شہاب الدین جونپور کے محلہ خواجگی میں سکونت رکھتے تھے اور زیادہ دنوں کے بعد اسی محلّہ کے بغل میں مسجد اٹالہ کے جنوبی دروازہ کی طرف ان کی قبر ہے اور آج بھی پتھر کی بنی ہوئی ان کی قبر مشن اسکول کے گراؤنڈ میں موجود ہے۔ زیادہ مدت گزر جانے کی وجہ سے مولانا کے مکان و مدرسہ کے نشانات مٹتے جارہے ہیں اور ان کی اولاد بھی باقی نہیں رہی

صاحب خزینۃ الاصفیاء نے حسب ذیل تاریخ وفات کہی ہے،

شہاب الدین چوں رفت از عالم دہر — بجنت گشت روشن آں مہ علم
وصالش کن رقم ’’تو قیر اسلام — وگربا‘‘ شہاب الدین مہ علم

’’جیسا کہ تجلی نور میں ہے قاضی صاحب کی اولاد کا سلسلہ نہیں چلا، ان کی صرف ایک

---

[1] تذکرۃ العلماء ص ۱۵ [2] تجلی نور ج ۲ ص ۳۰، راقم الحروف پہلی بار ۱۹ رشوال ۱۳۹۱ھ بروز سہ شنبہ اور دوسری بار ۲۰ محرم ۱۳۹۲ھ بروز سہ شنبہ آپ کے مزار پر فاتحہ خوانی کے لئے حاضر ہوا، جو ایک کالج کے احاطہ میں شکستہ تعویذ کی شکل میں ہے پاس میں چند اور قبریں ہیں یقینی طور پر یہ معلوم نہ ہوسکا کہ ان میں قاضی صاحب کی قبر کون سی ہے، فاعتبروا یااولی الابصار (قاضی اطہر مبارکپوری)

صاحبزادی تھیں، جن کا نکاح دہلی میں شیخ نصیر الدین بن شیخ نظام الدین غزنوی سے ہوا، اور وہیں ان کے بطن سے قاضی صاحب کے تین نواسے شیخ صفی الدین شیخ رضی الدین اور شیخ فخر الدین پیدا ہوئے اور سب نے اپنے نانا سے تعلیم حاصل کی اور ان ہی نواسوں نے اپنے نانا کے علوم و معارف کی میراث پائی، ان کے علاوہ قاضی صاحب کی علمی و روحانی اولاد ان کے تلامذہ تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆
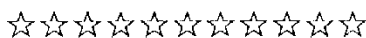
(۳)

حضرت راجہ سیّد حامد شاہ مانکپوری

آباء واجداد کی گرویز سے دہلی میں آمد:

ساتویں صدی کے شروع میں سلطان شمس الدین ایلتمش متوفی ۶۳۳ھ کے دور میں ترکستان کے شہر گرویز سے جو افغانستان میں غزنی کے مشرق میں واقع ہے، دو بھائی سید شمس الدین اور سید شہاب الدین دہلی آئے کچھ دنوں کے بعد دونوں بھائیوں نے پھر رختِ سفر باندھا، سید شمس الدین نے دہلی کے قریب میوات کو اپنی منزل قرار دیا، جہاں ان کی اولاد پھولی پھلی اور آباد ہوئی، اور سید شہاب الدین نے دہلی سے دور بہ جانب مشرق کڑا مانک پور میں اقامت اختیار کی جو نیا نیا اسلامی قلم رو میں داخل ہوا تھا کڑا مانک پور کو سید قطب الدین بن سید رشید الدین احمد غزنوی متوفی ۶۷۷ھ نے فتح کر کے فتح پورہ ہنسوہ کے قریب کڑا نامی مقام میں سکونت اختیار کی تھی یہ بزرگ غزنی سے قطب الدین ایبک کے زمانہ میں دہلی آئے تھے، اسی زمانہ سے کڑا مانک پور سلاطین دہلی کا مشرقی پایہ تخت بنا، اور ان کے امراء و حکام یہاں رہکر پورے مشرقی ہندوستان پر حکومت کرتے تھے۔

سید شہاب الدین گرویزی کی اولاد کو کڑا مانک پور میں بڑا فروغ حاصل ہوا۔ امارت و مشیخت اور دین و دنیا کے امتزاج کی وجہ سے شاہی منصب اور جاگیرداری نے ان کے قدم چومے، آگے چل کر روحانیت و مشیخت نے ان کو مشرقی علاقوں میں حسنِ قبول بخشا، سلاطین و امراء سے لیکر علماء و فضلاء اور عوام تک ان کے قدردان بن گئے، راجہ اور شاہ کے خطابات سے سرفراز ہوئے بعد میں اس خاندان گرویزیہ کے گوہر شب چراغ حضرت سید راجہ حامد شاہ چشتی مانک پوری متوفی ۹۰۱ھ نے جونپور کو اپنی مشیخت و روحانیت کا مرکز قرار دیکر دیارِ پورب کو سرزمین چشت بنادیا اور ان

کے خانوادہ کے راجگان کو اس دیار میں کئی صدیوں تک وہ شان و شوکت حاصل رہی کہ سلاطین شرقیہ ،سلاطین لودیہ، سلاطین تیموریہ اور نوابانِ اودھ کی حکومتوں میں انقلابات آتے رہے، مگر خانوادہ حامدیہ کا مینارۂ نور اپنی روشنی دکھاتا رہا۔ آئندہ صفحات میں راجہ سید حامد مانک پوری اور ان کے خانوادہ کے حالات اور دیار پورب میں ان کے دینی و روحانی فیوض و برکات کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مانک پور میں پیدائش، تعلیم اور بیعت و خلافت

حجۃ العاشقین حضرت راجہ سید حامد شاہ بن راجی عز الدین بن سید شہاب الدین مُشنّیٰ ابن میر حسام الدین بن سید شہاب الدین بن میر زین الدین بن میر سید محمد باقر حسن ابو طالب بن سید جعفر مدعی عرف موسیٰ مرقعہ بن امام محمد التقی بن امام علی حسین رضوی گردیزی مانک پوری کا نسب نامہ گنج ارشدی میں اسی طرح درج ہے، [۱] دوسری کتابوں میں کچھ اختلاف ہے، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سید عز الدین کے پوتے ہیں۔

معلوم ہو چکا ہے کہ راجہ سید حامد کے مورث اعلیٰ گردیز سے دہلی آئے تھے، وہاں سے نکل کر مانک پور میں آباد ہوئے، شاہ عبدالحق دہلوی اخبار الاخیار میں لکھتے ہیں۔

”در زمانِ سلطان شمس الدین التمش دو برادر از ساداتِ گردیز بہ دہلی قدوم آوردہ بودند، یکے سید شمس الدین در زمین میوات سکونت کرد، و بقیہ اولاد در انجا ماندہ، و دیگر شہاب الدین کہ از اجدادِ او (و راجہ سید حامد) ست، بزرگان ایشان معزز و مکرم بودہ اند،	شمس الدین التمش کے زمانے میں سادات گردیز میں سے دو بھائی دہلی آئے ایک بھائی سید شمس الدین سرزمین میوات میں رہائش پزیر ہوئے ان کی بقیہ اولاد بھی وہیں رہ گئی اور دوسرے بھائی شہاب الدین جو راجہ سید حامد کے مورثِ اعلیٰ ہیں، ان سب لوگوں کے اسلاف معزز و مکرم رہے ہیں اور اس دیار کے

[۱] گنج ارشدی جلد دوم ص ۱۰ محفوظ خانقاہ رشیدیہ جونپور

دور زبان مردم آن دیار برایشان اسم	لوگوں کی زبان میں ان لوگوں کے نام کے ساتھ
راجی غالب آمدہ[1]	عام طور پر راجی کا لفظ آتا ہے۔

سید شہاب الدین سب سے پہلے راجہ کے لقب سے مشہور ہوئے، مفتی غلام سرور لاہوری نے خزینۃ الاولیاء میں لکھا ہے" واسم راجی خطاب سید شہاب الدین کہ جد راجی حامد شاہ بود[2] اور آئینہ اودھ میں ہے کہ سید شہاب الدین بحکم باطن ساکن مانک پور وارد ہوئے، بعض گردیزی راویوں کے بیان کے مطابق آپ کو حکومت سے منصب سلطانی اور مانک پور کی جاگیر ملی، اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو اتنی اولادیں دیں کہ اس سے کئی مواضعات آباد ہو گئے اور سلاطین جونپور کے زمانہ میں بڑا اقتدار حاصل ہوا، ایسا اقتدار ظاہری و باطنی دوسرے سادات کو حاصل نہیں ہوا، آپ کا مزار پہلے مانک پور میں لبِ دریا تھا، بعد میں دریا برد ہونے کے خوف سے اولاد نے نعش کو آراضی شہاب الدین پور میں دفن کیا جہاں روضہ اب تک موجود ہے۔

راجہ کی وجہ تسمیہ

سید شہاب الدین کے دو صاحبزادے سید عزالدین اور سید شرف الدین ظاہری و باطنی کمالات کے جامع اور اپنے والد کے صحیح جانشین تھے، ان کو مخدوم جہانیاں حضرت سید جلال الدین حسین بخاری متوفی ۷۹۵ھ کی توجہ نے خصوصی فیض بخشا تھا، وہ سلطان الشرق خواجہ جہاں ملک مسرور متوفی ۸۰۲ھ کے دور سلطنت میں مانک پور تشریف لائے جو جونپور سے اسّی میل دور ہے، دونوں بھائیوں نے ان کے شایان شان استقبال کیا اور ان کو اپنا مہمان بنا کر خاطر تواضع کی، مخدوم سید جلال الدین بخاری نے دریافت کیا کہ کیا بات ہے آپ لوگوں میں بعض اسلحہ بند ہیں خرقہ پوش نہیں ہیں؟ انھوں نے عرض کیا کہ سلاطین و حکام کی طوائف الملوکی کی وجہ سے غیر مسلم رعایا موقع پا کر مسلمانوں پر حملہ آور ہوتے ہیں اسی لئے ہم ہتھیار پہنے رہتے ہیں، مخدوم صاحب نے سید عزالدین کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تم راجہ ہو اور سید شرف الدین سے فرمایا کہ تمہارے لئے عبدۂ

[1] اخبار الاخیار ص ۱۸۹ مجتبائی [2] خزینۃ الاولیاء ج ا ص ۴۰۹ طبع ثمر ہند لکھنؤ ۱۸۷۳ء

قضا ہے، اب تم لوگوں کو کوئی متمرد تکلیف نہ دے سکے گا بشرطیکہ اپنے آباء واجداد کے طور طریقہ پر رہ کر کتاب وسنت کی اتباع کرو، اگر تم لوگ اس پر قایم رہے تو یہ دونوں باتیں ختم نہیں ہوں گی جب مخدوم صاحب مانک پور سے واپس ہوئے تو دونوں بھائی پرگنہ پرتاب گڈھ تک ان کے ہمراہ آئے۔[۱]

سید علی موسوی حیدآبادی نے مشکوۃ النبوۃ میں سید عزالدین کا تذکرہ کرکے اس واقعہ کو اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔

''سید عزالدین جد شریف سید حامد شاہ سجادہ نشین آباء خود بودند، در زمانے کہ مخدوم جہانیاں سید جلال الدین بخاری سیاحت دیار شرق نمود با سید عزالدین کہ از مشاہیر مشائخ بود بملاقات نمودہ معائنہ فرمود کہ سید لباس مشائخانہ ندارد، وسلاح بند، مخدوم پرسید کہ سبب سلاح لبستن چیست؟ سید گفت دریں ملک راجہائے اہل فساد بر مسلمان تاخت می کنند، مخدوم فرمود کہ از امروز ولایت برشما باشد، الحال شما راجہ ایں ملک شدید، پس ازاں روز خطاب راجہ بر اولاد ایشاں جاری شد''۔[۲]	سید حامد شاہ کے دادا سید عزالدین اپنے آباؤاجداد کے گدی نشین تھے مخدوم جہانیاں سید جلال الدین بخاری جب دیار پورب کی سیاحت کو نکلے تو سید عزالدین سے ملے۔ انھوں نے دیکھا کہ سید عزالدین مشہور مشائخ میں سے ہوتے ہوئے بھی انھوں نے مشائخ کا لباس نہیں پہنا ہے اور ہتھیار لگائے ہوئے ہیں مخدوم جہانیاں نے سید عزالدین سے پوچھا کہ ہتھیار بند ہونے کی کیا وجہ ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ ادھر کے ہندو راجہ مسلمانوں کو لوٹتے ہیں مخدوم نے فرمایا کہ آج سے تم ادھر کے حاکم ہو اب تم اس طرف کے راجہ ہوگئے ہو پھر اس دن سے راجہ کا خطاب ان کی اولاد کے لئے شروع ہوگیا۔

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ راجہ حامد شاہ کے والدین اپنے والد سید شہاب الدین کے

---

[۱] آئینہ اودھ ص ۱۶۸، [۲] مشکوۃ النبوۃ قلمی ص ۳۶۴،

خلیفہ تھے اور راجہ کا خطاب ان ہی سے رواج پذیر ہوا۔

راجہ سید حامد بچپن ہی میں حضرت شیخ مخدوم حسام الدین چشتی مانک پوری متوفی ۸۵۳ھ سے وابستہ ہوئے اور تھوڑی مدت میں مرتبۂ کمال کو پہونچ گئے، مخدوم حسام الدین نے اپنے والد خواجہ خضر بن جلال الدین فاروقی مانک پوری سے درسیات کی تکمیل کر کے مشرق کا سفر کیا اور بنگال میں حضرت مخدوم نور الحق بن علاء الدین چشتی پنڈوی کی خدمت میں رہ کر طریقۂ چشتیہ میں کمال حاصل کیا۔ اور ۸۰۴ھ میں وہاں سے مانک پور واپس آکر رشد و ہدایت کی مسند سنبھالی، شاہ محمد ملاق چشتی نے مطلوب الطالبین میں بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ مخدوم حسام الدین نماز جمعہ پڑھ کر آرہے تھے، اور راجہ حامد شاہ اپنے گھر کے دروازہ پر کھڑے تھے، اس وقت اس کی عمر صرف سات سال کی تھی، ان کے چہرے بشرے سے جمال و کمال کے آثار ظاہر ہو رہے تھے، مخدوم حسام الدین کی نظر جوں ہی اس لڑکے پر پڑی اس کی باطنی صلاحیت کو تاڑ گئے اور فریفتگی کے انداز میں حیرت و مسرت کا اظہار کرتے ہوئے خانقاہ میں پہونچے، جب راجہ حامد شاہ کے والد راجہ سید عز الدین کو اس واقعہ کا علم ہوا تو وہ اپنے لڑکے کا ہاتھ پکڑ کر مخدوم صاحب کے پاس لائے اور کمال عقیدت سے ان کی خدمت وصحبت میں رکھدیا، مخدوم صاحب نے ان کی خصوصی تعلیم و تربیت کر کے قلیل مدت میں طریقۂ چشتیہ میں مرتبۂ کمال کو پہونچادیا اور خلافت بھی ویدی

”شیخ خوشنود شد، و در تربیت آں بحدے کوشید کہ بمرور ایام عارف کامل گردانید، و بخلافت خود رسانید“ [۱]	شیخ خوش ہوگئے اور ان کی تربیت میں بہت زیادہ کوشش کی اور زمانہ گزرنے کے ساتھ انھیں عارف کامل بنادیا اور اپنی خلافت عطا کی

خزینۃ الاولیاء میں ہے کہ راجہ حامد شاہ اوائل میں سپاہیانہ لباس میں رہتے تھے شیخ حسام الدین مانکپوری کی صحبت سے مشرف ہو کر ریاضات شاقہ برداشت کیں، جس سے صفائی باطن، اور حضوری قلب کی دولت نصیب ہوئی اور یہ کہ

”وے از علم ظاہری بقدر ما یحتاج کفایت	راجہ حامد شاہ نے علم ظاہری بقدر ضرورت

[۱] مطلوب الطالبین ص ۲۱۸ قلمی ۱۱۸۴ء

کردہ بود، لیکن دانشمندانِ دہر وعلماء	ہی حاصل کیا تھا، مگر ان کے زمانہ کے دانشور اور اہل
عصر اسیر حلقۂ ارادت او بودند ۱	علم ان کے حلقۂ ارادت وعقیدت کے اسیر تھے۔

جونپور میں آمد اور ارشاد وتلقین

راجہ حامد شاہ سلوک ومعرفت کی منزل طے کرنے کے بعد بحکم مرشد عین جوانی میں تشریف لائے جہاں ان کی کتابی کم علمی کے باوجود علماء وفضلاء نے استقبال کیا، اس زمانہ میں جونپور سلاطین شرقیہ کی قدر دانی اور علم دوستی کی وجہ سے دار العلم اور دہلی ثانی بنا ہوا تھا، اور اکناف واطراف سے اہل فضل وکمال کھنچ کھنچ کر یہاں آرہے تھے خود راجہ حامد شاہ کے شیخ ومرشد مخدوم حسام الدین مانک پوری نے یہاں سات سال تک فقر وفاقہ اور گمنامی میں زندگی بسر کی اس کے بعد وہ قبول عام ہوا کہ جونپور کے سلاطین وامراء تک ان کے نیاز مند ہوگئے، انھوں نے سلطان ابراہیم شاہ شرقی، سلطان محمود شاہ شرقی اور سلطان محمد شاہ شرقی کا دور سلطنت پایا تھا، نیز ان کے صاحبزادے شیخ محمود بن شیخ حسام الدین متوفی ۹۰۵ نے جو شیخ نتھن غازی پوری کے نام سے مشہور ہیں ۸۵۳ھ میں جونپور کے آگے غازی پور کو اپنی روحانیت کا مرکز بنایا تھا، اور پورے دیار میں باپ بیٹے کی فضیلت ومشیخت کی دھوم مچی ہوئی تھی، ان ہی حالات میں شیخ حسام الدین کے خلیفہ اجل راجہ سید حامد شاہ مانک پوری نے اس دیار کو رونق بخشی اور لوگوں نے اس جانے پہچانے روحانی خانوادہ کے اس فردِ فرید کا بھی بڑھ کر استقبال کیا، مخدوم حسام الدین نے اپنے عزیز ترین خلیفہ اور راجہ حامد شاہ کو بڑے پیار اور تزک واحتشام کے ساتھ جون پور بھیجا تھا، اور ان کی نیک تمنائیں یوں کام آئیں کہ راجہ حامد شاہ اور ان کی اولاد کئی صدیوں تک دیار جونپور میں مرجعیت ومرکزیت کی مالک رہی صاحب مشکوۃ النبوۃ نے ان کے واقعات کا نقشہ یوں کھینچا ہے، شیخ حسام الدین نے راجہ حامد شاہ کو ارشاد وہدایت کا پروانہ دیکر اس طرح جونپور بھیجا کہ ان کو سواری پر بٹھایا اور فخریہ انداز میں خود پاپیادہ ان کی رکاب میں شہر مانک پور کے باہر تک تشریف لائے اور یہ شعر بار بار زبان پر

---

۱ خزینۃ الاولیاء ج ۱ ص ۴۰۹۔

لاتے رہے۔

میروی تو در رکاب و میرود جانِ حسام
فی امان اللہ برو ، فاللہ خیرٌ حافظا

﴿تم رکاب میں جارہے ہو اور حسام الدین کی روح نکلی جارہی ہے اللہ کی حفاظت میں جاؤ بیشک اللہ بہتر حفاظت کرنے والا ہے﴾

جس وقت راجہ حامد شاہ کمال ولایت وتصرف کے ساتھ جونپور میں داخل ہوئے ان کے فضل وکمال کی شہرت شہر اور اطراف میں عام ہوئی اور اس دیار کی مخلوق ان کے ساتھ نیازمندی سے پیش آئی اور اکثر لوگ ان کی ادارت و بیعت سے مشرف ہوئے ۔مثل شیخ الہ داد اور شیخ بہاء الدین جون پوری وغیرہ [۱] یہ راجہ صاحب کے روحانی فیض وتصرف کا نتیجہ تھا کہ ایسے ایسے علمائے فحول ان کے حلقۂ ارادت میں آئے ورنہ وہ خود کوئی بڑے عالم وفاضل نہیں تھے، بلکہ معمولی طور سے لکھنا پڑھنا جانتے تھے ،شاہ عبدالحق صاحب دہلوی نے بھی ان کے بارے میں اس کی تصریح کی ہے۔

''وے از علم ظاہری بقدر مایحتاج کفایت کردہ بود، لیکن دانشمندانِ دہر وعلمائے عصر اسیر حلقۂ ارادت او بودند[۲]	وہ ظاہری علوم میں بقدر پڑھے لکھے تھے لیکن اپنے زمانہ کے اہل دانش اور علمائے وقت کے پیر تھے۔

مولانا حسن بن طاہر جونپوری اور مولانا الہ داد جونپوری اس عہد و دیار کے علمائے فحول میں تھے، دونوں بزرگوں میں قلبی محبت تھی ،اور دونوں ہی سلوک وطریقت کا ذوق رکھتے تھے جب مولانا الہ داد کو معلوم ہوا کہ مولانا حسن بن طاہر راجہ سید حامد شاہ کے مرید ہوگئے ہیں تو فرمایا کہ میاں حسن! تم نے تو طالب علموں کی عزت لے لی ایک معمولی علم والے کو اپنا شیخ و مرشد مان لیا ہے، مولانا حسن نے کہا کہ تم وقت نکال کر راجہ سید حامد کے یہاں چلو اور ان کا امتحان لو تاکہ میرے بارے میں اطمینان ہوجائے ، چنانچہ دوسرے دن دونوں یار ایک ساتھ راجہ حامد شاہ کی خدمت میں

[۱] مشکوۃ النبوۃ ص ۲۱۶، [۲] اخبار الاخیار ص ۱۸۹

حاضر ہوئے، مولانا الہ داد نے ہدایہ اور اصول بزدوی کے چند اشکالات ذہن میں رکھ لئے تھے کہ راجہ حامد سے ان کا حل دریافت کرنا چاہئے، ان دونوں عالموں سے راجہ حامد شاہ نے حسب معمول علمی و دینی گفتگو شروع کی اور اثنائے گفتگو میں مولانا الہٗ داد کے ان ذہنی اشکالات واعتراضات کو دفع کر دیا۔ یہ ماجرا دیکھ کر مولانا الہ داد بھی راجہ حامد شاہ کے قائل ہو گئے، اور ان سے بیعت کر کے مجاہدہ وریاضت میں لگ گئے۔

راجہ حامد شاہ شیخ حسام الدین کے ایک سو بیس خلفاء میں سب سے زیادہ نامور اور فیض بخش خلیفہ تھے، ان کی وفات ۲۵ رشعبان ۹۰۱ھ میں مانک پور میں ہوئی اور مزار بھی وہیں ہے۔ راجہ حامد شاہ کا مزار مانک پور میں ایک احاطہ کے اندر ہے اور گنبد وغیرہ اس پر نہیں ہے اور اس کے چاروں طرف بہت بڑا قبرستان ہے۔ راجہ حامد شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان میں سے راجہ سجاد حسین مانک پور میں حیات ہیں لیکن چار پانچ برس سے وہ پاگل ہو گئے ہیں

خلفاء

انھوں نے جون پور کے سلاطین میں سے سلطان ابراہیم شاہ شرقی، سلطان محمود شاہ شرقی، سلطان محمد شاہ شرقی، سلطان حسین شاہ شرقی اور سلاطین دہلی میں سے بہلول شاہ لودھی اور سکندر شاہ لودھی کا زمانہ پایا تھا، اس طویل مدت میں دیار پورب میں ان کے فیوض و برکات ہر طرف عام ہوئے، یوں تو ان کے بہت سے خلفاء تھے، جن کا فیض جاری ہوا مگر اس دیار میں خاص طور سے قابل ذکر یہ ہیں، (۱) صاحبزادہ راجہ سید نور، (۲) شیخ الہ داد، (۳) شیخ حسن بن طاہر، (۴) شیخ بہاء الدین، (۵) شیخ دانیال رحمہم اللہ، راجہ سید نور کا مستقل تذکرہ آگے آرہا ہے، یہاں باقی چار خلفاء کا حال لکھا جاتا ہے۔

مولانا حسن بن طاہر جونپوری

مولانا شیخ حسن بن طاہر جونپوری عباسی زبردست عالم وفقیہ اور مشائخ میں سے ہیں، بہار میں پیدا ہوئے، بچپن ہی سے تحصیل علم کا شوق تھا، اس زمانہ میں ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی جونپوری کے تلامذہ کا شہرہ دور دور تک تھا، اور اہل طلب ان کی وجہ سے اس دیار کا رخ کرتے تھے۔ شیخ حسن نے بھی اپنے والد کے ساتھ جون پور آکر ان علماء سے علومِ دینیہ کی تکمیل کی، اس کے بعد راجہ سید حامد شاہ سے طریقۂ چشتیہ کی تعلیم و تربیت پائی، راجہ حامد شاہ نے اپنے عزیز شاگرد و مرید کو خلافت دیکر ''کمال الحق'' کے لقب سے نوازا اور فرمایا کہ حسن قیامت تک حجت ہیں۔ مولانا حسن نے بعد میں راجہ سید نور سے بھی خلافت پائی، شاہ عبدالحق صاحب نے لکھا ہے۔

(حسن بن طاہر) مرید راجی حامد شاہ است، واز راجی نور نیز نعمت خلافت یافتہ [1]

نیز لکھا ہے کہ جس زمانہ میں شیخ حسن جونپور میں زیر تعلیم تھے، راجہ حامد شاہ کی مشیخت کا شہرہ عام تھا، ایک مرتبہ ان کی ملاقات کو گئے اور دل میں سوچا کہ اسی بہانہ سے کوئی علمی بحث چھیڑ کر ان کا امتحان لیں گے، مگر پہلی ہی ملاقات میں راجہ حامد شاہ کے جاذبۂ باطن نے شیخ حسن کو اپنے حلقۂ ارادت وعقیدت میں لے لیا، اور راجہ حامد شاہ کے سب سے پہلے مرید عالم یہی شیخ حسن ہوئے ''اول کسے کہ از علماء در حلقۂ ارادت سید آمد او بود [2]''

ان کے بعد مولانا الہ داد بھی اسی انداز سے ان کے حلقۂ ارادت میں آئے، شیخ حسن بن طاہر سلطان سکندر لودھی کے عہد میں اس کے معتقدانہ اصرار وطلب پر آگرہ اور وہاں سے دہلی جا کر مقیم ہو گئے، اور وہیں ربیع الاول ۹۰۹ھ میں وفات پائی ان کے تلامذہ ومریدین میں قاضی خان ظفر آبادی متوفی ۹۵۹ھ کبار مشائخ چشتیہ میں سے ہیں سترہ سال کی عمر میں علوم مروجہ سے فارغ ہو کر تمیں سال تک شیخ حسن بن طاہر کی خدمت میں رہے، شیخ سالار بن ھبتہ الدین کوڑوی متوفی

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۹۰، [2] اخبار الاخیار ص ۲۱۹

۹۴۶ھ نے بھی شیخ حسن بن طاہر سے خرقۂ خلافت پہنا، صاحبزادے شیخ محمد بن حسن بن طاہر متوفی ۹۴۶ھ نامور محدث وفقیہ تھے۔ حرمین شریفین اور یمن کا سفر کر کے کسب فیض کیا تھا، ان کے تلامذہ ومریدین میں شیخ عبدالرزاق جھنجھانوی اور شیخ عبدالملک پانی پتی قابل ذکر ہیں۔

شیخ حسن کے دوسرے صاحبزادے شیخ عبدالعزیز بن حسن بن طاہر متوفی ۹۷۵ھ بھی مشاہیر مشائخ چشتیہ میں سے ہیں، شریعت وطریقت کے جامع بزرگ ہیں، ان کے تلامذہ میں ملاعبدالقادر بدایونی ہیں۔

مولانا الٰہ داد جونپوری

مولانا شیخ الٰہ داد بن عبداللہ حنفی جونپوری سلطان سکندرلودی کے عہد کے علمائے کبار میں تھے، مولانا عبدالملک جونپوری سے تحصیل علم کر کے استاد کی زندگی ہی میں طبقۂ علیا میں شمار کئے گئے، درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کے ساتھ مشیخت وطریقت میں ممتاز مقام رکھتے تھے، طریقہ چشتیہ راجہ سید حامد شاہ سے حاصل کر کے ان کے خلیفہ ہوئے، راجہ سید حامد شاہ سے ان کی اور مولانا حسن جونپوری کی بیعت وارادت کا واقعہ پہلے گذر چکا ہے۔

مولانا الٰہ داد اپنے زمانہ میں نحو، فقہ، اصولِ فقہ وغیرہ میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے، ان کی تصانیف میں ہدایہ، اصول بزدوی، تفسیر مدارک اور کافیہ کی شروح وحواشی ہیں، راجہ سید حامد شاہ کے پڑپوتے راجہ سید مبارک بن راجہ احمد بن راجہ نور کی دوسری شادی مولانا الٰہ داد کی دختر سے ہوئی تھی جس کے بطن سے راجہ مبارک کے چھ فرزند پیدا ہوئے، ان کی وفات ۹۲۳ھ میں جونپور میں ہوئی۔

مولانا الٰہ داد کے صاحبزادے شیخ بھکاری (عبداللہ) بھی اس دور کے مشاہیر علماء میں تھے، لودی سلطان کی دعوت پر باپ بیٹے دونوں نے دہلی میں دونامور عالموں سے سرِ دربار مناظرہ ومباحثہ کیا تھا، مولانا الٰہداد کے تلامذہ میں مولانا معروف بن عبدالواسع جونپوری بہت مشہور ہیں، انھوں نے شریعت وطریقت کی تعلیم وتربیت مولانا الٰہ داد سے حاصل کر کے تیس سال تک درس وتدریس اور عبادت وریاضت میں زندگی بسر کی، طریقۂ چشتیہ مولانا الٰہ داد سے اور طرق قادریہ و

شطاریہ شیخ محمد بن عبدالعزیز جونپوری سے حاصل کئے تھے، اور مولانا معروف سے شیخ احمد بن زین جونپوری متوفی ۹۶۳ھ شیخ نظام الدین امیٹھوی متوفی ۹۰۹ھ اور شیخ مفتی آدم بن محمد گوپاموی متوفی ۱۰۰۱ھ نے تعلیم و تربیت پائی تھی، یہ حضرات شریعت و طریقت کے جامع تھے۔

مولانا بہاء الدین جونپوری

مولانا شیخ بہاء الدین بن خلق اللہ بن مبارک فاروقی جونپوری نے شیخ محمد بن عیسیٰ جونپوری سے دینی علوم حاصل کئے اور نو سال تک راجہ حامد شاہ کی خدمت وصحبت میں رہ کر طریقۂ چشتیہ میں ان کے خلیفہ ہوئے، نیز دیگر اساتذہ و شیوخ سے بھی استفادہ کیا تیس سال تک مکہ مکرمہ میں جبل ابوقبیس کے ایک زاویہ میں رہ کر ہر نماز کے لئے حرم شریف میں آتے تھے، اس مدت میں وہاں کے علماء اور محدثین اور شیوخ سے علم و معرفت کی تحصیل و تکمیل بھی کرتے رہے، سوسال سے زائد عمر میں رمضان ۹۱۱ھ میں فوت ہوئے، ان کے خلفاء میں میر علی عاشقان سرائمیری متوفی ۹۵۰ھ معرفت و روحانیت میں بہت بلند مقام رکھتے ہیں، میر علی عاشقان کے دو خلفاء دیار پورب میں بہت مشہور ہیں، ایک شیخ مبارک جونپوری ماہلی، ان کے والد شیخ خیرالدین ظفرآباد سے ماہل (اعظم گڑھ) میں آباد ہوگئے تھے، شیخ مبارک ماہلی کے تلامذہ میں مولانا محمد درویش غازی پوری متوفی ۹۹۸ھ کا وطن نونہرہ (غازی پور) تھا، طلب علم میں جونپور آئے اور شیخ مبارک کے زاویہ میں رہکر یکتائے زمانہ ہوئے، اور دوسرے قاضی حبیب اللہ عثمانی گھوسوی جوز بردست عالم وفقیہ اور ادب و عربیت میں ممتاز مقام کے مالک تھے، ان کے صاحبزادے شیخ عطاء اللہ عثمانی گھوسوی متوفی ۱۰۶۳ھ تھے، ان کو شیخ عبدالقدوس بن شیخ عبدالسلام جونپوری متوفی ۱۰۵۲ھ سے بھی خلافت حاصل تھی، نیز دیوان محمد رشید (عبدالرشید) جونپوری مرید راجہ سید احمد حلیم اللہ مانک پوری کو شیخ عبدالقدوس سے خلافت حاصل تھی، مگر خانوادہ حمیدیہ چشتیہ کی نسبت کا رنگ یوں نمایاں تھا کہ دونوں شیخ حسام الدین مانک پوری کے جانشین مانے گئے۔

از خلفائے شاہ عبدالقدوس جونپوری	شیخ عبدالقدوس جون پوری کے خلفاء
یکے دیوان عبدالرشید جون پوری و	میں سے ایک دیوان عبدالرشید جون
دیگر قدرۃ العلماء عمدۃ العرفاء شیخ	پوری اور دوسرے قدوۃ العلماء وعمدۃ
عطاء اللہ والد غلام نقشبند سجادہ نشین	العرفاء شیخ عطاء اللہ والد غلام نقشبند
شیخ حسام الدین مانک پوری اند[1]	سجادہ نشین شیخ حسام الدین مانک پوری ہیں۔

شیخ دانیال جونپوری

مولانا شیخ دانیال بن حسن جونپوری بلخی الاصل تھے، ہندوستان آکر کچھ دنوں شاہان دہلی کے دربار سے وابستہ رہے پھر مانک پور جاکر سید حامد شاہ سے طریقۂ چشتیہ حاصل کیا، اور وہاں سے بنارس گئے، آخر میں جونپور میں درس وتدریس اور افادہ وارشاد میں لگ گئے، یہاں ان سے شیخ محمد بن یوسف حسینی جونپوری اور شیخ احمد بن یوسف جونپوری دونوں بھائیوں نے اکتساب علم وفضل کیا، شیخ احمد نے مقالات احمدیہ نامی کتاب میں اپنے شیخ ومرشد مولانا دانیال کے ملفوظات جمع کئے نیز سید محمد مہدی جونپوری نے شیخ دانیال سے تعلیم حاصل کرکے طریقت حاصل کی اور مدتوں مجاہدہ وریاضت میں زندگی بسر کی، مولانا دانیال ۹۹۲ھ میں فوت ہوئے۔

راجہ سید نور بن راجہ سید حامد مانک پوری

راجہ سید نور بن راجہ سید حامد شاہ مانک پوری کا نام بطور لقب کے نور الحق اور نور الدین بھی ہے، اپنے والد کے مرید وخلیفہ، اور ان کے صاحب کشف وکرامت سجادہ نشین ہیں، شاہ عبدالحق صاحب نے لکھا ہے، ''او نیز مثل پدر بزرگ وصاحب کرامت بود[2] بلکہ بعض اقوال کے مطابق وہ اپنے والد ماجد سے بزرگی وروحانیت میں آگے تھے، شیخ عبدالصمد بن افضل احمد انصاری نے اخبار الاصفیاء میں تصریح کی ہے

---

[1] انتصاح عن ذکر اہل الصلاح ص ۱۶۰، [2] اخبار الاخبار ص ۱۸۹،

راجی نور الدین قدم ہمت در کلبۂ فقر و فنا فشردہ چند پایہ از پدر بلند رفت و چند خلفاء و مریدان یادگار گزاشتہ [1]	راجہ نور الدین فقر و فنا میں زندگی بسر کر کے اپنے والد سے بھی کئی درجہ آگے گئے، اور چند خلفاء اور مریدوں کو یادگار چھوڑا۔

ان کا شمار اس دور کے اولیاء عظام میں ہوتا تھا، خزینۃ الاولیاء میں ہے،

راجی سید نور کہ از سادات نور علی نور و اولیاء عظام است [2]	راجہ سید نور ان سیدوں میں سے ہیں جو نور علیٰ نور اور بڑے ولیوں میں سے ہیں

ان کے والد راجہ سید حامد کو مخدوم حسام الدین نے بشارت دی تھی کہ یہ بچہ آگے چل کر قطبِ وقت ہوگا، والد نے بچپن ہی سے ان کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی اور سید نور بھی اپنے والد کی طرح عنفوان شباب ہی میں جملہ ظاہری و باطنی علوم و معارف سے بہرہ مند ہو گئے تھے، اخبار الاصفیاء میں ہے کہ راجہ نور کی پیدائش کی خبر سنکر شیخ حسام الدین نے راجہ حامد سے فرمایا کہ یہ بچہ قطبِ وقت ہوگا، اس کی تعلیم و تربیت میں تم پوری کوشش کرنا، چنانچہ راجہ حامد شاہ نے ان کو جوانی ہی میں علوم ظاہری اور آدابِ سلوک و ہدایت سے بہرہ مند کر کے اپنے تختِ خلافت پر جلوہ افروز کر دیا تھا۔[3]

گنج ارشدی میں ہے کہ شیخ حسام الدین نے آخری وقت میں اپنے صاحبزادے شیخ فیض اللہ عرف قاضی شہ کو خرقۂ چشتیہ پہنایا اور فرمایا کہ میرے فرزند کا پہلا مرید قطبیت کے مرتبہ کو پہونچے گا، اس وقت راجہ حامد شاہ موجود تھے، فوراً اپنے گھر گئے اور اپنے بچہ راجہ سید نور کو لا کر قاضی شہ کا مرید بنا دیا جب شیخ حسام الدین کو یہ واقعہ معلوم ہوا تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جو نعمت مجھے عطا فرمائی تھی، اسے راجہ حامد نے لے لیا، اور جو نعمت اللہ تعالیٰ نے میرے لڑکے کو دی تھی اس میں بھی اپنے لڑکے کو شریک کر لیا[4] مشکوۃ النبوۃ کے مطابق اس وقت راجہ نور صرف چھ ماہ کے تھے (ص ۲۱۶)

اس طرح سید نور اپنے والد راجہ سید حامد اور شیخ فیض اللہ دونوں سے فیض یافتہ ہوئے۔

---

[1] اخبار الاصفیاء قلمی ورق ص ۸۳ [2] خزینۃ الاولیاء ج ۱ ص ۴۰۹، [3] اخبار الاصفیاء ورق ص ۸۳ قلمی
[4] گنج ارشدی ج ۱ ص ۱۱ قلمی

اور فقر وفنا میں متوکلانہ زندگی بسر کر کے طریقہ چشتیہ میں مرتبۂ کمال کو پہونچے تھے۔ وہ بھی اپنے آباء واجداد کی طرح سپاہیانہ اور مجاہدانہ لباس میں رہتے تھے، اور اسلحہ بند ہو کر اپنے ظاہری و باطنی احوال وکیفیات کو چھپائے رکھتے تھے، شاہ عبدالحق صاحب نے لکھا ہے۔" ولباس سپاہ گری راغشاوہ حال ومشغولیِ باطن ساختہ" راجہ سید نور صاحب کے حال میں لکھا ہے کہ، جب وہ ذکر الٰہی کرتے تو ایک من وزنی پتھر اپنی گردن میں لٹکا لیتے تھے، یہ پتھر ان کے روضہ میں رکھ دیا گیا تھا، جسے شیخ غلام رشید مرتب گنج ارشدی نے دیکھا تھا، انھوں نے لکھا ہے کہ میں نے اس پتھر کو دیکھا اور بوسہ دیا ہے اس کا کچھ حصہ زمین میں چھپا ہے، کچھ باہر نکلا ہے۔

راجہ نور کا انتقال بعہد سکندر لودی ۲۳/رمضان ۹۲۱ھ میں عاشق آباد عرف مانک پور میں ہوا اور وہیں دفن ہوئے بعد میں ان کے پرپوتے راجہ سید مصطفٰے نے مزار پر گنبد وغیرہ تعمیر کرایا،

شیخ غلام عباس نے غزانامہ مسعود میں، اور سید محمد صادق نے خلاصۂ تواریخ مسعودی میں لکھا ہے کہ قطب الوقت حضرت راجے سید نور مانک پوری کے فرزند نہیں ہوتا تھا، آپ کی بیوی نے نیت کی کہ اگر حق تعالیٰ مجھ کو فرزند نرینہ عطا کرے پس میں مع فرزند بہرائچ میں واسطے زیارت حضرت سلطان الشہداء سالار مسعود کے جاؤں، آپ کی برکت سے حق تعالیٰ نے فرزند مبارک نام عطا کیا (غزانامہ مسعود میں ہے کہ خدا فرزندار جمند نیک فرجام سید مبارک نام عطا فرمایا) بی بی نے سید نور کو واسطے جانے بہرائچ کے تاکید کی، (غزانامہ مسعود میں ہے کہ سید صاحب کو مستورات کی روانگی میں عذر تنگ دستی پیش آیا) ایک شب سید نور حجرہ میں مشغول تھے کہ حضرت سالار مسعود اسپ خنک پر سوار تشریف لائے، گھوڑے سے اتر کر پیش سید راجے نور کے بیٹھ کر فرمایا فرزند کو میرے پاس لاؤ، کچھ حاجت نہیں کہ فرزند تمہارے بہرائچ میں آکر تکلیف اٹھائیں، راجے سید نور اٹھ کر سید مبارک طفل کو حضرت سالار مسعود غازی کے قدموں پر ڈال دیا، حضرت سلطان الشہداء سالار مسعود نے اس کو بہت دعا دی اور اٹھ کھڑے ہوئے،

(خلاصۂ تواریخ مسعودی ص ۱۶ مطبوعہ غالب الاخبار ۱۲۸۸ھ، اور غزانامہ مسعود ص ۷۵، مطبوعہ نظامی کانپور ۱۲۸۷ھ)

اس خواب یا واقعہ میں راجہ سید مبارک کو راجہ سید نور کا فرزند بتایا گیا ہے۔ بحر زخار میں بھی حضرت راجہ سید مبارک خلف و خلیفۂ راجہ سید نور راست'' لکھا ہے مگر گنج ارشدی میں ان کے والد کا نام سید احمد بن راجہ نور ہے اور یہی صحیح ہے

خلفاء

راجہ نور کے سب ہی تذکرہ نویس ان کی روحانیت و کرامت کے معترف ہیں اور ان کے فیوض و برکات کا ذکر کرتے ہیں۔ یوں تو ان کے بہت سے مریدین و خلفاء ہیں جن میں کئی فضلائے عصر شامل ہیں چند مشہور خلفاء یہ ہیں،

شیخ وتین جونپوری

ان کا نام الہٰ داد بن احمد رضی الدین جونپوری اور وتین عرفیت ہے، ظاہری و باطنی علوم و معارف سے آراستہ تھے، ان کا شمار کبار مشائخ چشتیہ میں ہے، راجہ نور کی خدمت میں رہ کر معرفت وطریقت کی تعلیم و تربیت حاصل کی ۹۴۴ھ میں انتقال کیا، ان کے مقام و مرتبہ کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ راجہ سید نور کے خلیفہ شیخ جلال الدین اودھی اکبر آبادی نے بھی ان سے طریقت میں اکتساب فیض کیا ہے۔

شیخ جلال الدین اودھی اکبر آبادی

شیخ جلال الدین بن صدر الدین اودھی اکبر آبادی ۸۹۷ھ میں اودھ میں پیدا ہوئے ان کا خاندان بہت پہلے سے علم و فضل اور روحانیت میں مشہور تھا، وہ راجہ سید نور سے طریقہ چشتیہ حاصل کر کے ان کے خلیفہ ہوئے ایک مدت تک امراء و سلاطین کی خدمت میں رہے، اس کے بعد ترک و تجرد کی زندگی اختیار کر کے سُر ہُر پور (فیض آباد) میں مستقل قیام کیا اور وہیں چار سال تک شیخ دتین سے بھی مزید اکتساب فیض کر کے مرتبۂ کمال کو پہونچے، آخر میں آگرہ میں سکونت اختیار کر لی تھی

اور وہیں ۱۰/ ذوالحجہ ۹۶۹ھ میں فوت ہوئے شیخ جلال الدین سے ان کے صاحبزادے شیخ بدرالدین کے علاوہ اور کئی مشائخ نے معرفت وروحانیت کی تعلیم پائی ہے۔

شیخ عبدالرزاق جھنجھانوی

شیخ عبدالرزاق بن علوی جھنجھانوی ۸۸۶ھ میں پیدا ہوئے، حفظ قرآن اور مختصرات کی تعلیم کے بعد پانی پت، دہلی، کالپی اور کوڑہ کا علمی اور روحانی سفر کر کے ہر جگہ کے علماء و مشائخ سے فیض اٹھایا اور تعلیم و تدریس میں مشغول رہے۔

تیس سال کے بعد یہ مشغلہ ترک کر کے شیخ محمد بن حسن بن طاہر عباس جونپوری کی خدمت میں رہے، جن کے والد شیخ حسن راجہ حامد کے اجل خلفاء میں سے تھے، اور ان سے تربیت پا کر خانوادہ حامدیہ کے روحانی سلسلہ میں شامل ہوئے بعد میں براہ راست راجہ سید نور شاہ کے مرید و خلیفہ ہوئے۔

شیخ عبدالرزاق طریقہ چشتیہ کے کبار مشائخ میں شمار ہوتے ہیں ۹۴۹ھ میں انتقال کیا۔

راجہ سید احمد بن راجہ سید نور

راجہ سید احمد بن راجہ سید نور بن حجۃ العاشقین راجہ سید حامد شاہ مانک پوری کا انتقال عین جوانی میں ہوا، ان کے بارے میں صرف گنج ارشدی سے کچھ باتین معلوم ہوئی ہیں جن کا خلاصہ ہم درج کرتے ہیں، لکھا ہے کہ راجہ سید نور کے دو فرزند سید احمد اور سید محمد تھے، دونوں بھائی ایک مکتب میں پڑھتے تھے ایک دن معلم نے کسی بات پر دونوں بھائیوں کو طمانچہ مارا جس سے ان کو سخت ملال ہوا، جب اس کی خبر ان کے والد سید نور کو ہوئی تو ان کو بہت رنج ہوا اور کہا کہ آل حیدر کرار کے چہرے پر طمانچہ مارنا اچھا نہیں ہے، یہ دونوں بھائی بجائے خود حیدر (شیر) ہیں، دونوں شہادت کے مرتبہ کو پہونچنے والے ہیں، بعد میں سید احمد اور سید محمد دونوں بھائیوں نے شاہی ملازمت کر لی، سپہ

گری خاندانی ورثہ میں ملی تھی، اتفاق سے اسی زمانہ میں بادشاہ وقت کی ایک دوسرے بادشاہ سے جنگ ہوئی، جس میں دونوں بھائی شریک ہوئے، عین معرکہ میں سید احمد کو زخم کاری آئے اور وہ گر گئے، ان کے والد کے ایک مرید نے اپنے پیرزادہ کو اس حالت میں دیکھ لیا اور ان کو میدان جنگ سے اٹھا کر علاج کیا، جب سید احمد اچھے ہو گئے تو ان کے گھر بھیج دیا، کچھ دنوں کے بعد ان کی شادی ہوئی ابھی چند ماہ گذرے تھے کہ پرانے زخم عود کر آئے اور سید احمد اسی میں فوت ہو گئے اس وقت ان کی بیوی حمل سے تھیں، والد ماجد راجہ سید نور کو بڑھاپے میں اپنے جوان صالح فرزند کی موت پر بیحد صدمہ ہوا، اور سید احمد کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے راجہ سید مبارک پیدا ہوئے[1]۔

راجہ سید مبارک بن سید احمد بانی مبارکپور

راجہ سید مبارک بن راجہ سید احمد بن راجہ سید نور بن راجہ سید حامد شاہ مانک پوری بانی مبارک پور کا نام کتابوں میں ملتا ہے تلاشِ بسیار کے باوجود ان کا تذکرہ صرف گنج ارشدی میں مل سکا ہے جو بسا غنیمت ہے، جیسا کہ ان کے والد کے تذکرہ میں معلوم ہوا، وہ ایک جنگ میں عین جوانی میں زخمی ہو گئے اور شادی کے چند ماہ بعد اسی زخم میں انتقال کر گئے، اسی زمانہ میں راجہ سید مبارک کے دادا سید نور بڑھاپے کی آخری منزل میں تھے، اس حادثہ کے بعد ان کے مریدین و معتقدین نے عرض کیا کہ آپ بوڑھے ہو چکے ہیں، صاحبزادے عین جوانی میں اللہ کو پیارے ہو گئے کہیں آپ کی اولاد کا سلسلہ منقطع نہ ہو جائے، یہ سن کر راجہ سید نور نے کہا کہ ان کی بیوی کی خبر لو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سے ایک بچہ پیدا ہوگا جس سے ہمارا خاندان چلے گا، پتہ لگانے پر معلوم ہوا کہ راجہ سید احمد کی بیوی کو ایک ماہ کا حمل ہے، اسی سے راجہ سید مبارک پیدا ہوئے دادا نے اپنے یتیم پوتے کی پرورش اور روحانی تربیت میں بڑے پیار اور محبت کے ساتھ کوشش کی، وہ ان کو بچپن میں پیار سے ”میاں ماکھو“ کہا کرتے تھے، راجہ سید مبارک ایک مرتبہ مراہفت و بلوغ کے زمانہ میں اپنا پائجامہ دھو کر دھوپ میں ڈالے ہوئے تھے، دادا نے دیکھ کر کہا کہ۔

---

[1] گنج ارشدی ج ۲ ص ۸

حیات ما تا بلوغ میاں ماکھو بود (از راہ شفقت حضرت راجہ سید مبارک را ماکھو فرمودند) مرا در ین خانہ دفن خواہید نمود میاں ماکھو را کہ احتیاج رسیدن، خواہد پرسیدہ خواہند گرفت،	ہماری زندگی میاں ماکھو کے بالغ ہونے تک ہے (شفقت و محبت کی وجہ سے ان کو ماکھو کہا) مجھ کو اسی گھر میں دفن کرنا میاں ماکھو کو کچھ پوچھنا ہوگا تو (بطریق روحانیت) مجھ سے پوچھ لیا کریں گے۔

راجہ سید نور نے اپنے یتیم پوتے کی تعلیم و تربیت کر کے بچپن ہی میں ان کو خلافت بھی دے دی تھی، گنج ارشدی میں ہے۔

دے مرید جد بزرگوار حضرت راجی سید نور در صغر گشت، و خلافت ہم دراں ایام یافت،	وہ اپنے دادا حضرت سید نور کے بچپن ہی میں مرید ہو گئے تھے، اور اسی زمانہ میں ان کی خلافت سے بھی سرفراز ہو گئے تھے

راجہ سید مبارک بھی ظاہری علوم سے زیادہ واقف نہیں تھے، مگر مشیخت و روحانیت میں بلند مقام و مرتبہ کے مالک تھے، یہ ان کا خاندانی ورثہ تھا، صاحب گنج ارشدی شیخ غلام رشید بن شیخ ارشد بن شیخ محمد رشید جونپوری نے ان الفاظ سے ان کا تذکرہ شروع کیا ہے،"ذکر قدوۃ اہل اللہ، و پیشوائے عرفاء اللہ تعالیٰ و تبارک سید مبارک" ان روحانی القابات و خطابات سے راجہ مبارک کی عظمت کا اندازہ ہو سکتا ہے وہ اپنے دادا راجہ سید نور کے خلیفہ تھے اور ارشاد و تلقین کی زندگی بسر کرتے تھے، ان کے حلقۂ ارادت و خلافت میں اولیائے کاملین کی ایک کثیر تعداد تھی۔

اکثر اولیائے کمل مرید و خلیفہ آنحضرت بودند،	اکثر اولیائے کاملین ان کے مرید و خلیفہ تھے۔

ان کے صاحبزادے راجہ سید مجتبےٰ اپنے والد کے مشہور خلفاء میں سے تھے۔

راجہ مبارک کی پہلی شادی شیخ حسام الدین مانک پوری کے خاندان میں ہوئی تھی، جو ان کے پردادا حجۃ العاشقین راجہ سید حامد کے شیخ و مرشد تھے، مگر ایک مدت تک کوئی اولاد نہیں ہوئی تو ان کی بیوی نے خود ان سے کہا کہ آپ دوسری شادی کر لیں تاکہ بقائے نسل کا باعث ہو، راجہ مبارک نے کہا کہ تم ہمارے خانوادہ کے مخدوم کے خاندان سے ہو، تمہارے ہوتے ہوئے دوسری شادی

مناسب نہیں ہے، جب بیوی نے بہت زیادہ اصرار کیا تو زوجین نے استخارہ کیا اور مژدہ ملا کہ تمہاری نسبت جون پور میں شیخ الہ داد کے گھرانے میں ہوگی جس سے اولاد ہوگی، چنانچہ بشارت کے مطابق دوسری شادی مولانا الہ داد جونپوری کی صاحبزادی سے ہوئی جن کے بطن سے راجہ مبارک کے چھ لڑکے ہوئے۔

''حضرت ایشان با زوجۂ خود استخارہ نمودند، چنا ظاہر شد کہ در جونپور بخانۂ میاں شیخ الہ داد نسبت خواہند نمود، وفرزنداں خواہند شد، حسب بشارت پرداختند، آخر شش پسر از دختر شیخ الہ داد متولد گشتند''	راجہ سید مبارک نے اپنی بیوی کے ساتھ استخارہ فرمایا تو ظاہر ہوا کہ جونپور میں شیخ الہ داد کے یہاں رشتہ ہوگا تو اولاد ہوگی۔ بشارت کے مطابق عمل کیا تو شیخ الہ داد کی صاحبزادی سے چھ لڑکے پیدا ہوئے

دوسری شادی کے بعد بھی پہلی بیوی اور اس کے خاندان کا ادب واحترام برابر قائم رہا، اور دونوں خاندانوں کے دینی و روحانی تعلقات کی خوشگواری و استواری میں کوئی فرق نہیں آیا، چنانچہ ایک مرتبہ شیخ حسام الدین کے عرس کے موقع پر راجہ سید نے ایک رسی اپنے گلے میں اور دوسری رسی ایک گائے کے گلے میں ڈالی، اور اسی حال میں شیخ قاسم سجادہ نشین خانقاہ حسام الدین کی خدمت میں چلے، شیخ قاسم ان کی آمد کی خبر سن کر پیشوائی کو نکلے، ملاقات ہوتے ہی راجہ مبارک نے کہا گائے اور مبارک دونوں حاضر ہیں شیخ قاسم نے گائے لیکر ذبح کی اور راجہ مبارک سے کہا

'گاؤ از مبارک بہتر است قابل فاتحہ گشت نہ کہ مبارک [1]'	گائے مبارک سے بہتر ہے کیونکہ وہ قابلِ فاتحہ ہے اور مبارک اس لائق نہیں ہے۔

بحر زخار میں ہے کہ

آن نو بادۂ بوستان حسامی، آن متصرف مقامات نامی آن در مکان لامکان علوم قطب وقت شاہ قاسم (۲۱ رشوال ــــ ھ) خلف و	وہ نوبادۂ بوستان حسامی، وہ نامی مقامات کو تصرف میں لانے والے، وہ علوم باطن کے مکانِ لامکاں کے دروازے، قطب وقت شاہ قاسم

[1] گنج ارشدی ج ۱ ص ۷ تا ص ۱۰

خلیفہ بندگی شیخ احمد (۱۴/محرم ۹۲۷ھ) خلف وخلیفہ بندگی نظام الدین عرف میران شہ (۲ ذیقعدہ ۹۹۰ھ) خلف وخلیفہ قاضی شہ فیض اللہ خلف و خلیفہ عالی والد بزرگوار واخود حضرت قطب حق شیخ حسام الدین مانک پوری (۲۸/رجب ۹۸۳ھ) در عبادت ومتصرفات یگانۂ وقت بود واکثران ازفیضِ تلقینش آگاہی نمودند درمصارف اطعمۂ مسافران بس تکلف داشتے کہ بخونچہ ہائے طعام۔ دید کہ دارے مئے ظروف بخشندے، در بست ویکم شوال وفات او (بحرز خارص ۳۵۷) شاہ خلیل خلف وخلیفہ شاہ قاسم ۹/شعبان فوت شد وشاہ سلطان خلف و خلیفہ شاہ قاسم (بحرز خارص ۳۵۸)	(۲۱ شوال ھ) خلف وخلیفہ بندگی شیخ احمد (۱۴ محرم ۹۲۷ھ خلف وخلیفہ بندگی نظام الدین عرف میران شاہ (۲/ذیقعدہ ۹۹۰ھ) خلف وخلیفہ قاضی شاہ فیض اللہ اپنے والد بزرگوار حضرت قطب حق حسام الدین مانک پوری (۲۸/رجب ۹۸۳ھ کے عالی خلف وخلیفہ تھے۔ عبادت اور روحانی تصرفات میں یگانۂ زمانہ تھے اور کثیر لوگوں نے ان کی تعلیم وتلقین کے فیض سے آگاہی حاصل کی ہے اور مسافروں کے کھانے کے اخراجات برداشت کرتے تھے جیسے کھانے کے خونچے اور ہر برتن رکھنے والے کو عطا کرتے تھے ۲۱/شوال ھ کو وفات پائی۔ شاہ خلیل خلف وخلیفہ شاہ قاسم ۹/شعبان کو فوت ہوئے۔ اور شاہ سلطان خلف وخلیفۂ شاہ قاسم تھے۔

اپنے خاندان کے بزرگوں کی طرح راجہ مبارک نے بھی جون پور اور اس کے اطراف و جوانب میں رہ کر ارشاد وتلقین کی خدمت انجام دی، وہ قصبہ مبارک پور کے بانی ہیں پہلے اس بستی کا نام قاسم آباد تھا اس کے زوال وانحطاط کے بعد راجہ مبارک نے اپنے نام پر دوبارہ آباد کیا[1] ان کے ہمراہ راقم الحروف کا خاندان مانک پور سے آکر مبارک پور میں آباد ہوا، بعد میں راجہ مبارک مانک پور چلے گئے اور وہیں فوت ہوئے جس زمانہ میں وہ مبارک پور (پرگنہ محمد آباد گوہنہ) میں تھے

[1] اعظم گڑھ گزیٹر ص ۲۶۱ ذکر مبارک پور

انھوں نے کسی ''مولانا حاجی محمد علی صاحب'' سے امامت ووصایت کے بارے میں سوالات کئے تھے، اور مولانا نے جوابات دیئے تھے، اس کا ایک قلمی نسخہ مولانا عبدالفتاح گلشن آبادی (ناسک) کے کتب خانہ سے راقم کو ملا ہے جو ناقص الآخر ہے اس کی ابتدا یوں ہوتی ہے۔

''جواب سید راجی مبارک محمد آبادی کہ جناب مولانا حاجی محمد علی صاحب نوشتہ بودند،

سید راجہ مبارک محمد آبادی کے جواب میں مولانا حاجی محمد علی صاحب کا لکھا ہوا خط

بسم اللہ الرحمن الرحیم	بسم اللہ الرحمن الرحیم
'بخدمت راجی مبارک علی صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ از طرف فقیر محمد علی عفی عنہ بعد سلام سنت الاسلام آنکہ سوال از اثبات امامت دوصایت کہ فرمودہ اند معلوم نمایند کہ وصایت وامامت دوازدہ امام علی نبینا وعلیہم الصلواۃ والسلام نزد اہل سنت وجماعت ثابت و محقق است، نہ باین معنی کہ شیعہ می گویند بلکہ بمعنی دیگر است، چراکہ شیعہ لفظ امامت می گویند وازان مراد نبوت می دارند و دوازدہ امام را احکام نبوت ثابت می کنند از نزول وحی وتحریم وتحلیل اشیاء وغیرہ کہ در کتب ایں فرقہ مسطور است الخ''	راجہ مبارک صاحب کو فقیر محمد علی عفی عنہ کا سلام پہونچے بعد سلام عرض یہ ہے کہ انھوں نے امامت ووصایت کے ثبوت کے بارے میں جو سوال کیا ہے، اس کے تعلق سے انھیں معلوم ہونا چاہئے کہ بارہ امام علیٰ نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام کی امامت ووصایت اہل سنت وجماعت کے نزدیک ثابت ومتحقق ہے۔ مگر ان معنوں میں نہیں جو شیعوں کے نزدیک ہے۔ اہل سنت کے نزدیک امامت ووصایت کا مفہوم دوسرا ہے۔ شیعہ حضرات امامت کا لفظ بول کر اس سے نبوت مراد لیتے ہیں اور بارہ اماموں کے لئے نبوت کے احکام وخصائص جیسے وحی کا آنا، چیزوں کو حلال وحرام کرنے کا اختیار وغیرہ ثابت کرتے ہیں جیسا کہ شیعہ کتابوں میں لکھا ہوا ہے۔

راجہ مبارک بھی دیار پورب میں رہنے سہنے کے باوجود اپنے آباء واجداد کی طرح مانک پور

میں فوت ہوئے اور وہیں دفن کئے گئے، اعظم گڑھ گزیٹر کا یہ بیان صحیح نہیں ہے کہ مبارک پور کے موجودہ شیوخ زمینداروں کے مورث اعلیٰ راجہ مبارک تھے، بلکہ ان کے مورث اعلیٰ شیخ محمود بائیسی قریشی مبارک پوری تھے، جو شاہجہانی دور میں یہاں کے رئیس اعظم اور بائیس گاؤں کے زمیندار تھے،اور راجہ اعظم خاں بانی اعظم گڑھ اور شیخ محمود بائیسی میں چشمک رہا کرتی تھی اسی میں وہ مارے گئے۔

راجہ مبارک شاہ ۲رشوال ۹۶۵ھ میں مانک پور میں فوت ہوئے اور اپنے دادا سید نور کے پہلو میں دفن کئے گئے ان کی تاریخ وفات گنج ارشدی میں یہ ہے۔

امام سالکان و قطب الاقطاب — سر دیں حضرت راجی مبارک

چوں زیں دنیائے دوں رحلت نمودہ — بلطف حق تعالیٰ و تبارک

ہمہ قدوسیاں بر مسندِ عرش — تبرک دار بر دندش تبارک

شدہ مذکور سالش گفتہ حامد — بحق شد راجی سید مبارک

(۹۶۵ھ)

بعد میں ان کے صاحبزادے راجہ سید مصطفیٰ نے مزار پر گنبد تعمیر کرایا، اس گنبد کے اندر تین قبریں ہیں، پہلی قبر راجہ سید نور کی ہے۔اس کے بعد جانب مشرق راجہ سید مبارک کی۔ یہ دونوں قبریں سنگ مرمر کی ہیں، ان کا فرش بھی سنگ مرمر ہی کا ہے،اور حاشیہ سنگِ موسیٰ کا ہے۔تیسری قبر خود راجہ سید مصطفیٰ ابن راجہ مبارک کی ہے، یہ کچی ہے[1]۔

موج احوال آن روح روان — صوفیوں کے وہ روحِ رواں، مریدوں کے وہ

رہرواں، آن رہنمائے پیراں، آن بر — راہ بر، اللہ تبارک تعالیٰ کے وہ برگزیدہ، کامل ولی

گزیدۂ اللہ تبارک ولی کامل حضرت — حضرت راجی سید مبارک رحمۃ اللہ علیہ، راجہ سید

راجہ سید مبارک، خلف و خلیفہ راجہ سید — نور کے فرزند اور ان کے خلیفہ ہیں ان کا شمار

نور راست، از اعظم اولیاء صاحب — بڑے صاحب کرامات ولیوں اور اکابر صوفیوں

[1] یہ ساری تفصیلات گنج ارشدی جلد دوم ص ۷ تا ص ۱۱ سے ماخوذ ہیں۔

کرامات واکابر عاشقان، در تصوف و عشق مرتبۂ بلند داشت کرامتش را از ازینجا قیاس باید کرد کہ پسرش راجہ سید مجتبےٰ دوازدہ سالہ بود کہ آں حضرت قریب شب وفات نمود، صبح دایہ سید مجتبیٰ درعین نوحہ وزاری بر زبان کلمہ آورد کہ مجتبی راہنوز تلقین نکردہ بود، وخود ازین جہاں انتقال فرمود، بہ فور این کلمہ آن حضرت زندہ شد، برخواست وفرمود مجتبی را تلقین نمودہ ازین عالم خواہم رفت، پس پنج سال درین عالم ماندہ از سائر اکتساب و امانات اجداد پیران مجتبی را بہرہ ور و تلقین نمودہ فرمود حالا احتیاج صحبت بہ تو باقی نماندہ، پس ازین عالم بملاءِ اعلیٰ شتافت، و کیفیت احوال سید مجتبی رانیز ازین قصہ باید فہمید کہ برائے تربیت او حق سبحانہ وتعالیٰ پدرش را از ممات بحیات آورد۔[1]

میں ہوتا ہے۔ وہ عشق وتصوف میں بلند مقام و مرتبہ رکھتے ہیں، ان کی کرامت کا اندازہ اسی واقعہ سے کرنا چاہئے کہ ان کے صاحبزادے سید مجتبیٰ ابھی بارہ برس کے ہوئے تھے کہ یہ بزرگ راجہ سید مبارک شام کو انتقال فرما گئے۔ صبح کو سید مجتبیٰ کی دایہ نے نوحہ وزاری کے درمیان یہ جملہ ادا کیا کہ آپ نے ابھی سید مجتبیٰ کی تعلیم وتلقین نہیں فرمائی تھی اور خود اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ حضرت سید مبارک یہ بات سنتے ہی زندہ ہو گئے، اٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ مجتبیٰ کی تعلیم وتلقین اور تصوف میں تربیت کرنے کے بعد ہی اس دنیا سے جاؤں گا۔ پس پانچ برس تک اس دنیا میں رہ کر تمام تبرکات و امانات جو ان کے اجداد اور پیروں سے حاصل ہوئے تھے، ان سے سید مجتبیٰ کو بہرہ ور فرمایا اور مجتبیٰ کی تلقین کر کے فرمایا کہ اب تمہیں تربیت وصحبت کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ پس اس دار فانی سے ملاءِ اعلیٰ کی طرف کوچ کر گئے۔

سید مجتبیٰ کی کیفیتِ احوال کو بھی اسی واقعہ سے سمجھنا چاہئے کہ ان کی تربیت کے لئے اللہ تعالیٰ ان والد گرامی کو موت سے حیات میں لایا۔

---

[1] (بحر زخار از مولوی وجیہ الدین اشرف قلمی ص ۳۷۵)

راجہ سید مصطفیٰ بن راجہ سید مبارک

راجہ سید مصطفیٰ بن راجہ سید مبارک بن راجہ سید احمد بن راجہ سید نور بن راجہ سید حامد مانک پوری کا حال بھی بہت کم معلوم ہو سکا، مگر جتنا معلوم ہوا ہے ان کی عظمت شان کو بخوبی ظاہر کرتا ہے، معلوم ہو چکا ہے کہ راجہ سید مبارک کے چھ لڑکے مولانا الہداد جونپوری کی دختر کے بطن سے پیدا ہوئے، ان میں سے دو حضرات کے حالات کتابوں میں ملتے ہیں ایک یہی راجہ سید مصطفیٰ اور دوسرے راجہ سید مجتبیٰ ہیں۔

راجہ سید مصطفیٰ از سادات گز دیزیہ بودہ اند، وجد ایشان معارف پناہی راجی حامد شہ از خلفائے عظام مخدوم شیخ حسام الدین مانک پوری است، قدس سرہ، وصبیۂ شیخ (محمد غوث گوالیاریؒ) در قید نکاح سید بودہ است، بسے بزرگ وعظیم الشان وپیرزادہ آں دیار بودہ، و فقراء وغرباء بسیار شفقت ومہربانی می فرمودہ، دہر چہ داشتہ صرف فقراء وغرباء ومساکین ی فرمودہ، ودر جود وسخا یکتائے بے ہمتا بودہ است، رحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعۃ

(تذکرۃ الاولیاء مصنفہ شیخ عبدالنبی شطاری قلمی ص۱۱۶ تصنیف ۱۰۴۰ھ)

راجہ سید مصطفیٰ گردیزی سیدوں کی نسل سے ہیں۔ ان کے دادا معارف پناہ راجہ حامد شاہ مخدوم شیخ حسام الدین مانک پوری کے خلفائے عظام میں سے ہیں۔ شیخ محمد غوث گوالیاریؒ کی صاحبزادی سید مصطفیٰ کے نکاح میں تھیں۔ یہ راجہ مصطفیٰ اپنے دیار کے بڑے بزرگ اور عظیم الشان پیرزادے سمجھے جاتے تھے۔ فقراء وغرباء پر بہت مہربان وشفیق تھے۔ اور جو کچھ بھی اپنے پاس رکھتے تھے وہ سب فقراء وغرباء اور مساکین پر خرچ کر دیتے تھے سخاوت و بخشش میں یکتا اور بے مثال تھے۔

موج احوال آن روندۂ راہ بے شبہ راجی سید مصطفیٰ بن سید مبارک بن سید محمود بن سید نور بن سید راجی حامد شہ، نسبت دامادی و

سالک راہِ یقین راجہ سید مصطفیٰ بن سید مبارک بن سید محمود بن سید نور بن سید راجہ حامد شاہ انھیں شیخ محمد غوث گوالیاری سے

خلیفہ از شیخ محمد غوث گوالیاری داشت، در گلزار ابرار نویسد پاکیزہ دروں و مصفا بروں، سرود و سماع را بسیار دوست داشتے مگر بر نغمہ دلش از دست نرفتے تا کہ قوالان زمزمہ سازی بکمال مرتبہ ہنر مندگی در موسیقی درکار است نہ نمودے از صبیہ شیخ محمد غوث اورا فرزنداں پدید آمدند، بالفعل راجی سید محمد خلف رشید او بجائے پدر جانشین است، درسال نہصد و ہشتاد و نہ بعالم بقا خرامید (بحر زخار قلمی ص ۹۵۹)	نسبت دامادی و خلافت کا شرف حاصل ہے۔گلزار ابرار میں درج ہے کہ ان کا باطن پاکیزہ اور ظاہر بے داغ تھا۔سرود و سماع سے گہرا تعلق رکھتے تھے،مگر گانے پر اپنے دل کو بے قابو نہیں ہونے دیتے تھے جب تک کہ قوالوں کو زمزمہ سازی اور موسیقی میں جس کمال فن اور مرتبۂ کمال کی ضرورت ہوتی ہے وہ حاصل نہ ہو جاتی تھی۔محمد غوث گوالیاری کی صاحبزادی سے ان کے لڑکے ہوئے ان کے خلف رشید سید محمد سچے جانشین ہوئے ۹۸۹ھ میں عالم بقا کو سدھارے

راجہ سید مصطفیٰ کا حال مجھے صرف گلزار ابرار مصنفہ مولانا محمد غوثی منڈوی میں مل سکا ہے، گنج ارشدی میں دادا اور والد کے مزار پر ان کے روضہ اور گنبد تعمیر کرنے کا ذکر ہے،ان کے اوصاف و کمالات یہ ہیں۔

اخلاق درویشانہ و اطوارِ صوفیانہ داشت، برداشت گرانی ناملائم چیز ہا طبع او نیارستے بفراواں ظرافت زندگانی بر بُردے پاکیزگی بروں و صفائے دروں تخمر طینت او بود۔	وہ اخلاق درویشانہ اور اطوار صوفیانہ رکھتے تھے، نامناسب چیزوں کی گرانی ان کی طبیعت کے لئے ناقابل برداشت تھی بڑی پاکیزہ زندگی رکھتے تھے،ظاہری و باطنی پاکیزگی اور صفائی ان کے خمیر میں تھی۔

ظرافت طبع اور لطافتِ ذوق کا یہ حال تھا کہ سرود و سماع کا شغل رکھنے کے باوجود جب تک فن موسیقی کے مطابق کمال ہنر مندی کے ساتھ ترانہ پردازی اور زمزمہ سازی نہ ہوتی ہر نغمہ پر کیف اور وجد طاری نہیں ہوتا تھا اور تقیّد کے حضیض“ سے نکل کر اطلاق کے اوج” پر نہیں پہونچتے تھے،

۹۸۴ھ میں اکبر بادشاہ دار الخلافہ آگرہ سے لشکر کے ساتھ مالوہ کی طرف جا رہا تھا مشائخ

فقراء، فضلاء، اور قضاۃ لشکر کے ہمراہ تھے، راقم (مولانا محمد غوثی منڈوی) اکابر کی صحبت وخدمت کا حریص ہے یہ خبر سنتے ہی صبر نہ کر سکا اور بزرگانِ شہر (منڈو) کی رفاقت میں جو سیرِ لشکر کے ارادہ سے نکلے تھے، شاہی لشکر میں پہونچا، اسی تقریب میں راجہ سید مصطفٰے سے شرف ملاقات حاصل کیا اور متعدد باران کی حاشیہ نشینی کی سعادت سے بہرہ ور ہوا ان کی یہ مجلسیں بڑی روحانی و پرُ کیف ہوتی تھیں، خاص طور سے دائرۂ شیخ ضیاء اللہ بن غوث الاولیاء قدس سرہ میں جو مجلس برپا ہوئی تھی اس میں ہر طرف سے الحوصلہ الحوصلہ کی ندا اور الاستعداد کی فریاد برپا ہو رہی تھی، اس میں راجہ سید مصطفٰے کی بادۂ وحدت سے سرمستی کا عجیب عالم تھا [۱]۔

راجہ سید مصطفٰے نے اپنے دادا اور والد کی قبروں پر روضہ اور گنبد تعمیر کرایا تھا، جس کے اندر تاریخ بناء کے یہ اشعار نقش تھے۔

للہ الحمد، خالق الکونین	وحدہ لاشریک لہ ثانی
قادرِ ذوالجلال والاکرام	کہ جہاں راست قدرتش بانی
چوں موفق شدہ عنایتِ او	بتوفیق لطف سبحانی
در زمانِ جلال دین اکبر	کہ بدادش خدا جہاں بانی
روضہ ساختہ مصطفٰے راجی	کش چوں رضواں سزد بہ دربانی
فیض بخش مروّحِ ارواح	در سرِ قطبہائے ربانی
بہر سال بنائے تاریخش	ہم بیک بیت او معانی

جنت پر بنور ربانی [۲]

راجہ سید مصطفٰے کی شادی شیخ اویس بن غوث الاولیاء کی دختر سے ہوئی تھی، شیخ اویس عربی زبان کے ماہر اور علوم ظاہری کے ساتھ سلوک و معرفت میں بہت آگے تھے، اپنے والد کی خانقاہ اور مسجد واقع احمد آباد میں رہتے تھے، ۱۰۰۳ھ میں گلزار ابرار کے مولف شیخ محمد غوثی نے ان سے نیاز

---

[۱] گلزار ابرار ص ۱۱۴ قلمی در کتب خانہ سالار جنگ میوزیم حیدر آباد مخطوطہ ۱۱۵۷ھ [۲] گنج ارشدی ج ۲ ص ۱۰

حاصل کیا تھا۔[1]

راجہ مصطفیٰ کی وفات ۹۸۹ھ میں مانک پور میں ہوئی اور وہیں اپنے دادا اور والد کے خطیرہ میں دفن ہوئے "درسال نہصد و ہشتاد ونہ کمانش بعالم قوس فرامید" ان کے کئی فرزند تھے، جن میں راجہ سید محمد اپنے پدر بزرگوار کے جانشین تھے اور گلزارِ ابرار کی تصنیف ۱۰۲۲ھ تک بقید حیات تھے راجہ مصطفیٰ کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا تعلق اکبر کے درباری حلقہ سے تھا ان کے خطۂ پورب میں آنے جانے کی کوئی تصریح نہیں ملتی۔ البتہ ان کے بھائی راجہ سید مجتبیٰ اپنے آباء واجداد کے مانند اس دیار سے تعلق رکھتے تھے۔

راجی سید معین الدین

از سادات گردیزیہ بودہ اند، وجد ایشان معارف پناہی راجہ سید حامد شہ از خلفائے عظام مخدوم شیخ حسام الدین مانک پوری است قدس سرہ، وصبیہ حضرت شیخ درقید نکاح سید بودہ است، بسے بزرگ وعظیم الشان پیرزادہ آن دیار بود وبفقراء وغرباء بسیار شفقت ومہربانی می فرمود، وہرچہ داشتہ صرف فقراء وغرباء ومساکین می فرمود، دردسخا وجود یکتائے بے ہمتا بودہ است، رحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعۃ (تذکرۃ الاولیاء قلمی ص ۱۶ مصنفہ ابن عبداللہ عبدالنبی شطاری متوفی ۱۰۴۰ھ)

راجہ سید مصطفیٰ گردیزی سیدوں کی نسل سے ہیں۔ ان کے دادا معارف پناہ راجہ حامد شاہ مخدوم شیخ حسام الدین مانک پوری کے خلفائے عظام میں سے ہیں۔ شیخ محمد غوث گوالیاریؒ کی صاحبزادی سید مصطفیٰ کے نکاح میں تھیں۔ یہ راجہ مصطفیٰ اپنے دیار کے بڑے بزرگ اور عظیم الشان پیرزادے سمجھے جاتے تھے۔ فقراء وغرباء پر بہت مہربان وشفیق تھے۔ اور جو کچھ بھی اپنے پاس رکھتے تھے وہ سب فقراء وغرباء اور مساکین پر خرچ کردیتے تھے سخاوت وبخشش میں یکتا اور بے مثال تھے۔

[1] اذکار ابرار ترجمہ گلزار ابرار ص ۶۰۲، ص ۶۰۷،

راجہ سید مجتبیٰ ابن راجہ سید مبارک

راجہ سید مجتبیٰ بن راجہ سید مبارک بن راجہ سید احمد بن راجہ سید نور بن راجہ سید حامد مانک پوری، راجہ سید مصطفےٰ کے بھائی اور کبار مشائخ چشتیہ میں ہیں ان کے علوّ ئے مرتبت کے بارے میں صاحب گنج ارشدی نے تصریح کی ہے۔

''قدوۃ الاولیاء، بدر العرفاء، حضرت سید مجتبی قدس سرہ مانک پوری مقدام اولیاء و عرفاء بود، علوئے مقامات و کراماتِ او زیادہ از آنست کہ مرتبِ احقر در تحریر و تقریر آرد''	قدوۃ الاولیاء ، بدر العرفاء حضرت سید مجتبیٰ مانکپوری اولیاء اللہ کے پیشوا تھے ان کے مراتب کی بلندی اور ان کی کرامتیں ان سے بہت زیادہ ہیں جو اس حقیر مرتب نے تحریر و تقریر میں بیان کی ہیں

پھر لکھا ہے کہ ان کے حلقۂ ارادت اور دائرۂ انقیاد و اطاعت میں صاحب کمال حضرات تھے، ان کی تعلیم و تربیت والد ماجد راجہ مبارک نے کی تھی اور وہ ان ہی کے مرید و خلیفہ بھی تھے،

دے مرید و خلیفۂ والد بزرگوارِ خود حضرت راجی سید مبارک قدس سرہ بود،	وہ اپنے والد بزرگوار حضرت راجہ سید مبارک کے مرید اور خلیفہ تھے۔

شیخ غلام رشید جونپوری کا بیان ہے کہ میں نے راجہ غلام محی الدین جانشین راجہ سید حلیم اللہ مانک پوری سے سنا ہے کہ اگر کسی کو کوئی حاجت پیش آئے یا مصیبت میں گرفتار ہو، اور آٹھ عدد شیرینی راجہ سید مجتبیٰ کے ایصال ثواب کے لئے فقراء کو تقسیم کرے تو اس کی مراد بر آئے گی اور وہ مصیبت سے نجات پا جائے گا۔ ان کی وفات ۱۳؍ جمادی الثانیہ ــــھ میں ہوئی، اور ان کی قبر مانک پور میں حجۃ العاشقین راجہ سید حامد شاہ کے روضہ میں ہے [۱]۔

---

[۱] گنج ارشدی ج ۲ ص ۷

راجہ سید احمد حلیم اللہ بن راجہ سید مجتبیٰ

راجہ سید احمد حلیم اللہ بن راجہ سید مجتبیٰ ابن راجہ مبارک بن راجہ سید احمد بن راجہ نور بن راجہ حامد شاہ مانک پوری نے اپنے والد بزرگوار سے دینی علوم حاصل کر کے ان ہی سے طریقۂ چشتیہ حاصل کیا اور عرصہ دراز تک ان کی صحبت میں رہ کر ارشاد و تلقین کا سلسلہ جاری کیا، مشہور ہے کہ جو بات کہتے تھے اسکا ظہور ہو جاتا تھا، ان کی کشف و کرامت کے بہت سے واقعات مشہور ہیں، کبھی کبھی خود بھی اپنی کرامتوں کو بیان کیا کرتے تھے، بعض مریدوں نے الخوارق الاحمدیہ" کے نام سے ان کی کرامتوں کو جمع کیا ہے، اپنے خاندان کے شیخ الشیوخ مخدوم حسام الدین مانک پوری کی ذرّیات کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے، اس خاندان کے بچے اگر سامنے سے گزرتے یا کھیلتے نظر آتے تو ان کے احترام میں کھڑے رہتے تھے۔

محمد آباد (اعظم گڑھ) میں راجہ سید احمد حلیم کے دو مرید تھے، ایک نے دوسرے کی زمین پر قبضہ کر کے مکان بنانا چاہا، راجہ احمد حلیم نے ہر چند اسے اس حرکت سے روکا مگر اس نے نہیں مانا، اور مکان بنا لیا، جب ان کو اس نازیبا حرکت کا علم ہوا تو فرمایا کہ اس زمین پر عمارت باقی نہیں رہے گی، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور وہ آخر میں شرمندہ ہو کر اپنی حرکت سے باز آگیا،

دیوان محمد رشید جونپوری متوفی ۱۰۸۳ھ اور دوسرے بہت سے مشائخ نے ان سے طریقت و مشیخت کی تعلیم و تربیت پائی ہے۔ ایک مرتبہ دیوان محمد رشید نے راجہ سید احمد حلیم اللہ سے عرض کیا کہ اگر آپ کا حکم ہو تو میں جون پور کے بجائے مانک پور میں سکونت اختیار کر لوں، اس پر انھوں نے کہا کہ تم اس چھوٹی سی جگہ کو راجہ غلام محی الدین کے لئے چھوڑ دو، میں نے تم کو جون پور جیسی بڑی جگہ دی، تم وہیں رہ کر خلق اللہ کو رشد و ہدایت کی راہ دکھاؤ،

راجہ سید احمد حلیم اللہ ۱۵ر جمادی الاولی ۱۰۴۰ھ میں فوت ہوئے اور مانک پور کے باہر حجۃ العاشقین ارجہ سید حامد شاہ کے روضہ میں دفن کئے گئے انھوں نے اپنی زندگی ہی میں اس کی وصیت کی تھی، ایک مرتبہ متوسلین نے عرض کیا کہ اگر آپ مناسب سمجھیں تو آپ کو بھی راجہ سید نور اور

راجہ سید مبارک کے روضہ میں دفن کیا جائے، اس پر فرمایا کہ مریدوں کو چاہیئے کہ پیروں کی پاسبانی کریں تم لوگ مجھے ان کی پاسبانی کے لئے شہر کے باہر ہی دفن کرنا۔

راجہ سید احمد حلیم اللہ کے مقام و مرتبہ کا اندازہ گنج ارشدی کے ان الفاظ سے ہوتا ہے، جن سے ان کا تذکرہ شروع کیا گیا ہے، قدوۃ الاولیاء، برہان الاتقیاء موصوف بکراماتِ سنیہ مبعوث بمقامات منیعہ، دستگیر درماندگان، وسیلۂ بے چارہ گان، رئیس و پیشوائے اہل السر حضرت راجی میر احمد حلیم اللہ مانکپوری، انھوں نے اپنے والد بزرگوار سے تعلیم و تلقین اور تربیت پائی تھی اور ان ہی کے مرید و خلیفہ تھے بہت سے مشائخ نے ان سے بیعت و خلافت کی سعادت پائی اور خلق اللہ کو فیض پہونچایا۔

آنحضرت مرید و خلیفہ برحق، جانشین مطلق والد بزرگوار خود حضرت راجی سید مجتبیٰ مانک پوری است، داکثر اولیاء اللہ در حلقۂ ارادت وے درآمدہ، واکثرے اجازت و خلافت یافتہ جماعت را ارشاد و ہدایت نمودہ بکمال انسانی رسانده[1]	وہ اپنے والد بزرگوار راجہ سید مجتبیٰ کے خلیفۂ برحق اور جانشین مطلق تھے اور اکثر اولیاء ان کے مرید تھے اور بہتوں نے ان سے اجازت و خلافت پاکر لوگوں کو کمال انسانی تک پہونچایا۔

ان کے خلفاء میں دیوان محمد رشید جونپوری متوفی ۱۰۸۳ھ اس دیار کے مشہور عالم و مرشد ہیں بعض روایات کی رو سے ان کا آبائی وطن نظام آباد (اعظم گڑھ) تھا، وہ طریقہ چشتیہ اور سہروردیہ دونوں میں راجہ سید احمد حلیم اللہ سے خلافت یافتہ تھے، دیوان محمد رشید کے خلفاء میں تین بزرگوں کا تعلق موجودہ اعظم گڑھ کے علاقہ سے رہا ہے، (۱) شیخ عبداللطیف بن عبدالہادی مٹھن پوری، حضرت شیخ جنید بغدادی کی اولاد سے تھے، سلسلۂ چشتیہ کے علاوہ سلسلۂ جنیدیہ اور سلسلۂ اشرفیہ کے مجاز تھے، دیوان محمد رشید کے صاحبزادے شیخ محمد ارشد کے خسر تھے، ان کا وطن مٹھن پور نواح نظام آباد (اعظم گڑھ) تھا[2]، (۲) میر سید قیام الدین سگڑوی گورکھپوری بڑے زاہد و مرتاض

---

[1] گنج ارشدی ج ۲ ص ۲ [2] سمات الاخیار ص ۷۰

اور درویش تھے، دیوان محمد رشید سے ارادت وخلافت رکھتے تھے، صائم الدہر قائم اللیل تھے، کثرت ریاضات کی وجہ سے بہت ضعیف ہو گئے تھے ایک دن دیوان صاحب نے ان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تم اور سید جعفر اس فقیر کی نجات کے لئے سبب ہو گئے، گورکھپور کے سبز پوش خاندان کے مورث اعلیٰ ہیں، ۸ر صفر ۱۱۲۸ھ میں انتقال ہوا، اصلی وطن سگڑی (اعظم گڑھ) تھا[۱]، (۳) سید محی الدین محمد آبادی سید حمید الدین کا حال معلوم نہ ہو سکا صاحب سمات الاخیار نے دیوان محمد رشید کے ۳۴ کامل اور جید خلفاء میں ان کو بھی شمار کیا ہے۔ غالباً گیارہویں صدی کے آخر یا بارہویں صدی کی ابتداء میں فوت ہوئے[۲]۔

راجہ سید غلام محی الدین بن راجہ سید احمد حلیم اللہ

راجہ سید غلام محی الدین کا حال نہ مل سکا، وہ راجہ سید احمد حلیم اللہ کے صاحبزادے اور ان کے جانشین تھے، گنج ارشدی کا بیان گذر چکا ہے کہ ایک مرتبہ غلام محمد رشید نے راجہ احمد حلیم اللہ سے جونپور کے بجائے مانک پور میں قیام کرنے کی اجازت طلب کی تو انھوں نے فرمایا کہ۔

این جائے خرد را براجی غلام محی الدین گذرایند،	یہ چھوٹی جگہ راجی غلام محی الدین کے لئے چھوڑ
شمارا جائے بزرگ جونپور دادہ ام[۳]،	دو، میں نے تم کو بڑی جگہ جونپور دی ہے۔

نیز ایک واقعہ کے سلسلہ میں راجہ سید غلام محی الدین کے اپنے راجہ سید احمد حلیم اللہ کے خلیفہ و جانشین ہونے کی تصریح موجود ہے۔

مرتب احقر از زبان فیض ترجمان حضرت	احقر (شیخ غلام رشید جونپوری) نے
راجہ سید غلام محی الدین نبیرہ؟ جانشین حضرت	راجی سید غلام محی الدین جانشین راجی
راجی سید حلیم اللہ مانک پوری استماع نمود	سید حلیم اللہ مانکپوری سے سنا ہے کہ
کہ الخ[۴]	الخ

غالباً ان کی عرفیت راجہ یٰسین تھی مولوی ابوالحسن مانک پوری نے آئینۂ اودھ میں راجہ سید

---

[۱] سمات الاخیار ص ۶۲ [۲] ص ۶۳ [۳] گنج ارشدی ج ۲ ص ۵ [۴] ص ۲۷

مبارک کے ایک پوتے راجہ یٰسین کا تذکرہ کیا ہے، اور لکھا ہے کہ راجہ سید نور کے پسر راجی سید احمد، ان کے سید مبارک، ان کے راجی سید بندگی، ان کے راجی سید یٰسین الخ[1] یہی راجہ سید یٰسین راجہ سید غلام محی الدین ہوں گے، ان کو بھی خاندانی مشیخت و بزرگی اور طریقہ چشتیہ میں خلافت حاصل تھی۔ پدر بزرگوار نے ان کو مانک پور کی ولایت دیکر خلافت دی تھی، مگر ان کے دو صاحبزادوں راجہ سید غلام معین الدین عرف راجہ دانی اور راجہ سید غلام نظام الدین عرف راجہ خیر اللہ نے جونپور اور نواحی محمد آباد گوہنہ کی ولایت سنبھالی، جیسا کہ شیخ شمس الدین حیدری نے مناقب غوثی "میں حضرت ابولغوث گرم دیوان بھیروی لہراوی متوفی ۱۰۷۸ھ کے حالات میں تفصیل سے بیان کیا ہے"۔

راجہ سید غلام نظام الدین بن راجہ غلام محی الدین عرف راجہ خیر اللہ

راجہ سید غلام نظام الدین بن راجہ سید غلام محی الدین بن راجہ سید احمد حلیم اللہ بن راجہ سید مجتبیٰ بن راجہ سید مبارک مانک پوری کی عرفیت راجہ سید خیر اللہ ہے۔ مناقب غوثی میں ہے۔

در سلسلۂ عالیہ حامدی و احمدی ایں دو	سلسلہ عالیہ حامدی (راجہ حامد شاہ سے منسوب)
بزرگ حضرت راجی سید غلام معین الدین	اور احمدی (راجہ احمد حلیم سے منسوب) ہیں یہ
عرف حضرت راجی دانی، و حضرت راجی	دونوں بزرگ راجی سید غلام معین الدین عرف
سید غلام نظام الدین عرف راجی سید	راجہ دانی اور راجی سید غلام نظام الدین عرف
خیر اللہ قدس سرہما بغایت تصرفات و	راجہ خیر اللہ قدس سرہما انتہا درجہ کے تصرفات و
کمالات داشتہ بودند دراں وقت در فرقۂ	کمالات رکھتے تھے، اس وقت طبقۂ اہل اللہ
اہل اللہ نظیر ایشان نبود، اہل درجات و	میں ان دونوں بھائیوں کی مثال نہیں تھی، بلند
صاحب مقامات عالی بودہ اند،	درجات و مقامات کے مالک تھے،

[1] آئینہ اودھ ص ۲۸۲،

پھر لکھا ہے کہ راجہ سید خیر اللہ طریقہ چشتیہ میں انتہائی بلند مقام اور عالی شان تھے۔ ظاہری اور باطنی تصرفات کے مالک، پاک نہاد، اور حجۃ العاشقین راجہ سید حامد شاہ کے محتشم جانشین تھے راہ سلوک کے طالبوں اور مریدوں کی تعلیم و تربیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کو کرامت کی حد تک ملکہ دیا تھا۔ چوں کہ وہ دیار محمد آباد کے صاحب ولایت تھے اس لئے اکثر محمد آباد میں سکونت کرتے تھے، اس دیار میں مشہور بزرگ حضرت ابوالغوث گرم دیوان بھیروی لہرادی نے ان سے طریقۂ چشتیہ حاصل کر کے خرقۂ خلافت پہنا تھا، صاحب مناقب غوثی کا بیان ہے کہ:۔

شاہ ابوالغوث گرم دیوان جس زمانہ میں وحدت آباد عرف لہرا میں مسند ارشاد پر متمکن ہوئے، سید العابدین، متوصل الی اللہ حضرت راجہ سید خیر اللہ قدس سرہ کے ہاتھ سے پیران چشت کا خرقۂ خلافت پہنا، دونوں بزرگوں میں انتہائی تعلق تھا اکثر ایسا ہوتا تھا کہ حضرت مرشد حقیقی (شاہ ابوالغوث گرم دیوان) سید العابدین (راجہ سید خیر اللہ) کی ملاقات وصحبت کے جذبۂ اشتیاق میں لہرا سے تین کوس کا فاصلے طے کر کے راتوں رات محمد آباد چلے جاتے اور چلے آتے تھے، اور کسی کو خبر تک نہیں ہوتی تھی، دونوں بزرگوں میں عشق ومحبت کی حد تک تعلق تھا۔

ایک مرتبہ سید العابدین، تاج العارفین راجہ خیر اللہ وحدت آباد تشریف لائے مرشد حقیقی شاہ ابوالغوث ان کی آمد سے بے حد خوش ہوئے اور نہایت تعظیم و تکریم کی رات کو سوتے وقت شاہ ابوالغوث نے اپنی چادر راجہ خیر اللہ کے بستر پر بچھادی، مگر راجہ خیر اللہ نے اسے اٹھالیا اور فرمایا ''واللہ این جسارت ندارم کہ پائے خیال من بدین روائے مبارک افتد، تصدیق دل برین است کہ بہ تبرک بردارم، وبجائے خرقہ شمارم'' ان الفاظ سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ مرشد کے دل میں اپنے مرید کی کیا عظمت ومحبت تھی؟ ایک مرتبہ محمد آباد میں راجہ سید احمد حلیم اللہ کے عرس کی تقریب تھی، راجہ سید خیر اللہ کی دعوت پر قصبہ محمد آباد کے تمام اکابر واشراف جمع تھے، مانک پور، جونپور، غازی پور، اور اس دیار میں مشاہیر ومشائخ بھی آئے تھے، شاہ ابوالغوث گرم دیوان اچانک معمولی لباس میں مجلس ذوق وسماع میں پہونچے راجہ خیر اللہ نے اٹھ کر ان کا استقبال کیا اور اپنے پہلو میں بٹھایا اور اہل مجلس سے مخاطب ہو کر فرمایا، کہ اس وقت ہمارے درمیان ابوالغوث ''فرید ثانی'' ہیں کیونکہ حضرت فرید گنج

شکر کے آداب سلوک جو انکے خانوادہ میں رائج ہیں، ان کا احیاء آج تک اس خلف برحق سے بہتر کسی نے نہیں کیا ہے یہ ایک شمع ہیں جن کی ہدایت کا نور مشائخ سلف کے خاندان کو منور کرے گا، یہ ایک آفتاب ہیں، جن کی ہدایت کا پرتو ثریٰ سے ثریا تک اپنی حفاظت کرے گا، اس مجلس میں میری جگہ پر ممتاز رہیں گے،

اس کے بعد راجہ سید خیر اللہ نے سر سے عمامہ اتار کر دو ٹکڑے کئے ایک ٹکڑا شاہ ابوالغوث کو دیا اور دوسرا اپنے صاحبزادے راجہ سید مروان علی کو عنایت کیا، راجہ خیر اللہ شاہ پنجشنبہ ۷/رجب ۱۱۲۸ھ میں محمد آباد میں فوت ہوئے اور اپنے صحن میں دفن کئے گئے، [1] راجہ خیر اللہ شاہ مسلمانوں کی مشہور بستی خیر آباد کے بانی ہیں جو محمد آباد سے جانب مغرب چند فرلانگ پر ہے۔

ان کے صاحبزادے راجہ سید مروان علی کے بارے میں مناقب غوثی میں ہے کہ حضرت راجہ سید مروان علی زاد اللہ قدرہ سید خیر اللہ کے فرزند رشید ہیں اور اپنے والد بزرگوار کے جانشین ہو کر مسند ارشاد پر متمکن ہیں، اپنے آباو اجداد کے قدم بقدم چلنے کی کوشش کرتے ہیں، سلوک وطریقت میں نہایت پسندیدہ روش رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ چمن ولایت کے اس نوجوان کو سرسبز و شاداب رکھے" مناقب غوثی ذوالحجہ ۱۱۴۴ھ میں لکھی گئی ہے اس وقت راجہ سید مردان علی اپنے والد کے خلیفہ کی حیثیت سے متعارف تھے،

راجہ سید غلام معین الدین بن راجہ سید غلام محی الدین عرف راجہ دانی

راجہ سید غلام معین الدین بن راجہ سید غلام محی الدین بن راجہ سید احمد حلیم اللہ عرف راجہ دانی مانک پوری، راجہ سید خیر اللہ کے بڑے بھائی تھے، وہ بہ قول صاحبِ مناقب غوثی صاحب ولایتِ دیار جونپور اور اپنے والد کے خلیفہ تھے، ساتھ ہی راجہ سید ابراہیم کے مریدوں خلیفہ تھے،

---

[1] مناقب غوثی باب ہشتم قلمی مملوکہ دارالمصنفین اعظم گڑھ

سید العاشقین راجہ سید غلام معین الدین عرف حضرت راجی دانی قدس سرہ کہ برادر حقیقی کلان آنحضرت بود، بغایت مروی بابرکت عظیم القدر، مرید وخلیفہ حضرت حجۃ العارفین سراج السالکین راجی سید ابراہیم بود قدس سرہ از طرف پدر عالی قدر خود حضرت محبوب الواصلین راجی غلام محی الدین قدس سرہ نیز خرقۂ خلافت پوشیدہ بود، حسب الاجازت پیرومرشد خود صاحب ولایت دیار جونپور بود، بسے صاحب تصرفات صوری و معنوی و سر حلقہ اہل معانی و رموزدانِ وقائق اشارات وحقائق نکات مقتدائے ارباب تصوف وپیشوائے اصحاب تصرف بود،

سید العاشقین راجی سید غلام معین الدین عرف راجہ دانی راجہ سید خیر اللہ کے بڑے بھائی ہیں، نہایت بابرکت، عظیم المرتبہ اور راجہ سید ابراہیم کے مرید وخلیفہ تھے، اپنے والد بزرگوار راجہ سید غلام محی الدین سے بھی خرقۂ خلافت پہنا تھا، اور اپنے پیر ومرشد کی اجازت سے دیار جونپور کے صاحب ولایت تھے، تصرفات صوری ومعنوی کے مالک، حلقہ اہل معانی کے صدر نشین، حقائق اشارات کے رمز شناس، حقائق نکات کے راز دان اہل تصوف کے مقتدا، اور ارباب تصوف کے پیشوا تھے،

جس زمانہ میں شاہ ابو الغوث گرم دیوان راجہ خیر اللہ شاہ سے کسب فیض کر رہے تھے، اور دونوں بزرگوں میں روحانی تعلقات نہایت خوشگوار و استوار تھے راجہ دانی اپنے بھائی راجہ خیر اللہ کے ساتھ جونپور سے محمد آباد آئے، پھر وہاں سے دونوں بھائی وحدت آباد عرف لُہر تشریف لائے، شاہ ابو الغوث نے ان حضرات کی تعظیم وتکریم میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا، اور ان کی آمد کو غنیمت سمجھا، جب کھانے کیلئے دستر خوان بچھایا گیا تو میزبانی کی رسم کے مطابق معذرت کرتے ہوئے کہا کہ آپ حضرات نے توجہات شاہانہ سے ویرانہ درویش کو رشک فردوس بنا دیا ہے، یہ اس فقیر کی سعادت مندی کا باعث ہے، آپ حضرات کے ذوق کے مطابق اس جنگل میں سامان ماحضر مہیا نہ ہو سکا، جو کچھ نان نمک سبزی گھر میں موجود تھی حاضر خدمت کر دی، امید ہے کہ شرف قبولیت سے نوازیں گے راجہ سید دانی نے اس صدق واخلاق پر خوش ہو کر فرمایا کہ اطمینان رکھو اسی جنگل میں تم کو ہر قسم کی چیزیں آسانی سے مہیا ہوں گی ''دل قوی دار، حق تعالیٰ این جنگل را از عمدہ بلاد وامصار جلوہ

خواہد داد، ہر گونہ اشیا نایاب این جا بے دست رنج میسر خواہد گشت"۔[1]

اسی تقریب میں راجہ دانی نے بھی شاہ ابوالغوث گرم دیوان کو پیران چشت کی امانت اور خرقہ عطا فرمایا، اور کہا کہ "الحمد للہ امانتِ پیران چشت بمرکز حق بسلامت رسید"

اس کے بعد جب تک دونوں بھائی زندہ رہے، شاہ ابوالغوث گرم دیوان کی تعمیر احوال اور تربیت روح پر نظر توجہات رکھے رہے راجہ سید غلام معین الدین دانی کا انتقال یکشنبہ آخری شعبان ۱۱۴۰ھ میں جونپور میں ہوا اور وہیں اپنی خانقاہ میں دفن کیے گئے۔

ان کے خلف رشید حضرت راجہ سید غلام احمد اپنے والد بزرگوار کے آستانہ کی مجاورت میں سعادت مندی حاصل کر رہے اور سلوک وصفائی باطن میں کوشش کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ اس گوہر ولایت کو ظاہری و باطنی جلا سے متجلی رکھے، [2] صاحب مناقب غوثی نے راجہ سید غلام احمد کے بارے میں یہ باتیں ۱۱۴۲ھ میں لکھی ہیں، غالباً یہ اس وقت جوان تھے۔

راجہ سید ابراہیم بن راجہ سید عبدالحق

راجہ سید ابراہیم بن راجہ سید عبدالحق بن راجہ سید یٰسین (غلام محی الدین؟) بن راجہ سید بندگی (احمد حلیم اللہ) مانک پوری، شاہ محمد ابوالحسن مانک پوری نے آئینہ اودھ میں ان کا نسب یوں ہی درج کر کے لکھا ہے کہ یہ سب لوگ کامل و قابل و عامل و صاحب باطن گذرے ہیں، کہ ہزارہا ان کے نور باطن سے فیضیاب ہوئے نقل ہے کہ خدام مدام راجی سید ابراہیم کے قوم جنات تھی، جب وضو کرتے لوٹا معلق دکھائی دیتا کہ خود بخود پانی گر رہا ہے،[3]

مخدوم راجہ سید ابراہیم خاندانی روحانیت و مشیخت سے حصہ وافر رکھتے تھے اور اپنے دور

---

[1] یہ پیش گوئی اب سے تقریباً ڈھائی سو برس پہلے کہ ہے ان دنوں لہرا، گجہڑا، اور فخر الدین پور تینوں ملکر بڑی بستی ہیں، اور شمال میں چند فرلانگ پر قصبہ مبارک پور چھوٹا سا شہر بن گیا ہے جسے سید غلام معین الدین دانی کے جداعلیٰ راجہ سید مبارک شاہ نے حدود ۹۵۰ھ میں اپنے نام سے آباد کیا تھا، یہاں ہر قسم کی ضروریات باسانی یسر ہیں، [2] مناقب غوثی باب ہشتم قلمی، [3] آئینہ اودھ ص ۲۸۳،

میں خانوادۂ حامد یہ کے ترجمان اور سجادہ نشین تھے، شیخ عبدالرحمن چشتی نے مرآۃ الاسرار (سنہ تصنیف ۱۰۴۵ھ) میں مخدوم حسام الدین مانک پوری کے تذکرہ میں آگے چل کر ان کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:۔

چنانچہ بالفعل شیخ سلطان بایزید صاحب	اس زمانہ میں شیخ سلطان بایزید مخدوم
سجادۂ مخدوم شیخ حسام الدین و میر سید	حسام الدین کے سجادۂ نشین اور میر سید
ابراہیم صاحب سجادۂ راجی سید حامد شہ	ابراہیم راجہ سید حامد شاہ کے سجادہ نشین
موجوداند[1]	موجود ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ وہ ۱۰۴۵ھ میں سجادہ نشین اور بقید حیات تھے۔ ملا محمود جونپوری متوفی ۱۰۶۲ھ کے دادا شیخ بڑے (بڈھ) بن شیخ محمود بن قاضی منجھن بھیروی راجہ سید ابراہیم سے سلوک وطریقت میں بیعت تھے، ان کے خاندان کے شیخ حاجی ابوالخیر بن شیخ ابوسعید بھیروی متوفی ۱۰۵۹ھ نے اپنی کتاب شیر وشکر'' میں ان کے حال میں لکھا ہے، ''درصحبت مخدوم شیخ ابراہیم مذکور بیعت کردہ اخذ طریقت سالکین نمودہ''۔ شیخ بڑے کا مزار ولید پور میں ہے، راجہ سید ابراہیم طریقہ چشتیہ میں اپنے دور کے حجۃ العارفین اور سراج السالکین'' تھے اور اپنے آباء واجداد کی طرح جونپور اور دیار پورب میں ارشاد وتلقین کی خدمت انجام دیتے تھے، راجہ سید غلام معین الدین عرف راجہ دانی متوفی ۱۱۳۰ھ بھی ان کے مرید وخلیفہ تھے، شیخ شمس الدین حیدری نے مناقب غوثی میں ان کے بارے میں تصریح کی ہے۔

[1] پوری عبارت یہ ہے'' تا امروز فرزندانِ مخدوم شیخ حسام الدین وفرزندان راجی سیدّ حامد شہ بر مسند سجادۂ خواجگانِ چشت مستقیم اند وطریق آن سلسلہ را بوجہ احسن برپا می دارند، وصاحب ذوق وصاحب سماع اند، ودستِ ارادت بمردمی کی دہمند ہمہ اطوار ایشان پسندیدہ است، چنانچہ بالفعل شیخ سلطان بایزید صاحب سجادہ مخدوم شیخ حسام الدین، ومیر سید ابراہیم صاحب سجادہ راجی سید حامد شہ موجود اند'' مرآۃ الاسرار جلد اول، طبقہ بیز دہم قلمی مملوکہ دارالمصنفین اعظم گڑھ۔

مرید و خلیفہ حضرت حجۃ العارفین، سراج السالکین راجہ سید ابراہیم بود قدس سرہ، از طرف پدر عالی قدر خود حضرت محبوب الوا صلین راجی سید غلام محی الدین قدس سرہ نیز خرقۂ خلافت پوشیدہ بود، حسب الا جازت پیر و مرشد خود صاحب ولایت دیار جونپور بود [۱]	راجہ غلام معین الدین حضرت حجۃ العارفین سراج السالکین راجہ سید ابراہیم قدس سرہ کے مرید و خلیفہ تھے اور اپنے والد بزرگوار راجہ سید غلام محی الدین سے بھی خرقۂ خلافت پہنا تھا، اور اپنے پیر و مرشد کی ہدایت و اجازت سے دیار جونپور کے صاحب ولایت تھے۔

راجہ سید ابراہیم کے تیسرے مرید و خلیفہ شیخ فتح محمد حسینی سیدانوی الہ آبادی علمائے کبار میں سے تھے ان کا نسبی تعلق سادات سبزوار یہ سے تھا انھوں علمائے عصر سے تعلیم حاصل کر کے طریقت کی تعلیم و تربیت راجہ سید ابراہیم سے پائی تھی، نزہۃ الخواطر میں ہے،

ثم اخذ الطريقة عن الشيخ ابراهيم بن عبد الحق الحسيني المانكبوري [۲]،	اس کے بعد شیخ ابراہیم بن عبدالحق حسینی مانک پوری سے طریقت حاصل کی،

شیخ فتح محمد سیدانوی نے الہ باد میں ارشاد و تلقین کی بزم سجائی، ان کی تصانیف میں تفسیر محمدی، مجمع الانوار، مجمع الاسرار، حل المشکلات، حقایق و معارف کے انداز میں ہیں، ان کا انتقال نصف رجب ۱۱۴۳ھ کو سیدانہ میں ہوا، راجہ سید غلام معین الدین عرف راجہ دانی اور سید فتح محمد سیدانوی دونوں حضرت شاہ ابوالغوث گرم دیوان بھیروی لہراوی متوفی ۱۱۷۸ھ کے پیر و مرشد ہیں غالباً ان ہی راجہ سید ابراہیم کے نام پر موضع ابراہیم پور ہے جو مبارک پور اور خیر آباد کے درمیان مسلمانوں کی مشہور آبادی ہے، اس کے مغرب میں ابراہیم شاہ کا مزار بتایا جاتا ہے، اس دیار میں خانوادۂ حامدیہ کی تین بستیاں مبارک پور خیر آباد اور ابراہیم پور آباد کردہ ہیں۔ جو ان کے نام سے مشہور ہیں اور علم و علماء سے معمور و مشحون ہیں۔

---

[۱] مناقب غوثی [۲] نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۲۱۷،

راجہ سید ابراہیم کے پوتے راجہ سید ابراہیم ثانی تھے یعنی راجہ سید ابراہیم بن راجہ سید میر میران جی بن راجہ سید ابراہیم، یہ بھی خاندانی روایات کے کسی نہ کسی انداز میں حامل رہے راجہ سید احمد ثانی راجہ سید ابراہیم ثانی کے زمانہ میں نوابی اودھ کی طرف سے جاگیروں اور معافیوں کی ضبطی ہونے لگی تو معافی کی ضبطی کے خوف سے شیعہ ہو گئے، راجہ غلام شاہ بن راجہ سید احمد ثانی کے تین لڑکے تھے ،میر علی حسن، میر ہنر بر علی، اور میر بدر علی میر علی حسن سنی تھے، باقی دو شیعہ تھے، ۱؎

(۴)

حضرت میر علی عاشقان سرائمیری

ہمارے دیار ''شیراز ہند پورب'' میں دسویں صدی میں ایک بزرگ حضرت میر سید علی بن قوام الدین سرائمیری جونپوری متوفی ۹۵۰ھ رحمۃ اللہ علیہ گذرے ہیں، جو اپنے مقام و مرتبہ کے اعتبار سے ہندوستان کے اولیائے کبار اور مشائخ عظام میں شمار کیے جاتے ہیں، ہندوستان و بیرون ہند کے تذکرہ نگاروں نے اپنی کتابوں میں ان کا تذکرہ لکھا ہے، جن میں ان کے حالات، واقعات اور اوصاف و کمالات درج کیے ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے:۔

(۱) سب سے پہلے شاہ عبدالحق صاحب محدث دہلوی متوفی ۱۰۵۲ھ نے میر صاحب کے حالات اخبار الاخیار میں لکھے ہیں، جو بعد کے تذکروں کے مقابلہ میں زیادہ مستند اور مفصل ہیں، شاہ صاحب کے والد شیخ سیف الدین دہلوی متوفی ۹۹۰ھ نے میر صاحب سے ملاقات کی تھی، اور وہ دیار پورب کے مشائخ میں شیخ یوسف چریا کوٹی اور شیخ سلطان بہرائچی سے بھی ملے تھے، شاہ صاحب نے ان بزرگوں کے تذکرہ میں اس کی تصریح کی ہے، شاہ صاحب نے میر صاحب کے حالات اپنے والد کی زبانی اخبار الاخیار میں بیان کئے ہیں اس لئے بعد کے مؤرخوں کے مقابلہ میں ان کا بیان سب سے زیادہ مستند ہے،

(۲) شاہزادہ داراشکوہ متوفی ۱۰۷۱ھ نے سفینۃ الاولیاء میں میر صاحب کا ذکر کیا ہے، جس کا ماخذ اخبار الاخیار معلوم ہوتا ہے،

(۳) شیخ محمد امین بن فضل اللہ محبی شامی متوفی ۱۰۹۲ھ نے خلاصۃ الاثر فی اعیان القرن الحادی عشر میں شیخ تاج الدین سنبھلی کے تذکرہ کے ضمن میں ان کے شیخ الشیخ کی حیثیت سے میر صاحب کا حال لکھا ہے، جس میں بعض مشائخ کی زبانی میر صاحب کے علوئے مرتبت اور کشف و کرامت کا بیان ہے، مگر بہت مختصر ہے،

(۴) گذشتہ صدی کے عالم و بزرگ شیخ یوسف بن اسماعیل بنہانی نے جامع کرامات الاولیاء میں خلاصۃ الاثر کا بیان نقل کر دیا ہے۔

(۵) شیخ عبدالصمد بن فضل محمد تمیمی انصاری نے اخبار الاصفیاء میں میر صاحب کا تذکرہ کیا ہے جس میں چندنئی اور اہم باتیں ہیں اسلئے یہ کتاب اخبار الاخیار اور خلاصۃ الاثر کے بعد میر صاحب کے تذکرہ کا تیسرا مستند ماخذ ہے، اخبار الاصفیاء کا قلمی نسخہ میرے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہے،

(۶) شیخ نظام الدین احمد بن محمد صالح صدیقی نے کرامات الاولیاء میں میر صاحب کے تذکرہ میں ان کی بعض کرامتوں کا ذکر کیا ہے، جو سب سے الگ اور نئی ہیں، اس کا قلمی نسخہ میرے پاس موجود ہے۔

(۷) شیخ سید علی موسوی حیدآبادی نے مشکوۃ النبوۃ میں شیخ قاضن (محمد بن علاء الدین قاضن) متوفی ۸۹۲ھ کے ذکر میں ان کے دو اکمل خلفاء میں میر صاحب کا ذکر کیا ہے، مشکوۃ النبوۃ کا قلمی نسخہ بھی میرے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہے،

(۸) شیخ محمد بن حسن غوثی مندوی نے گلزار ابرار (سنہ تصنیف ۱۰۲۲ھ میں میر صاحب کا تذکرہ کیا ہے جو زیادہ تر ان کے وجد و سکر اور جذب و حال کی کیفیات کے بیان پر مشتمل ہے،

(۹) مفتی غلام سرور ہاشمی لاہوری متوفی ۱۳۰۷ھ نے خزینۃ الاصفیاء میں میر صاحب کا تفصیلی تذکرہ لکھا ہے، جو زیادہ تر اخبار الاخیار سے ماخوذ ہے،

(۱۰) مولوی امام الدین گلشن آبادی نے تاریخ الاولیاء میں میر صاحب کا حال لکھا ہے، جو اخبار الاخیار کا خلاصہ معلوم ہوتا ہے،

(۱۱) مولانا سید عبدالحئی لکھنوی متوفی ۱۳۴۲ھ نے نزہۃ الخواطر میں میر صاحب کا حال نسبۃً تفصیل سے لکھا ہے جو زیادہ تر شیخ علی عارف کے رسالہ عاشقیہ اور شیخ محبی شامی کی کتاب خلاصۃ الاثر سے ماخوذ ہے، اس کتاب میں میر صاحب کے کئی خلفاء کے حالات درج ہیں۔

(۱۲) مولوی حکیم عبدالمجید مصطفےٰ آبادی نے سمات الاخیار میں جونپور کے خانوادہ رشیدی

کے حالات میں ضمناً ایک مقام پر حاشیہ میں میر صاحب کے حالات لکھے جو گویا سفینۃ الاولیاء کی عبارت کا ترجمہ ہے، میر صاحب کے خاندان کے آخری دور کے بعض بزرگوں کا حال بھی لکھا ہے، ان ہی کتابوں سے میر صاحب کا یہ تذکرہ مدون و مرتب شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔

نام ونسب اور خاندانی حالات

عام تذکرہ نویسوں نے میر صاحب کا سلسلۂ نسب بیان نہیں کیا ہے کسی نے ان کا نام سید علی قوام، [۱] کسی نے میر سید علی قوام الدین، [۲] اور کسی نے سید علی بن قوام الدین لکھا ہے [۳] کرامات الاولیاء میں میر سید قوام ہے، جو کاتب کی غلطی ہے، [۴] البتہ نزہۃ الخواطر میں میر صاحب کے دادا سید سعید بن محفوظ کے ذکر میں جو سلسلہ نسب درج ہے، اس سے ان کا نسبی سلسلہ اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے، میر سید علی بن قوام الدین بن سعید بن محفوظ بن حسین بن عبدالمجید بن نعمانی بن حمزہ بن حسین بن ابوبکر بن عمر بن احمد حسینی ترمذی، لاہوری، سوانوی جونپوری سرائمیری، [۵]

مقامات کی نسبتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب کے آباء واجداد ترمذ اور لاہور سے ہوتے ہوئے پہلے سرہند کے قریب مقام سوانہ میں آباد ہوئے، یہ خاندان سوانہ میں کب آیا اور کب آباد ہوا،؟ اس کا پتہ نہیں چلتا، البتہ میر صاحب کے دادا سعید بن محفوظ کا مولد سوانہ ہے، [۶] جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے پردادا محفوظ بن حسین یا ان سے پہلے کوئی بزرگ آئے ہوں گے، بعد میں یہ خاندان سادات سوانہ کے لقب سے مشہور ومتعارف ہوا، اخبار میں ہے ”او در اصل از سادات سوانہ است“۔ (ص ۲۲۱) اسی قسم کی عبارت خزینۃ الاصفیاء (ج ۱ ص ۴۲۳) گلزار ابرار (ص ۶۸) اور تاریخ الاولیا (ج ۲ ص ۲۳۸) میں ہے اور سفینۃ الاولیاء میں مزید تشریح کے ساتھ درج ہے:

---

[۱] اخبار الاخیار ص ۲۲۱ مطبع ہاشمی وخزینۃ الاولیاء ج ۱ ص ۴۲۲ مطبع ثمر ہند لکھنؤ وسفینۃ الاولیاء ص ۱۹۰ مطبع نولکشور و تاریخ الاولیاء ج ۲ ص ۲۳۸ مطبع فتح الکریم ممبئی [۲] اخبار الاصفیاء قلمی ص ۹۵، [۳] خلاصۃ الاثر ج ۱ ص ۲۶۸ طبع مصر و جامع کرامات الاولیاء ج ۲ ص ۸۷ مصر ونزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۲۴۴ مطبع دائرۃ المعارف حیدرآباد، [۴] کرامات الاولیاء ص ۱۶۲، [۵] نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۸۱ [۶] نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۸۱

"از سادات سوانہ کہ درنزدیکی سرہند است"۔ (ص ۱۹۰) اخبار الاصفیاء میں صرف "از سادات بزرگ" ہے(۹۵)

میر صاحب کی جائے ولادت کے بارے میں عام تذکرہ نگار خاموش ہیں، البتہ صاحب اخبار الاصفیاء نے تصریح کی ہے کہ ان کا مولد سوانہ ہے [۱] خلاصۃ الاثر میں مسکن و مدفن کی طرح مولد بھی جونپور لکھا ہے، [۲] جو صحیح نہیں ہے میر صاحب کا سنہ پیدائش بھی معلوم نہیں ہے، مگر اس کا اندازہ اس طرح لگایا جا سکتا ہے کہ انکے پہلے مرشد و مربی حضرت قاضن کی وفات ۸۹۲ھ میں ہوئی، اور ان کی خدمت میں حاضری سے پہلے وہ دہلی میں یا کسی اور جگہ کچھ دنوں رہ چکے تھے۔ ظاہر ہے کہ شیخ قاضن کے یہاں ان کی حاضری ۸۹۲ھ سے پہلے ہوئی ہوگی، اگر اسے ۸۹۰ھ میں مان کر ان کی عمر اس وقت بیس سال کی مان لی جائے تو پیدائش ۸۷۰ھ کے حدود میں ہوئی ہوگی،

آپ کے والد سید قوام الدین سوانہ کے مشہور اصحاب علم و فضل میں تھے، اپنے والد شیخ سعید ابن محفوظ سے تحصیل علم کی تھی، اور ان کو علم و فضل سے حصۂ وافر ملا تھا، سنبھل کے قریب کسی مقام پر امیر یا حاکم تھے، جہاں آپ کو قتل کر دیا گیا۔ اور جوگی پور نامی گاؤں میں دفن کیے گئے، اس وقت میر صاحب بچے تھے۔ یتیمی کے بعد ان کی پرورش ان کے چچا محمد بن سعید نے کی۔[۳]

میر صاحب کے دادا شیخ سعید بن محفوظ نویں صدی کے صلحاء و مشائخ میں تھے، سوانہ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی، طریقت و روحانیت کی تعلیم و تلقین شیخ صدر الدین راجو قتال متوفی ۸۲۷ھ اور شیخ بدیع الدین مدار سے پائی تھی۔ سوانہ سے پیدل مکہ مکرمہ گئے اور سات حج کرنے کے بعد اسی بقعۂ مبارکہ میں انتقال فرمایا۔

میر صاحب کی یتیمی اور چچا کی پرورش کے دور میں یہ پتہ نہیں چلتا کہ آپ کو خاندانی علم و فضل سے کوئی حصہ مل سکا یا نہیں، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بچپن میں کوئی خاص تعلیم و تربیت نہ ہو سکی، بلکہ سوانہ سے نکلنے کے بعد آپ نے تحصیل علم کی۔

---

[۱] اخبار الاصفیاء ص ۹۷ [۲] خلاصۃ الاثر ج ۱ ص ۴۶۸ [۳] نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۱۴۴

دہلی، بہار، جونپور اور نظام آباد میں علم و معرفت

میر صاحب نواح دہلی کے رہنے والے تھے، مگر آپ کی تعلیم و تربیت دیار پورب میں ہوئی، جہاں سلاطین شرقیہ کی بزم دوشین کے علم و فضل کے چراغ اب تک روشن تھے، دہلی میں لودھیوں کی نئی نئی حکومت قائم ہوئی تھی اور وہاں کے ارباب علم و فضل ایک گونہ انتشار کے شکار تھے، اس لئے آپ نے پورب کا رخ کیا، اور یہیں کے ہو رہے، اخبار الاخیار میں ہے" دراوان طلب بجانب جونپور افتاد (ص ۲۲۱) سفینۃ الاولیاء (ص ۱۹۰) اور گلزار ابرار کے ترجمہ (ص ۱۰۹) میں بھی یہی ہے، اخبار الاصفیاء میں ہے کہ" او ابتدائے حال در تعلقیان بسری برد" (ص ۹۵) نزہۃ الخواطر میں ہے کہ میر صاحب سوانہ سے دہلی گئے، اور کچھ دنوں وہاں رہ کر علماء و مشائخ سے کسب فیض کیا (ج ۴ ص ۲۴۴) بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ عہد شباب میں دہلی گئے، اور وہیں کسی امیر کبیر کے دربار میں ملازم ہو گئے اور وہاں کے بعض علماء و مشائخ سے بھی تعلق قایم کیا، مگر تھوڑے ہی دنوں کے بعد ایک خاص واقعہ سے متاثر ہو کر راہ طلب میں دیار پورب کی طرف نکل کھڑے ہوئے، دہلی میں آپ کی آمد ۸۹۲ھ سے بہت پہلے ہوئی ہوگی، اس وقت سلطان بہلول لودھی متوفی ۸۹۴ھ کی حکومت تھی، اس سلسلہ میں صاحب اخبار الاصفیاء نے تفصیل سے کام لیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ میر صاحب ابتدائے حال میں درباریوں سے منسلک ہو گئے، ایک دن آقا کے دربار میں حاضر ہوئے اور باریابی کی اجازت چاہی مگر اجازت نہ مل سکی، اس واقعہ سے بہت زیادہ متاثر ہوئے، اور اسی وقت آپ کے دل میں تعلق مع اللہ کا شدید داعیہ پیدا ہو گیا، اور یہ خیال پیدا ہوا کہ آج تم جس امیر کی خدمت میں لگے رہتے ہو جب اس کے دربار میں تم کو باریابی کی اجازت نہیں ملی تو کل مالک حقیقی کے دربار میں باریابی کی اجازت کیسے مل سکتی ہے، اس حال میں کہ تم اس کی اطاعت و فرمانبرداری بھی نہیں کرتے ہو، یہ سوچ کر تمام مال و اسباب فقراء و مساکین میں تقسیم کر دیا۔ اور دہلی سے برہنہ پا شیخ قاضن کی خدمت میں حاضر ہوئے، شیخ قاضن نے بڑھ کر استقبال کیا اور فرمایا کہ میں تمہاری آمد کا منتظر تھا، اس کے بعد شیخ نے کچھ اوراد و اذکار کی تلقین فرمائی، جن سے میر صاحب کے

قلب میں سوز دروں کی کیفیت پیدا ہوگئی، یہ آگ رفتہ رفتہ تیز ہوگئی اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ آپ بیتابی میں ادھر ادھر چکر کاٹتے اور کہتے کہ کوئی ہے جو قاضن کی لگائی ہوئی آگ کو بجھادے، اسی عالم حیرانی و پریشانی میں آپ کا گذر شیخ بہاء الدین جونپوری کے یہاں ہوا، انھوں نے ایسی روحانی غذا دیدی جس سے یہ آگ دب گئی اور معرفت الٰہی کے تمام مقامات آپ پر منکشف ہوگئے۔

اس کے بعد صاحب اخبار الاخیار نے لکھا ہے کہ اس واقعہ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بزرگ نے ایک دنیادار شخص سے پوچھا کہ تم دنیا کس طرح حاصل کرتے ہو؟ اس نے کہا کہ جدوجہد کے بعد دنیا ملتی ہے، انھوں نے پوچھا کہ جدوجہد کے بعد بھی تم کو پوری دنیا حاصل ہوجاتی ہے؟ اس نے نفی میں جواب دیا، بزرگ نے کہا جب تم اس دنیائے فانی کو اس قدر کوشش کے بعد بھی پورے طور حاصل نہیں کر سکتے۔ تو عقبائے باقی کو بلا کوشش کے کیسے پا سکتے ہو؟ یہ سنتے ہی اس دنیا پرست پر خوفِ خدا طاری ہوگیا، اور وہ اسی وقت ترکِ علائق کر کے مقصد اعلیٰ کی طلب میں لگ گیا، اور ولی بن گیا۔[1]

میر صاحب کے شیخ قاضن سے کسب فیض کرنے کی تصریح دوسرے تذکرہ نویسوں نے بھی کی ہے۔ چنانچہ اخبار الاصفیاء میں مذکورہ بالا واقعہ کی تفصیل سے پہلے لکھا ہے کہ ”مرید و خلیفہ شیخ بہاء الدین جونپوری است، و برخے گویند کہ از شیخ قاضاً (قاضن) شطاری فیض گرفتہ“ (ص ۹۵) اور بقول صاحب گلزار ابرار ”برخے نگارندگان بر آنند کہ در سلسلہ شطار یہ مرید شیخ قاضن شطاریست (ص ۶۸)

صاحب مشکوٰۃ النبوۃ نے میر صاحب کو شیخ قاضن کے کامل ترین خلفاء میں شمار کیا ہے، اور لکھا ہے ”ازاں جملہ دو خلیفہ اکمل بودند، یکے میر سید علی قوام کہ کمالات او اظہر است، درنواحی جونپور بسرائے میران آسودہ است، ازدے مردم بسیار ارشاد یافتند“۔ (ص ۱۸۲)۔

میر صاحب کے شیخ قاضن سے کسب فیض کرنے بلکہ ان کے اکمل خلیفہ ہونے کی ان تصریحات کے باوجود ان کے کئی تذکرہ نولیس اس کا ذکر نہیں کرتے بلکہ ان کو صرف ”مرید و خلیفہ شیخ

---

[1] اخبار الاصفیاء ص ۹۵

بہاء الدین جونپوری'' بتاتے ہیں، چنانچہ اخبار الاخبار (ص ۲۲۱) سفینۃ الاولیاء (ص ۱۹۰) خزینۃ الاصفیاء (ج ا ص ۴۲۲) اور تاریخ الاولیاء (ص ۲۳۸ ج ۲) میں یہی لکھا ہے اور ان میں سے کسی کتاب میں شیخ قاضن یا کسی دوسرے مرشد و مربی کا ذکر نہیں ہے، حالانکہ شیخ قاضن شطاری کی نگاہ نے میر صاحب کی خشک لکڑی میں آگ لگائی تھی۔ جس کو بجھانے کے لئے وہ در بدر کی خاک چھانتے پھرے اور شیخ قاضن کے علاوہ اور دوسرے کئی مشائخ سے بھی کسب فیض کیا جن میں شیخ بہاء الدین چشتی جون پوری جیسے جامع شریعت وطریقت عالم تھے اور میر صاحب ان ہی کے مرید و خلیفہ کی حیثیت سے مشہور ہوئے، اس کے باوجود آپ پر شطاری رنگ غالب رہا، شیخ قاضن کا نام محمد بن علاء الدین ہے، ترہٹ بہار کے رہنے والے اور بہار ہی میں منیر کے قاضی تھے جو ان دنوں جونپور کی عملداری میں تھا، اس لئے میر صاحب دہلی سے چل کر سب سے پہلے بہار پہنچے جو حدود جونپور میں شامل تھا، اور اس پر جونپور کا اطلاق بھی صحیح تھا، شاید اسی لئے شاہ عبدالحق صاحب وغیرہ نے شیخ قاضن کا تذکرہ نہ کرنے کے باوجود میر صاحب کے ابتدائے طلب کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ ''دراوان طلب بجانب جونپور افتاد'' (۲۲۱) اور نزہۃ الخواطر میں ہے کہ جب میر صاحب دہلی سے جونپور تشریف لائے تو ان کے چچا شیخ محمد ابن سعید بھی ساتھ تھے، اور جوان صالح بھتیجے کی تعلیم و تربیت میں دلچسپی لیتے تھے۔

عام تذکرہ نویسوں نے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، میر صاحب کو مرید و خلیفہ شیخ بہاء الدین جونپوری بتایا ہے اور ان کے کسی دوسرے شیخ کا نام نہیں لیا ہے، مگر کئی کتابوں میں شیخ بہاء الدین جونپوری سے پہلے شیخ قاضن شطاری سے تلمذ کا ذکر ہے، ان دونوں بزرگوں کے علاوہ میر صاحب نے دو اور مشائخ سے کسب فیض کیا ہے، جو دیار جونپور کے رہنے والے تھے، چنانچہ نزہۃ الخواطر میں رسالہ عاشقیہ کے حوالہ سے درج ہے، کہ میر صاحب جونپور آنے کے بعد سب سے پہلے شیخ شہاب الدین حسینی جونپوری کی خدمت میں پہنچے، جو سلسلۂ سہروردیہ کے مشائخ میں تھے، ان کی خدمت وصحبت میں رہ کر طریقۂ سہروردیہ حاصل کیا، اور خرقہ پہنا، اس کے باد نظام آباد (اعظم گڑھ) پہنچے، جہاں شیخ عبدالقدوس عرف شاہ قدن شطاری کا روحانی فیض جاری تھا، مدتوں

ان کی خدمت میں رہ کر طریقۂ شطاریہ حاصل کیا، اور اس کے اذکار و اشغال میں اس قدر مشغول رہے کہ آپ پر کشف و شہود کے دروازے کھل گئے، گویا شیخ قاضن شطاری کی تعلیم و تربیت کے بعد شیخ عبدالقدوس شطاری کی صحبت نے آپ کو حق میں طریقۂ شطاریہ کو مئے دوآتشہ بنا دیا، اور آپ کو تمام مروجہ سلسلوں میں نسبت تامہ حاصل ہونے کے باوجود سلسلہ شطاریہ عشقیہ سے خصوصی تعلق رہا، شیخ شہاب الدین جونپوری اور شیخ عبدالقدوس نظام آبادی سے میر صاحب کے تلمذ کا ذکر نزہتہ الخواطر میں موجود ہے۔[۱]

ان سب مشائخ سے کسب فیض کرنے کے بعد میر صاحب آخر میں حضرت شیخ بہاء الدین عمری چشتی جونپوری کی خدمت میں پہنچے، اس زمانہ میں آپ کی ذات جامع شریعت و طریقت ارباب علم و فضل کا مرجع تھی، وہ ایک طرف بڑے عالم دین اور علوم شریعت کے حامل تھے۔ تو دوسری طرف سلسلۂ چشتیہ کے مشائخ کبار میں ان کا شمار تھا، میر صاحب نے ایک مدت تک شیخ بہاء الدین کی خدمت و صحبت میں رہ کر ظاہری و باطنی علوم کے فیوض و برکات حاصل کئے اور ان کے مرید و خلیفہ مشہور ہوئے۔

علوم ظاہری و باطنی میں جامعیت

اس زمانہ میں عام طور سے علماء اور مشائخ علماء ہوتے تھے آج کل کی طرح بے علم مشائخ اور بے نسبت علماء کا رواج نہیں تھا، میر صاحب نے اپنے جن اساتذہ و مشائخ سے روحانی فیوض و برکات حاصل کئے، ان ہی سے علوم شرعیہ کی بھی تحصیل فرمائی، کیونکہ یہ حضرات ظاہری اور باطنی علوم کے جامع تھے، اور ارشاد و تلقین کے ساتھ تعلیم و تدریس کی خدمت بھی انجام دیتے تھے اور ان کے کاشانے بیک وقت مدرسہ اور خانقاہ دونوں تھے خاص طور سے شیخ قاضن اور شیخ بہاؤالدین علوم شرعیہ کے زبردست ماہرین میں سے تھے، ایک منیر میں قاضی اور دوسرے جونپور میں معلم و مرشد تھے۔

شیخ محمد بن حسن غوثیؒ نے گلزار ابرار میں تصریح کی ہے کہ جب سید علی قوام شہر جونپور پہونچے

---

[۱] نزہتہ الخواطر ج ۳ ص ۲۴۴ [۲] اذکار ابرار ص ۱۰۹،

تو شیخ بہاء الدین سے بیعت ہوئے، اور ظاہری علوم اور باطنی کمالات پیدا کیے [2] یہ ضرور ہے کہ میر صاحب کی زندگی کا روحانی پہلو اتنا پرکشش اور نمایاں رہا کہ آپ کا شمار مشائخ میں ہوا، اور تذکرہ نگاروں نے اسی حیثیت سے آپ کا تذکرہ کیا ہے، مشائخ کی تذکرہ نگاری کا یہ پہلو ہمیشہ سے بہت افسوسناک رہا ہے کہ ان کے درجات و مراتب، کشوف و کرامات اور تصرفات کے انبار میں ان کی علمی زندگی دب گئی اور یہ بہت کم معلوم ہوسکا کہ علوم شرعیہ میں ان کا کیا مقام و مرتبہ تھا، حالاں کہ ان بزرگوں میں بہت سے اصحاب علوم و فنون کے ماہر و جامع گذرے ہیں، اور ارشاد و تلقین کے ساتھ درس و تدریس کی خدمت بھی انجام دیتے رہے۔

روحانیت و طریقت کے تمام مروجہ سلاسل میں جامعیت

میر صاحب دیار پورب کے دسویں صدی کے تمام مروجہ طرق و سلاسل کے مشائخ سے فیضیاب ہوئے، ان کے بعض مشائخ ان سب میں کامل تھے اس لئے ان کے سوانح نگاران کی سب نسبتیں شطاری، چشتی، نقشبندی اور سہروردی وغیرہ بیان کرتے ہیں، ان تمام طرق و سلاسل میں آپ کو نسبتِ کاملہ حاصل تھی صاحب اخبار الاصفیاء نے لکھا ہے کہ "و چندے برآنند کہ باہر سلسلۂ نسبت درست داشتہ"۔ [1] گلزار ابرار میں ہے کہ "بعض کہتے ہیں کہ آپ کو تمام مشہور خانوادوں سے نسبت صحیحہ حاصل ہے، اور تمام دروازوں سے اپنی استعداد کی بدولت گوناگوں دانش و بینش حاصل ہے [2] اس کے باوجود عام تذکرہ نویس آپ کو مرید و خلیفۂ شیخ بہاء الدین لکھتے ہیں، اس اعتبار سے آپ طریقۂ چشتیہ کے مشائخ کبار میں ہیں، جن پر طریقۂ شطاریہ عشقیہ کا رنگ بھی چڑھا ہوا تھا، اور شیخ قاضن شطاری کی نظر اور شیخ عبدالقدوس شطاری کی صحبت سے جو فیض پہنچا تھا، وہ شیخ بہاء الدین کی ارادت و خلافت کے بعد بھی نمایاں رہا، میر صاحب کے طلب و اکتساب کی ابتداء شیخ

---

[1] اخبار الاصفیاء ص ۹۵ [2] گلزار ابرار ص ۸۶۔

قاضن متوفی ۸۹۲ھ کی خدمت میں حاضری سے ہوئی، اور انتہا شیخ بہاء الدین متوفی ۹۱۱ھ کی خلافت پر ہوئی ظاہر ہے کہ یہ ابتدا اور انتہا ان دونوں بزرگوں کی وفات سے پہلے ہوئی ہوگی، اور کم و بیش بیس سال تک میر صاحب نے علم و معرفت کی چار شمعوں سے روشنی حاصل کی ہوگی، اور یہ مدت سوانہ سے نکلنے کے بعد دہلی، بہار، نظام آباد اور جونپور میں گذری، تحصیل و تکمیل کے بعد آپ نے دیارِ مشرق ہی میں سکونت اختیار فرمائی اور سرائمیر کو ارشاد و تلقین کا مرکز بنا کر یہیں انتقال فرمایا۔

میر صاحب کے اساتذہ و شیوخ

میر صاحب کی شخصیت سازی میں جن اساتذہ و شیوخ کی نگاہ نے کیمیا گری کی ہے، ان میں چار بزرگ نمایاں ہیں، جن سے آپ نے براہ راست کسبِ فیض کیا ہے ان کے مختصر حالات یہاں درج کئے جاتے ہیں، ان سے خود میر صاحب کے فضل و کمال کا اندازہ ہو سکے گا۔

شیخ قاضن شطاریؒ

آپ کا اصل نام شیخ محمد بن علاء الدین بن قاضی عالم بن قاضی جمال الدین ہے قاضی منیر اور قاضن کے لقب سے مشہور ہیں، ترہٹ بہار کے رہنے والے تھے، جو اس زمانہ میں حدود جونپور میں شمار ہوتا تھا ظاہری و باطنی دونوں علوم میں ید طولیٰ رکھتے تھے، شریعت و طریقت کے جامع اور منیر کے قاضی تھے آپ کو طریقت کے تمام مروجہ طرق و سلاسل کے اکابر سے نسبت حاصل تھی، طریقۂ فردوسیہ اپنے والد بزرگوار شیخ علاء الدین بن عالم سے طریقہ سہروردیہ شیخ رکن الدین جون پوری سے طریقۂ چشتیہ شیخ زاہد بن بدر الدین چشتی سے، طریقہ قادریہ شیخ عبدالوہاب بن عبدالرحمن صدیقی سے، طریقہ مداریہ شیخ حسام الدین اصفہانی جونپوری سے، اور طریقہ شطاریہ براہ راست اس کے بانی و امام شیخ عبداللہ بن حسام الدین شطاری خراسانی سے حاصل کیا تھا طریقہ شطاریہ کا رنگ آپ پر اس قدر غالب تھا کہ شطاری کی نسبت سے مشہور ہوئے، آپ کے اکمل ترین خلفاء میں میر صاحب اور آپ کے صاحبزادے شیخ ابوالفتح ہدایت اللہ شطاری شامل ہیں انصاح عن

ذکر اہل الصلاح میں ہے کہ آپ نے ۳/صفر ۸۹۲ھ کو وفات پائی، ان کی قبر جونپور میں ہے، برکات الاولیاء میں آپ کا مزار دارالقصر مندو میں بتایا گیا ہے، اس میں اور مشکوۃ النبوۃ میں تاریخ وفات ۳/صفر ۹۰۲ھ ہجری درج ہے، جو ۸۹۲ھ کی تصحیف کا نتیجہ ہے، میر صاحب کی راہ طلب میں پہلی منزل آپ ہی کی ذات اقدس ہے، جہاں دہلی سے پہونچے اور فیضیاب ہوئے[1]

شیخ شہاب الدین سہروردی جونپوری

حضرت شیخ شہاب الدین حسینی سہروردی جونپوری دسویں صدی کے جونپوری علماء و مشائخ میں بڑے مقام و مرتبہ کے بزرگ ہیں طریقۂ سہروردیہ میں امامِ مشیخت کا درجہ رکھتے تھے، روحانی تعلیم شیخ برہان الدین حسینی تلمید شیخ صدرالدین محمد بن احمد بخاری اُچّی سے حاصل کی تھی میر صاحب شیخ قاضن کے بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اس وقت میر صاحب راہ سلوک کی ابتدائی منزل میں تھے۔ صاحب نزہۃ الخواطر نے رسالہ عاشقیہ کے حوالہ سے اس کی تصریح کی ہے[2]

شیخ عبدالقدوس قلندری شطاری نظام آبادی

آپ شیخ قدّن اور قطب صدیق کے لقب سے مشہور ہیں، حضرت قطب الدین بینادل قلندر متوفی ۸۱۰ھ کے نبیرہ ہیں طریقہ قلندریہ اپنے خاندان سے حاصل کیا مستقل قیام نظام آباد (اعظم گڈھ) میں تھا، طریقہ شطاریہ عشقیہ براہ راست اس کے بانی و امام شیخ عبداللہ بن حسام الدین خراسانی سے حاصل کیا تھا، اس کے بعد ان کے مرید خاص شیخ حافظ شطاری واسطہ کار کی صحبت میں رہکر درجۂ کمال کو پہونچے، اور حافظ شطاری نے ان کو خلافت سے نوازا اس کے بعد آپ نے نظام آباد میں ارشاد و تلقین کی بزم سجائی اور خلق اللہ کی ہدایت کی ایک سو پندرہ سال کی عمر میں ۱۲/شوال ۱۰۵۲ھ میں فوت ہوئے، اور موضع جوگیا پور میں دفن ہوئے، آپ کا مزار لب سڑک ایک

---

[1] مشکوۃ النبوۃ ص ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۳، برکات الاولیاء ص ۵۵، نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲،

[2] نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۲۴۴،

قناتی مسجد کے پاس ہے میر صاحب نے غالباً شیخ شہاب الدین جونپوری کے بعد ہی آپ سے تعلیم وتلقین حاصل کی تھی، آپ سے اخذ وکسب کی تصریح صاحب تجلی نور نے یوں کی ہے۔

حضرت میر قوام نظام آبادی و حضرت دیوان عبدالرشید جونپوری ہم ازایشان فیض ربود[1]	حضرت میر علی عاشقان اور حضرت دیوان عبدالرشید جونپوری نے بھی انھیں سے فیض روحانی اٹھایا ہے

شیخ بہاء الدین عمری چشتی جونپوری

آپ شیخ حمید الدین ناگوری کی اولاد میں ہیں اور زبردست عالم دین اور طریقہ چشتیہ کے مشہور مشائخ میں ہیں۔ ولادت اور نشو ونما جونپور میں ہوئی علوم شرعیہ کی تحصیل وتکمیل شیخ محمد بن عیسیٰ جونپوری سے فرمائی اور علوم باطنی راجہ سید حامد شاہ مانک پوری چشتی سے حاصل کر کے ان کے مرید وخلیفہ ہوئے جن دنوں شیخ بہاء الدین شیخ محمد بن عیسیٰ کی خدمت میں علوم شرعیہ کی تحصیل کر رہے تھے دھولقہ (گجرات) سے شیخ حسین نامی ایک بزرگ جونپور آئے، انھوں نے شیخ بہاء الدین کو جوان صالح دیکھ کر ان کی روحانی تربیت شروع کردی، اس طرح شیخ بہاء الدین ایام طالب علمی ہی میں طریقت کی لذت سے آشنا ہوگئے، جب شیخ حسین دھولقہ واپس ہونے لگے تو آپ نے ان سے ارادت وخلافت کے بارے میں سوال کیا شیخ حسین یہ کہکر چلے گئے کہ تمہارا شیخ اسی شہر جونپور میں ہے تمہارے نصیب میں ہماری طرف صرف اتنی ہی تربیت تھی ان کے جانے کے بعد شیخ بہاء الدین پھر اپنے استاذ کی خدمت میں تحصیل علم کرتے رہے شیخ محمد عیسیٰ نے بھی خلافت نہیں دی اور وصال کے وقت فرمایا کہ ”بہاء الدین! خرقہ خلافت تو پیش سیدے است کہ از مانک پور تشریف خواہد آورد“ چنانچہ شیخ محمد عیسیٰ کے انتقال کے بعد راجہ سید حامد مانک پوری جونپور تشریف لائے اور شیخ بہاء الدین ان کی آمد کی خبر سنکر استقبال کے لئے شہر سے باہر گئے، راجہ سید حامد شاہ نے پہلی ہی

[1] تجلی نور ج اص ۶۷، ۶۸ اعظم المطابع جونپور ۱۸۸۹ء

ملاقات میں آپ کو اپنی خلافت سے سرفراز فرمایا۔

شیخ بہاء الدین آخری عمر میں حرمین شریفین چلے گئے اور تیس سال تک مکہ مکرمہ میں جبل ابوقبیس کے اوپر ایک خلوہ میں مقیم رہے ہر نماز کے وقت حرم شریف میں نماز باجماعت ادا کرتے تھے اس وقت ان کی عمر سو سال سے زائد ہو چکی تھی اسی دوران قیام میں وہاں کے علماء سے احادیث کی سند عالی حاصل کی اور شیخ کمال الدین اسمٰعیل شروانی سے جو خواجہ عبید اللہ احرار کے فیض یافتہ تھے طریقہ نقشبندیہ حاصل کیا اور ایک مدت تک ان کی صحبت میں رہے، آپ کی تصانیف میں ارشاد السالکین مشہور کتاب ہے، ۱۴؍ جمادی الاخری یا ۲۶ رمضان ۹۱۱ھ کو انتقال فرمایا۔[۱]

میر صاحب نے یوں تو کئی علماء و مشائخ سے فیض حاصل کیا مگر درجہ' کمال کو شیخ بہاؤ الدینؒ کی خدمت وصحبت میں پہنچے اور مرید و خلیفہ شیخ بہاء الدین جونپوری سے متعارف ہوئے۔ تجلی نور میں ہے مخدوم سالار کورہ، وقاضی خان ظفر آبادی، و میر علی قوام از مشاہیر خلفائے شیخ بہاء الدین است۔[۲]

طریقہ شطاریہ اور اس کے بانی شیخ عبداللہ خراسانی

جیسا کہ معلوم ہوا میر صاحب کی روحانی اور احسانی نسبت تمام طرق و سلاسل مروجہ سے تھی، مگر طریقہ شطاریہ کا جو رنگ ابتدائے طلب میں ان پر چڑھا تھا وہ آخر تک باقی اور شیخ بہاء الدین سے طریقہ چشتیہ میں خلافت پانے کے بعد بھی شطاری سوز و ساز غالب رہا، اس طریقہ کے بانی شیخ عبداللہ بن حسام الدین خراسانیؒ میر صاحب کے دو شیوخ کے شیخ و مرشد بھی ہیں، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ اور اس کے بانی کے بارے میں بھی کچھ باتیں آجائیں ان سے میر صاحب کی شخصیت کے سمجھنے میں مدد ملے گی،

حضرت شیخ عبداللہ بن حسام الدین شطاری خراسانی متوفی ۸۳۲ھ رحمۃ اللہ علیہ سلسلہ سہروردیہ کے بانی و پیشوا حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کی اولاد سے ہیں اور طریقہ شطاریہ

---

[۱] اخبار الاخیار ص ۱۹۲، [۲] اخبار الاصفیاء قلمی ورق ۷۹،

عشقیہ کے بانی وامام ہیں اس کا سلسلہ اس طرح ہے شیخ عبداللہ عن الشیخ محمد عارف عن الشیخ محمد عاشق عن الشیخ خدا قلی عن الشیخ ابی الحسن الخرقانی عن الشیخ ابی مظفر الطوسی عن الشیخ ابی یزید العشقی عن الشیخ محمد المغربی رحمھم اللہ،

شیخ عبداللہ شطاری بڑی شان وشوکت کے بزرگ تھے، دنیائے اسلام میں سیر وسیاحت کرنے کے بعد ارشاد وتلقین کی بزم آراستہ کی، اسی سلسلہ میں ہندوستان بھی تشریف لائے اور مختلف علاقوں میں گھوم پھر کر خلق اللہ کی ہدایت کی، جس شہر یا گاؤں میں جاتے اس کے باہر اپنے مریدوں اور حشم وخدم کے ساتھ خیمہ زن ہوتے آپ کی سواری شاہانہ انداز سے نکلتی اور نوبت ونقارہ سے دعوت وتبلیغ کا اعلان کیا جاتا شاہ عبدالحق صاحب لکھتے ہیں:۔

”سطوت وشوکت ظاہر و باطن داشت،	ظاہری وباطنی شان وشوکت رکھتے تھے کہتے
گویند کہ وے نقارہ میزد، ندا در می داد	ہیں کہ وہ نقارہ بجاتے تھے اور آواز دیتے
کہ طالبے است کہ بیاید، اور انحد اراہ	تھے کہ ہے کوئی مانگنے والا جو آئے اور میں
نمایم“۔	اس کو راہ دکھاؤں

ایک مرتبہ آپ اسی شان وشکوہ کے ساتھ دیار جونپور میں تشریف لائے اور سُر ہُر پور (ضلع فیض آباد) پہونچے جوان دنوں طریقہ قلندریہ کا مرکز تھا، شاہ داؤد قلندر سُر ہُر پوری کو آپ کی تشریف آوری کا علم ہوا تو ملاقات کے لئے ان کی قیام گاہ پر گئے، اور دربان نے اندر جانے سے روکا، شاہ داؤد اس کو پچھاڑ کر سینے پر سوار ہو گئے، اور اندر جا کر شیخ عبداللہ شطاری کے برابر کرسی پر بیٹھ گئے، آپ نہایت تعظیم وتکریم سے پیش آئے، بعد میں ایک خادم نے شیخ داؤد سے کہا کہ بے ادب خدا تک نہیں پہونچ سکتا شاہ داؤد نے جواب دیا کہ باادب خدا رسیدہ نہیں ہو سکتا، اگر میں ادب کر کے دربان کو دھکا نہ دیتا اور اندر داخل نہ ہوتا تو شیخ عبداللہ کی صحبت سے فیضیاب نہیں ہو سکتا تھا۔[1]

شیخ عبداللہ شطاری کے دو خلفاء دیار پورب میں مشہور ومخصوص تھے ایک شیخ قاضن،

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۷۱، اخبار الاصفیاء ص ۸۲، مشکوۃ النبوۃ ص ۲۰۸ و ۲۰۹ نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۹۵۔

دوسرے شیخ عبدالقدوس نظام آبادی اور دونوں سے میر صاحب نے طریقۂ شطاریہ کی تعلیم و تلقین حاصل کی بلکہ شیخ قاضن کے اکمل ترین خلفاء میں سے ہیں،

شیخ عبداللہ شطاری نے سلسلہ شطاریہ کے چند مخصوص و متعارف اذکار واشغال وضع کئے ہیں جن میں وہ منفرد ہیں اور شطاری اوراد و وظائف اور مراقبات میں رسالۂ شطاریہ کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جس میں ان کے اصول بیان کئے ہیں، شاہ عبدالحق صاحب نے شیخ بہاء الدین ابراہیم قادری شطاری کے تذکرہ میں ان کی کچھ عبارتیں نقل کی ہیں ہم ان کو یہاں درج کرتے ہیں۔ تاکہ میر سید علی بن قوام الدین کی روحانی زندگی کے سمجھنے میں مدد ملے، شاہ صاحب لکھتے ہیں،

''درر سالہ می گوید الطریق الی اللہ بعدد انفاس الخلق گفتہ اند، اما سہ طریق ازاں مشہور و معروف است، اول طریق اخیار، وآں صوم وصلوٰۃ وتلاوت قرآن و حج و جہاد است، روندگان ایں طریق درزمان طویل اندک بمقصود رسند''

دوم طریق اصحاب مجاہدات وریاضات در تبدیل اخلاق ذمیمہ وتزکیۂ نفس، وتصفیۂ روح، وہو طریق الابرار، فالواصلون بہذا الطریق اکثر من تلک الطریق۔

سوم طریق شطاریہ، فالواصلون منہم فی البدایات اکثر من غیرہم فی النہایات، وایں ازاں دو طریق اقرب الطریق الی، اللہ واصول طریق شطارده (۱۰) چیز اند، اول توبہ، ہو الخروج عن کل مطلوب سواہ دوم زہد عن الدنیا وبجتہا ومتاعہا وشہواتہا قلیلہا وکثیرہا، سوم توکل و ہو الخروج عن الاسباب، چہارم قناعت، وہی الخروج عن الشہوات النفسانیۃ، پنجم عزلت وہی الخروج عن مخالطۃ الخلق بالانزواء، والانقطاع کما ہو بالموت، ششم توجہ بسوئے حق، وہو الخروج عن کل داعیۃ تدعوا الی غیر الحق کما ہو بالموت، فلا یبقی مطلوب ولا محبوب ولا مقصود الا اللہ، ہفتم صبر وہو الخروج عن محظوظ عن نفس بالمجاہدۃ، ہشتم رضا وہو الخروج عن رضا النفس بالدخول فی رضا اللہ تعالیٰ، بالتسلیم للا حکام الازلیۃ، والتفویض الی تدبیر اللہ بلا اعراض کما ہو بالموت، نہم ذکر است، وہو الخروج عن ذکر ما سوی اللہ تعالیٰ، دہم مراقبہ، وہی الخروج عن وجودہا وقوتہا کما ہو بالموت''[1]

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۹۳، رسالہ شطاریہ کا قلمی نسخہ میں نے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں دیکھا ہے۔ غالباً یہ رسالہ چھپ چکا ہے۔

علّوئے مرتب

میر صاحب نے راہ طلب کی خاک چھانتے ہوئے دسویں صدی کے مشرقی علماء وفضلاء سے اپنی استعداد وجستجو سے اکتساب فیض و برکات کیا اور سوانہ، دہلی، بہار، جون پور، اور نظام آباد کے علمی روحانی مرکزوں سے حصہ وافر پایا اور پورب کی یہ سرزمیں اس طرح پسند آئی کی یہیں کے ہورہے، سرائمیر آپ کے نام سے مشہور قصبہ ہے اس زمانہ میں پورب کے قصبات ودیہات بڑے پرکشش تھے اور ارباب ذوق دور دور سے یہاں آکر آباد ہوتے تھے، چنانچہ اسی زمانہ میں میر صاحب کے شیخ الشیخ حضرت راجہ سید حامد شاہ مانک پوری کی نسل سے ایک بزرگ راجہ سید مبارک شاہ بن راجہ سید احمد بن راجہ سید نور بن راجہ سید حامد شاہ متوفی ۹۶۵ھ نے اس علاقہ کی ایک قدیم مسلم بستی قاسم آباد کو اپنے نام سے ازسرنو آباد کر کے اس کا نام مبارک پور (اعظم گڑھ) رکھا اور کچھ دنوں یہیں بودوباش اختیار کی، گویا سرائمیر اور مبارکپور دونوں معاصر اسلامی قصبات ہیں اور ان کا تاسیسی تعلق دو روحانی بزرگوں سے ہے، میر صاحب نے پہلے سرائمیر سے متصل کھریواں نامی بستی میں بودوباش اختیار کر کے اسی کے قریب مرتضٰی آباد کے نام سے ایک گاؤں بسایا جو بعد میں سرائمیر کے نام سے مشہور ہوا اور پھر سرائمیر کو اپنا مسکن بنایا کسی روایت سے پتہ نہیں چلتا کہ اس کے بعد میر صاحب نے اپنے آبائی وطن سوانہ کا سفر کیا ہو، بلکہ سرائمیر ہی میں رہکر خلق اللہ کی ہدایت میں پوری زندگی بسر کی حتیٰ کہ یہیں وفات پائی۔ البتہ مبارکپور کے بانی راجہ سید مبارک شاہ کا وصال مانکپور میں ہوا واضح ہو کہ مبارک پور کے متصل مغرب میں سرائے مبارک نامی ایک بستی ہے ممکن ہے کہ یہ بھی راجہ مبارک کے ہی نام سے موسوم ہو اور سرائمیر کی طرح سرائے مبارک کی ہو۔

میر صاحب نے علوم ظاہری وباطنی میں کمال حاصل کر کے دسویں صدی کے تمام مروجہ سلاسل میں خلافت پائی، اور مشیخت کے سلسلہ میں چشتیت کے ساتھ شطاریت کو اپنایا اور پوری زندگی رشد وہدایت، وجد وکیف اور شریعت وطریقت کی جامعیت میں بسر کی اپنے معاصرین و اقران میں ممتاز وبلند مرتبہ کے وارث ہوئے، اور ارباب یقین وعرفان میں اپنے خصوصی اوصاف و

کمالات میں مشہور ہیں، شاہ عبدالحق صاحب کے والد بزرگوار شیخ سیف الدین جو آپ کے معاصر اور ملنے والے تھے، اپنے خیالات یوں ظاہر فرماتے ہیں،

''من بملازمت او رسیدہ ام وازوے سخنان شنیدہ ، اثر ذوق و عرفان وطیبت قلب وسرگرمی محبت از کلمات او لائح بود،

میں میر علی عاشقان کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کی کچھ باتیں سنیں تو میرے دل میں ذوق ومعرفت کا اثر ، دلی مسرت اور محبت کی گرمی کا احساس ان کی باتوں سے شدید طور سے ہوا۔

خود شاہ صاحب جو میر صاحب کے پہلے سوانح نگار ہیں لکھتے ہیں

''دے از ارباب کمال وسکر و وجد حال بود ، دائم با خود حالتے و سرگرمی داشتے ، سخن را مجذوانہ گفتے'' ۱؎

وہ جذب وسرمستی اور وجد وحال والے ارباب کمال سے تھے ، ہمیشہ مست حال رہتے اور سرگرمی عشق میں رہتے تھے۔ مجذوبوں جیسی باتیں کرتے تھے۔

دارا شکوہ نے لکھا ہے،

از بندگانِ ارباب کمال وسکر و وجد حال ، واز کبار مشائخ ہندوستان بودہ اند'' ۲؎

صاحب کمال بندوں اور ارباب سکر و جد وحال اور ہندوستان کے بڑے مشائخ میں سے تھے،

صاحب اخبار الاصفیاء کا قول ہے،

میر سید علی قوام الدین بردّ اللہ مضجعہ از سادات بزرگ ، اولیائے کبار ہندوستان است، وصاحب خوارق عادات ۳؎

میر سید علی قوام الدین اللہ ان کے اثر ونشانِ قبر کو بڑھائے بزرگ سادات اور ہندوستان کے اولیائے کبار میں سے ہیں

مشکوۃ النبوۃ میں شیخ قاضن کے دو اکمل خلفاء میں میر صاحب کو بھی شمار کیا ہے،

۱؎ اخبار اخیار ص ۲۲۲ ۲؎ سفینۃ الاولیاء ص ۱۹۰ ۳؎ اخبار الاصفیاء قلمی ص ۹۵

''یکے میر سید علی قوام کہ کمالات او	شیخ قاضن کے ایک خلیفہ میر سید علی قوام ہیں ان
اظہرست درنواحی جون پور بسرائے	کے کمالات لوگوں پر ظاہر ہیں اور جونپور کے
میراں آسودہ است از وے مردم	اطراف میں واقع سرائمیران کی آرام گاہ ہے۔
بسیار ارشاد یافتند''[1]	بہت سے لوگوں نے ان سے ہدایت پائی

میر صاحب میں سوز دروں اور عشق و محبت کی گرمی پائی جاتی تھی جس کے اثرات کم استعداد والے برداشت نہیں کر سکتے تھے، اسی لئے آپ کا معمول تھا کہ جب میدان میں گھومنے پھرنے تشریف لے جاتے تو کسی کو ساتھ نہیں لیتے تھے، عموماً آپ پر اس وقت غلبۂ حال ہوتا تھا، کرامات اولیاء میں ہے،

ہر گاہ لصحرائے بر آمدے، مردم	علی عاشقان جذب و سکر میں ہر وقت میدان میں
راازہمراہی خود منع فرمودے وگر	گھوما کرتے اور لوگوں کو اپنے ساتھ آنے سے
احیاناً کسے برخلاف ایشاں رفتے از آتش	روکتے اگر کوئی جان بوجھ کر ان کی بات نہ مانتا اور
جلال بسوختے،	ساتھ چلا جاتا تو ان کے جلال کی آگ سے جل جاتا۔

اور جس وقت یہ کیفیت طاری ہوتی تھی زبان پر یہ کلمہ ہوتا تھا ''محی الدین چنیں می فرمایند و چناں می نمایند'' یہ کہکر عجیب عجیب اسرار و رموز بیان فرماتے تھے[2] خزینۃ الاصفیاء میں ہے ''سید علی قوام قدس سرہ، از ارباب کمال و صاحب جذب و سکر حال۔[3]'' شیخ محمد امین بن فضل اللہ محبی شامی نے خلاصۃ الاثر میں شیخ تاج الدین سنبھلی متوفی ۱۰۵۰ھ کے ذکر میں ان کے سلسلے کے مشائخ میں میر صاحب کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے،

السیّد علی بن قوام الدین الهندی	سید علی بن قوام الدین ہندی
النقشبندی کان من اکابر اولیاء الله	نقشبندی اکابر اولیاء اللہ میں
تعالیٰ صاحب تصرفات عجیبة	سے تھے، تصرفاتِ عجیبہ اور
وجذب قویّ قال بعض الصّالحین	جذب قوی کے مالک تھے بعض

[1] مشکوۃ النبوۃ ص ۱۸۲ [2] کرامات الاولیاء ص ۱۶۳ [3] خزینۃ الاصفیاء ج ۱ ص ۴۲۲۔

ماظهر في الامة المحمدية على	صلحاء کا قول ہے کہ امت محمد
افضل الصلوة واتم السلام من احد	یہ علی نبینا الصلواۃ والسلام میں
بعد القطب الرباني الشيخ عبد	حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی
القادر الجيلاني رضي الله عنه من	کے بعد آپ سے جس قدر
الخوارق والكرامات والتصرفات	کرامات ظاہر ہوئی ہیں کسی
مثل ماظهر منه [1]	اور سے ظاہر نہیں ہوئیں۔

شیخ یوسف بن اسمٰعیل نبہانیؒ نے بھی جامع کرامات اولیاء میں میر صاحب کے متعلق یہی الفاظ درج کیے ہیں، گلزار ابرار میں شیخ محمد بن حسن غوثی نے لکھا ہے کہ آپ کا جذب سلوک پر غالب تھا، زیادہ زمانہ سکر میں گزرتا تھا اور کمتر ہوشیاری میں، ہوشیاری میں عجیب حال ہوتا تھا، جب وجد و کیف اور انوار و تجلیات کی حالت ختم ہو جاتی تو نالۂ حسرت و ندامت آسمان تک پہونچاتے تھے، اور گریہ وزاری اور سوز و گداز سے ایک لحظہ بھی رہائی نہیں ملتی تھی۔[2]

تاریخ الاولیاء میں ہے کہ آپ صاحب کمال و وجد و حال تھے۔[3]

صاحبِ نزہۃ الخواطر نے آپ کے اوصاف و کمالات کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے،

”شیخ علی بن قوام الدین حسینی سوانی جونپوری مشہور بہ علی عاشقاں شیخ کبیر زاہد و مجاہد اور ہندوستان کے صوفیاء میں مشائخ کبار میں سے ہیں۔[4]

ان بیانات کی روشنی میں حضرت میر علی عاشقاں کے علم و عرفان، جذب و کیف، زہد و عبادت، کشف و کرامات اور روحانی سوز و ساز کا پورا اندازہ ہو جاتا ہے اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ آپ اپنے دور میں ہندوستان کے مشائخ کبار میں کیا مقام و مرتبہ رکھتے تھے۔

میر صاحب نے علوم ظاہری کی تعلیم و تدریس کے بجائے علوم روحانی کی تلقین و ترویج اور رشد و ہدایتِ خلق کو اپنا مشغلۂ حیات بنایا اور پوری زندگی اسی میں بسر کی اور اس کا معیار علوم شرعیہ کو بنایا، اور پیروی سنت اور اتباع شریعت سے باہر قدم نہیں نکالا۔

---

[1] خلاصۃ الاثر ج ا ص ۲۶۸ [2] گلزار ابرار ص ۶۸ [3] تاریخ الاولیاء ج ۲ ص ۲۳۸ [4] نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۲۴۴

ایک مرتبہ خواب دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اے علی! تو اپنے دروازے پر نوبت بجواتا ہے اور خلق اللہ کے حال سے بے خبر ہے۔ عرض کیا یا رسول اللہ! اگر نوبت ہے تو آپ ہی کی اور دروازہ ہے تو آپ ہی کا علی بیچارہ درمیان میں کون ہوتا ہے۔

معاصرین سے تعلقات

میر صاحب کے دور میں سوادِ جونپور علماء و فضلاء اور اربابِ صدق و صفا سے معمور و منور تھا اور سرآمدگان روزگار موجود تھے، جن سے میر صاحب کے تعلقات نہایت خوشگوار تھے، تجلی نور میں ہے کہ میر علی عاشقان سرائمیری، مخدوم بندگی جلال الحق قاضی خان ناصحی ظفر آبادی، مخدوم شیخ اڈھن بن شیخ بہاء الدین چشتی جونپوری، سید مخدوم غیاث الدین محمد درویش بن ابو محمد محمود ظفر آبادی صاحب سجادہ آستانہ مخدوم آفتاب ہند، سید اسد الدین ظفر آبادی سب کے سب معاصر تھے، اور ان چاروں بزرگوں میں خصوصی روابط و تعلقات استوار تھے، ایک دن یہ چاروں حضرات جمع تھے، اور بر سبیل تذکرہ حیات و ممات کا ذکر آیا تو ہر ایک نے عہد و پیمان کیا کہ ہم میں سے جو شخص پہلے انتقال کرے وہ خبر دے کہ اس عالم میں وجہ مقبولیت کیا ہے، سب سے پہلے مخدوم بندگی جلال الحق قاضی خان ناصحی نے انتقال فرمایا تیسرے دن تینوں حضرات ان کے مزار پر گئے اور کہا کہ اَلْـکَـرِیْـم اِذَا وَعَـدَ وَفَـا اتفاق سے اسی وقت ایک پرچہ ہوا میں اڑتا ہوا گرا، جس میں حافظ شیرازی کا یہ شعر بخط سبز درج تھا،

این جافنونِ شیخ نیرزد بہ نیم خس — راحت بدل رساں کہ ہمیں می خرند و بس[۱]

(اس جگہ شیخ کے علوم و فنون کی قیمت آدھے تنکے کے برابر بھی نہیں ہے دل کو راحت پہونچاؤ کیونکہ اسی سودے کو خریدتے ہیں)۔

۱؎ تجلی نور ج اص ۱۷، ص ۲۹۔

دینی جمال اور دنیاوی جلال

میر صاحب کی زندگی دین و دنیا دونوں کے بہترین امتزاج کا نمونہ تھی، آپ ان خاصانِ خدا میں سے ہیں جن کے بارے میں کہا گیا ہے "آنانکہ درفقیری شہنشاہی کردہ اند"

آپ کا کاشانہ ایک طرف دنیاوی جاہ و جلال کا منظر پیش کرتا تھا، حشم و خدم تھے، صبح و شام نوبت بجتی تھی، حرم سرا میں چار چار بیویاں تھیں، ارباب دنیا آپ کے آستانہ پر حاضر ہوتے تھے مگر آپ کسی بڑے سے بڑے انسان کے دروازے پر نہیں جاتے تھے، فتوحات و نذرانے کا سلسلہ جاری تھا جو خدام و متوسلین اور مستورات پر خرچ ہوتا تھا دوسری طرف اہل عرفان و یقین کے لئے زاویہ اور خانقاہ تھا، جس میں طالبین و مسترشدین غمِ روزگار اور فکر معاش سے یکسو ہو کر تزکیہ نفس اور یاد خدا میں منہمک رہا کرتے تھے، خود میر صاحب کا یہ حال تھا کہ آپ کے صحو پر سکر غالب تھا اور اکثر اوقات وجد و کیف اور سکر و حال کی کیفیت طاری رہتی تھی مگر اپنے متوسلین کی ہر ذمہ داری پوری فرماتے تھے، اور وجد و حال سے اس میں خلل نہ پڑتا تھا۔

سرائمیر میں مستقل قیام کے بعد میر صاحب کی معاش اور واردین و صادرین کی خدمت کی کیا صورت تھی، اس کی تصریح کتابوں میں نہیں ملتی، غالب گمان ہے کہ اس زمانہ کے دستور کے مطابق آپ کو حکومت کی طرف سے کچھ جاگیریں ملی ہوں گی، بعد کے بعض قرائن سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، تیرہویں صدی میں آپ کی اولاد میں ایک بزرگ دیوان فضل علی سرائمیری گزرے ہیں، جو آپ کی خانقاہ کے سجادہ نشین تھے سمات الاخیار کی روایت کے مطابق وہ صاحب ثروت و فراغت اور کئی مواضع موروثی کے مالک تھے،[1]

فتوحات و عطیات

میر صاحب کی فتوحات و عطیات کی تصریح کتابوں میں ملتی ہے، جو بیوی بچوں اور خدم و

---

[1] سمات الاخیار حاشیہ ص ۱۱۲،

حشم کے لئے کافی ہوتی تھی، شاہ عبدالحق صاحب نے لکھا ہے ”وصول فتوحات بروے متصل و متوالی بودے، وہرگز منقطع نہ گشتے“[1] خزینۃ الاصفیاء میں بھی یہی لکھا ہے[2] فتوحات وعطیات کے بارے میں میر صاحب کا عمل اس حدیث پر تھا کہ اگر حرص وطلب کے بغیر مال ملے تو اسے قبول کرلو، بعد میں اگر چاہو تو اسے استعمال میں لاؤ، اور اگر چاہو تو صدقہ کردو، اور جو مال اس طرح نہ آئے اس کی فکر میں نہ پڑو، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا اصول تھا کہ آپ خود کسی سے سوال نہیں کرتے تھے، لیکن اگر کوئی شخص کچھ دے دیتا تو اسے واپس بھی نہیں کرتے تھے[3] میر صاحب کا عمل بھی اسی پر تھا بغیر طلب وخواہش کے جو رقم آتی تھی اسے لیکر حرم سرا اور خدام پر خرچ کردیتے تھے۔

آپ نے اللہ تعالیٰ سے عہد کیا تھا کہ وہ دنیا میں کسی سے سوال نہ کریں گے چنانچہ چالیس سال سے زائد مدت تک اس پر اس طرح قایم رہے کہ اپنے کسی ملازم کو بھی کسی کام کا حکم نہیں دیا، حتیٰ کہ پیاس کی شدت میں ان سے پانی بھی نہ مانگتے تھے، اخبار الاخیار وغیرہ میں ہے، ”گویند کہ وے تا چہل سال ہیچ خادمے امر نکرد“ جس انسان کا حال یہ ہو کہ وہ اپنے خادم تک سے ذاتی خدمت نہ لیتا ہو، وہ دوسروں سے مال ودولت کس طرح طلب کرسکتا ہے۔

ذمہ داریوں کا ایفا

میر صاحب پر جذب وکیف کا غلبہ تھا باتیں مجذوبانہ کرتے تھے، مگر زندگی کے تمام فرائض اور ذمہ داریوں کو پورا کرتے تھے، آمدنی کو دو حصہ کرکے ایک حصہ بیویوں کو دیدیتے اور دوسرا خدام پر تقسیم فرماتے تھے، اخبار الاخیار اور خزینۃ الاصفیا میں ہے، ”چہار منکوحہ داشت ووظیفہ داران بسیار بودند، ہرچہ از فتوح رسیدے نصفے بروظیفہ داران درقسمت یافتے ونصفے دیگر منکوحات“[4] اس بارے میں آپ کا عمل رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث پر تھا کہ سب سے افضل دینار وہ ہے جسے آدمی اپنے بال بچوں پر خرچ کرتا ہے، اپنی سواری پر خرچ کرتا ہے، اپنے دوستوں پر اور اللہ کی راہ میں خرچ کرتا

---

[1] اخبار الاخیار ص ۲۲۱ [2] خزینۃ الاصفیاء ج ۱ ص ۴۲۲، بخاری ومسلم [3] اخبار الاخیار ص ۲۲۱ و خزینۃ الاصفیاء ج ۱ ص ۴۲۲،

ہے۔[۱] ایمان میں کامل ترین وہ مومن ہے، جو سب سے اچھے اخلاق رکھتا ہے اور تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے، جو اپنی عورتوں کے بارے میں بہتر ہے۔[۲]

لباس میں تنوع

لباس میں میر صاحب کسی خاص وضع کے پابند نہ تھے، بلکہ جلال و جمال کی کیفیات کے مطابق مختلف قسم کے کپڑے زیب تن فرماتے تھے، اگر فقر و درویشی کی کیفیت ہوتی تو جبہ و دستار کے جمال میں نظر آتے اور اگر استغنا و بے نیازی کی حالت طاری ہوتی، تو فوجی اور سپاہیانہ لباس کے جلال میں نظر آتے، تقریباً سب ہی تذکرہ نگاروں نے آپ کے کے لباس کے بارے میں اس کی تصریح کی ہے، اخبار الاخیار میں ہے،

بلباس مقید نہ بودے، گاہے خرقۂ مشائخ پوشیدے، و گاہے لباس سپاہیانہ در برداشتے، (ص۲۲۱)	میر صاحب کسی خاص لباس کے پابند نہیں تھے کبھی صوفیانہ لباس زیب تن فرماتے کبھی سپاہیوں جیسا پہنتے

سفینۃ الاولیاء میں ہے،

لباس ایشاں معین نہ بود، گاہے خرقہ می پوشیدند گاہ لباس لشکریاں در بری کردند"۔ (ص۱۹۰)	ان کا لباس متعین نہیں تھا کبھی خرقہ پہنتے اور کبھی فوجی لباس زیب تن فرماتے تھے۔

خزینۃ الاصفیاء میں ہے

اما مقید بیک حال نبود گاہے خرقۂ مشائخ پوشیدے دگاہے لباس سپاہیانہ در برداشتے" (گ ۲ ص ۴۲۲)	وہ ایک حال میں مقید نہیں تھے کبھی خرقۂ مشائخ زیب تن کرتے کبھی فوجی لباس پہنتے رہے۔

اور گلزار ابرار میں ہے کہ آپ کسی معین لباس کے پابند نہیں تھے کبھی خرقہ پہنتے تھے، اور کبھی قبا زیب تن کرتے تھے،[۳]

---

[۱] رواہ مسلم عن ثوبانؓ [۲] رواہ الترمذی عن ابی ہریرہؓ [۳] گلزار ابرار ص ۶۸

لباس کا یہ تنوع میر صاحب کی دین و دنیا کی جامعیت کو ظاہر کرتا ہے، اس سے دونوں کی شان معلوم ہوتی تھی، خرقۂ مشائخ ان کے زہد و تقویٰ کا نشان اور سپاہیانہ لباس دنیاوی جاہ و جلال کی علامت تھا۔ حدیث میں آیا ہے، کہ اللہ تعالیٰ اس کو پسند فرماتا ہے، کہ اپنے بندے پر اپنی نعمت کی علامت دیکھے، امام مالکؒ نہایت قیمتی کپڑے زیب تن کرتے تھے، اور اسے تحدیثِ نعمت سے تعبیر فرماتے تھے، بعض عازمین کا قول ہے، بعض اوقات مشائخ کو مخصوص لباس کے بجائے دوسرا لباس پہننا چاہئے، تاکہ مخصوص لباس کی وجہ سے خود اپنے کو اور دوسرے کو غلط فہمی نہ ہو، ایسے لباس سے ریا کاری کا احتمال ہے۔

دروازہ پر صبح شام نوبت

میر صاحب کا کاشانہ شان و شوکت میں امراء و سلاطین کا دربار معلوم ہوتا تھا، صبح و شام دروازے پر نوبت بجتی تھی، یہ رسم آپ کے شیخ الشیوخ حضرت شیخ عبداللہ شطاری کے اصول دعوت و ارشاد کے مطابق تھی۔ شیخ شطاری کے یہاں دستور تھا کہ گھوم پھر کر ارشاد و تلقین کرتے تھے، اور نقارہ بجا کر لوگوں کو خدا شناسی کی تلقین کرتے تھے کہ جس شخص کو خدا کی تلاش ہو میرے پاس آئے اسے خدا سے ملا دوں۔ گویا میر صاحب کے دروازے پر جو نوبت بجتی تھی وہ اللہ و رسول کا بانگ دہل اعلان تھا اس سلسلہ کا خواب اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا سوال و جواب گزر چکا ہے،

دنیا داروں سے بے تعلقی

میر صاحب کسی دنیا دار کے گھر پر کبھی تشریف نہیں لیجاتے تھے اگر کسی معاملہ میں ضرورت پڑتی تو اس کو اپنے یہاں بلا لیتے تھے، مگر اس میں بھی احتیاط کا حال یہ تھا، کہ اپنے کسی خادم کو اس کے یہاں نہیں بھیجتے تھے، بلکہ کسی دوسرے آدمی کو بھیج کر بلوا لیتے تھے، خود فرماتے ہیں:۔

''من تا بودہ ام بخانۂ دنیا دارے	جب تک ہوسکتا ہے میں کسی دنیا دار کے گھر
نرفتہ ام دہر کسے را از ایشاں بخانہ خود	نہیں جاتا اور کسی سے ان کو اپنے یہاں

طلبیدہ ام، و خادم بخانۂ کس نفرستادہ ام"۔	بلوا لیتا ہوں اور ملازم کو کسی کے یہاں نہیں بھیجتا

اُن احادیث رسول پر شدت سے عمل کرتے تھے، جن میں علماء اور ارباب علم و فضل کو امراء و اغنیاء کے یہاں بلا ضرورت آنے جانے سے منع فرمایا گیا ہے اور ان سے تعلق کو علماء کے حق میں فتنۂ عظیم بتایا گیا ہے۔

اس بارے میں آپ نے اپنے زمانہ کے اہل طریقت کی اس روش پر تنقید کی ہے جو بظاہر دنیا داروں سے نہیں ملتے اور بے نیازی ظاہر کرتے تھے۔ مگر اندر اندر ربط و ضبط رکھتے تھے، آپ نے ایسی حیلہ بازی کی سخت مذمت کی ہے، فرماتے ہیں:۔

"بعضے مردم کہ بخانۂ کس نمی روند، و رقعہ می نویسند و خادم می فرستند، ایں چیزے نیست۔ ممنوع توجہ بدیشان است بہر وجہ کہ باشد"[1]	کچھ لوگ کسی کے یہاں نہیں جاتے مگر وہ رقعہ لکھتے ہیں اور ملازم کو بھیجتے ہیں یہ کوئی بات نہیں ہوئی ایسے لوگوں کی طرف توجہ کرنا ممنوع ہے چاہے وہ کسی وجہ سے ہو

غناء وسماع کے بارے میں اظہارِ خیال

آپ کے دور میں ایسے صوفیاء بھی تھے، جن کا ذوقِ تصوف نے و نغمہ کا رہین منت تھا، اور وہ حظِّ نفس لے لئے قوالوں سے فرمائش کرتے تھے کہ فلاں غزل سنائیں، اور اس سماع و غنا پر اُن کو وجد آتا تھا، آپ نے ایسے صوفیاء پر بھی سخت تنقید کی ہے اور اُن کے اس ذوقِ وجد و کیف پر تعجب ظاہر کیا ہے، فرماتے ہیں:۔

"مرا عجب می آید ازاں طائفہ کہ بر قوالاں حکم رانند کہ فلاں غزل بگو، ایں را خوش دارم و ایں را خوش ندارم ذوقِ من مقید	مجھے ان لوگوں پر حیرت ہوتی ہے جو قوالوں کو حکم دیتے ہیں کہ فلاں غزل سناؤ، اس کو پسند کرتا ہوں اور فلاں کلام ناپسند کرتا

[1] اخبار الاخیار ص ۲۲۲

نیست، مرا ہر چہ بگویند خوش آید، وہم بر آن ذوق کنم" ۱؎ | ہوں۔ میرا ذوق مقید نہیں ہے جو مجھے سنایا جاتا ہے میں اسی کو پسند کر لیتا ہوں

میر صاحب نے وجد و سماع کے بارے میں غیر محتاط صوفیاء کا احتساب کرتے ہوئے اپنے ذوق کے بارے میں نہایت صفائی سے ظاہر کر دیا ہے کہ میں بھی کبھی کبھی سماع سے ذوق کرتا ہوں، میرا حال ان لوگوں سے خدا گانہ ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو سماع سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، اور اس بارہ میں آپ کا حال مخدوم شیخ عبدالقادر بن شیخ محمد حسنی جیلانی ملقب بہ شیخ عبدالقادر ثانی" جیسا تھا کہ جب وہ مقام مشیخت پر پہونچے تو سماع و غنا سے شدت کے ساتھ پرہیز کرنے لگے، اور مریدوں کو بھی شدت سے منع کرتے تھے اور کبھی اتفاق سے سماع سے ذوق کر لیتے تو گریہ و بکا اور بے تابی سے معلوم ہوتا تھا کہ روح پرواز کر جائے گی ۲؎

سوال نہ کرنے کا عہد

حقیقی ترک و تجرید یہ ہے کہ بندہ تمام مخلوقات سے یکسو ہو کر صرف اللہ تعالیٰ سے تعلق رکھے، کسی دوسرے سے کسی قسم کا سوال نہ کرے، میر صاحب توکل و تجرید کے اس مقام پر فائز تھے، انھوں نے اللہ تعالیٰ سے عہد و پیمان کیا تھا کہ میں دنیا میں تیرے سوا کسی سے سوال نہیں کروں گا، اور چالیس سال سے زاید اسی پر قائم رہے، اس مدت میں ابتلا و آزمائش کے بڑے سخت دور آئے، مگر آپ کے عزم و استقلال میں سرِ مو فرق نہیں آیا، سوال نہ کرنے کے بارے میں حدیث میں سخت تاکید آئی ہے۔

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص مجھ سے عہد و پیماں کرے کہ میں کسی سے سوال نہیں کروں گا، میں اس کے لئے جنت کی ضمانت لیتا ہوں، حضرت ثوبانؓ نے عرض کیا کہ میں اس کا وعدہ کرتا ہوں، راوی کا بیان ہے کہ اس کے بعد سے حضرت ثوبانؓ نے کسی سے کبھی سوال نہیں کیا، ۳؎ حضرت عوف بن مالک اشجعی کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ہم نو یا آٹھ یا سات نفر

۱؎ ایضاً ۲؎ اخبار اخیار ص ۱۹۷ ۳؎ رواہ ابوداؤد عن ثوبان،

خدمت نبوی میں حاضر ہوئے، اور رسول ﷺ نے ہم سے بیعت لی کہ تم لوگ اللہ تعالیٰ کی عبادت کروگے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کروگے، پانچ فرض نمازیں ادا کروگے، اور اللہ و رسول کی اطاعت کروگے، اور یک بات آہستہ سے یہ فرمائی کہ کسی آدمی سے کسی چیز کا سوال نہ کروگے، حضرت عوف بن مالکؓ کا بیان ہے کہ میں نے ان میں سے بعض حضرات کو دیکھا ہے کہ اگر ان کا چابک گر جاتا تھا تو کسی سے اٹھانے کا سوال نہ کرتے تھے، اور کہتے کہ ہم نے رسول ﷺ سے وعدہ کیا ہے کہ ہم دنیا میں کسی سے سوال نہ کریں گے۔[۱]

تقسیم اوقات اور خدمتِ خلق

خدمتِ خلق مشائخ عظام کا خاص شعار ہے، اور وہ افضل الاشغال خدمتہ الناس کو اپنا نصب العین قرار دیتے ہیں، میر صاحب کا عمل بھی اسی پر تھا، اپنے طالبین اور مسترشدین کا خاص خیال رکھتے تھے، فجر کے بعد سے اشراق تک اور عصر سے مغرب تک مخصوص کیفیت رہتی تھی، اس لئے ان اوقات میں کسی سے نہیں ملتے تھے انکے علاوہ پورا دن خدمتِ خلق میں صرف کرتے تھے، اخبار الاخیار میں آپ کا قول درج ہے:-

من خادم فقرائم، تمام روز خدمت گاریٔ ایشاں می کنم، غیر آنکہ درمیان عصر و مغرب مرا معذور دارند، و مزاحم احوال من نشوند، کہ دراں یک ساعت بحالِ خود باشم"[۲]	میں مساکین وفقراء کا خادم ہوں، پورے دن انکی خدمت گزاری کرتا ہوں، سوائے عصر ومغرب کے اوقات میں مجھے معذور جانیں اور میری کیفیت میں دخل اندازی نہ کریں کہ اس ایک گھنٹے تک میں اپنی کیفیت میں رہتا ہوں۔

خلاصۃ الاثر اور جامع کرامات الاولیاء میں ہے کہ میر صاحب کے یہاں قاعدہ تھا کہ چاشت کے وقت کوئی ان کے پاس نہ جائے، اس وقت ان پر جذب کا غلبہ رہتا تھا، لوگ اس سے

[۱] رواہ مسلم۔ [۲] اخبار اخیار ص ۲۲۲

واقف تھے، اس لئے کوئی شخص اس وقت ان کی خدمت میں حاضر نہیں ہوتا تھا،[1]

اس سلسلہ میں یہ حدیث پیش نظر رہے جس میں یہ فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ میرے خاص اوقات ہیں جن میں مقرب فرشتہ کی بھی گنجائش نہیں ہوتی۔

کرامات و خوارق

ہندوستان قدیم زمانہ سے سادھوؤں سنتوں کی سرزمین رہی ہے، جو تپسیا اور ریاضت سے کرتب دکھا کر عوام کو مسحور کرتے رہے ہیں، اس لئے ان کے مقابلہ میں یہاں کے مشائخ اور بزرگان دین حضرات نے بعض اوقات ضرورۃً کرامتیں ظاہر کی ہیں جن کا مقصد یہاں کے عوام کو ان کے قدیم اور موروثی ذہن و مزاج کے پیش نظر راہ راست پر لانا ہوتا تھا، انھوں نے اُن کے ذریعہ ہزاروں انسانوں کو خدا سے ملایا میر صاحب کے ہندی تذکرہ نویسوں نے اجمالی طور سے ان کے کشف و کرامت اور خوارق کا تذکرہ کیا ہے، صاحب اخبار الاصفیاء نے ان کو صاحب خوارق عادات'' لکھا ہے،[2] اخبار الاخیار، خزینۃ الاصفیاء اور اخبار الاصفیاء میں بعض کراماتیں مذکور ہیں۔

وفات ۹۵۰ھ

میر صاحب کا وصال سلطان نصیر الدین ہمایوں متوفی ۹۶۳ھ کے دور سلطنت میں ۹۵۰ھ میں بمقام سرائمیر ہوا اور وہیں دفن ہوئے، اخبار الاخیار میں ہے،

''قبر او در جونپور است، وفات در خمسین و تسعمأۃ (ص ۲۲۲) — ان کی قبر جونپور میں ہے۔ وصال ۹۵۰ھ میں ہوا۔

خزینۃ الاصفیاء میں بھی یہی تاریخ وفات درج ہے۔

---

[1] خلاصۃ الاثرج ا ص ۲۶۹، وجامع کرامات الاولیاء ج ۲ ص ۸۷، [2] اخبار اصفیاء ص ۹۵۔

"وفاتِ آن جامع الکمالات بقولِ صاحب اخبارالاخیار نہصد و پنجاہ ہجری است، و مزار پرانوار در جون پور" (ج ۲۲۳)	اخبار الاخیار کے مصنف کے لکھنے کے مطابق ان جامع کمال کی وفات ۹۵۰ھ میں ہوئی اور مزار پرانوار جونپور میں ہے،

کراماتِ اولیا میں ہے:۔

"وفاتش در سـ نہصد و پنجاہ واقع شدہ و مرقد منورش در جونپور است" (ص ۶۲)	ان کی وفات ۹۵۰ھ میں ہوئی اور مرقد پاک جونپور میں ہے

سفینۃ اولیاء میں ہے:۔

"وفات ایشاں در سال نہصد و پنجاہ ہجری بودہ، وقبر او در حوالی جون پور در موضع کہ توطن داشتہ اند، وآن سرائمیراں مشہور است، یُزار و یُتبرک (ص ۱۹۱)	ان کی وفات ۹۵۰ھ میں ہوئی۔ ان کی قبر جونپور کے قریب اس موضع میں ہوئی جہاں ان کی سکونت تھی اور وہ موضع سرائمیراں کے نام سے مشہور ہے

یہی تاریخ وفات تاریخ الاولیاء (ج ۲ ص ۲۳۸) اور سمات الاخیار (حاشیہ ص ۱۱۲) میں درج ہے، مگر اخبار الاخیار کے بعض مطبوعہ نسخوں میں غلطی سے خمسین (پچاس کے بجائے خمس پانچ چھپ گیا ہے اور یہ تصحیف بہت پہلے سے اس کے بعض قلمی نسخوں میں چلی آتی ہے، اسی کو دیکھ کر بعد کے بعض تذکرہ نگاروں نے بھی آپ کی تاریخ وفات ۹۰۵ھ لکھ دی ہے ہمارے علم میں سب سے پہلے گلزار ابرار میں یہ غلطی ہوئی ہے، "در سال نہصد و پنج جان پاکش از نشیب کدۂ تن کشیدہ بملکوت اعلیٰ خرامید خوابگاہ جونپور (ص ۶۸)

اس کے بعد اخبار الاصفیاء میں بھی " نہصد و پنج آنجہانی شد" لکھا گیا (ص ۹۷ قلمی)

اور ان سب کے خلاف نزہۃ الخواطر میں رسالہ عاشقیہ کے حوالہ سے ۶ رصفر ۹۵۵ھ درج ہے (ج ۴ ص ۲۴۶) یعنی تسعماۃ سے پہلے خمسین" صحیح اور خمس غلط کو ملا کر خمس وخمسین وتسعماتۃ" بنا دیا گیا، ہندسوں میں لکھے ہوئے، اعداد میں اسطرح کی غلطیاں اکثر ہو جاتی ہیں، اسی لئے علمائے رجال وتواریخ تاریخ وسنہ کو لفظوں میں لکھتے ہیں، اسی قسم کی غلطی میر صاحب کے پہلے مرشد شیخ

قاضن کے سنہ وفات میں ہوئی ہے، صحیح ۸۹۲ھ ہے، جیسا کہ انتصاح کے حوالہ سے نزہتہ الخواطر میں درج ہے:۔

''مات فی ثالث صفر سنۃ اثنتین وتسعین وثمانمائۃ'' (ج ۳ ص ۱۴۲) مگر مشکواۃ النبوۃ میں سنہ ۹۰۲ھ درج ہے:۔

''وفاتِ ایشاں بتاریخ سیوم ماہ صفر سنۃ اثنی وتسعمائۃ'' (ص ۱۸۲ قلمی)

اسمیں ''ثمان مائۃ'' سے صرف نظر کرتے ہوئے، اثنتین وتسعین کو اثنی وتسعمائۃ بنادیا گیا ہے، مفتی سرور لاہوریؒ نے میر صاحب کی تاریخ وفات پر دو قطعات لکھے ہیں، جن میں سنہ ۹۵۰ھ درج ہے۔

یافت زحق رتبہ عالی بخلد — سیّد معصوم معلّی علی

سال وصالش چو بجستم زدل — گفتا کہ ''مخدوم معلّی علی''

۹۵۰ھ

زدنیا شد بفردوس معلّیٰ — علی مخدوم عالی شاہ معصوم

وصال او ''علی میر شریف'' است — وگر فرما ''علی سلطان مخدوم!''

۹۵۰ھ — ۹۵۰ھ

اولاد

میر صاحب کے چار بیویاں تھیں جن سے اولادیں ہوئی ہوں گی، مگر آپ کی کسی اولاد کا ذکر نہ مل سکا، البتہ آپکی نسل سے گذشتہ صدی میں ایک بزرگ دیوان سید فضل علی سرائمیریؒ تھے، جن کا تذکرہ صاحب سمات الاخیار نے کیا ہے کہ آپ سید علی قوام شاہ کی اولاد سے ہیں، اور ان کی خانقاہ کے صاحب سجادہ اور حضرت محبوب الحق شاہ فصیح الدین قدس سرہٗ (متوفی ۱۲۰۶) کے خلیفہ بھی تھے، صاحب ثروت وفراغت تھے، کئی مواضع موروثی کے مالک تھے، شاہ فصیح الدین نے اپنی بیٹی کی شادی سید فضل علی سے کی تھی[۲] بعد میں نوابان اودھ کی شیعہ گردی کے چکر میں پڑکر آپ کی اولاد بھی شیعہ ہوگئی۔

---

[۱] خزینۃ الاصفیاء ج ۱ ص ۴۲۳، [۲] سمات الاخیار ص ۱۱۱ و ۱۱۲۔

چند مریدین وخلفاء

میر صاحب نے طلب واکتساب کے بعد پوری زندگی سرائمیر میں ارشاد وتلقین میں بسر کی، اور ہندوستان کے مشائخ کی طرح آپ نے دیار پورب میں بڑا تبلیغی کام کیا بہار میں شیخ قاضن سے کسب فیض کرنے کے بعد جونپور میں شیخ بہاء الدین سے خلافت پائی، اورشہر جونپور میں مسند مشیخت بچھائی، پھر کچھ دنوں کے بعد نظام آباد میں شیخ عبدالقدوس کی خدمت میں حاضر ہوکر خرقۂ خلافت حاصل کیا، اور سرائے میر کو مرکز ارشاد وتلقین بنایا۔

وازشیخ قدن بہ سید السادات سید علی سالار عاشقان خرقہ رسیدہ، وازسید خرقہ بہ پسر ارشد ارجمند قنبر علی رسیدہ، والحال (۱۰۴۰ھ) جانشین سید قنبر علی خواہر زادہ وداماد اوست کہ سید محمد نام دارد، و مردے معمر وعزیز الوجود است، وتوطن و اقامت درموضع کھریوہ درنواحی، والحال آنمقام بسرائے میران شہرت دارد، و خدمت علی قنبر بسے بزرگ ومقتدائے زماں ووحید رواں بودہ است، رحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعۃ

وخدمت سید خلفاء بسیار داشتند یکے شیخ مبارک ابوالخیر، ودیگر شیخ عبدالحمید ساکن مجوارہ، ودیگرے شیخ مبارک بالادستی، وجملہ دیگر بسیار بودند، واز خلفائے شیخ عبدالحمید عرفان پناہ کمالات دستگاہ

کے بہت سے خلیفہ ہوئے ان میں سے ایک شیخ مبارک ابوالخیر تھے، دوسرے شیخ عبدالحمید ساکن مجھوارہ اور تیسرے شیخ مبارک بالادستی اوران کے علاوہ اور بہت سے دوسرے خلفاء تھے، شیخ عبدالحمید کے خلفا میں سے عرفان پناہ، کمالات دستگاہ شیخ عبد اللہ زاہد بہت بزرگ گزرے ہیں

سید السادات سید علی عاشقان کو شیخ قدن سے خرقہ ملا اور ان کے بعد ان کے فرزند ارجمند قنبر علی کو پہنچا اور اس وقت (۱۰۴۰ھ) سید قنبر علی کے جانشین ان کے داماد وخواہر زادہ سید محمد ہیں جو ایک معمر اور اورعزیز الوجود شخص ہیں۔ ان کی سکونت موضع کھریوہ نواح میں ہے یہ مقام اب سرائمیراں سے مشہور ہے۔ سید قنبر علی کی خدمت میں بہت سے بزرگ ومقتدائے

شیخ عبداللہ زاہد لسبے بزرگ بودہ، واین
فقیر ابن عبداللہ شطاری بخدمت ایشاں
رسیدہ، وخدمت شیخ رابا ارواح بندگان
مجانست تام بودہ ومصاحبت
استفادہ، وہر چہ پیش آمدے از ایشان
حل کردے، واین فقیر حسب الامر
حضرت ارشاد پناہی بخدمت ایشان میر
سید، الحق کہ درعصر خود دران دیار یکتاو
بے ہمتا بودہ است، و لقب زاہد بہ
آنجناب مسلم کہ بما سوی اللہ ہرگز توجہے
نبودہ، و جناب شیخ فضیلت ظاہری بر
کمال داشت، وشیخ از سادات حسینی بودہ،
وبزرگ ایشاں میر باداماد خواجہ احمد یسوی
قدس سرہما بودہ، وزیارت حمین کردہ، وبر
مسند فقر استقامت عجب داشت، وہرگز
باریاب دولت توجہ و اختلاط نکرد، و
استغراق بنوعی غالب بودہ کہ اکثر
اوقات توجہ شیخ بعالم اعلیٰ بود، وحالت وجد
ایشان برحاضران اثرے تمام داشت،
در دار السلطنت لاہور متوطن بودہ دوازدہم
محرم الحرام درسنہ فلاں متوجہ بعالم بقا فرودہ،

زمانہ اور وحید وقت تھے۔ سید قنبر علی اور یہ فقیر
ابن عبداللہ شطاری ان کی خدمت میں پہونچا،
شیخ کو بزرگوں کی ارواہ سے بڑا گہرا تعلق تھا
اور استفادہ کا خوب موقع حاصل تھا، اور جو
مسائل درپیش ہوتے وہ ان سے حل ہوجایا
کرتے تھے، اور یہ فقیر حضرت کے حکم کے
مطابق ان کی خدمت میں پہونچا، واقعتاً وہ
اس دیار میں اپنے وقت کے یکتا اور بیمثال
تھے، ان کے لئے زاہد کا لقب مسلم تھا، اس
لئے کہ وہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف ہرگز
متوجہ نہیں تھے، اور حضرت شیخ ظاہری فضیلت
درجۂ کمال پر رکھتے تھے، وہ حسینی سادات کی نسل
سے تھے، ان کے بزرگ میر باد پا داماد خواجہ
احمد یسوی قدس سرہما تھے۔ زیارت حرمین کی
تھی، فقیری کی مسند پر عجب استقامت فرمائی
تھی، حکام رسی میں انکی کوئی دلچسپی نہیں تھی،
استغراق اتنا غالب تھا کہ اکثر اوقات شیخ کی
توجہ اعلیٰ مقام پر رہتی تھی اور وجد کی حالت
حاضرین پر پورا اثر رکھتی تھی، دار الحکومت
لاہور میں تھے بارہ محرم الحرام فلاں سنہ میں
عالم بقا کی راہ لی۔

(تذکرۃ الاولیاء قلمی ص ۱۳۴ مصنفہ ابن عبداللہ عبدالنبی العثمانی الشطاری سنہ تصنیف ۱۰۴۰ھ)

اور بقول صاحب مشکوٰۃ النبوت ''از وے مردم بسیار ارشاد یافتند'' ان مردم بسیار میں جن چند بزرگوں کے نام و حالات مل سکے ہیں وہ یہ ہیں،

شیخ مبارک محمدی ماہلیؒ

شیخ مبارک بن خیر الدین محمد ماہلی جونپوریؒ شیخ صدر الدین قریشی ظفر آبادی چراغ ہند کی اولاد سے ہیں، ان کے والد شیخ خیر الدین ظفر آباد سے ترکِ وطن کر کے ماہل (اعظم گڑھ) چلے آئے، اور اس کے پاس ہی اپنے نام پر خیر الدین پور گاؤں آباد کر کے وہیں باپ بیٹے رہنے لگے، شیخ مبارک بعض کتابیں اپنے والد سے پڑھ کر جونپور گئے، اور وہاں کے اساتذہ وشیوخ سے تعلیم کی تکمیل کی، اور طریقت کی تلقین و تربیت اپنے والد سے پائی، اس زمانہ میں میر علی عاشقانؒ کی روحانی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر تھا، دور دور کے تشنگان علم و عرفان اس چشمۂ مصفّا سے سیراب ہو رہے تھے، جو شیخ مبارک کے گویا پڑوسی تھے، اس لئے انھوں نے ان کی طرف رخ کیا اور ایک زمانہ تک اُن کی خدمت و صحبت میں رہ کر مرتبۂ مشیخت کو پہونچے، میر صاحب نے اپنے لائق مسترشد و تلمیذ کو محمدی کے لقب سے نوازا، شیخ مبارک نے میر صاحب سے فیض حاصل کرنے کے بعد ان کے حکم سے محلّہ سپاہ جونپور میں خانقاہ بنائی اور علائقِ دُنیا سے یکسو ہو کر زہد و عبادت کو شیوۂ زندگی بنایا، اور پوری زندگی، ارشاد و تلقین میں بسر کر دی آپ کی ذات سے بہتوں نے فیض حاصل کیا، ۱۴؍ شوال ۹۸۳ھ کو جونپور میں وفات پائی، ''فخر زمانہ'' تاریخ وفات ہے، تجلی نور میں آپ کے حالات میں لکھا ہے:۔ خاندانی فیوض و برکات حاصل کرنے کے علاوہ تمام سلاسل کے بہت زیادہ فیوض و برکات حضرت میر سید علی قوام نظام آبادی (سرائمیری) سے حاصل کئے اور اس قدر زیادہ نفس کشی، اور مجاہدہ و ریاضت کی کہ ان کے مشاہیر خلفا میں شمار ہوئے، اور اپنے مرشد کے حکم سے جونپور کے محلّہ سپاہ میں ایک خانقاہ تعمیر کر کے ارشاد و ہدایت کے ساتھ علوم ظاہری کا درس جاری کیا۔[1]

---

[1] تجلی نور ج ۱ ص ۷۶،

قاضی حبیب اللہ عثمانی گھوسویؒ

قاضی حبیب اللہ بن قاضی احمد بن ضیاالدین بن یحییٰ بن شرف بن نصیرالدین بن مفتی حسین عثمانی اصفہانی گھوسوی کا مسلسلۂ نسب حضرت عمر بن عثمان بن عفان اور بقول بعض حضرت ابان بن عثمان بن عفان تک پہونچتا ہے، فقہ اصول فقہ اور علوم عربیہ (نحو، صرف، ادب، لغت وغیرہ) میں اپنے دیار کے ممتاز علماء میں تھے اور علوم شرعیہ کے فاضل تھے، گھوسی (اعظم گڑھ) کے قاضی مقرر ہوئے اور پوری زندگی اسی عہدہ پر اسی مقام میں گزار دی، صاحب نزہۃ الخواطر نے شیخ علی عارف کے رسالہ عاشقیہ کے حوالہ سے تصریح کی ہے کہ قاضی صاحب موصوف نے طریقت کی تعلیم و تلقین شیخ علی بن قوام الدین جونپوری سے حاصل کی تھی [1]، آپ کے بیٹے شیخ عطاء اللہ عثمانی گھوسوی متوفی ۱۰۶۳ھ اور پوتے شیخ غلام نقشبند متوفی ۱۱۲۶ھ بڑے عالم و بزرگ گزرے ہیں۔

شیخ عبدالصمد سرہندی

شیخ عبدالصمد سرہند کے رہنے والے تھے جو سوانہ کے قریب ہے، اس اعتبار سے میر صاحب کے ہم وطن تھے، فقہ، اصول اور عربیت کے ممتاز عالم تھے، صاحبِ نزہۃ الخواطر نے رسالہ عاشقیہ کے حوالہ سے لکھا ہے، کہ شیخ عبدالصّمد نے شیخ علی بن قوام الدین جونپوری سے ملاقات کی اور اُن سے اکتسابِ فیض کیا، [2]

شیخ مبارک جھنجھانوی جونپوری

شیخ مبارک بن عبدالمقتدر بن فاضل علوی جھنجھانوی، جونپوریؒ جو طریقت و روحانیت میں اپنے علوّئے مرتبت کی وجہ سے ''بالا دست'' کے لقب سے مشہور تھے، شیخ عبدالرزاق

[1] نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۸۵، [2] نزہۃ الخواطر ص ۱۸۳

جھنجھانوی کے چچازاد اور رضاعی بھائی تھے، ظاہری و باطنی کمالات و فضائل کے جامع تھے آپ کی ذات سے خلق اللہ کو بڑا فیض پہونچا، گلزار ابرار میں ہے کہ آپ نے طریقۂ شطاریہ سید علی ابن قوام الدین شطاری جونپوری سے حاصل کیا، اور مدتوں انکی خدمت وصحبت میں رہ کر فیض اٹھایا، آپ کا مولد و مدفن دونوں جھنجھانہ ہے،[۱] آپ کے خلفاء میں شیخ الٰہ بخش شطاری گڑھ مکیتشری متوفی ۱۰۰۲ھ بڑے صاحبِ کمال گزرے ہیں، جو شیخ تاج الدین سنبھلی کے مرشد تھے اور محبی نے خلاصۃ الاثر میں شیخ تاج الدین سنبھلی کے تذکرہ میں ان کے شیخ الشیخ علی بن قوام الدین سرائمیری کا ذکر بھی کیا ہے،

قاضی منجھلہ جونپوریؒ

آپ علم فقہ اور علوم عربیہ کے ممتاز علماء میں تھے، جونپور کے قاضی مقرر ہوئے اور ایک مدت تک اس عہدہ پر رہ کر خدمات جلیلہ انجام دیں، اس سے الگ ہونے کے بعد شیخ علی بن قوام الدین کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے طریقۂ شطاریہ عشقیہ حاصل کیا۔

شیخ منجھن شطاری کمال پوری

آپ نہایت متقی اور صالح عالم تھے، شرعی امور میں سخت دارو گیر فرماتے تھے، رسالہ عاشقیہ کے حوالے سے نزہۃ الخواطر میں ہے کہ شیخ منجھن نے طریقۂ شطاریہ عشقیہ میر علی بن قوام الدین جونپوری سے حاصل کیا، اور ایک مدت تک ان کی خدمت میں رہکر مرتبۂ کمال کو پہونچے[۲]

شیخ سلطان محمود عثمانیؒ

حضرت خواجہ عثمان ہارونی کی اولاد سے ہیں، آپ کے والد شیخ حمزہ مفتی مازندران کے مشہور شہر دُباوند سے دیار ہند میں آکر قصبہ ردولی میں فروکش ہوئے اور یہیں شیخ سلطان محمود پیدا

---

[۱] اذکار ابرار ص ۲۳۶، [۲] نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۳۶۷

ہوئے، سن شعور کو پہونچ کر اپنے برادر کلاں استاذ الملک ملا محمد افضل کے ساتھ جون پور تشریف لائے، اور محلّہ سپاہ میں سکونت اختیار کی، اسی محلّہ میں شیخ مبارک خیر محمدی بھی اپنے مرشد حضرت میر علی قوام کے حکم سے خانقاہ بنا کر ارشاد و ہدایت اور درس و تدریس میں مشغول تھے، شیخ سلطان محمود نے ان کی صاحبزادی سے شادی کر لی، اور علوم ظاہری اپنے بھائی استاذ الملک ملا محمد افضل سے حاصل کئے، چونکہ طبیعت میں فقر و استغناء تھا اور فطری میلان زہد و تقویٰ کی طرف تھا، اس لئے اپنے خسر شیخ مبارک کے دست حق پرست پر بیعت کر کے یوں عبادت و ریاضت کی کہ تھوڑی ہی مدت میں سلوک کی تمام منزلیں طے ہو گئیں، اور اس جادۂ مستقیم کے خضر راہ بن گئے، اسی کے ساتھ

واز حضرت میر علی عاشقان سرائمیری ہم	اور حضرت میر علی عاشقان سے بھی بہت
فراوان فیض بہ گرفت	زیادہ فیوض حاصل کئے،

سونے پر سہاگہ" کے بعد آپ کی شخصیت بڑی پر کشش ہو گئی، اور روحانیت کی اس مئے دو آتشہ کے لئے دور دور سے تشنگان معرفت آنے لگے اور کرامات و خوارق کا ظہور بکثرت ہوا، آپ ملا محمود جون پوری متوفی ۱۰۶۲ھ کے پرنانا ہیں، جون پور میں فوت ہوئے اور قبر محلّہ چاچک پور میں ہے۔ آپ کے صاحبزادے شیخ محمد عیسیٰ نے آپ سے بیعت کر کے خلافت حاصل کی اور والد کے وصال کے بعد ان کے سجادہ نشین ہوئے، ساتھ ہی درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھتے تھے، ان کا مزار بھی چاچک پور میں ہے،

شیخ محمد عیسیٰ کے صاحبزادے شیخ محمد متوفی ۱۰۶۹ھ اپنے والد کے مرید تھے اور چار واسطوں سے ان کو میر علی عاشقان سے بیعت کا شرف حاصل تھا، یہ بھی چاچک پور میں دفن ہیں، شیخ سلطان محمود کی اولاد خوب پھلی پھولی چنانچہ جونپور میں محلّہ سپاہ میں، الہ آباد میں دائرہ شاہ اجمل میں، اور کوڑہ جہان آباد میں یہ لوگ آباد ہوئے [1]

---

[1] تجلی نور ج ا ص ۷۷ ص ۷۸

(۵)

مُلّا محمود جونپوری

آج ہم شاہجہاں کے شیراز ہند پورب کے ایک ایسے فاضل کا تذکرہ کر رہے ہیں، جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ہندوستان کے اسلامی عہد میں اتنا بڑا حکیم و فلسفی پیدا نہیں ہوا تھا، اور عجب کیا ہے کہ شاہجہاں نے اپنے دور کے اسی عالم کے فضل و کمال کی بنا پر، پورب شیراز ماست" کہا ہو، ہماری مراد حضرت علامہ شیخ ملا محمود فاروقی جون پوری صاحب شمس بازغہ متوفی ۱۰۶۲ھ سے ہے جو پرگنہ محمد آباد گوہنہ کے ایک قریہ سے علم و حکمت کا آفتاب بن کر جون پور کے مطلع پر جلوہ گر ہوئے جسکی روشنی سے پورے عالم اسلام کی علمی محفلیں منور ہو گئیں، مگر افسوس کہ دیار مشرق کے دوسرے بہت سے ارباب فضل و کمال کی طرح ملا محمود جون پوری کا مفصل و مرتب تذکرہ بھی موجود نہیں ہے، جس سے اس عبقری کی شخصیت کے خدوخال معلوم کیے جا سکیں، اس کمی کو پورا کرنے کے لئے یہ تذکرہ پیش کیا جا رہا ہے۔

سلطان ابراہیم شاہ شرقی والی جون پور کے دور میں حضرت شیخ خضر فاروقی اور ان کے صاحبزادے حضرت شیخ محمد فاروقی دہلی سے جون پور آئے، شیخ محمد کی وفات کے بعد سلطان ابراہیم شاہ شرقی نے ان کے صاحبزادے شیخ مشید کو پرگنہ محمد آباد میں قریہ ولید پور وغیرہ کی جاگیر دی اس لئے اس خانوادہ کے افراد جون پور سے یہاں آکر آباد ہوئے، جس میں مولانا شاہ ابوسعید ان کے صاحبزادے مولانا شاہ حاجی ابوالخیر، شاہ اسمٰعیل، قاضی منجھن قاضی جونپور، شیخ بڑے، مولانا شاہ ابوالغوث گرم دیوان، مولانا شاہ ابوالحق جیسے بڑے علماء و فضلاء و مشائخ پیدا ہوئے، اسی خانوادہ کے چراغ ملا محمود جون وپوری بھی ہیں، یہ خاندان علم و فضل، روحانیت و مشیخت اور جاہ و جلال میں ہمیشہ سے ممتاز رہا ہے، آخری دور میں اس خانوادہ کی مشہور شخصیت سر شاہ سلیمان مرحوم تھے، جنھوں

نے انگریزی دور میں ہندوستان میں سب سے بڑا سرکاری عہدا پایا، اور مشہور نظریۂ اضافیت میں ایک نیا فکر یورپ کے جدید عقلاء وفلاسفہ کے سامنے پیش کیا، وہ علم وحکمت، ادبی ذوق اور اونچے منصب میں ملا محمود کی یادگار تھے۔

ملا محمود کی سوانح حیات کے ماخذ

(۱) ملا محمود جون پوری کا سب سے قدیم اور مستند تذکرہ شیر وشکر نامی کتاب میں ملتا ہے، جسے ملا صاحب کی وفات سے پانچ چھ سال پہلے ۱۰۵۶ھ میں ان کے خاندان کے مشہور معاصر عالم اور ان کے بہنوئی مولانا حاجی شاہ ابوالخیر بن شاہ ابوسعید فاروقی بھیروی (۱۰۰۸ھ، ۱۰۵۹ھ) نے حج وزیارت کے موقع پر لکھا تھا، اس کتاب میں کل چار ابواب ہیں، تیسرے باب میں ان کے خاندانی حالات اور جون پور سے پرگنہ محمد آباد آ کر آباد ہونے کی تفصیل درج ہے، باب سوم در ذکر نسب آل فاروقی و برخے از سوانح احوال خانوادۂ فاروقیان و سبب توطن قبیلۂ کاتب الحروف بولایت جون پور وغیرہ کہ تعلق بدان احوال وارد، اس باب میں ملا صاحب کے آباء واجداد کے حالات ان کی پیدائش اور ابتدائی تعلیم وغیرہ کے بارے میں بڑی مستند اور معتبر معلومات ہیں، مولانا شاہ حاجی ابوالخیر فاروقی ملا محمود سے عمر میں آٹھ سال بڑے تھے، اور ان سے تین سال پہلے فوت ہوئے، مناقب غوثی مصنفہ شمس الدین حیدری کے بیان کے مطابق ان کی تین بیویوں میں سے ایک ملا محمود کی بہن بھی تھیں، شاہ ابوالخیر شاہجہاں اور شایستہ خاں کے مقربین میں سے تھے اور مراحم خسروانہ سے نوازے گئے تھے، ۱۰۵۶ھ میں حج وزیارت کی دولت حاصل کی، اس کے بعد وہ اپنے وطن ۱۰۵۶ھ میں فوت ہوئے، ان کی کتاب شیر وشکر نایاب ہے، سنا ہے کہ اس کا کوئی قلمی نسخہ دائرہ شاہ اجمل الہ آباد میں موجود ہے، خیال ہے اس کتاب میں ملا صاحب کے مزید حالات ہوں گے، اس کے باب سوم کے کچھ حصہ کی نقل محترم حاجی مقبول احمد صاحب محمد پوری کے توسط سے راقم کو ملی ہے جو بسا غنیمت ہے، اس میں نہایت نادر معلومات ہیں۔

(۲) ملا صاحب کا دوسرا قدیم اور مستند تذکرہ ان کے ایک تلمیذ رشید کی کتاب صبح صادق

میں ہے، مولانا غلام علی آزاد نے سبحۃ المرجان میں اور مولانا خیر الدین جونپوری نے تذکرۃ العلماء میں اس کتاب کے حوالہ سے ملا صاحب کے کچھ حالات لکھے ہیں غالب گمان ہے کہ اس کتاب میں ملا صاحب کے علمی وفنی کمالات کا ذکر زیادہ ہوگا، اور شاگرد نے اپنے استاذ کے ذکر میں قلم کی جولانی دکھائی ہوگی، مگر افسوس کہ اس کتاب کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔

(۳) مولانا شاہ خوب اللہ محمد یحییٰ الٰہ آبادی متوفی ۱۱۴۴ھ نے بسط الکلام فی وفیات الاعلام میں ملا صاحب کا ذکر کیا ہے، یہ کتاب ملا صاحب کی وفات کے پچاس سال بعد لکھی گئی ہے۔ اس وقت تک ان کے تلامذہ اور صحبت یافتہ حضرات موجود تھے، اس لئے یہ کتاب بھی ان کے مستند تذکروں میں ہے نزہۃ الخواطر میں وفیات الاعلام کے حوالہ سے ان کی بیعت وارادت اورا دو وظائف کا بیان ہے، خیال ہے کہ اس کتاب میں ان کی روحانی اور احسانی زندگی کے حالات درج ہوں گے، یہ نادر کتاب بھی ہماری نظر سے نہیں گذری ہے، مگر ان تینوں کتابوں سے بالواسطہ ملا صاحب کے تذکرہ میں کچھ نہ کچھ استفادہ ہوسکا ہے جو بسا غنیمت ہے۔

(۴) ان نایاب تذکروں کے بعد مولانا غلام علی آزاد نے ۱۱۷۷ھ میں سبحۃ المرجان تصنیف کی جس میں ملا صاحب کا تذکرہ ہے، یہ کتاب ۱۳۰۳ھ میں بمبئی میں چھپی ہے۔

(۵) آزاد نے مآثر الکرام میں بھی ملا صاحب کے حالات درج کئے ہیں جن میں بعض باتیں سبحۃ المرجان سے زائد ہیں، یہ کتاب ۱۳۲۸ھ میں مفید عام پریس آگرہ میں چھپی ہے،

(۶) مولانا خیر الدین محمد جونپوری نے ۱۲۱۶ھ میں تذکرۃ العلماء لکھی جس میں ملا صاحب کے حالات تفصیل سے درج کئے ہیں، خاص طور سے ان کے علمی وفنی کمالات پر زور دیا ہے ۱۳۵۲ھ میں الطافی پریس کلکتہ میں چھپی ہے۔

(۷) مولوی سید نور الدین زیدی ظفر آبادی نے تجلی نور کی دوسری جلد میں ملا صاحب کا تذکرہ بڑے شاندار الفاظ میں کیا ہے یہ جلد جادو پریس جونپور میں چھپی ہے،

(۸) مولوی رحمان علی نے تذکرۂ علمائے ہند میں ملا صاحب کا حال لکھا ہے مگر اس میں کوئی نئی بات نہیں ہے، ۱۹۱۴ء میں نولکشور پریس لکھنؤ میں چھپی ہے،

(۹) مولانا حکیم سید عبدالحیٔ صاحب نے نزہتہ الخواطر کی پانچویں جلد میں ملا صاحب کے حالات نسبتۃً تفصیل سے لکھے ہیں۔ اور وفیات الاعلام کے واسطہ سے بعض اہم حالات درج کئے ہیں، حیدرآباد میں چھپی ہے،

(۱۰) مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی نے شمس بازغہ کے آخر میں "ترجمہ مؤلف الشمس البازغہ کے ماتحت ملا صاحب کا مختصر حال لکھا ہے، جس میں ان کی تصانیف پر خاص طور سے زور دیا گیا ہے" تلک عشرۃ کاملۃ، یہ سب مطبوعہ کتابیں اس وقت ہمارے پیش نظر ہیں،

ان قلمی اور مطبوعہ کتابوں کے علاوہ بعض دیگر کتابوں میں ملا صاحب کے حالات کسی نہ کسی انداز میں پائے جاتے ہیں مگر ان میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔

ملا صاحب کا اجمالی تعارف

اس مضمون میں شیراز ہندپورب کی بزم حکمت وادب کے جس امام عالی مقام کا تذکرہ ہوگا، اس کی عظیم شخصیت وعبقریت کے تفصیلی تعارف سے پہلے اجمالی تعارف کے لئے ان کے بارہ میں تذکرہ نگاروں کے اقوال نقل کئے جاتے ہیں، مآثر الکرام میں ہے کہ استاذ الملک ملا محمد افضل نے اپنے اس عزیز ترین شاگرد رشید کے متعلق بارہا اپنی علمی مجلسوں میں فرمایا تھا،

"از وقتے کہ علامہ تفتازانی و جرجانی از عالم رفتہ اند کسے اجتماع دو فاضل بہ ایں فضیلت در یک شہر نشان نہ دادہ، یعنی ملا محمود شیخ عبدالرشید"[۱]	جب سے علامہ تفتازانی اور جرجانی دنیا سے رخصت ہوئے ہیں کسی نے اس طرح دو فاضل کا اجتماع ایک شہر میں نہیں دیکھا یعنی ملا محمود جون پوری اور دیوان عبدالرشید جس فضیلت کے ساتھ ایک دور میں ہیں

صاحب تجلی نور نے بھی معمولی فرق کے ساتھ اس قول کو اس طرح نقل کیا ہے،

"استادش بارہا فرمودے کہ بعد علماء	استاد بارہا فرمایا کرتے تھے کہ علامہ تفتازانی و

[۱] مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۰۳

تفتازانی و جرجانی اجتماع دو فاضل اجل مانند ملا محمود و دیوان عبد الرشید در یک شہر بیک زماں بوجود نہ آمدے"[۱]

جرجانی کے بعد ملا محمود جون پوری اور دیوان عبد الرشید کی طرح دو زبردست فاضل کا اجتماع ایک شہر اور ایک زمانہ میں نظر نہیں آیا۔

ملا محمود کے ہم وطن، ہم خاندان، معاصر اور رشتہ دار مولانا شاہ ابو الخیر فاروقی متوفی ۱۰۵۹ھ نے اپنی کتاب شیر و شکر میں ملا صاحب کا تذکرہ جمیل کرتے ہوئے لکھا ہے،

ایشان راحق سبحانہ بمزید کرم فرزندے کرامت نمود کہ یگانہ انفس و آفاق و آفتاب مکارم اخلاق است، فرزند حال اورا دفترے جداگانہ ی بایست کہ برخے ازان نوشتہ آید واما اجمال ایں احوال آنکہ وہوا لامام الاعظم ، والمولی المکرّم ، جامع المناقب ، شمس المشارق والمغارب السراج الوہاج فی الملۃ الحنیفہ ، البحر المواج فی العلوم الحقیقۃ علم الہدیٰ والعلامۃ المقتدیٰ وملک العلماء الراسخین افتخار الملۃ والدین شیخ محمود بن محمد مد اللہ تعالیٰ ظلالہ علیٰ راس المستفیدین [۲]

اللہ تعالیٰ نے شیخ محمد کو ایک ایسا فرزند مرحمت فرمایا، جو انسانوں اور کائنات میں بے مثال اور مکارم اخلاق کا آفتاب ہے، اس فرزند کے حالات مختصر طور پر بیان کرنے کے لئے علیحدہ دفتر چاہئے، مجمل طور پر یہ ہے کہ وہ امام اعظم مولانائے مکرم، جامع مناقب، آفتاب مشرق ومغرب، ملت حنیفہ کے روشن چراغ علوم حقیقۃ کے بحر ذخار، مینارۂ ہدایت، علامۂ مقتدی ملک العلماء راسخین دین و ملت کے افتخار شیخ محمود بن محمد ہیں اللہ تعالیٰ ان کے سایہ کو طالبان فیض کے سروں پر قائم رکھے

اس آئینہ میں ملا صاحب کے علمی و دینی اور اخلاقی شخصیت کے خدوخال کی پوری عکاسی موجود ہے۔

مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے سبحۃ المرجان میں والہانہ اور عقیدت مندانہ انداز میں لکھا ہے۔

---

۱ تجلی نور ج ۲ ص ۴۹، ۲ شیر و شکر باب سوم،

هوالعلامة الاوحدبين العلماء الغوارية	وہ یورپ کے علماء میں یگانہ
وسلب نظيره اسطقس القضايا	اور بے نظیر تھے اشراقیوں اور
السالبةنقادة العلماء الا شراقيين	مشائیوں کے نقاد اور خلاصہ
وسلالة الحكماء المشائين	تھے۔

آگے چل کر یہاں تک لکھ دیا ہے،

ولاريب انه لم يظهر بالهند مثل	بلاشبہ ہندوستان میں دو فاروقیوں کی
الفاروقِيِيَنْ، احد همافي علم الحقائق	مثال نہیں ملتی ہے، ان میں سے ایک
وهو مولاناالشيخ احمد السر هندى	شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی علم
والثانى فى العلوم الحكمية والادبية	حقائق میں اور دوسرے ملا محمود علوم
وهو الملا محمود[1]	حکمیہ وادبیہ میں۔

اور مآثر الکرام میں ملا صاحب کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

نقادہ علمائے اشراقیین وسلالہ حکمائے مشائین است، درفنون عقلی ونقلی سیما حکمت سرآمد افاضل ومشارالیہ اناملِ بود[2]،

مولانا خیرالدین محمد جونپوری نے تذکرہ العلماء میں مآثر الکرام کی مذکورہ بالا عبارت نقل کرکے ملا صاحب کی حکمت وادب کی جناب میں نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے،[3] صاحب تجلی نور نے بھی مآثر الکرام کا یہ بیان نقل کرکے یہاں تک لکھا ہے کہ،

شہرۂ فضیلت بچہار دانگ ہندوستان	ان کی فضیلت کا شہرہ ہندوستان کے چار دانگ
بلند آوازگی یافت، ازروز استحکام	میں گونج اٹھا، جب سے ہندوستان میں اسلام
بنائے اسلام بعلوم فلسفہ وحکمت شخصے در	کی بنیاد پڑی فلسفہ اور حکمت میں ملا محمود جیسا
ہند ہمچو ملا محمود پیدا نگشت جامع سبحۃ	کوئی شخص پیدا نہیں ہوا صاحب سبحۃ المرجان
المرجان می فرماید کہ ملا محمود نہ فخر استاذ	نے لکھا ہے کہ ملا محمود اپنے استاذ کے لئے

[1] سبحۃ المرجان ص۵۳، ۵۴ [2] مآثر الکرام ج۱ ص۲۰۲ [3] تذکرۃ العلماء ص۴۵،

بل باعث تفاخر و مباہات دانایان سبق بود در علم حکمت کوس لمن الملکی نواخت، و در فنِ فلسفہ غلغلۂ لیس کمثلی انداخت، نظیرش در ہندوستان بروشنی شمع شعور نتواں یافت و در اقالیم سبعہ ہیچ عالم پنجۂ علمش نہ برتافت۔[1]

باعث فخر نہیں بلکہ قدیم حکمائے و عقلا کے لئے فخر و مباہات کا باعث تھے، وہ علم و حکمت کی اقلیم کے شہنشاہ تھے، اور فلسفہ میں اپنی مثال نہیں رکھتے تھے، ان کی نظیر ہندوستان میں ارباب عقل و شعور کو نہیں مل سکی اقلیم سبعہ میں کوئی عالم ان کے پنجۂ علم کو موڑ نہ سکا،

جامع المعقول والمنقول مولانا عبدالحئی فرنگی محلی متوفی ۱۳۰۴ھ نے لکھا ہے۔

ھوالعلامۃ فی عصرہ الفہامۃ فی دھرہ محقق العلوم الحکمیۃ مدقق العلوم العقلیۃ مولانا محمود الجونفوری[2]

وہ علامۂ زمانہ، فہامۂ وقت، علوم حکمت کے محقق علوم عقلی کے مدقق ملا محمود جونپوری تھے۔

صاحب تذکرہ علمائے ہند کے تاثرات ملا صاحب کے بارے میں یہ ہیں،

"درعلوم حکمیہ و ادبیہ پایہ بلند داشت، اگر بوجودش سرزمین جون پور بمرز بوم شیراز تفاخری جست روا بودے،[3]

حکمت و ادب کے علوم میں بلند پایہ تھے اگر جون پور کی سرزمین ان کی ذات پر شیراز سے اترائے کچھ بھی برا نہیں، روا ہے۔

مولانا عبدالحئی نے نزہۃ الخواطر میں لکھا ہے،

الشیخ العالم الکبیر، العلامۃِ الشہیر محمود بن محمد العمری الجونپوری احد الافاضل المشھورین لم یکن فی زمانہ مثلہ فی العلوم الحکمیۃ والمعارف الادبیۃ وکان غایۃ فی الذکاء والفطانۃ ،

شیخ عالم کبیر علامۂ شہیر ملا محمود جونپوری مشہور فضلا میں سے تھے، ان کے زمانہ میں حکمت و ادب کے علوم و معارف میں کوئی عالم ان کا ہم پلہ نہیں تھا، ان میں ذکاوت، فطانت تیزی ذہن، قوتِ حافظہ اور شدتِ ادراک

---

[1] تجلی نور ج ۲ ص ۴۹، [2] ترجمہ ملا محمود در آخر شمس بازغہ [3] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۲۱،

وسیلان الذهن وقوة الحفظ والادراك[1] انتہا درجہ کی تھی۔

ہمارے عہد و دیار کے مشہور معقولی عالم اور استاذ الاستاد مولانا محمد شریف مصطفےٰ آبادی متوفی ۱۳۷۲ھ نے الافاضۃ القدسیہ فی المباحث الحکمیہ کے مقدمہ میں ملا صاحب کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ علمائے حکمت و فلسفہ کے حلقہ کی آخری رائے ہے، وہ لکھتے ہیں،

كان علامة الاشراقيين ونقادة المشائين كان من اجل تلامذة الشيخ محمد افضل الجونفوري[2]	ملا صاحب اشراقیوں کے علامہ اور مشائیوں کے نقاد اور شیخ محمد افضل جون پوری کے سب سے جلیل القدر شاگرد تھے،

نام و نسب اور خاندانی حالات

ملا محمود بن شیخ محمد بن شیخ بڈھ (بڑے) بن شیخ محمود بن شیخ قاضی منجھن (قاضی معین) بن شیخ چاند بن شیخ معروف ثانی بن شیخ مشید بن شیخ معروف اول بن شیخ محمد بن شیخ خضر بن سلطان غیاث الدین محمد بن سلطان تاج الدین محمد بن سلطان عزالدین محمد بن ابوالفوارس موٴالدین سلطان سلیمان شاہ بن نعمان شاہ بادشاہ بن مظفر الدنیا والدین سلطان السلاطین سلطان احمد فرخ شاہ بن امیر بہاء الملۃ مسعود بن امام الائمہ مولانا واعظ الاصغر بن امام الائمہ مولانا واعظ الاکبر بن ابو الفتح بن امام اسحٰق بن امام سالم بن حضرت عبداللہ بن امیر المومنین ابوحفص عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما

مولانا شاہ ابوالخیر بن شیخ ابوسعید فاروقی فرخشاہی بھیروی متوفی ۱۰۵۹ھ نے شیر شکر میں اپنے خانوادہ کے نسب نامہ میں بھی ایسا ہی لکھا ہے شمس العلماء مولانا ظفر حسن عینی مبارکپوری متوفی ۱۳۴۷ھ نے اپنے خاندانی شجرہ میں شیخ بڈھ کی جگہ شیخ بڑے اور قاضی منجھن کی جگہ راضی معین لکھا ہے، یہ شجرہ مطبوعہ ہے، بڈھ اور بڑے میں صرف تلفظ کا فرق ہے، قاضی منجھن اور راضی معین میں یا تو تحریف ہوگئی ہے ورنہ معین نام اور منجھن عرفیت ہوگی، بعض مآخذ میں راجی بھی ملتا ہے ہمارے

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۳۹۷-۹۸، [2] الافاضۃ القدسیہ ص ۱۶ طبع ادارہ احمدی الہ آباد ۱۳۶۲ھ۔

خیال میں قاضی صحیح ہے،

شیخ محمد بن خضر فاروقی جون پوری متوفی ۸۱۱ھ اور ان کے بعد کے افراد کے حالات میں مستند معلومات ملتی ہیں اور ان ہی سے دیار پورب میں اس خانوادہ کی تاریخ شروع ہوتی ہے ان سے پہلے کے سلسلۂ نسب کے بارے میں وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کہاں تک صحیح ہے، اس میں کئی نام مجہول قسم کے معلوم ہوتے ہیں مولانا ابوالخیر نے شیر وشکر میں اوپر کے بعض حضرات کے متعلق جو معلومات درج کی ہیں، ان کی حیثیت خاندانی روایت کی ہے، تجلی نور میں شیخ محمد بن خضر جونپوری متوفی ۸۱۱ھ کے حالات اور مناقب غوثی میں شاہ ابو الغوث گرم دیوان لہراوی متوفی ۸۷۱ھ کے خاندان کے حالات زیادہ تر شیر وشکر سے ماخوذ ہیں۔

شیخ محمد بن خضر کی جونپور میں آمد

مولانا شاہ ابوالخیر نے شیر وشکر کے تیسرے باب میں لکھا ہے کہ اس خانوادہ کے جد امجد شیخ خضر اور ان کے صاحبزادے شیخ محمد دہلی سے جونپور تشریف لائے، شیخ خضر نے حضرت شیخ ابوالفتح رکن الدین بن شیخ الاسلام زکریا ملتانی سے سلسلہ سہروردیہ میں بیعت کر کے خلافت حاصل کی تھی، اور وہ اس سلسلہ کے مشائخ کبار میں شمار کئے جاتے تھے، بعد میں ملتان سے دہلی چلے آئے، اور یہیں ان کے صاحبزادے شیخ محمد پیدا ہوئے، جو اپنے والد سے تعلیم وتربیت حاصل کر کے ان کی حیات ہی میں مرجع خاص وعام بن گئے، اس زمانہ میں تیموری حملہ کی وجہ سے دہلی بہت پر آشوب تھا اور وہاں کے بہت سے علماء وفضلاء اور مشائخ دوسرے مقامات کی طرف ہجرت کر رہے تھے، یہ سلطان ابراہیم شاہ شرقی کا دور تھا، اور جونپور دارالعلم اور دہلی ثانی بن رہا تھا، اس لئے دوسرے بہت سے علماء فقراء کی طرح شیخ خضر اور ان کے صاحبزادے شیخ محمد نے بھی جونپور کا رخ کیا، اور محلّہ سپاہ کے کھلے میدان میں ایک درخت کے سایہ میں بال بچوں سمیت فروکش ہو گئے، سلطان ابراہیم شاہ شرقی کو اس کا علم ہوا تو اس نے مکان کا انتظام کیا، اس کے بعد یہ خاندان جونپور میں مستقل طور سے آباد ہو گیا، یہ نویں صدی ہجری کی ابتدائی دہائیوں کا واقعہ ہے۔

شیخ خضر کی وفات کے بعد شیخ محمد ان کے جانشین ہوئے، شیر وشکر میں ہے کہ سلطان ابراہیم شاہ نے کوشش کی کہ شیخ محمد کوئی خدمت قبول کرلیں مگر انھوں نے منظور نہیں کیا۔ جون پور کے اصاغر واکابر اور علماء ومشائخ ان سے عقیدت ومحبت رکھتے تھے، قاضی شہاب الدین دولت آبادی اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، قاضی صاحب نے حواشی کافیہ کا ایک نسخہ ان کے پاس بھجوایا کہ آپ کی نگاہ فیض ہو جائے تو یہ کتاب مقبول ہوسکتی ہے، انھوں نے ملاحظہ کے بعد فرمایا ''کافیہ راز ینت دادہ است'' اور کافیہ کے شروع میں حمد وثنا نہ ہونے پر قاضی صاحب اور دیگر فضلاء نے جو کچھ لکھا ہے اسے دیکھ کر کہا کہ ''من نسخہ دیدم قدیم وکہنہ کہ درے بودہ نوشتہ'' ایک مرتبہ سلطان ابراہیم نے والی بنگالہ کے خلاف لشکرکشی کی، اور قاضی شہاب الدین کو اپنا سفیر بنا کر اس کے پاس بھیجا اس وقت شیخ محمد نے قاضی صاحب سے کہا کہ وہ سلطان کو سمجھائیں، کہ اس تعدی سے باز آجائے۔ ایسے اقدام سے فقراء کے دل کو رنج ہوتا ہے، اور یہ اچھی بات نہیں ہے، اس سلسلہ میں قاضی صاحب کی طرف سے کچھ تلخ کلامی بھی ہوئی۔ شیخ محمد صاحب تصانیف عالم تھے، مولانا ابوالخیر نے تصریح کی ہے،

وحضرت مخدوم قدس سرہٗ رادر ایام تحصیل وحین حیات پدر بزرگوار تصانیف وتوالیف بود در علوم دینیہ، وامروز اثرے ازان پیدا نیست۔	حضرت مخدوم (شیخ محمد) اپنی طالب علمی اور اپنے والد کی زندگی ہی میں دینی علوم میں تصنیف وتالیف کا کام کرنے لگے تھے مگر آج ان کے آثار نہیں ملتے۔

ان کی وفات ۳ رجمادی الاولی ۸۱۱ھ میں جونپور میں ہوئی،

پرگنہ محمد آباد میں جاگیر اور توطن

مخدوم شیخ محمد بن خضر کے دولڑکے تھے۔ شیخ وجیہہ الدین اور شیخ مشید، شیخ وجیہہ الدین سے نسل نہیں چلی، شاہ ابوالخیر نے لکھا ہے کہ میں نے بعض مشائخ سے سنا ہے کہ بعض قصبات میں ان کی صاحبزادیوں کی اولاد موجود ہے، مخدوم شیخ مشید اپنے آبائے کرام کے طریقہ پر زندگی بسر

کرتے تھے، ظاہری علوم و کمالات کی تحصیل و تکمیل کے بعد اپنے پدر بزرگوار سے طریقت حاصل کی اور مسند ارشاد و تلقین پر متمکن ہوئے، سلطان ابراہیم شاہ شرقی، [۱] (۸۰۴ھ، ۸۴۴ھ) آپ کے عقیدت مندوں اور نیاز مندوں میں تھا قاضی سید عبدالملک شاہ اجمل بہرائچی میر صدر جہاں سید اجمل اور شیخ مشید دونوں بچپن کے یار غار اور ایک دوسرے کے غم خوار تھے، اور دونوں کے تعلقات نے برادرانہ حیثیت حاصل کر لی تھی، [۲] میر صدر جہاں سید اجمل نے بارہا سلطان کی طرف سے اور خود اپنی طرف سے التماس کی کہ اگر بار خاطر نہ ہو تو فقرا اور واردین اور صادرین کے اخراجات کے لئے کچھ جاگیر دے دی جائے، اور متعلقین کے گزر بسر کا انتظام کر دیا جائے، مگر شیخ مشید اس کے لئے آمادہ نہ ہوتے تھے۔ جب سید اجمل کا اصرار بہت زیادہ بڑھا تو استخارہ کے بعد پرگنہ محمد آباد [۳] میں ولید پور وغیرہ بارہ قریات قبول کر لئے جہاں اس خانوادہ کے اکثر افراد آکر آباد ہو گئے مگر ان کا تعلق جونپور سے آخر تک قائم رہا، مولانا ابوالخیر کے الفاظ یہ ہیں

تابجہت پاس خاطر سید اجمل بعد تقدیم	سید اجمل کا دل رکھنے کے لئے بزرگوں کی ارواح سے
استخارہ از ارواح بزرگان دوازدہ قریہ بجہت	استخارہ کرنے کے بعد فقراء کے خرچ کے واسطے بارہ
خرچ فقراء قبول فرمودند، وازاں جملہ قریہ ولید	گاؤں قبول کر لئے ان میں سے موضع ولید پور ہے
پور کہ امروز اکثر قبیلہ درآں جا توطن دارند،	جس میں آج قبیلہ کے اکثر لوگ سکونت پذیر ہیں

---

[۱] شیر و شکر سے منقولہ عبارت میں سلطان حسین شاہ شرقی ۸۶۲ھ، ۸۸۱ھ کا نام ہے، جو صحیح نہیں معلوم ہوتا ہے۔

[۲] قاضی سید عبدالملک مشہور شاہ اجمل بہرائچی خواجہ صدر جہاں سید اجمل علوم شریعت و طریقت کے جامع ورع تقویٰ میں بلند پایہ اور اپنے زمانہ کے نامور مشائخ میں سے تھے، ایک مرتبہ سلطان ابراہیم کے دربار میں صدر جہاں سید اجمل اور قاضی شہاب الدین دولت آبادی میں آگے پیچھے بیٹھنے پر نوک جھونک ہو گئی تھی، اور قاضی صاحب نے ساوات کے مقابلہ میں علماء کی افضلیت پر ایک کتاب لکھی تھی، سلطان ابراہیم خواجہ صدر جہاں سے بہت زیادہ عقیدت رکھتا تھا، ان کے لئے دریا کے کنارے بہت خوبصورت مسجد بنوائی تھی، جو آج بھی جھجری مسجد کے نام سے موجود ہے سلطان ابراہیم کے ایک لڑکے کو ان کی خانقاہ کے قریب دفن کیا گیا، (تجلی نور ج ۱ ص ۵۰، اعظم المطابع جونپور ۱۸۸۹ھ) تیموری دور میں سرکار جونپور کے اکتالیس پرگنوں میں سے محمد آباد گوہنہ بھی ایک پرگنہ اور دارالقضاء تھا اعظم گڑھ سے مشرق میں تقریباً بارہ میل پر واقع ہے،

شمس الدین حیدری نے مناقب غوثی کے باب ہشتم میں لکھا ہے کہ شیخ محمد بن خضر کی وفات سے سلطان ابراہیم شاہ شرقی کو بہت زیادہ رنج ہوا، اور اس نے شیخ مشید کو یہ جاگیر عنایت کی،

سلطان ابراہیم از تعزیت نہایت کوفتہ شد، آخر الامر حضرت مشید را صدر و جانشین آں مسند محتشم گردانید، بکمال نیازمندی در پرگنہ محمد آباد قریہ ولید پور با دیگر مواضع در وجہ معاش مقرر داشت''[1]

سلطان ابراہیم شاہ شرقی سوگ سے نڈھال ہوگیا تھا آخر حضرت شیخ مشید کو صدر و جانشین بنا کر اس مسند پر بیٹھا دیا اور بہ کمال نیازمندی پرگنہ محمد آباد میں دوسرے مواضع کے ساتھ قریہ ولید پور کو گزر بسر کے لئے مقرر فرمادیا تھا،

اس جاگیر کا تذکرہ اعظم گڑھ گزیٹیر میں بھی ہے۔ یہ معلوم نہ ہوسکا کہ یہ بارہ مواضع کون کون سے تھے، البتہ یہ یقین ہے کہ ولید پور اور بھیرا (سلطان پور) کے مغرب میں مبارک پور سے متصل لہرا تک اس کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا، تجلی نور میں ہے ''از اولاد حضرت شیخ محمد در مواضع بھیرا و لہرا اعظم گڑھ سکونت پزیراست (ج ۱ ص ۴۸) چنانچہ شاہ ابوالغوث گرم دیوان متوفی ۱۱۷۸ھ نے (سلطانپور) بھیرا کا قیام ترک کر کے لہرا (وحدت آباد) میں سکونت اختیار کی اور یہاں خانقاہ و مدرسہ تعمیر کر کے درس وتدریس اور ذکر وشغل میں مشغول ہوگئے اور یہیں فوت ہوئے، مولانا شاہ ابوالخیر نے لکھا ہے کہ اس شاہی جاگیر کی نگرانی اور انتظام کے لئے چند ملازم رکھے گئے تھے، جو ان کی آمدنی وصول کرتے تھے ان میں دو ملازم سرخیل اور مرغوب نامی نے شیخ مشید کے نام ونسب کی آڑ میں اکثر مواضعات ان کے مالکوں سے چھین کر اپنے قبضہ میں کر لئے اور بڑے کروفر کی زندگی بسر کرنے لگے، البتہ اجناس اور غلہ جات وغیرہ سال بہ سال جونپور کی خانقاہ کے لئے روانہ کرتے رہے، شیخ مشید کو ملازموں پر اعتماد تھا وہ دینی مصروفیات کی وجہ سے اس صورت حال سے بالکل بے خبر تھے، ان کو اسکی طرف توجہ کرنے کی فرصت ہی نہیں تھی، اسی دوران میں میر صدر جہاں سید اجمل سلطان ابراہیم شاہ شرقی[2] کی طرف سے

---

[1] مناقب غوثی باب ہشتم قلمی مخلوکہ دار المصنفین اعظم گڑھ) [2] اس جگہ بھی شیر وشکر سے منقولہ عبارت میں سلطان حسین شاہ شرقی ہے۔

بنگالہ کی سفارت پر گئے تھے، واپسی میں جب ان مواضعات سے گذرے تو ان کو ان حالات کا علم ہوا انھوں نے جونپور پہونچ کر شیخ مشید سے اس کو بیان کیا اس کے بعد شیخ مشید کے دونوں صاحبزادے شیخ معروف اور شیخ علی ایک جماعت کے ساتھ یہاں آئے اور زمینداری کے جملہ انتظامات کو اپنے ہاتھ میں لے لیا مولانا ابوالخیر نے لکھا ہے

بفرمودنِ امیر مذکور حضرت شمس العلماء وزبدۃ الاتقیاء مخدوم شیخ معروف کہ اکبرالاولادِ مخدوم بودند با جماعت صوفیاں وطلبہ بقریۂ مذکورہ آمدند، آنہا مواضعات مخدوم رسمی نمودند؟ مدتے بریں بگزشت سال دیگر برادر خوردتر مخدوم شیخ علی ہم باشارۂ میر مذکور آمدند، وبتدریج املاک و مواضع بستند، بعد وفات شیخ مشید سکونت دریں قریہ اختیار افتاد"	امیر مذکور کے حسب الحکم حضرت شمس العلماء و زبدۃ الاتقیاء مخدوم شیخ معروف جو کہ مخدوم کے بڑے لڑکے ہیں، صوفیوں اور طالب علموں کی ٹولی کے ساتھ یہاں آئے اور ان مواضعات پر قبضہ کیا مدت گزرنے کے بعد دوسرے سال ان کے سب سے چھوٹے بھائی مخدوم شیخ علی بھی امیر مذکور کے اشارہ پر آئے دھیرے دھیرے املاک ومواضعات پر قبضہ کیا، شیخ مشید کی موت کے بعد اسی گاؤں میں رہنے لگے۔

ملا صاحب کے قریبی آباء واجداد

شیخ مشید نے جونپور میں انتقال کیا اور ان کے لڑکے شیخ معروف اور شیخ علی قریہ ولید پور کے قریب سلطان پور کے نام سے ایک بستی آباد کر کے اس میں سکونت پزیر ہوئے، شیخ علی کے کئی اولادیں تھیں، ان کے چھوٹے صاحبزادے شیخ بایزید جاگیر اور زمینداری کے نگران ومنصرم تھے، اور شیخ معروف جو قطب وقت اور صاحب ولایت تھے، اپنے والد شیخ مشید کے جانشین بنے، ان کے صاحبزادے شیخ چاند نے اپنے آباؤ اجداد کے طریقہ پر ظاہری و باطنی علوم وفنون کی تحصیل و تکمیل کی تھی، ان کے دو صاحبزادے تھے، ایک شیخ ماہ، دوسرے قاضی منجھن، ان دونوں کے بچپن تک جاگیر کا انتظام شیخ بایزید ابن شیخ علی کے ذمہ رہا، ان کے بعد تمام املاک دونوں بھائیوں یعنی شیخ

معروف اور شیخ علی کی اولاد میں تقسیم ہوگئی، شیخ ماہ کے دو صاحبزادے شیخ چاند اور شیخ عثمان تھے شیخ چاند مدتوں خاندان کے رئیس وامیر رہے۔ انکے ایک صاحبزادے شیخ بھیکہ اور تین صاحبزادیاں تھیں، قاضی منجھن ملا محمود کے جد اعلیٰ جونپور میں عہدۂ قضاء پر فائز تھے اسلئے ان کا قیام زیادہ تر جونپور ہی میں رہتا تھا مولانا ابوالخیر نے تصریح کی ہے، شیخ قاضی منجھن مدتے بالزام حکام منصب قضائے جونپور رونقے دادند، وازیں جہت بیشتر اوقات درشہر جونپور بسرمی بردند"[1]

قاضی منجھن کے صاحبزادے شیخ محمود ملا محمود کے پردادا ہیں، ان کے صاحبزادے شیخ بڈھ (بڑے) بڑی شان وشوکت اور عقل و دانش کے مالک تھے شیخ بڑے کی شادی سید گھورن قاضی محمد آباد کی صاحبزادی سے ہوئی تھی، اور وہ مخدوم ابراہیم سے بیعت تھے[2] مولانا ابوالخیر لکھتے ہیں دیرا آثار و بزرگواری و سرداری ہویدا بود" انھوں نے ولید پور میں انتقال کیا ان کا مزار آج بھی وہاں کھجوروں کے جھنڈ میں ہے اور بڑے صاحب" کے نام سے مشہور ہے، ان کے پانچ لڑکے تھے، شیخ محمد، شیخ مشید، شیخ قطب الدین، شیخ حافظ، اور شیخ عبدالحیٔ اور چار لڑکیاں تھیں،

یہی شیخ محمد بن شیخ بڑے ملا محمود کے والد ہیں، ان کے حالات مولانا ابوالخیر کی زبانی یہ ہیں:۔

---

[1] شیر وشکر سے منقولہ عبارت میں ہر جگہ راجی منجھن درج ہے اور بعض دوسری جگہ راضی بھی نظر آیا مگر ہم نے ہر جگہ "قاضی" لکھا ہے، [2] یہ بزرگ راجہ سید ابراہیم بن راجہ سید عبدالحق بن سید عبدالحق بن راجہ سید یٰسین ابن راجہ سید بندگی (شیخ مجتبی) بن راجہ سید مبارک ہیں، مانک پور کے راجگان چشت راجہ سید حامد مانک پوری کے زمانہ سے دیار پورب میں آتے جاتے تھے، اور ان کے فیوض و برکات یہاں عام ہوئے، آئینۂ اودھ میں ہے کہ راجہ سید ابراہیم کے خدام جنات تھے (ص ۲۸۲) راجہ سید غلام معین الدین عرف راجہ دانی متوفی ۱۱۳۰ھ ان کے مرید وخلیفہ تھے، مناقب غوثی میں ان کو حضرت حجتہ العارفین سراج السالکین راجی سید ابراہیم قدس سرہ کے القاب سے یاد کیا گیا ہے، غالباً یہی راجہ ابراہیم موضع ابراہیم پور کے بانی ہیں، جبکہ راجہ دانی کے بھائی راجہ سید خیر اللہ شاہ خیر آباد کے بانی ہیں، اور ان لوگوں کے مورث اعلیٰ راجہ سید مبارک شاہ مبارک پور کے بانی ہیں، ایک اور بزرگ شیخ مخدوم ابراہیم دانشمند بن شیخ اسمٰعیل کلاں ہیں جن کا مزار محمد آباد کے علاقہ گھرانٹی میں ہے، دیگر یہ اکبری دور سے تعلق رکھتے ہیں (مرآۃ اسرار)

و امام شیخ محمد بہ صفات فاضلہ و مکارم اخلاق وعلوئے ہمت و خدمت؟ وفتوت متصف بود مدتے از بہر اعانت مومناں و رعایت خویشاں صحبت سلوک اختیار کرد۔ وآخریں عتبۂ عزلت اختیار کرد ودر سنہ یکہزار و بست وہفت دوم ربیع الاول بجوار الہیٰ ارتحال کرد، وایشان راحق سبحانہ بمزید کرم فرزندے کرامت فرمود کہ یگانہ انفس وآفاق و آفتاب مکارم اخلاق استفرزند حال اور ادفترے جداگانہ می بایست کہ برخے ازاں نوشتہ آیدو اما اجمال ایں احوال آنکہ ہوالامام الاعظم الخ

شیخ محمد مکارم اخلاق، ہمت و خدمت اور مروّت کے اوصاف سے متصف تھے ایک زمانہ تک مسلمانوں کی اعانت اور خویش واقرباء کی رعایت کی خاطر روکھی پھیکی زندگی بسر کی اور آخر میں گوشہ نشین ہوگئے ۲ ربیع الاول ۱۰۲۷ھ میں فوت ہوئے، ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل وکرم سے ایک ایسا فرزند عنایت فرمایا جو یکتائے زمانہ اور بے مثال اور حسن اخلاق کا آفتاب ہے، اسکے مختصر حالات لکھنے کے لئے الگ سے دفتر کی ضرورت ہے، مختصر یہ ہے کہ وہ شیخ محمود ہے،

ہم نے ملا صاحب کے آباء واجداد کے ذکر میں اس لئے تفصیل سے کام لیا ہے کہ ان کے حالات بہت کم ملتے ہیں۔

ملا صاحب کے جد مادری شیخ شاہ محمد

ملا صاحب باپ کی طرف سے فاروقی اور ماں کی طرف سے عثمانی تھے، صحیح معنوں میں نجیب الطرفین اور لا یدری ای جانبہ اطول کے مصداق تھے، ان کے نانا شیخ شاہ محمد بن شیخ سلطان محمود عثمانی تھے، ملا صاحب نے ادب وعربیت کی تعلیم ان ہی سے حاصل کی تھی، مولانا ابوالخیر کا بیان ہے۔

والدۂ ماجدۂ آنحضرت دختر شیخ العصر البحر

ملا محمود کی والدہ ماجدہ دختر شیخ العصر بحر

المدقق،، العلامتہ المحقق شیخ شاہ محمد بن شیخ المشائخ قطب الآفاق مخدوم شیخ محمود است وشیخ محمود را سلطان محمودمی خوانند کہ خلیفہ شیخ مبارک خیری وخلیفہ حضرت عاشقان سید میر علی قوام است وفقیر خدمت شاہ محمد کردہ ام، در فنون وعلوم یگانۂ وقت، ودر مکارم اخلاق وحلم وحیاو مروت و وقار، تواضع و ایثاری فرمود،	مدقق علامہ محقق شیخ شاہ محمد بن شیخ المشائخ قطب الآفاق مخدوم شیخ محمود ہیں، جن کو سلطان محمود کہتے ہیں، وہ مبارک خیری اور میر علی عاشقان سرائے میری کے خلیفہ تھے، میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں، علوم و فنون میں یگانہ تھے اور محاسنِ اخلاق، حلم و حیاء مروت، وقار اور تواضع سے متصف تھے۔

اس کے بعد لکھا ہے کہ ان کے رگ وریشہ میں اہل بیت رسول کی محبت اس طرح سرایت تھی کہ دن میں کئی باران کے ذکر سے آنکھیں نم ہو جاتی تھیں، اہل بیت سے غایت محبت وعقیدت کی بنا پر کچھ لوگ ان کی نسبت رفض وتشیع کی طرف کرتے تھے،۱۰۳۲ھ میں ان کا انتقال ہوا تذکرہ علمائے ہند میں ان کا مختصر حال یہ ہے کہ شیخ شاہ محمد فاروقی اکابر علمائے جونپور میں سے ہیں، ورع و تقوی سے متصف اور افادہ ودرس میں مصروف تھے، ملا محمود جونپوری ان کے نواسے تھے۱۰۳۲ھ میں وفات پائی۔[1]

شیخ شاہ محمد کے دادا مفتی حمزہ عثمانی علاقہ ماژندران کے شہر داوند کے رہنے والے تھے وہاں سے ہجرت کر کے ہندوستان کی خاک چھانتے ہوئے قصبہ ردولی پہونچے یہ سلاطین شرقیہ جونپور کا دور تھا، ہر طرف علم وعلماء کی چہل پہل تھی اس لئے یہیں فروکش ہو گئے، اور ردولی ہی میں ان کے صاحبزادے ملا محمد افضل اور سلطان محمود پیدا ہوئے، شیخ سلطان محمود سن رشد کو پہونچ کر اپنے بڑے بھائی استاذ الملک ملا محمد افضل کے ساتھ جون پور تشریف لائے اور محلّہ سپاہ میں قیام پذیر ہوئے اسی محلّہ میں شیخ مبارک خیری متوفی ۱۴ ارشوال ۹۸۳ھ اپنے مرشد حضرت میر علی عاشقان قوام الدین سرائے میری متوفی ۹۵۰ھ کے حکم سے خانقاہ بنا کر تعلیم وتدریس اور ارشاد وتلقین میں

[1] تذکرۃ العلمائے ہند ص ۸۴،

مشغول تھے، شیخ سلطان محمود کی شادی ان کی صاحبزادی سے ہوئی اور انھوں نے اپنے بھائی ملا محمد افضل سے علوم ظاہری کی تحصیل وتکمیل کر کے اپنے خسر شیخ مبارک خیری سے بیعت کی اور تھوڑی ہی مدت میں سلوک ومعرفت کی تمام منزلیں طے کرلیں ۔ میر علی عاشقان سے بھی فیوض و برکات حاصل کیے، اس سونے پر سہاگہ سے ان کی شخصیت بڑی پرکشش ہوگئی اور ان کی ذات سے خلق اللہ کو بڑا فیض پہونچا، جونپور میں وفات پائی، محلّہ چاچک پور میں ان کا مزار ہے ان کی اولاد جون پور، الہ آباد، کوڑہ، جہاں آباد میں پھیلی [1] انہی کے صاحبزادے شیخ شاہ محمد ملا صاحب کے نانا اور استاذ اور انکے بڑے والد ملا محمد افضل ملا صاحب کے شیخ الکل ہیں،

ولادت اور مولد ومنشاء

ملا صاحب اپنے گھر کی روایت کے مطابق سلطان نورالدین جہانگیر کی سلطنت کے دوسرے سال رمضان ۱۰۱۵ھ میں پیدا ہوئے ،مولانا ابوالخیر نے شیر وشکر میں تصریح کی ہے: ولادت باسعادتش در ماہ مبارک سنہ ہزار ویا نزدہ واقع شد" مگر تجلی نور اور نزہتہ الخواطر میں ملا صاحب کی پیدائش ۹۹۳ھ درج ہے،[2] جو صحیح نہیں ہے، ملا صاحب کی جائے پیدائش جونپور ہے، جیسا کہ انھوں نے خود الفرائد کے شروع میں تحریر فرمایا ہے، اما بعد فیقول العبد الملتجی الیٰ ربہ الصمد و محمود بن محمد الفاروقی محتدًا، الجونفوری مولدًا، [3] .... یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ملا صاحب کے پردادا شیخ منجھن جونپور کے قاضی تھے، اور زیادہ تر وہیں رہتے تھے، جونپور ان کا قدیم آبائی وطن تھا، اور ملا صاحب کا نانہال بھی جونپور ہی میں تھا، پھر جونپور اور ولید پور بھیرا کے درمیان اسی پچاسی میل کی مسافت ایسی نہیں تھی کہ آمدورفت میں دقت ودشواری ہو، یہ درست ہے کہ ملا صاحب کے دادا شیخ بڑے اور ان کے والد شیخ محمد اپنے وطن میں رہے۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ ان کی ولادت جونپور میں ہوئی، اور اسکی کوئی حقیقت نہیں ہے کہ وہ ولید پور میں پیدا ہوئے جیسا کہ "ہندوستان کی قدیم درسگاہوں" اور بعض

---

[1] تجلی نور ج ۱ ص ۷۸۔۷۷، [2] تجلی نور ج ۲ ص ۴۸، نزہتہ الخواطر ج ۵ ص ۳۹۷، [3] الفرائد ص ۳،

دوسری کتابوں میں مذکور ہے، ملا صاحب اپنے نانا کے یہاں جونپور میں پیدا ہوئے اور وہیں ان کی نشو ونما ہوئی، ان کے والد شیخ محمد[۲] ربیع الاول ۱۰۲۷ھ میں فوت ہوئے، اس وقت ملا صاحب کی عمر بارہ سال سے بھی کم تھی، اور نانا شیخ شاہ محمد زندہ تھے۔ انھوں نے اپنے نواسے کو اپنی تعلیم وتربیت میں پروان چڑھایا۔

تعلیم

ملا صاحب کی تعلیم کے سلسلے میں ان کے صرف دو تین استادوں کے نام ملتے ہیں ایک ان کے نانا شیخ شاہ محمد، دوسرے نانا کے بڑے بھائی استاذ الملک ملا محمد افضل اور تیسرے ملا شمس نور برونوی۔ ملا صاحب نے ننہال میں قرآن شریف ختم کرنے کے بعد نانا سے علوم آلیہ نحو وصرف اور ادب وغیرہ کی تعلیم حاصل کی، مولانا ابوالخیر نے تصریح کی ہے کہ "بعد ختم قرآن در تحصیل علوم ادبیہ در خدمت جد مادری آغاز کردند، ومن برابر بودم پدر بزرگوار شیخ شاہ محمد علوم وفنون میں یگانۂ وقت اور شرافت ومکارم اخلاق میں ممتاز تھے مولانا ابوالخیر بھی ان سے اکتساب علم وفن کرتے تھے، اور انھوں نے انکو شیخ العصر، البحر المدقق، العلامۃ المحقق کے القاب سے یاد کیا ہے، نزہۃ الخواطر میں ملا صاحب کی پیدائش جونپور میں بتائی گئی ہے، اور یہ بھی لکھا ہے کہ، ملا صاحب اپنے نانا شاہ محمد کے یہاں پروان چڑھے اور ان سے کتب درسیہ کی تعلیم پائی، [۱]

تذکرۂ علمائے ہند میں بھی یہی ہے کہ ملا ابتداءً از جد خود مولانا شاہ محمد اخذ علوم کردہ[۲]" مولانا آزاد بلگرامی نے سبحۃ المرجان میں اور مولانا عبدالحئی فرنگی محلی نے شمس بازغہ کے آخر میں شیخ شاہ محمد سے ملا صاحب کے ابتدائی تلمذ کی تصریح کی ہے، مگر ان دونوں بزرگوں نے تلمذ علی جدہ القریب لکھا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ شیخ شاہ محمد ملا صاحب کے نانا نہیں بلکہ دادا تھے، کیوں کہ اصطلاحاً جد قریب دادا کو کہتے ہیں، نانا کے لئے جد بعید یا جد فاسد یا جد

---

[۱] نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۳۹۷، [۲] تذکرۃ العلمائے ہند ص ۲۲۱،

الام کہا جاتا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ ملا صاحب جونپور میں اپنے نانا کے یہاں پیدا ہوئے اور وہیں سن شعور کو پہنچے اور عربی کی ابتدائی تعلیم ان ہی سے حاصل کی۔

استاذ الملک ملا محمد افضل جونپوری

اس کے بعد تمام تذکرہ نگاروں کی تصریح کے مطابق ملا صاحب نے اپنے نانا کے بڑے بھائی استاذ الملک ملا محمد افضل سے اپنی خداداد ذہانت فطانت اور کوشش سے قلیل مدت میں جملہ مروجہ علوم وفنون کی تحصیل وتکمیل کرلی، ملا محمد افضل کے والد مفتی حمزہ عثمانی علاقۂ ماژندران سے آکر قصبہ ردولی میں آباد ہوئے[1] اور وہیں ۱۶ رمضان ۹۷۷ھ میں ملا محمد افضل پیدا ہوئے۔ سن شعور کو پہونچ کر اپنے والد مفتی حمزہ سے علوم عقلیہ ونقلیہ کی تعلیم حاصل کی، پھر وہ جونپور آئے اور یہاں سے لاہور جاکر ملا عبدالحکیم سیالکوٹی متوفی ۱۰۶۷ھ سے پڑھا پھر دہلی میں ملا شیخ حسین کے حلقۂ درس سے استفادہ کیا۔ ملا شیخ حسین جملہ مروّجہ علوم وفنون میں یکتائے روزگار تھے۔ ملا طاہر لاہوری اور حکیم اسمٰعیل سے بھی شرف تلمذ رکھتے تھے، دہلی ہی میں صحاح ستہ اور دیگر کتب حدیث ملا ابوحنیفہ سے پڑھیں، جو مخدوم الملک اور حکیم گیلانی کے شاگردوں میں تھے، اور ان ہی کی خدمت میں رہ کر مسائل کے استنباط وتحقیق میں مہارت حاصل کی اس طرح ملا محمد افضل نے بیس سال کی عمر میں تمام مروجہ علوم وفنون کی تحصیل وتکمیل سے فراغت پائی،

اس وقت جونپور شیراز ہند بنا ہوا تھا، ہر طرف علماء وفضلاء کا مجمع تھا، ملا محمد افضل فراغت کے بعد اپنے چھوٹے بھائی شیخ سلطان محمود (ملا محمود کے نانا کے والد) کے ساتھ جونپور آئے اور محلّہ سپاہ میں قیام کرکے درس وتدریس میں مشغول ہوگئے۔ ملا محمد افضل ظاہری علوم میں یگانہ روزگار ہونے کے ساتھ روشن ضمیر صوفی بھی تھے، شیخ عبدالقدوس قلندر شطاری نظام آبادی متوفی ۱۰۵۳ھ سے بیعت ونسبت رکھتے تھے، جو شیخ قدن اور قطب صدیق کے لقب سے مشہور تھے، اور میر علی

[1] ان کی نسل اب بھی ردولی میں آباد ہے ملا افضل جونپوری خواجہ عثمان ہارونی کی اولاد سے تھے اس لئے ان کی نسل کے لوگ اپنے کو ہارونی لکھتے ہیں،

عاشقان سرائمیری متوفی ۱۰۵۰ھ اور شیخ دیوان عبدالرشید متوفی ۱۰۸۳ھ کے شیخ و مرشد تھے، انھوں نے طریقہ شطاریہ کو براہ راست اس کے بانی شیخ عبداللہ بن حسام الدین خراسانی سے حاصل کیا تھا، ملا محمد افضل زندگی بھر درس و تدریس میں مشغول رہے، ان کے فضل و کمال کا شہرہ دور دور تک پہونچا۔ علمائے جونپور نے خاص طور سے ان سے استفادہ کیا، یہ جہانگیر کا دور سلطنت تھا، جونپور کے وقائع نگار نے ملا محمد افضل کی مرجعیت اور ان کے علم و فضل کے بارے میں جہانگیر کو اطلاع دی، اس نے ان کو استاذ الملک کا لقب دیا، اور جونپور کے شاہی مدرسہ کی مدرسی اور جاگیر کا پروانہ روانہ کیا مگر ملا محمد افضل نے اس کے قبول کرنے سے معذرت کی اور پوری زندگی توکل و تدریس میں گذار دی یوں تو ان کے تلامذہ میں برے بڑے علماء و فضلاء اور اہل اللہ تھے مگر ان میں ان کو اپنے دو شاگردوں پر ناز تھا اور ان دونوں کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ علامہ تفتازانی اور علامہ جرجانی کے بعد ایک وقت اور ایک شہر میں ان کے جیسے دو فضلاء کا اجتماع نہیں ہوا، یہ دونوں ملا محمود اور شیخ عبدالرشید تھے۔ ملا محمود کا انتقال استاذ کی زندگی میں ہو گیا، ان کو ان کی وفات کا اتنا صدمہ ہوا کہ اس کے اثر سے ۱۳؍ ربیع الثانی ۱۰۶۲ھ میں انتقال کر گئے، ان کے کوئی اولاد باقی نہیں رہی البتہ ان کے چھوٹے بھائی سلطان محمود کی نسل چلی جو ماضی قریب تک ملا محمد افضل کے مکان اور خانقاہ واقع محلہ سپاہ میں آباد تھی [۱]، ملا محمد افضل کے تذکرہ میں صاحب تجلی نور نے لکھا ہے کہ جس وقت ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی کا وصال ہوا، اہل جونپور نے علم کا الوداعی ماتم کیا تھا، ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ ملک العلماء خود تو دنیا سے تشریف لے گئے، مگر علم کی خلعت فاخرہ استاذ الملک ملا محمد افضل کے لئے چھوڑ گئے،

گماں مبر کہ تو چوں بگزری جہاں بہ گزشت ہزار شمع بکشتند و انجمن باقی است

﴿یہ گمان نہ کرو کہ جب تم دنیا سے چلے جاؤ گے تو دنیا بھی ختم ہو جائے گی۔ ہزاروں شمعیں بجھتی ہیں اور انجمن باقی رہتی ہے،﴾

---

[۱] تذکرۃ العلماء ص ۴۴، ۴۵ و تجلی نور ج ۲ ص ۴۳ تا ۴۶،

مولانا شمس نور برونوی جونپوری

ملا صاحب کے ایک اور استاذ مولانا شمس نور (شمس نور بن نور الدین) برونوی جونپوری تھے وہ برونہ میں پیدا ہوئے، اور مروجہ تعلیم وتربیت سے آراستہ ہوکر مسند تدریس کو رونق بخشی اور اپنے زمانہ کے مشہور علماء میں شمار کئے گئے، ان کی درس گاہ سے علماء وفضلاء کی ایک بڑی جماعت نکلی جس میں ان کے بھانجے دیوان محمد رشید اور ملا محمود قابل ذکر ہیں، صاحب تجلی نور نے لکھا ہے مولانا دیوان عبدالرشید نے ابتدائی کتابیں ان سے پڑھیں اور ملا محمود نے بھی ان سے درس لیا ہے۔

نزہتہ الخواطر میں ہے:۔

ملا محمود نے ان سے بعض کتابیں پڑھی ہیں، اور ان کے بھانجے دیوان محمد رشید جونپوری نے بھی پڑھا ہے۔[1]

ان کے علم وفضل کی شہرت سن کر اکبر نے شاہزادہ پرویز کی تعلیم انکے سپرد کی، انھوں نے الٰہ آباد جاکر یہ خدمت انجام دی، اکبر نے ان کو جونپور کا قاضی بنایا، بعد میں انھوں نے افتاء اور تدریس کا مشغلہ اختیار کرلیا۔ ایک بہت بڑا مدرسہ اور ایک عظیم الشان خانقاہ تعمیر کی، اکثر فضلائے جونپور نے ان سے استفادہ کیا، ۱۰۴۷ھ میں جونپور میں انتقال فرمایا اور اپنے مدرسہ میں دفن کئے گئے، مدرسہ اور خانقاہ کا کوئی نشان اب باقی نہیں ہے۔ ان کی اولاد میں شاہ محمد طفیل ایک بزرگ تھے۔ ان کے دروازہ کے سامنے ملا شمس نور کا مزار تھا، ان کے تلامذہ میں ملا رکن الدین بہریابادی بھی ہیں۔[2]

---

[1] نزہتہ الخواطر ج ۵ ص ۱۶۵۔ [2] تجلی نور و نزہتہ الخواطر ج ۵ ص ۱۶۸

زمانۂ طالب علمی اور ذکاوت وذہانت

ملا محمود میں بچپن ہی سے خداداد ذہانت وذکاوت تھی، اور گھر ہی میں اپنے نانا اور انکے بڑے بابا سے پوری تعلیم حاصل کی تھی، ان دونوں بزرگوں کی خصوصی توجہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ طالب علمی کے ہی زمانہ میں ملا صاحب کو ایسی شہرت و ناموری حاصل ہوگئی کہ ان کے سامنے بڑے بڑے علماء علمی مسائل میں گفتگو کرنے میں احتیاط برتتے تھے، نزہتہ الخواطر میں ہے:۔

ملا صاحب بچپن میں علمی مجلسوں میں شریک ہوکر علمی مباحث میں گفتگو اور مناظرہ کرتے اور بڑے بڑے اہل علم کو خاموش کر دیتے اور ایسی ایسی علمی باتیں کرتے جن سے علمائے جونپور متحیر رہتے تھے۔[۱]

دیوان محمد رشید عثمانی جونپور (ولادت ۱۰۰۰ھ وفات ۱۰۸۳ھ) اور ملا محمود جونپوری (ولادت ۱۰۱۵ھ وفات ۱۰۶۲ھ) دونوں استاذ الملک محمد افضل کے عزیز ترین تلامذہ میں سے تھے۔ استاذ ان دونوں پر فخر کرتے تھے، اثنائے درس میں کبھی کبھی ان دونوں میں علمی نوک جھونک بھی ہوجاتی تھی۔ خاص طور سے حاشیۂ چلپی کے درس میں ملا محمود اور دیوان محمد رشید کے درمیان مسابقت رہا کرتی تھی۔ تجلی نور میں ان کی طالب علمی کے تذکرہ میں ہے۔

ملا صاحب کی طبیعت اخّاذ، ذہن تیز اور حافظہ قوی تھا، اور اس قدر محنتی تھے کہ تھوڑی مدت میں تمام طالب علموں پر سبقت لے گئے، اور سترہ سال کی عمر میں مروجہ علوم سے فارغ ہوکر اشراقی علماء اور مشائی حکماء کے سرخیل بن گئے۔[۲]

ملا صاحب کے تقریباً تمام سوانح نگاروں نے سترہ سال کی عمر میں تحصیل و تکمیل سے فراغت کی تصریح کی ہے، اس حساب سے ۱۰۳۲ھ میں سلسلۂ تعلیم ختم ہوا اور اسی سال ان کے نانا شیخ شاہ محمد کا وصال ہوا۔ والد کا انتقال زمانۂ طالب علمی میں جب ملّا صاحب صرف بارہ سال کے تھے ۱۰۲۷ھ میں ہوگیا تھا، اس حادثہ کے پانچ سال بعد ملا صاحب فارغ ہوئے، اس وقت سلطان

---

[۱] نزہتہ الخواطر ج ۵ ص ۳۵۸ [۲] تجلی نور ج ۲ ص ۴۹،

جہانگیر کا آخری دورِ سلطنت تھا، ملا صاحب کے دادہال اور نانہال دونوں قدیم زمانہ سے ظاہری علوم کے ساتھ، روحانیت اور مشیخت کا بھی ذوق تھا، ان کے جدِ اعلیٰ سلسلۂ سہروردیہ کی خلافت سے بہرہ ور تھے، خاندان میں سجادہ نشینی کا سلسلہ جاری تھا، ان کے دادا شیخ بڑے مخدوم ابراہیم سے بیعت تھے، اوران کے خسر سید گھورن قاضی محمد آباد مشہور سادات میں سے تھے، اور والد شیخ محمد نے بھی سلوک و معرفت کی راہ اختیار کر لی تھی اور آخر میں گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ پرنانا شیخ المشائخ قطب الآفاق سلطان محمود شیخ مبارک محمدی ماہلی جونپوری متوفی ۹۸۳ھ اور شیخ میر علی عاشقان سرائمیری متوفی ۹۵۰ھ کے مرید وخلیفہ اور نانا شیخ شاہ محمد شیخ العصر والبحر المدقق والعلامۃ المحقق تھے، ملا محمد افضل علوم وفنون میں یگانہ ہونے کے ساتھ روشن ضمیر صوفی اور صاحب دل بزرگ تھے۔ میر علی عاشقان کے پیر و مرشد شیخ عبد القدوس شطاری نظام آبادی متوفی ۱۰۵۳ھ سے بیعت کی نسبت رکھتے تھے، ایسے ماحول اور گھرانے میں ملا صاحب نے پرورش پائی، اور سترہ سال کی عمر جب کہ ان کا عنفوانِ شباب تھا، مروجہ علوم وفنون خاص طور سے حکمت و ادب میں یگانۂ عصر ہوئے، خاندان کے روحانی ماحول سے ان کو روحانی فیض پہونچا، ابتدا میں رسمی طور سے نہ سہی مگر طبعی طور سے روحانیت اور سلوک کا ذوق رکھتے تھے، اور یہی دبی ہوئی چنگاری آگے چلکر حضرت میاں میر لاہوری کے فیض صحبت سے ایسی بھڑکی کہ ملا صاحب کی دنیا ہی بدل گئی، اور انھوں نے ۱۰۵۲ھ میں شیخ نعمت اللہ فیروز پوری سے بیعت کر لی اس کی تفصیل اپنی جگہ آئے گی، بعض اقوال کے مطابق ملا صاحب حافظ قرآن بھی تھے، مگر اس کی تصریح ان کے حالات میں نہ مل سکی،

فراغت کے بعد

ملا صاحب سترہ سال کی عمر میں ۱۰۳۲ھ میں تحصیل علم سے فارغ ہوئے، اس کے چار سال کے بعد ۱۰۳۶ھ میں شاہجہاں کا دور سلطنت شروع ہوا سبحۃ المرجان ص ۵۳، تذکرۂ علمائے ہند ص ۲۲۱، اور نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۳۹۸ میں ہے کہ ملا محمود نے فراغت کے بعد مستقرِ خلافت آگرہ جا کر آصف خاں وزیر سے ملاقات کی، اس کے بعد جونپور واپس آکر درس وتدریس میں

مشغول ہو گئے، سبحۃ المرجان اور نزہۃ الخواطر میں صبح صادق کے حوالہ سے یہ بیان نقل کیا گیا ہے جو ملا صاحب کے ایک شاگرد کی تصنیف ہے، مگر یہ واقعہ فراغت کے فوراً بعد کا نہیں ہے کیوں کہ اس کے چار سال بعد شاہجہاں کا دور سلطنت شروع ہوا، بلکہ یہ جہانگیر کا آخری دور تھا، اس لئے ملا صاحب کا جونپور سے اکبر آباد جانا اور شاہجہاں کے وزیر آصف خاں سے ملنا ۱۰۳۶ھ کے بعد کا واقعہ ہے، ملا صاحب نے یہ مدت جونپور میں درس وتدریس میں گزاری جہاں ان کے استاد ملا محمد افضل اور ان کے ہم سبق دیوان محمد رشید وغیرہ موجود تھے،

شاہجہاں کے دربار میں قدردانی

تجلی نور میں ہے کہ ملا صاحب فراغت کے بعد جونپور ہی میں درس وتدریس میں مشغول ہو گئے، اور چند ہی دنوں میں انکے علم وقابلیت کا شہرہ جونپور کے مدرسہ کی چہار دیواری سے نکل کر دارالخلافہ آگرہ کے ایوان تک پہونچا، اور شاہجہاں نے ملا صاحب کو کمال آرزو اور عقیدت سے دہلی طلب کر کے فضلائے شاہی کے زمرہ میں شامل کیا، اور منصب سہ صدی ذات سے نوازا، اس سفر میں جب ملا صاحب دہلی کے قریب پہونچے تو بادشاہ کے حکم سے وزیر سعد اللہ خاں نے استقبال اور پیشوائی کی خدمت انجام دی اور دربار میں شاہ جہاں نے ملا صاحب کو اپنے پہلو میں جگہ دی، اس وقت سے ملا صاحب کی عزت وشہرت میں چار چاند لگ گئے،[1] ملا صاحب کے شاہ جہانی دربار سے تعلق ہونے کے سلسلے کی اس کڑی کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ انکے ہم خاندان معاصر اور بہنوئی مولانا شاہ ابوالخیر بن شاہ ابوسعید بھیروی متوفی ۱۰۵۹ھ (مدفون بھیرا) اس سے پہلے سے شاہ جہانی دربار سے منسلک ہو چکے تھے، مناقب غوثی میں ہے کہ مولانا حاجی ابوالخیر سلطان شاہ جہاں کی سلطنت کے ابتدائی ایام میں دہلی گئے۔ انکی علمی شہرت وصلاحیت کے پیش نظر امیر الامراء نواب شائستہ خان نے انکی آمد کو غنیمت جانا اور بڑے ادب واحترام سے اپنے یہاں رکھ کر ان سے حدیث، تفسیر اور تصوف کی تعلیم حاصل کی۔ شاہجہاں ان سے ملکر بہت متاثر ہوا اور شائستہ خاں کے

[1] تجلی نور ج ۲ ص ۵۰،

توسط سے خواہش کی کہ وہ کوئی شاہی منصب یا جاگیر قبول کرلیں، ایک مرتبہ مولانا ابوالخیر شاہ جہان کی مصاحبت میں سیالکوٹ گئے اور شاہ میر کی خدمت میں حاضر ہوئے، ۱۰۵۶ھ میں جب حج وزیارت کا ارادہ کیا تو نواب شائستہ خاں نے خدمت کرنا چاہی مگر انہوں نے قبول نہیں کیا۔[۱] اس لئے عجب کیا ہے کہ ملا صاحب کے شاہجہانی دربار سے منسلک ہونے میں مولانا ابوالخیر کی ذات وسیلہ بنی ہو، ورنہ خود ملا صاحب بھی اس درجہ کے تھے کہ ان کے سامنے امراء وسلاطین سرِ عقیدت جھکائیں۔

منصب سہ صدی میں بادشاہ کی طرف سے ملا صاحب کو پندرہ گھوڑے، سات ہاتھی، چار رکاب دار، گیارہ گاڑیاں اور ۱۴۵ روپے سالانہ ملتے تھے [۲]، کچھ جاگیر بھی وجہ معاش کے لئے عطا ہوئی تھی، اس کے بعد ملا صاحب جونپور کے شاہی مدرسہ میں تدریس کی خدمت انجام دینے لگے، تذکرۃ العلماء میں ہے:۔

بادشاہ شاہجہاں نے مدرسہ سلطانی میں تدریس کی خدمت مع اچھی خاصی جاگیر کے ملا صاحب کو پیش کی اور وہ جونپور آکر تدریس وتعلیم میں مشغول ہوگئے،[۳]

اگرچہ ملا صاحب مستقل طور سے جونپور میں رہتے تھے، مگر بوقت ضرورت شاہی دربار میں آنا جانا رہتا تھا۔ خاص خاص مواقع پر ان کی طلبی بھی ہوتی تھی، اور شاہجہاں کے ساتھ امرائے دربار بھی ان سے استفادہ کرتے تھے، تذکرۃ العلماء اور دوسری کتابوں میں ہے:۔

خود سلطان شاہجہاں بھی ان سے علمی مسائل میں اکثر استفادہ کرتا تھا، اور شاہی حکم سے شاہزادہ محمد شجاع نے ملا صاحب کی شاگردی اختیار کی اور امیر الامراء شائستہ خاں نے ان سے پوری الفرائد پڑھی، ایک واقعہ کے سلسلہ میں لکھا ہے،

وزیر سعد اللہ خاں ملا محمود کے تلمیذ تھے، اور انھوں نے بادشاہ سے ان کے علمی کمالات بیان کئے۔[۴]

---

[۱] مناقب غوثی باب ہشتم قلمی [۲] اس منصب کی تفصیل الہند فی العہد الاسلامی سے ماخوذ ہے۔ [۳] تذکرۃ العلماء ص ۴۸، [۴] تذکرۃ العلماء ص ۴۶، ۴۷، ۴۸،

غرض بادشاہ اور شاہزادہ سے لے کر امراء واعیان دولت تک نے ملا صاحب سے استفادہ اوران سے شرف تلمذ حاصل کرنے میں عزت محسوس کی۔ ملا صاحب کی درباری زندگی سے متعلق کچھ واقعات کتابوں میں ملتے ہیں جن سے ان کے مقام ومرتبہ کا پتہ چلتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ شاہ جہاں کے درباری علماء وفضلاء میں ملا صاحب ممتاز حیثیت کے مالک تھے، چند واقعات ملاحظہ ہوں۔

شاہی دربار میں ملا صاحب کے مقابلہ میں ایک ایرانی فاضل کی شکست

صبح صادق کے حوالہ سے تذکرۃ العلماء میں لکھا ہے کہ شاہ ایران کی طرف سے ایک ایلچی اکمج نامی شاہجہاں کے دربار میں آیا وہ مادرزاد اندھا تھا۔ مگر اس کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ نے اس کی چشم باطن کو زبردست بصیرت بخشی تھی۔ عقلی ونقلی علوم وفنون کے اہم وادق مسائل اس کو از بر تھے۔ اس نے ہندوستان کے علماء سے بحث ومناظرہ کی خواہش کی، چنانچہ اکبرآباد وغیرہ کے علماء بلائے گئے مگر مجلس مناظرہ میں اکمج کے مقابلہ میں وہ ٹھہر نہ سکے۔ شاہ جہاں کو اس کے مقابلہ میں اپنے علماء کی بے مائیگی پر بڑا تعجب ہوا، اس نے ارکان دولت سے کہا کہ ہماری قلم رو میں بڑے بڑے علماء و فضلاء موجود ہیں، ان میں کسی ایسے عالم کو بلایا جائے جو اکمج سے مناظرہ کر سکے۔ وزیر سعد اللہ خاں نے جو ملا محمود کے سامنے زانوائے تلمذ تہ کر چکا تھا، اوران کی ذہانت وذکاوت سے اچھی طرح واقف تھا، ناظم جونپور کے نام سے شاہی فرمان لکھا کہ علامہ کی خدمت میں خود حاضر ہو کر شاہی فرمان پیش کر کے کسی طرح ان کو دارالخلافہ آنے پر راضی کرو، چنانچہ ملا صاحب بڑے کروفر کے ساتھ دہلی روانہ ہوئے، جب دہلی کے قریب پہونچے تو وزیر سعد اللہ خاں، آصف خاں، اور

دوسرے ارکان دولت نے بڑھ کر استقبال کیا، اور کمال تعظیم وتوقیر کے ساتھ ان کو شاہی دربار میں پہونچایا، اور شاہجہاں کے حکم سے مجلس مناظرہ منعقد ہوئی جس میں اثبات ہیولیٰ کی بحث چھڑ گئی، انجم نے اثبات ہیولیٰ پر باری باری سے وہ تمام دلائل پیش کئے جو اسے یاد تھے، ملا صاحب نے اس کی ہر دلیل کا ایسا کافی وشافی جواب دیا کہ تمام حاضرین ان کی تعریف وتحسین کرنے لگے۔ آخر میں انجم نے ملا صاحب سے کہا کہ اچھا اگر آپ کے پاس اثبات ہیولیٰ کی کوئی دلیل ہو تو بیان کیجئے، ملا صاحب نے اثبات ہیولیٰ پر اپنا ایک رسالہ **الدوحة الميادة فى حديقة الصورة والمادة** پیش کیا اس کے علاوہ اثبات ہیولیٰ پر چند خاص دلائل بیان کئے ان کو سن کر انجم نے بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کر ملا صاحب کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور اپنی کمر کا خنجر انکی کمر میں باندھ دیا، اور ان الفاظ میں ملا صاحب کے علم وفضل کا بھری مجلس میں اعتراف کیا،

جوانے بایں فہم و فراست ازولایت	اس فہم وفراست کے جوان عالم ایران سے
ایران تا ہندوستان کمتر یافتہ،	لیکر ہندوستان تک بہت کم نظر آئے ہیں۔

شاہجہاں نے ملا صاحب کی کامیابی پر زرو جواہر سے بھرے ہوئے طبق ان کی خدمت میں پیش کئے، کچھ دنوں کے بعد جب انجم ایران واپس جانے لگا تو اس نے درخواست کی کہ ملا صاحب کی تصنیف بھی شاہی تحائف میں شامل کی جائیں اور شاہ ایرن کی خدمت میں یہ قیمتی تحفہ بھی بھیجی جائے۔

ملا صاحب خود بھی بڑے غیور وحساس تھے اور علماء وفضلاء کی غیرت وحمیت سے واقف تھے۔ انھوں نے شاہجہاں سے کہا کہ یہ عالم حد درجہ غیور ہے اور معقولات میں کسی کو اپنا ہم پلہ نہیں سمجھتا، اس مناظرہ میں خفت وشکست سے غالباً زندہ نہ رہ سکے گا۔ ملا صاحب کا یہ اندازہ صحیح نکلا اور انجم دارالخلافہ اکبرآباد سے ایران جاتے ہوئے تیسری منزل پر فوت ہوگیا۔[1]

---

[1] تذکرۃ العلماء ص ۴۵، ۴۶،

رصدگاہ بنانے کی پیش کش

ایک مرتبہ ملا صاحب نے شاہجہاں سے رصدگاہ بنانے کی خواہش ظاہر کی اور اسکے لئے ایک ایسی جگہ تجویز کی جہاں قدیم زمانہ میں کسی بادشاہ نے رصدگاہ بنوائی تھی مگر اس کے لئے کثیر رقم کی ضرورت تھی، اس لئے یہ تجویز بروئے کار نہ آسکی، وفیات الاعلام کے حوالہ سے نزہتہ الخواطر میں لکھا ہے کہ ملا صاحب نے ایک رصدگاہ بنانے کا ارادہ کیا اور اکبرآباد جاکر بادشاہ کو آمادہ کرلیا، مگر وزیر نے اس رائے سے اتفاق نہیں کیا، اور بادشاہ سے کہا کہ اس وقت بلخ کی مہم درپیش ہے جس کے لئے بہت زیادہ روپے کی ضرورت ہے، الغ بیگ کی رصد کے بعد اس کی ضرورت نہیں ہے،[۱]

مآثر الکرام میں بھی اختصار کے ساتھ یہی درج ہے[۲] تجلی نور میں ہے کہ زرِ کثیر کے خرچ کا خیال رصد کی تعمیر میں مانع ہوا، تذکرۃ العلماء میں اس وزیر کا نام سعد اللہ خاں ہے اور یہ لکھا ہے کہ وہ ملا صاحب کی حداثت سن اور علمی تبحرّ سے حسد کرتا تھا، اس لئے اس نے بلخ کی مہم کا بہانہ کر کے بادشاہ کو رصدگاہ بنانے سے روک دیا،[۳] ملا صاحب سے سعد اللہ خاں کا حسد کرنا بظاہر سمجھ میں نہیں آتا کیوں کہ اسی کتاب میں تصریح ہے کہ سعد اللہ خاں وزیر کہ تلمیذ علامہ محمود بود، کوائف فہم وفراست علامہ بیان نمود (ص ۴۶) ایسا شاگرد اپنے استاد سے کس طرح حسد کرسکتا ہے پھر یہ وہی ملا سعد اللہ لاہوری ہے جس نے ملا عبدالحکیم سیالکوٹی سے علم کی تحصیل وتکمیل کی، اور مدرسۂ وزیر خاں لاہور میں درس دیا، ۱۰۵۰ھ میں جب شاہجہاں لاہور گیا اور اس کے علم وفضل کا شہرہ سنا تو خلعت شاہی سے سرفراز کیا۔ پھر اس کے بعد سعد اللہ خاں کا لقب دیکر وزارت کا منصب عطا کیا اور ۱۰۵۶ھ میں اپنا سفیر بنا کر بلخ بھیجا، ایسے عالم وفاضل اور امیر ووزیر کا حسد کرنا بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے۔

---

[۱] نزہتہ الخواطر ج ۵ ص ۳۹۸، [۲] مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۰۲، [۳] تجلی نور ج ۲ ص ۴۸،

حوض میں کتنا پانی ہے؟

ملا صاحب حکمت وفلسفہ کے جملہ اقسام میں مہارت تامہ رکھتے تھے جن میں ریاضی، حساب، اور ہندسہ بھی شامل ہے ایک مرتبہ دہلی میں شمسی حوض سے گزر ہوا تو اس پر ایک نظر ڈال کر ساتھیوں کو بتادیا کہ اس حوض میں اتنی مقدار میں پانی ہے، یہ سن کر لوگوں کو تعجب ہوا اور دل میں سوچا کہ اس کی آزمائش کرنی چاہئے تھوڑے دنوں کے بعد حوض کا کچھ پانی نکال دیا اور کسی بہانے سے ملا صاحب کو وہاں لیجا کر دریافت کیا کہ آج اس میں کتنا پانی ہے؟ ملا صاحب نے حوض پر نظر ڈالی اور فرمایا کہ اتنی مقدار میں اس کا پانی نکال دیا گیا ہے جس سے حاضرین کو سخت تعجب ہوا۔[1]

ملا صاحب کی فنی مہارت کا یہ بہت معمولی مظاہرہ تھا ورنہ ریاضی اور ہندسہ جاننے والے کے لئے یہ معمولی بات ہے، راقم کے ماموں مولانا محمد یحییٰ رسول پوریؒ متوفی ۱۱ رصفر ۱۳۸۷ھ فلکیات اور ریاضیات کے اچھے عالم تھے، وہ ریاضی کی رو سے درختوں اور مکانوں کی بلندی اور کنویں وغیرہ کی گہرائی بتایا کرتے تھے اور بادل کی چمک گرج سے بتادیتے تھے کہ بادل کتنے اوپر ہے، حوض یا تالاب وغیرہ کے حدود اربعہ اور قطر وغیرہ کی پیمائش کر کے اس کے پانی کی مقدار بتائی جاسکتی ہے۔

ملا صاحب کی حضرت میاں میر لاہوری کی خدمت میں حاضری

اگرچہ ملا صاحب کے فضل وکمال میں حکمت وفلسفہ اور ادب وعربیت کا رنگ نمایاں تھا۔ مگر وہ خاندانی دولت روحانیت ومشیخت سے بھی حصۂ وافر رکھتے تھے۔ مادری اور پدری دونوں سلسلوں میں احسان وتصوف سلوک ومعرفت اور زہد وتقویٰ موروثی ملے، ملا صاحب کو ان کے ظاہری علوم نے سجادہ وخانقاہ سے ہٹا کر مدرسہ ودربار میں پہونچادیا تھا، مگر جب ایک صاحب دل

---

[1] تجلی نور ج ۲ ص ۵۰۔

کی نگاہ کیمیا اثر نے کام کیا تو تمام باطنی کیفیات ظہور میں آگئیں، اس کا واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ شاہجہاں لاہور گیا، جلوس میں ملا محمود اور ملا عبد الحکیم سیالکوٹی متوفی ۱۰۶۷ھ بھی تھے، تینوں میاں میر لاہوری کی خدمت میں حاضر ہوئے مگر اقلیم فقر و استغناء کے شہنشاہ نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کی اقلیم دنیا کے شہنشاہ کو اس سے بہت رنج ہوا اور اقلیم علم کے دونوں شہنشاہوں نے عالمانہ شان میں میاں میر سے کہا، ''توجہ بہ علماء نہ کردن چہ معنی دارد''؟ میر صاحب نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا اور اندر سے اپنا کمبل لاکر بچھایا اس پر خوب مؤدب ہوکر بیٹھے اور ان دونوں فاضلوں کو بیٹھا کر فرمایا، '' میں جاہل ہوں، ماشاء اللہ آپ حضرات عالم ہیں اس شعر کا مطلب مجھے سمجھا دیں۔

مبادا دل آن فرد مایہ شاد　　　　کہ از بہر دنیا دہد دیں بباد

یہ شعر سنتے ہی ملا عبد الحکیم پر گریہ کی کیفیت طاری ہوگئی اور ملا محمود اتنے متاثر ہوئے کہ اسی وقت درباری زندگی ترک کر کے جونپور آگئے، اور باقی زندگی تدریس و تصنیف میں بسر کی۔ لیکن ان کے ساتھ شاہی نوازش بدستور جاری رہی [1]۔

احسان و تصوف

جن دنوں ملا صاحب درباری علائق سے قطع تعلق کر کے سکون و اطمینان سے جونپور میں علمی زندگی گزار رہے تھے اور حضرت میاں میر کی تنبیہ نے ان میں یکسوئی پیدا کر دی تھی، بادشاہ کے حکم سے ملا صاحب کو شاہزادہ محمد شجاع کی تعلیم کیلئے بنگال جانا پڑا۔ یہ اللہ کی شان ہے کہ اس بار بھی دنیا کی راہ سے ملا صاحب کو زہد و تقویٰ کی دولت ملی اور وفات سے دس سال پہلے ۱۰۵۲ھ میں سرزمین بنگال میں شیخ نعمت اللہ بن عطاء اللہ فیروز پوری متوفی ۱۰۷۲ھ سے سلوک و طریقت کی تعلیم و تربیت حاصل کی۔ اس کے بعد ملا صاحب اپنے دونوں خانوادوں کے اصلی رنگ میں نمایاں ہوگئے اور تدریس و تصنیف کے ساتھ ذکر و شغل اور اورادو وظائف اور عبادت و ریاضت میں بھی مشغول رہنے لگے۔ مآثر الکرام میں صرف شہزادہ شجاع کی شاگردی کا ذکر اس طرح ہے،

[1] تجلی نور ج ۲ ص ۵۰، ۵۱۔

شاہ شجاع بن صاحب قرآن شاہجہاں نزد علامہ تلمذ کرد[1]	شاہ شجاع بن شاہ جہاں نے علامہ محمود کی شاگردی کی۔

تذکرۃ العلما میں بھی اتنا ہی ہے۔

حسب الحکم سلطان شاہ جہاں محمد شجاع نزد علامہ تلمذ نمود[2]	سلطان شاہ جہاں کے حکم سے محمد شجاع نے علامہ سے تلمذ کیا،

مگر نزہتہ الخواطر میں وفیات الاعلام کے حوالہ سے محمد شجاع کے تلمذ کے ساتھ ملا صاحب کی بیعت وارادت کی تفصیل بھی یوں درج ہے،

شاہزادہ شجاع بن شاہ جہاں نے ملا محمود کو بنگال بلایا، وہ وہاں گئے اور شجاع نے ان سے حکمت وفلسفہ کی کتابیں پڑھیں۔ بنگال میں ملا صاحب شیخ نعمت اللہ بن شیخ عطاء اللہ فیروز پوری سے ملے اور ان سے بیعت کر کے ۱۰۵۲ھ میں طریقت حاصل کی، اور میں نے (مصنف وفیات الاعلام) ملا صاحب کا ایک رسالہ دیکھا ہے۔ جس میں وہ اذکار واوراد درج ہیں جو انھوں نے شیخ نعمت اللہ سے حاصل کئے تھے[3]۔

شیخ خوب اللہ محمد یحییٰ الہ آبادی نے یہ رسالہ وفیات الاعلام میں نقل کر دیا ہے۔ شیخ نعمت اللہ فیروز پوری ملا محمد افضل کے تلامذہ میں سلسلۂ قادریہ کے مشائخ میں سے تھے، شاہزادہ محمد شجاع جس زمانہ میں اپنے والد کی طرف سے بنگال کا حاکم تھا شیخ نعمت اللہ سے بیعت ہوا، اس کے بعد ان کو عوام وخواص میں بڑا قبول ہوا، وہ نارنول میں پیدا ہوئے طلب علم میں مختلف شہروں کا چکر لگایا، فراغت کے بعد متاہل ہو کر فیروز پور میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ سیف خاں کی طرف سے فیروز پور میں انکو جاگیر عطا ہوئی، وہ قادریہ وچشتیہ ونقشبندیہ سلسلوں کے جامع تھے، انھوں نے جہانگیری عہد میں ۱۰۷۰ھ میں تفسیر جہانگیری اور ترجمۂ قرآن لکھا۔ ۱۰۷۲ھ میں فوت ہوئے[4]۔

ملا صاحب کی زندگی میں روحانی واحسانی انقلاب ان کی وفات سے دس سال پہلے رونما ہوا۔ اس کے بعد ان کی حکمت ودانش نے فراستِ مومن کا رنگ اختیار کر لیا، اور تدریس وتصنیف کے ساتھ

---

[1] مآثر الکرام ج ا ص ۲۰۳ [2] تذکرۃ العلماء ص ۴۷ [3] نزہتہ الخواطر ج ۵ ص ۲۹۸ [4] ایضاً ص ۴۲۳ و ۴۲۴

اوراد و وظائف کا سلسلہ آخری عمر تک جاری رہا۔ اب ان کی نظر میں اپنے علم وفن کی متاع ہیچ معلوم ہونے لگی اور وہ اپنے تلامذہ میں ''عالم باعمل اور مرد زاہد۔'' پر اطمینان ومسرت کا اظہار کرنے لگے، چنانچہ ملا صاحب کے شاگرد رشید ملا محمد صادق بن ملا شمس نور جونپوری متوفی ۱۰۶۴ھ نے جو بہت عابد و زاہد اور بڑے پایہ کے بزرگ تھے ایک مرتبہ اپنے یہاں استاد کی موجودگی میں خود نماز کی امامت کی، حالانکہ عام طور سے وہ امامت نہیں کرتے تھے، اور اسکی توجیہہ میں کہا، میرے نزدیک فلاسفہ وحکماء کے کلام میں ایمان مشتبہ ہے اس لئے میں نے اپنی نماز ضائع نہیں کی،

ملا صاحب اپنے عزیز شاگرد کی یہ بات سن کر بے انتہا خوش ہوئے اور فرمایا۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں نے اپنے شاگردوں میں ایک کو عالم باعمل اور عابد وزاہد پایا،[۱]

ملا صاحب کے مرشد شیخ نعمت اللہ فیروز پوری نے ان کو جواز کار و اوراد تلقین کئے تھے، ان کو انھوں نے ایک رسالہ کی شکل میں جمع کرایا ہے جو دفیات الاعلام میں ہے۔ ویسے ملا صاحب کی علمی زندگی میں روحانی انقلاب اسی وقت سے شروع ہو گیا تھا، جب حضرت میاں میر نے ایک شعر کے ذریعہ ان کی عنان عقل کو میدانِ قلب کی طرف موڑا تھا، اس واقعہ کے بعد سے ان کا رنگ ہی کچھ اور ہو گیا تھا۔ تجلی نور میں ہے۔

یہ شعر سن کر ملا محمود اپنے سے بے خبر ہو گئے کہ اسی وقت نوکری چھوڑ کر جونپور آئے اور آخر تک درس وتدریس میں مشغول رہے،[۲]

اس درمیان میں شاہزادہ محمد شجاع کی تعلیم کے لئے بنگال کا سفر کیا، اور شاہجہاں کے ساتھ سفرِ لاہور میں جس منزل کی طرف راہنمائی کی گئی تھی، سفر بنگال میں اس منزل پر پہونچ گئے۔ اس کے بعد ملا صاحب جونپور سے نہیں نکلے، غالباً ملا محمد صادق نے شمس بازغہ میں حدوث دہری کی بحث دیکھی ہوگی جس میں ملا صاحب نے اپنے پیش رو فلاسفہ سے اختلاف کیا ہے، مگر بیعت وارادت کے بعد عقل کی پُر خار وادی سے نکل کر قلب کے میدان میں آگئے تھے۔

---

[۱] تجلی نور ج ۲ ص ۸۸، [۲] ایضاً ص ۵۱،

پختہ کلامی

ملا صاحب کے تقریباً سب ہی سوانح نگار اس پر متفق ہیں کہ زندگی بھر ان کی زبان سے کوئی ایسی بات نہیں نکلی جس سے بعد میں رجوع کرنا پڑا ہو۔ ہر بات علم وتحقیق کی روشنی میں ناپ تول کر منھ سے نکالتے تھے، اس سلسلہ میں ان کا اصول تھا، کہ اگر کوئی آدمی کسی قسم کا سوال کرتا اور اس وقت طبیعت حاضر ہوتی تھی تو جواب دیتے تھے ورنہ صاف کہہ دیتے تھے کہ اس وقت دماغ جواب کے لئے تیار نہیں ہے اس معاملہ میں علمیت وقابلیت کی شان رکھتے تھے۔[۱]

علمی چشمک

ملا محمود فاروقی اور دیوان محمد رشید عثمانی استاذ الملک ملا محمد افضل کی دو آنکھیں تھے، وہ فرمایا کرتے تھے کہ میرے دونوں شاگرد علم وکمال میں تفتازانی اور جرجانی کے درجہ کے ہیں، یہ دونوں طالب علم ملا محمد افضل کی درسگاہ کے آفتاب و ماہتاب تھے، اور اثنائے درس میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ ذہین وطبّاع طالب علموں کی معاصرانہ چشمک ایک دوسرے کے لئے علمی مہمیز کا کام دیتی ہے، اور اس سے بڑے علمی فوائد حاصل ہوتے ہیں بشرطیکہ یہ معاصرت ومسابقت صرف علم وفن تک محدود ہو۔ ملا محمود اور دیوان محمد رشید میں اسی قسم کی معاصرت شروع سے تھی، اس سلسلہ میں ایک واقعہ کتابوں میں ملتا ہے کہ ایک دن ملا محمود اور دیوان محمد رشید دونوں اپنے استاد ملا محمد افضل کے مکان پر موجود تھے، ملا محمد افضل اندر سے نکلے تو ان کے ہاتھ میں فنِ مناظرہ کی مشہور کتاب ''شریفیہ'' کے دو نسخے تھے، انھوں نے ان دونوں کو ایک ایک نسخہ دیا اور کہا کہ بہت خوب متن ہے، دیوان محمد رشید نے شریفیہ کی تعریف اور متن کہنے سے سمجھا کہ استاد اس کی شرح لکھنے کا اشارہ کررہے ہیں، چنانچہ وہ ایک ہفتہ کے بعد شریفیہ کی شرح رشیدیہ لکھ کر استاد کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اسے دیکھ کر وہ بہت زیادہ خوش ہوئے، ملا محمود کو اس کی خبر ہوئی تو ان کے

---

[۱] سبحۃ المرجان ص ۵۳، مآثر الکرام ج ۲ ص ۲۰۲، تذکرۃ العلماء ص ۴۵، نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۳۹۸۔

جذبۂ معاصرت کو ٹھیس لگی۔انھوں نے اپنے شاگرد ملا محمد باقی بن مفتی ابو البقاء متوفی ۱۰۸۶ھ سے شریفیہ کی دوسری شرح لکھنے کی فرمائش کی اور شرح رشیدیہ کے رد کا بھی اشارہ کیا۔ملا محمد باقی بڑے عالم وفاضل تھے ،انھوں نے قلیل مدت میں شریفیہ کی دو شرحیں لکھ دیں ،ایک الآداب الباقیہ فی شرح الشریفیہ اس میں متن شریفیہ کی خالص شرح تھی اور دوسری الابحاث البقیہ فی شرح الرشیدیہ، اس میں دیوان محمد رشید کی شرح پر اعتراضات تھے،ملا محمد باقی نے الآداب الباقیہ کے دیباچہ میں اپنے استاذ ملا محمود کی دل کھول کر تعریف کی ہے۔بعد میں دیوان محمد رشید کے ایک شاگرد نے ردّ الباقیہ کے نام سے ایک کتاب لکھی ،جس میں ملا محمد باقی کے اعتراضات کے جوابات دئے ہیں،[۱] اسکا قلمی نسخہ خانقاہِ رشیدیہ جونپور میں موجود ہے۔شیخ نور الدین جعفر بن عزیز اللہ جونپوری متوفی ۱۰۹۳ھ نے ملا محمد باقی کی کتاب الابحاث البقیہ کے رد میں ایک کتاب ''نور الانوار'' کے نام سے لکھی جس میں اپنے استاذ دیوان محمد رشید کی طرف سے دفاع کیا ہے۔وہ سلسلۂ مداریہ کے مشائخ میں سے تھے،ان کے تلامذہ میں شیخ محمد افضل الہ آبادی ،اور شیخ محمد ماہ دیوگانی مشہور ہیں،[۲] ان دونوں کے استاذ بھائیوں کی علمی نوک جھونک سے جونپور کے علماء فنِ مناظرہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ ملا محمد صادق نے بھی الآداب الصادقیہ کے نام سے فنِ مناظرہ میں ایک کتاب لکھی۔

مکارمِ اخلاق اور جاہ وثروت

ملا محمود دیارِ پورب کے ان چند اعاظم رجال میں سے تھے جن کو شاہجہاں اور ان کے امراء ووزراء کی خصوصی توجہات حاصل تھیں ،شاہجہاں شاہزادہ محمد شجاع،آصف خاں شائستہ خاں اور سعد اللہ خاں وغیرہ ان کے عقیدت مندوں میں سے تھے، مستقل جاگیروں اور وقتی نوازشوں کے علاوہ ملا صاحب کو بادشاہ کی طرف سے منصب سہ صدی ذات حاصل تھا،اور وہ نہایت فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے تھے ،مگر درس وتدریس کا سلسلہ برابر جاری رہا ،جونپور کے مدرسہ شاہی میں درس دیتے تھے،اور امیرانہ انداز سے زندگی گزارتے تھے۔حکمت وفلسفہ میں طوسی ودوّانی کے

---

[۱] تذکرۃ العلماء ص ۴۹، ۵۰۔ [۲] نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۱۱۰، ۱۱۱۔

حریف اور ادب و بلاغت میں جرجانی اور تفتازانی کے مدمقابل تھے، اس علمی مرتبہ اور دنیاوی وجاہت کے ساتھ اعلیٰ اخلاقی فضائل سے بھی آراستہ تھے۔ نخوت کا دل میں نام و نشان نہ تھا۔ مولانا ابوالخیر نے شیر و شکر میں ان کو مکارم اخلاق کا آفتاب بتایا ہے، اور لکھا ہے ''یگانۂ انفس و آفاق و آفتابِ مکارم اخلاق است''۔

ملا صاحب کی کتاب الفرائد کے مقدمہ سے کچھ عبارتیں ہم نقل کرتے ہیں۔ جن سے اندازہ ہوگا کہ ملا صاحب کے دل میں اپنے محسن شاہجہاں کے لئے امتنان و تشکر کا کتنا جذبہ تھا، اور اپنے اساتذہ خاص طور سے ملا محمد افضل کی کتنی عظمت تھی، اور اپنے تلامذہ کی خیر خواہی و نفع رسانی کے کس قدر حریص تھے۔ الفرائد کے شروع میں شاہجہاں کی تعریف و توصیف کے بعد لکھا ہے۔

وما هوالا الملك القرم الهمام البحر الخضم القمقام مجدد الملة على رأس الالف ،محدّد المعدلة من غير فتر ولا سرف .... السلطان بن السلطان الخاقان بن الخاقان المنصور على العتاة،المظفرعلى الطغاة فى المعارك والمغازى ابوالمظفر شهاب الدين محمدصاحب القران الثانى،شاهجهان بادشاه الغازى لازوال نظام العالم منوطاًبحقرى سلطنةوصلاح بنى آدم مضبوطاًبيدى دولته ما قام تيسر وسمر ابنا سميرانان نفقت بحضرته بضاعتي فيالها من سعادة وقد ما قبلت من النحلة رجل جراوة والله سبحانه اسئال ان يصلح فاسدى وينيفق كاسدى ويكنفنى برحمته ويبوئنى فى جنته ويجزى عنى افضل جزاءٍ اساتذتى الافضل منهم فالافضل وينفع بكتابى تلامذتي الامثل منهم فالا مثل ،انه علىٰ كل شيئٍ قدير،وباجا به دعاء السائلين جدير، [1]

ملا صاحب نے الفرائد جوانی میں لکھی تھی، اس زمانہ میں ان کے حسنِ اخلاق خلوص نیت اور صفائی باطن کا یہ حال تھا تو آگے چل کر ان کا کیا مقام رہا ہوگا؟

---

[1] الفرائد فی شرح الفوائد ص ۶، ۷،

زندہ دلی اور شاعری

ملا محمود بھی حکماء و فلاسفہ کی طرح نازک خیال اور زندہ دل آدمی تھے، حکمت و فلسفہ اور شعر وادب کا اجتماع بہت کم ہوتا ہے، مگر ملا صاحب حکیم و فلسفی کے ساتھ شاعر اور ادیب بھی تھے۔ انکی زندہ دلی کا ثبوت ان کا ایک چو ورقہ رسالہ ''نایکا بھید'' فارسی زبان میں ہے اس میں بقول آزاد بلگرامی عورتوں کی قسمیں بیان کی ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ اہل ہند نے ناز و انداز عمر و مراتب الفت ومحبت کے اعتبار سے معشوق کی مختلف قسمیں کی ہیں اور ان کا الگ الگ نام رکھا ہے اور اس کے مطابق اشعار کہے ہیں اور اسطرح معشوقہ کے ہر دور اور ہر حال کا سراپا بیان کیا ہے، چوں کہ یہ رسالہ فارسی زبان میں ہے اس لئے اس میں ہندی اشعار مثال میں نہیں آسکے۔[1] اور ان کی شاعری کے متعلق تجلی نور میں ہے۔

ملا محمود طبع سخنوری ہم نیکوداشت، شاعر ادا بند، وموجد انداز ہائے دل پسند بود، محمود تخلص کرد، دو دیوان فارسی دارد، یکے دیوان شعراء۔ دومیں مستند شعراء۔	ملا محمود شاعرانہ طبیعت رکھتے تھے، وہ نہایت اچھے شاعر اور دل پسند طریقوں کے موجد تھے، کامیاب شاعر تھے، تخلص محمود تھا، ان کے فارسی اشعار کے دو دیوان تھے، ایک دیوان شعراء اور دوسرا مستند شعراء۔

ہمارا خیال ہے کہ ملا صاحب کے یہ دونوں دیوان صرف ان کے اشعار پر مشتمل نہیں تھے، بلکہ ان کے ناموں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک میں مختلف شعراء کے منتخب اشعار تھے جن میں ملا صاحب نے اپنے اشعار بھی درج کیے تھے اور دوسرے میں مستند شعراء کے حالات واشعار تھے، ان کے چند اشعار یہ ہیں:۔

ہر آں مے کہ ندارد خمار درلب تست ۔۔۔ چرا در چشم تو پیوستہ در خمار بود

اشکے کہ راز عشق بگو ید فشاندنی ست ۔۔۔ طفلے کہ خوش محاورہ افتد نماندنی ست

---

[1] مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۰۳ وسبحۃ المرجان ص ۵۴۔

خط کرد ظاہر آن دہن غنچہ رنگ را ۔۔۔ درکار بودہ حاشیہ این متن تنگ را

بر صوفی بے وجد وبال است عبادت ۔۔۔ بر شیشہ کہ خالی ست زمے سجدہ حرام است

ریخت کافر بچۂ خونِ مسلماں را ۔۔۔ یاد آں روز کہ من نیز مسلماں بودم

سبب چاک گریبانِ منِ خستہ مپرس ۔۔۔ کہ شب غم با جل دست وگریباں بودم[1]

علمی کمالات اور جامعیت

ملا محمود کے علمی وفنی تبحر کے بارے میں ان کے تذکرہ نویسوں اور دوسرے اہل علم وفن کے اقوال وتاثرات پہلے بیان ہو چکے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ملا صاحب جملہ علوم عقلیہ و نقلیہ میں عبقریت وامامت کا درجہ رکھتے تھے۔ اور عرب وعجم میں کوئی شخص علوم وفنون کی جامعیت خاص طور سے حکمت وادب میں انکا ہمسر نہ تھا، وہ ان دونوں علوم میں بیک وقت میر سید شریف جرجانی وشیخ عبدالقاہر جرجانی، رازی ودوّانی اور سکّا کی وتفتازانی تھے اور کہنے والوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ ہندوستان میں اسلام کی آمد کے بعد سے فلسفہ اور حکمت میں ملا محمود جیسا کوئی عالم پیدا ہی نہیں ہوا۔ ملا صاحب کے علمی کمالات کا اندازہ کرنے کے لئے اگر حکمت وفلسفہ کے ساتھ ادب وبلاغت کا ذوق بھی ہو تو ان کی دونوں کتابوں یعنی شمس بازغہ اور فرائد کا مطالعہ کرنا چاہیے انکے اقران ومعاصرین میں سے کسی کو ان کی کسی کتاب پر اور اسکی عبارت پر انگلی اٹھانے کی جرأت نہ ہوئی، البتہ بعض اہلِ علم نے شمس بازغہ کے مقدمہ کی اس عبارت پر۔

سوّدتُ کثیرًا من مباحث ما قبل الطبیعہ وبقی اکثر، واملیت من مطالب ما بعد الطبیعہ الاقل الاندر	میں نے ماقبل الطبیعات کے بہت سے مباحث کا مسودہ تیار کرلیا، مگر اس کا اکثر حصہ رہ گیا تھا اور مابعد الطبیعات کے چند مسائل کا املاء کرایا تھا،

یہ اعتراض کیا ہے کہ ملا صاحب نے ماقبل الطبیعات کے مباحث کو فن طبیعات میں شمار کیا

---

[1] تجلی نور ج ۲ ص ۴۹،

ہے، حالانکہ ماقبل الطبیعات اور مابعد الطبیعات کے مسائل فن الہیات کے ساتھ مخصوص ہیں۔ مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی نے شرح موافقت کے حواشی میں اس اعتراض کا جواب دیا ہے۔ جس کا خلاصہ ان ہی کے الفاظ میں یہ ہے کہ ملا صاحب کا ماقبل الطبیعہ کو طبیعات میں شمار کرنا فلسفہ اور حکماء کے عرف واصطلاح کی رو سے نہیں ہے بلکہ درحقیقت طبیعات کے مباحث فن الہیات ہی سے متعلق ہیں مگر مرتبہ کے لحاظ سے طبیعات کی بحث الہیات کی بحث سے پہلے ہے اس اعتبار سے ماقبل الطبیعات کی بحث فن طبیعات سے متعلق ہے۔[1]

ملا صاحب کا دوسرا شاہکار الفرائد اور اس کا حاشیہ ہے جس سے ادب اور فصاحت وبلاغت میں تبحر کا اندازہ ہوتا ہے۔ مولانا غلام علی آزاد کی شہادت ہے۔

ملا صاحب نے اپنی شرح الفرائد پر خود حاشیہ لکھا جس میں پورا حسن و جمال بھر دیا ہے۔ حاشیہ جلیل القدر شرح ہے جس سے علم فصاحت و بلاغت میں ان کے تبحر کا پتہ چلتا ہے۔ میں نے متعدد بار اس کا مطالعہ کیا ہے اور اسے ادب کے چمن پر برستا ہوا بادل پایا ہے۔[2]

مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی لکھتے ہیں:۔

ملا صاحب نے فرائد پر حاشیہ لکھا ہے جس کا حجم فرائد سے زیادہ ہے اس میں انھوں نے ایسی عجیب وغریب باتیں بیان کی ہیں جن سے ذہنوں کو نشاط اور کانوں کو فرحت حاصل ہوتی ہے۔[3]

امراض کا ہجوم

ملا محمود کی پوری زندگی عیش وتنعم میں گزری تھی، ان کے پدری و مادری خانوادے پشتہا پشت سے شاہی نوازشوں سے بہرہ ور تھے، وہ اگرچہ بارہ سال کی عمر میں شفقت پدری سے محروم ہوگئے تھے مگر نانا کی شفقت ومحبت میں نہایت آرام سے یتیمی کے دن گزارے، سترہ سال کی عمر میں فراغت کے چند ہی سال بعد شاہجہاں اور امرائے دولت کی قدر دانی نے انکو دربار شاہی میں پہونچا دیا، مستقل منصب، وظیفہ اور جاگیر کے علاوہ مختلف تقریبات میں انعامات ملتے تھے جس سے

---

۱ ترجمہ ملا محمود در آخر شمس بازغہ، ۲ سبحۃ المرجان ص ۵۳، ۳ ترجمہ ملا محمود در آخر شمس بازغہ۔

ان کی زندگی بڑی فراغت سے بسر ہوتی تھی، مگر آخر میں ان کو امراض واسقام کے ہجوم نے گھیر لیا جس سے ان کے تعلیمی و تصنیفی مشاغل میں خلل پیدا ہونے لگا، خاص طور سے شمس بازغہ کی تصنیف کے زمانہ میں شدید مرض میں مبتلا تھے جس کی وجہ سے کتاب کے بعض مباحث پر بعد میں مستقل کتاب لکھنی پڑی، شمس بازغہ کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ میں نے ایک عمدہ متن اور اس کی نفیس شرح لکھنی شروع کی متن کا نام الحکمۃ البالغہ اور شرح کا نام الشمس البازغہ رکھا، مگر میں تالیف وتصنیف میں چیونٹی کی چال چلتا تھا اور زمانہ میری موت کو قریب کرنے کے لئے دوڑ رہا تھا، اسی درمیان میں ماقبل الطبیعہ کے بہت سے مباحث کا مسودہ تیار کرلیا، پھر بھی اکثر و بیشتر مباحث رہ گئے اور مابعد الطبیعہ کے کچھ مسائل لکھے لکھائے کہ اچانک خطرناک مرض کا حملہ ہوگیا جس نے کوچ کا طبل بجا دیا اس وقت ماقبل الطبیعہ کی بحث کا جو مسودہ تیار کیا تھا میرے مقررہ معیار کے تقریباً مطابق تھا اور مابعد الطبیعہ کے جو مباحث لکھے تھے وہ بھی اس کتاب کے معیار کے قریب تھے، چنانچہ میں نے ان ہی پر ابواب قائم کئے، البتہ مابعد الطبیعہ کے کچھ مسائل ایک دوسرے سے متعلق تھے اور ان کے نظم و ترتیب کے لئے وسعت درکار تھی، اس لئے جو مباحث مبادی و اجسام سے تعلق رکھتے ہیں ان کو میں نے ایک علیحدہ رسالہ میں بیان کیا ہے جس کا نام ''الدّوحۃ المیادۃ فی حدیقۃ الصورۃ والمادۃ ہے۔[۱]'' اس بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ شمس بازغہ جیسی عظیم کتاب کی تصنیف کے وقت ملا صاحب کا حال یہ تھا کہ کنت ادبّ فی التالیف دبیباً وان الدھر فی تقریب حمامی اد قالاً وتقریباً اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ ھجم المرض الوبیل وضرب علیٰ طبل الرحیل معلوم نہیں مرض کا یہ ہجوم وقتی تھا یا مزمن ثابت ہوا، البتہ ملا صاحب کے بیان سے اس کی شدت کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔

وفات ۱۰۶۲ھ

ملا محمود کی وفات جونپور میں ۹؍ربیع الاول ۱۰۶۲ھ میں ہوئی مآثر الکرام میں ہے رحلت

---

[۱] شمس بازغہ ص۲

ملا محمود نہم ربیع الاول سنتہ اثنتین وستین والف (۱۰۶۲ھ) اتفاق افتاد (ج ا ص ۲۰۳) اور سبحۃ المرجان (ص ۵۳) تجلی نور (جلد ۲ صفحہ ۵۱) اور تذکرۃ علمائے ہند (صفحہ ۲۲۱) میں بھی یہی درج ہے، البتہ تذکرۃ العلماء صفحہ ۴۸ میں صرف ۱۰۶۲ھ ہے تاریخ و ماہ درج نہیں ہے یہ بھی لکھا ہے کہ عین شباب میں وفات ہوئی جو خلاف واقعہ ہے، نزہۃ الخواطر جلد ۵ صفحہ ۳۹۹ میں بھی ۹ ربیع الاول ۱۰۶۲ھ ہے۔ ان تصریحات کے علی الرغم ہمارے استاذ الاستاذ مولانا محمد شریف مصطفےٰ آبادی نے الافاضۃ القدسیہ فی المباحث الحکمیہ کے مقدمہ ص ۱۶ میں ملا صاحب کی وفات ۱۰۳۲ھ میں درج کی ہے جو سراسر خلافِ واقعہ ہے، ملا صاحب کی ولادت رمضان ۱۰۱۵ھ میں اور وفات ربیع الاول ۱۰۶۲ھ میں ہوئی، اس حساب سے ان کی عمر وفات کے وقت ۴۷ سال کی تھی، اس لئے نہ عین شباب تھا اور نہ شباب ہی تھا۔ اور اگر تجلی نور اور نزہۃ الخواطر کی روایت کے مطابق ان کی ولادت ۹۹۳ھ میں مان لی جائے تو مدت عمر ۶۹ سال ہوگی مگر پہلا تخمینہ صحیح ہے۔

ملا صاحب کی وفات علم وفن کی وفات تھی اس لئے ارباب علم وفن میں آپ کا بڑا ماتم ہوا، اور ان کے استاد ملا افضل کو اپنے شاگرد رشید کی وفات پر اس قدر رنج وغم ہوا کہ چالیس دن تک ان کے لب پر مسکراہٹ نہ آسکی اور اس غم میں وہ بھی انتقال فرما گئے، کہنے والے نے استاد و شاگرد کی موت پر یہ تاریخ وفات کہی

"زمحمود و افضل بگو آہ آہ"[1]

۱۰۶۲ھ

تجلی نور کے مصنف سید نورالدین زیدی ظفر آبادی نے ملا صاحب کی وفات پر یہ تاریخی اشعار لکھے ہیں،

دریغا ز دنیائے ناپائدار	سفر کرد محمود عالی تبار
تہی شد زمانہ ز علم و ہنر	بجز جاے نیست کے غمگسار
زمیں گرد شد، آسماں نیلگوں	سیہ گشت گیتی جہاں سوگوار

[1] مآثر الکرام ج ا ص ۲۰۳، تذکرۃ العلما ص ۴۸، تذکرہ علمائے ہند ص ۲۲۱،

رگ ابر را اشکباری ہنوز — دمِ برق در ما تمش بیقرار
بس اے زیدیؔ دل حزیں بس خموش — بقا ذات باری جہاں بے مدار
یکے آمدو دیگرے می رود — ہمینست نہجا رِ لیل و نہار
تر اشید روئے بقا بہر سال — بیفزود، دورا بدو چار چار

ملا صاحب اپنے مولد ومنشا اور مدفن جونپور کے محلّہ چاچک پور میں دفن کئے گئے ،جہاں ان کا پختہ مزار موجود ہے،اوران کی اولاد بھی وہاں آباد ہے۔[1]

ملا محمد دائم بن ملا محمود

ملامحمود صاحب کی ایک صلبی اولاد کے علاوہ کسی کا تذکرہ ابتک نظر سے نہیں گزرا۔

ملا محمد دائم قادری جونپوری کے بارے میں صاحب تجلی نور نے تصریح کی ہے کہ ازاولاد ملا محمود جونپوری است اور لکھا ہے کہ انھوں نے علومِ متداولہ وفنون رسمیہ کی تحصیل اپنے دیار کے علماء سے کی تھی ، اور اپنی ذہنی استعداد اور فکری قوت کی وجہ سے تھوڑی مدت میں علم وفضل میں کمال پیدا کرکے عقلی ونقلی علوم میں شہرت کے مالک ہوئے ، ابتدا میں درس وتدریس کا مشغلہ رکھتے تھے مگر آخر میں علائق دنیا سے الگ ہوکر گوشہ نشین ہوگئے تھے، رات دن میں ایک گھنٹہ سے زیادہ نہیں سوتے تھے، صائم الدہر اور قائم اللیل تھے صرف ظہر کی نماز کے لئے حجرہ سے باہر آتے تھے ،نماز کے بعد تھوڑی دیر لوگوں سے ملاقات کرتے تھے، سلسلہ قادریہ کے مشائخ اور دوسرے سلاسل کے درویشوں کی نسبت کے آثار وبرکات ان پر نمایاں تھے، جونپور میں وفات پائی ،تاریخ وفات اور مدفن کی تحقیق نہیں ہوسکی [2]۔

ملا صاحب کی اولاد میں بعد میں اور بھی علماء وفضلاء پیدا ہوئے۔

[1] تجلی نور ص ۵۱ [2] ایضاً ج ۲ ص ۵۲۔

تلامذہ

ملا محمود نے ۱۰۳۲ھ سے ۱۰۶۲ھ تک کی زندگی تعلیم و تدریس اور تصنیف و تالیف میں بسر کی، اس تیس سالہ درس میں صدہا تلامذہ ان کی درسگاہ سے فارغ ہوئے، انکی علمی شہرت سن کر دور دور سے طالبان علم ان کی خدمت میں آئے اور ان کے خزانہ علم سے اپنا اپنا حصہ لے کر واپس ہو گئے ان کے شاگردوں میں بادشاہ شاہجہاں، شاہزادہ محمد شجاع اور وزراء و امراء میں آصف خاں شائستہ خاں، سعد اللہ خاں جیسے ارباب جاہ وچشم بھی شامل ہیں، ان کے علاوہ ایک بڑی تعداد ان سے فیضیاب ہوئی، ان میں چند مشہور تلامذہ یہ ہیں:۔

ملا محمد باقی جونپوریؒ

ملا محمد باقی بن مفتی ابوالبقا بن ملا محمد درویش جونپوری ابتدائی دور میں زہد و تصوف کی طرف مائل تھے، مگر بعد میں ملا محمود کی خدمت میں آکر تحصیل علم کی اور سرتاج علمائے عظام اور سرتاج حکمائے اسلام بن گئے، ملا صاحب نے ان کی ذکاوت و ذہانت کی بنا پر خصوصی توجہ فرمائی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملا صاحب نے ان کو تھوڑے زمانہ میں ابتداء سے انتہا تک یوں تعلیم دیدی کہ وہ انکے مخصوص و ممتاز تلامذہ میں شمار کئے گئے،

ملا محمد باقی تمام علوم عقلیہ و نقلیہ کے جامع تھے، مگر ریاضی اور حکمت میں امتیازی مقام رکھتے تھے، انکی گفتگو اور خطابت میں بڑا زور تھا، اپنی شیریں بیانی اور طلاقت لسانی سے سامعین کو ہمہ تن گوش بنا دیتے تھے، ان کے کمالات کی وجہ سے ان کا لقب "فاضل جونپوری" پڑ گیا تھا، اور انھوں نے اپنے استاد کے اشارہ پر الآداب الباقیہ اور الابحاث البقیہ دو کتابیں دیوان محمد رشید کی شرح شریفیہ کے مقابلہ میں لکھی تھیں، اور استاد کے وصال کے بعد ان کی جگہ تدریس و افادہ کی خدمات انجام دیں، جہانگیر نے ان کو ایک گاؤں جاگیر میں دیا تھا، جس سے ہر سال آٹھ نو سو روپیہ

کی آمدنی ہوتی تھی، ۲۰/ربیع الثانی ۱۰۸۶ھ میں وفات پائی، ان کی قبر جونپور کے محلہ گنج میں منشی امام بخش کی مسجد کے شمال میں بلندی پر موجود ہے، نزہتہ الخواطر میں ان کا نام عبدالباقی بن غوث الاسلام صدیقی جونپوری ہے۔[1]

ملا شیخ محمد صادق برونوی جونپوریؒ

ملا محمد صادق بن شمس نور برونوی جونپور نے ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار مفتی شمس نور سے حاصل کی، باقی کتابیں ملا محمود سے پڑھ کران کی درس گاہ سے سند فراغ پائی، اور والد کے انتقال کے بعد ان کی جگہ مفتی اور ان کے مدرسہ کے مدرس ہوئے، عالم باعمل اور زہد وتقویٰ میں یکتا تھے ـ طبیعت میں توکل اور فقر واستغنا تھا، دنیا اور اہل دنیا سے دور رہتے تھے، ایک مرتبہ ملا رکن الدین بحریابادی غازی پوری امیر الامراء نواب شائستہ خاں کی ملازمت کے زمانہ میں وطن آئے تو نہایت قیمتی شال ملا محمد صادق کی خدمت میں پیش کر کے حق استاذ زادگی ادا کرنا چاہا ملا صاحب نے یہ کہکر واپس کردیا،

من دلق رابہ اطلس شاہان نمی خرم" فقیر	میں گدڑی کو بادشاہوں کے اطلس سے نہیں
راگلیم بس است لایق شال خود رانمی	خریدتا فقیر کو گدڑی کافی ہے میں خود کو شال
انگارم،	کے لائق نہیں جانتا

ایک مرتبہ حاکم جونپور نواب الہ وردی خاں نے کوئی بات لکھی جواز روئے شریعت غلط تھی، اور اس کو مفتی محمد صادق کی خدمت میں مہر تصدیق ثبت کرنے کے لئے بھیجا، ملا صاحب نے صاف انکار کردیا، اس کے بعد الہ وردی خاں نے سیر دریا کے بہانے آپ کو کشتی پر سوار کیا، جب کشتی بیچ دریا میں پہونچی تو مفتی محمد صادق سے کہا کہ اگر میری تحریر پر مہر نہیں کریں گے تو ابھی آپ کو دریا میں پھینک دونگا، ملا صاحب نے ہنس کر کہا کہ اس جبر واکراہ کی صورت میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، اور انگوٹھی نکال کر الہٰ وردی خاں کو دے دی اس نے بار بار مہر لگائی مگر اس کا نشان ظاہر نہ ہوا،

[1] تجلی نور ج ۲ ص ۶۶، نزہتہ الخواطر ج ۵ ص ۱۹۵،

آخر میں شرمندہ ہوکر معذرت خواہ ہوا،

ملا محمد صادق بھاری بھرکم جسم کے تھے اس لئے امامت سے حتی الامکان بچتے تھے، اور دوسرے کو آگے بڑھاتے تھے، ایک دن ان کے استاد ملا محمود نماز کے وقت تشریف لائے اور امامت کے لئے آگے بڑھے مگر استاد ہونے کے باوجود ملا محمد صادق نے ان کا ہاتھ پکڑ کر ہٹادیا، اور خود امامت کی، فارغ ہونے کے بعد دست بستہ شفیق استاد کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ حضرت! میں حتی الامکان امامت نہیں کرتا ہوں مگر مجھے حکماء اور فلاسفہ کے کلام میں ایمان مشتبہ معلوم ہوتا ہے، اس لئے میں نے نماز ضائع نہیں کی، بلکہ خود ہی امامت کر دی ''در کلام حکماء شبہہ ایمان میدارم بہر ایں نماز خود را ضائع نہ نمودم'' ملا محمود شاگرد رشید کے اس متقیانہ اقدام سے بے حد خوش ہوئے اور فرمایا۔

'' کہ الحمد اللہ از شاگردان خود یک عالم باعمل و مرد زاہد یافتم'' (الحمد للہ میں نے اپنے شاگردوں میں ایک عالم باعمل اور مردِ زاہد پایا)

ملا محمد صادق کی وفات ۴/ ذوالحجہ ۱۰۶۴ھ میں ہوئی، ان کی قبر جونپور کے محلہ مفتی میں املی کے درخت کے نیچے موجود ہے، شمالی چبوترہ پر پہلی بڑی پختہ قبر ان ہی کی ہے، پہلے اس علاقہ کو چند پور کہتے تھے، ان کی تاریخ وفات ''عالم فاضل بود'' ہے۔[1]

ملا عبدالجلیل بردنوی جونپوری

ملا عبدالجلیل بن ملا شمس نور بردنوی جونپوری ملا محمد صادق کے بھائی ہیں انھوں نے تمام کتب درسیہ من اولہ الی آخرہ اپنے والد ملا شمس الدین بن نور الدین سے پڑھیں اور بعض مشکل مسائل میں ملا محمود اور دیوان محمد رشید سے استفادہ کیا ''و بعض بعض مشکل مسائل را پیش ملا محمود راست نمود''۔ تمام علوم متداولہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے، اور نہایت محققانہ انداز میں درس دیتے تھے زہد و تقویٰ میں ممتاز تھے، عام طور سے مسلسل روزہ رکھتے تھے، اور پوری رات عبادت و ریاضت

[1] تجلی نور ج ۲ ص ۸۴ و ۸۵

میں گزارتے، ان کو شاہ عبدالجلیل لکھنوی اور شیخ عزیز الحق دہلوی سے ارادت وخلافت حاصل تھی۔

۸رشوال ۱۰۶۷ھ میں انتقال ہوا۔ ان کا مزار جونپور میں ملا محمد صادق کے مزار کے برابر ہے۔[1]

مولانا عطاء اللہ اصفہانی گھوسوی

مولانا شیخ عطاء اللہ بن قاضی حبیب اللہ عثمانی اصفہانی گھوسوی ملا محمود کے آبائی وطن کے قریب گھوسی کے رہنے والے تھے، ان کے والد قاضی حبیب اللہ عثمانی گھوسوی میر علی عاشقان سرائمیری کے خلفاء میں تھے، مولانا عطاء اللہ گھوسی میں پیدا ہوئے اور وہیں پروان چڑھے، ملا محمود اور دوسرے علماء سے تعلیم حاصل کر کے شیخ عبدالقدوس بن عبدالسلام جونپوری نظام آبادی سے طریقت حاصل کی فقہ، اصول فقہ اور علم کلام کے مشاہیر علماء میں تھے، نہایت متقی اور دیندار عالم تھے، ۵ربیع الثانی ۱۰۶۳ھ میں لکھنؤ میں انتقال کیا اور وہیں دفن کئے گئے۔[2] ان کے صاحبزادے شیخ غلام نقشبندی گھوسوی لکھنوی متوفی ۱۱۲۶ھ مدفون لکھنؤ تھے جو اپنے زمانہ میں کبار علماء واساتذہ میں سے تھے۔ نواب شائستہ خاں (ابوطالب بن ابوالحسن دہلوی متوفی ۱۱۰۵ھ بھی ملا صاحب کے شاگرد تھے

وكان قرأ بعض الكتب على العلامه محمود بن محمد الجونپوری وشاركه فی الاخذ والقرأة عليه نور الدين بن جعفر بن عزيز الله المدراسی كما فی گنج ارشدی (نزهته الخواطر جلد ٦ ص١٣)

قاضی عبدالرحمن کمال پوری

مولانا قاضی عبدالرحمٰن بن ابراہیم بن یوسف کمال پوری اپنے دور کے علمائے کبار میں تھے، ان کے اساتذہ میں ملا محمود بھی شامل ہیں، علوم وفنون ملا صاحب وغیرہ سے حاصل کر کے شیخ فتح قلندر سے طریقت حاصل کی، مقام سکدی کے قاضی تھے، فارسی اور عربی زبان میں ان کی متعدد تصانیف ہیں، عربی میں رموز المعارف، اور فارسی میں قصص الاسرار، تلقینہ، وجدانی، فارسی میں ان کے اشعار بھی ہیں۔[3]

---

[1] تجلی نور ج ۲ ص ۶۵ [2] نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲۷۴ [3] نزہۃ الخواطر ج ۲ ص ۱۴۴

تصانیف

ملا محمود ہندوستان کے ان علماء میں سے ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے تعلیم و تدریس کے ساتھ تصنیف و تالیف کی استعداد سے بھی نوازا تھا، وہ صاحب تلامذہ کثیرہ کی طرح صاحب تصانیف کثیرہ بھی تھے، سترہ سال کی عمر میں فارغ ہونے کے بعد سے وفات تک پوری زندگی اسی جامعیت کے ساتھ بسر کی، مآثر الکرام میں ہے،

دور عرض ہفدہ سالگی فاتحہ فراغ خواندو	سترہ سال کی عمر میں فارغ ہوئے اور قلم کے
کمیتِ قلم درمیدانِ تصنیف جولان	شہ سوار بن کر تصنیف کے میدان میں جولانی
داد، وشمس بازغہ در حکمت وفرائد درفنِ	دکھاتے رہے، حکمت میں شمس بازغہ اور بلاغت
بلاغت املا کرد[1]	میں فرائد جیسی کتابیں لکھیں،

یہی سبحۃ المرجان صفحہ ۵۳ میں بھی ہے، مولانا عبدالحئی فرنگی محلی نے بھی یہی نقل کیا ہے، یوں تو ملا صاحب نے متعدد کتابیں لکھیں اور مختلف فنون میں خامہ فرسائی کی مگر ان میں دو کتابیں ان کے علم وقلم کا شاہکار ہیں۔ تجلی نور میں ہے۔

فن حکمت وفلسفہ میں شمس بازغہ اور فن بلاغت میں فرائد، ان کی یہ دونوں کتابیں، انکی قابلیت پر دلالت کرتی ہے۔[2]

ا۔ الفرائد فی شرح الفوائد

ملا صاحب کی یہ کتاب اور اس کا حاشیہ دونوں ان کے ذوق ادب و بلاغت کا مظہر ہیں، انھوں نے یہ جوانی کے ایام میں لکھی اور اپنی جوان فکر و جوان علم وقلم سے پورا کام لیا۔ یہ کتاب الفوائد الغیاثیہ کی شرح ہے جو مشہور متکلم و امام قاضی عضد الدین ایجی متوفی ۷۵۶ھ کی تصنیف ہے، قاضی عضد الدین ایجی سے وزیر غیاث الدین بن رشید الدین متوفی ۷۳۶ھ نے فن بلاغت کی

---

[1] مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۰۲ [2] تجلی نور ج ۲ ص ۵۰

مشہور کتاب المفتاح کی تلخیص وتحریر کی خواہش کی، وزیر غیاث الدین علم اور اہل علم کا بڑا قدردان تھا، بہت سے علماء و مصنفین نے اس کے نیک نام سے اپنی کتابیں منسوب کی ہیں، چنانچہ قاضی عضد الدین ایجی نے بھی اپنی اس کتاب کا نام اسی کے نام پر رکھا، ملا محمود، ادب و بلاغت کے شیدائی تھے۔ان کو اپنے ذوق کے لئے اس فن کی کسی معیاری کتاب کی تلاش تھی۔آخر ان کی نگاہ انتخاب الفوائد الغیاثیہ پر ٹھہری، اور اس کی بہترین شرح الفرائد فی شرح الفوائد کے نام سے لکھی اور اپنے زمانہ کے سب سے بڑے بادشاہ اور علم وعلماء کے قدردان شاہ جہاں کی نذر کی، ملا صاحب نے مقدمہ میں لکھا ہے کہ اس کتاب کی تالیف شروع کرتے ہی سفر درپیش ہوگیا اور کام چھوٹ گیا، چند سال کے بعد وطن واپسی ہوئی تو پھر کام شروع کیا، مگر اختتام سے پہلے پھر سفر پیش آ گیا، نتیجہ یہ ہوا کہ اسی پر کتاب ختم کرنی پڑی (صفحہ ۵) یہ سفر دہلی لاہور اور آگرہ وغیرہ کے تھے۔جو شاہی دربار کی علمی اور دینی ضرورت پر ہوتے تھے۔

الفرائد کا ایک حاشیہ فارسی میں راقم کے نانا مولانا احمد حسین رسولپوری متوفی ۲۶ر رجب ۱۳۵۹ھ نے قیام ڈھاکہ کے دوران میں القلائد من الفوائد کے نام سے لکھا ہے۔جو الفرائد کے ساتھ ۱۳۳۸ھ میں چھپا ہے، یہ حاشیہ پہلے عربی زبان میں شرح کے انداز میں لکھا گیا ہے۔مگر بعد میں طلبہ کی آسانی کے خیال سے مختصر کر کے فارسی میں لکھا گیا، عربی شرح کا نام سمط الفرائد تھا اور اس کا خطبہ مولانا مرحوم نے اپنے استاذ مولانا محمد عرب مکی متوفی ۱۳۳۵ھ کی خدمت میں جب وہ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں عربی ادب کے مدرس تھے، بغرض اصلاح پیش کیا تھا، انھوں نے یہ لکھ کر خطبہ واپس کر دیا تھا کہ واما الخطبه فلا تحتاج الیٰ اصلاح. یہ خطبہ جو نظم ونثر دونوں پر مشتمل ہے مولانا مرحوم کے عربی دیوان میں موجود ہے،

حاشیۃ الفرائد

ملا صاحب نے الفرائد فی شرح الفرائد لکھنے کے بعد خود اس کا حاشیہ بھی تحریر فرمایا جس کے متعلق علماء نے شاندار توصیفی الفاظ لکھے ہیں، سبحۃ المرجان میں مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے

لکھا ہے کہ ملا صاحب نے فرائد کے حاشیہ میں نہایت عمدگی اور سلیقہ مندی سے کام لیا ہے، یہ حاشیہ درحقیقت بڑی شرح ہے جس سے ملا صاحب کا علم فصاحت میں تبحر معلوم ہوتا ہے۔ میں نے اس کا مطالعہ بار بار کیا ہے۔ یہ کتاب گلستان ادب کے لئے ابر باران ہے،[1] مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی نے لکھا ہے کہ ملا صاحب نے فرائد پر حاشیہ تحریر کیا جو اصل کتاب سے بہت زیادہ ہے، اس میں خوش کن عجائب بیان کئے ہیں جن سے ذہنوں کو نشاط اور کانوں کو فرحت ہوتی ہے۔

۲۔ الشّمس البازغۃ

ملا صاحب کی اہم ترین تصنیف شمس بازغہ ہے جو ان کے معقولاتی علوم وفنون کا شاہکار ہے، اس کو ایسے وقت میں لکھا تھا جب امراض و اسقام کا بے پناہ ہجوم تھا۔ اور صحت وتندرستی تقریباً جواب دے چکی تھی، مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی نے لکھا ہے کہ ملا صاحب شمس بازغہ میں جملہ علوم طبیعیہ کو بیان نہیں کر سکے کیونکہ ان کی عمر طبعی کے کوچ کا طبل بج گیا تھا۔ ملا صاحب نے خود اس کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ میں اس کتاب کی تصنیف میں چیونٹی کی چال چلتا تھا۔ اور زمانہ میری موت کو قریب لانے میں دوڑ رہا تھا۔ ماقبل الطبعیات کے بہت سے مباحث کا مسودہ تیار کر کے اور باقی مسائل کو چھوڑ کر مابعد الطبعیات کے کچھ مطالب لکھے تھے کہ مرض کا حملہ ہوگیا اور ان مباحث کی تکمیل حسب منشاء نہیں ہوسکی ان میں مبادی اجسام کے مباحث بھی تھے۔ جن کے لئے ''الدوحۃ المیادہ فی حدیقۃ الصورۃ والمادۃ'' کے نام سے ایک علیحدہ رسالہ لکھا۔ اس کتاب میں ملا صاحب نے الحکمۃ البالغۃ کے نام سے متن لکھ کر الشّمس البازغہ کے نام سے اس کی شرح کی ہے ،قُلت کہہ کر متن کی عبارت لکھی ہے، اور اقول کہہ کر اس کی شرح کی ہے۔ الدوحۃ المیاذ کے علاوہ متعدد مباحث جو شمس بازغۃ میں نہیں آسکے تھے ملا صاحب نے ان کو الگ الگ رسالے کی شکل میں مرتب کیا تھا، یہ سب مطبوعہ شمس بازغہ کے آخر میں موجود ہے اسی لئے ان کے سوانح نگاروں نے ایسے رسائل کو الگ تصنیف نہیں شمار کیا ہے مگر بعض متاخرین نے ان کو مستقل کتاب قرار دیا ہے،

[1] سبحۃ المرجان ص ۵۳،

چنانچہ مولانا عبدالحئی فرنگی محلی نے لکھا ہے۔ کہ ملا صاحب کی تصانیف میں سے الدوحۃ المیادۃ رسالہ کلی وجزئی، رسالہ تحقیق اجتماع نقیضین وارتفاع نقیضین بھی ہیں جن سے غلام علی آزاد بلگرامی نا واقف تھے، ہمارے نزدیک آزاد کے ان رسائل کو ذکر نہ کرنے کا سبب یہ ہے کہ وہ ان کو شمس بازغہ کے مباحث قرار دیتے تھے، شمس بازغہ صرف حکیمانہ وفلسفیانہ مباحث اور تحقیقات ہی کی بے مثل کتاب نہیں ہے بلکہ زبان وادب کے اعتبار سے بھی اس کا معیار بہت بلند ہے۔ حالانکہ عام طور سے حکما وفلاسفہ کی عبارتیں ادبی ذوق سے عاری اور فنی معیار سے خالی ہوتی ہیں کیوں کہ ان کے نزدیک اصل چیز مفہوم ومعنی ہے، لفظ وعبارت کی حیثیت صرف ذریعہ اور وسیلہ کی ہے اس لئے ان کے یہاں اس کا اہتمام نہیں ہوتا ہے، مگر ملا صاحب حکمت وادب اور لفظ ومعنی دونوں کے جامع تھے۔ آخری دور میں علمائے خیر آباد میں یہ وصف پایا جاتا تھا کہ وہ منطقی وفلسفی ہونے کے ساتھ ادب وعربیت کا بھی نہایت ستھرا ذوق رکھتے تھے۔ اس کا اندازہ ان کی تصانیف سے کیا جاسکتا ہے ہمارے مدارس میں اب سے تیس چالیس سال پہلے تک صدرا اور شمس بازغہ کا رواج تھا، اور ہم نے بھی ان کو پڑھا ہے مگر اب تو ان کتابوں کے نام بھی مدارس عربیہ میں زبانوں پر نہیں آتے، شمس بازغہ اور ملا محمود دونوں لازم وملزوم ہیں اور ایک کے ساتھ دوسرے کی دلالت التزامی ضروری ہے۔

۳۔ الدوحۃ المیادۃ فی حدیقۃ الصورۃ والمادۃ

ملا صاحب نے اپنی اس کتاب کا تعارف شمس بازغہ کے مقدمہ میں خود کیا ہے۔

مابعد الطبیعیات جو مباحث مبادی اجسام سے تسلسل کے ساتھ متعلق تھے انکو میں نے اس رسالہ میں بیان کرکے اس کا نام ”الدوحۃ المیادۃ فی حدیقۃ الصورۃ والمادۃ“ رکھا ہے۔

ملا صاحب نے شاہجہاں کے دربار میں ملا اکج ایرانی سے مناظرہ اور کامیابی کے بعد اثبات ہیولیٰ کے دلائل کے سلسلے میں اس رسالہ کو اکج کو دیا تھا، یہ رسالہ شمس بازغہ کے آخر میں موجود

ہے جو بسم اللہ کے بعد "فصل فی اثبات الھیولیٰ" سے شروع ہوتا ہے، اور یہ بھی شمس بازغہ کی طرح متن اور شرح پر مشتمل ہے۔

۴۔ رسالہ فی الکلی والجزئی

یہ رسالہ بھی درحقیقت شمس بازغہ کے مباحث کا تکملہ وتتمہ ہے مطبوعہ شمس بازغہ کے آخر میں الدوحۃ المیادۃ کے بعد بسم اللہ سے یہ رسالہ شروع ہوتا ہے اور اس میں بھی قلت سے متن اور اقول سے شرح ہے،

۵۔ رسالہ ارتفاع النقیضین

شمس بازغہ کے آخر میں رسالہ کلی وجزئی کے بعد رسالہ ارتفاع النقیضین ہے، یہ بھی اسی طرح متن اور شرح پر مشتمل ہے، مولانا عبدالحئی فرنگی محلی نے اس کا نام رسالہ فی تحقیق اجتماع النقیضین وارتفاعہما لکھا ہے۔

۶۔ رسالہ فی وحدت الوجود

اس کا ذکر مولانا عبدالحئی فرنگی محلی نے کیا ہے۔

۷۔ رسالہ تحقیق قضا وقدر

یہ رسالہ قضا وقدر کی تحقیق میں فارسی زبان میں ہے جیسا کہ مولانا عبدالحئی فرنگی محلی نے لکھا ہے، اس کا اردو میں ترجمہ سرشاہ سلیمان نے الہ آباد میں ایک عالم سے کرایا تھا جس پر مولانا محمد شریف صاحب مصطفےٰ آبادی "صاحب الافاضۃ القدسیہ" نے تعاقب لکھ کر دوسرے کے نام سے شایع کیا تھا مولانا اس زمانہ میں مدرسہ مصباح العلوم الہ آباد میں صدر مدرس تھے۔

۸۔ رسالہ اقسام نسواں

یہ چار ورق کا مختصر رسالہ فارسی زبان میں ہے جو بقول مولانا غلام علی آزاد فن نائیکا بھید میں ہے اور اس میں عورتوں کے اقسام بیان کئے گئے ہیں یعنی باعتبار سن وسال اور بلحاظ درجات عمر ومراتب الفت، عورتوں کی مختلف قسمیں اور ان کے الگ الگ نام ہیں۔ ملا صاحب کے اکثر تذکرہ نویس ان کی اس مختصر سی کتاب کا تذکرہ کرتے ہیں۔

(۹۔۱۰) صاحب تجلی نور نے ملا صاحب کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''دو دیوان فارسی دارد، یکے دیوان شعراء، دوئمیں مستند شعراء، ہمارا خیال ہے کہ ان دونوں کتابوں میں مختلف شعراء کے 'اشعار اور ان کے مستند حالات ہوں گے، جن میں ملا صاحب نے اپنے اشعار وحالات بھی درج کئے ہوں گے۔

(۱۱) ملا صاحب نے اپنے مرشد شیخ نعمت اللہ فیروز پوریؒ کے بتائے ہوئے اوراد و وظائف کو ایک الگ رسالہ میں جمع کیا تھا، جس کو مولانا خوب اللہ محمد یحیٰی الہ آبادی نے وفیات الاعلام میں نقل کردیا ہے''۔

ملا محمود جونپوری کی سوانح حیات کے بعض نئے ماخذ

محترم جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم۔اے، ایل، ایل، بی[۱] نے ''معارف اعظم گڑھ بابت اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۷۳ء میں میرے مقالہ ''ملا محمود جونپوری پر ملا محمود جونپوری کی سوانح حیات کے بعض نئے ماخذ کے عنوان سے استدراک لکھا جس میں ملا صاحب کے سوانح کے دو مزید ماخذوں کی نشاندہی کرکے ملا صاحب کی کلامی اور معقولی حیثیت پر نہایت فاضلانہ انداز میں مفصل بحث کی، ہم موصوف کے شکریہ کے ساتھ ملا صاحب کا سوانحی حصہ نقل کرتے ہیں، وہو ہذا:۔

''معارف'' کی سابقہ اشاعت میں[۲] مولانا قاضی اطہر مبارک پوری صاحب کا ایک

---

[۱] سابق رجسٹرار امتحانات عربی وفارسی اترپردیش، [۲] مئی، جون، جولائی ۱۹۷۳ء

فاضلانہ مقالہ ملا محمود جونپوری علیہ الرحمتہ پر شائع ہوا ہے، قاضی صاحب نے اپنے رئیس التذکرہ کے متعلق دس ماٰخذ گنائے ہیں۔ جن میں سے تین کمیاب یا نایاب ہیں، اور سات انکے پیش نظر تھے۔ ان میں سے قدیم ماخذ فاضل جونپوری کے معاصر اور بہنوئی حاجی شاہ ابوالخیر بن شاہ ابوسعید بھیروی کی نایاب کتاب ''شیروشکر'' ہے، جسے انھوں نے ملا صاحب کی وفات سے پانچ چھ سال پہلے ۱۰۵۶ھ میں مرتب فرمایا تھا، آخری ماخذ قاضی صاحب نے مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی کا ترجمہ مولف شمس البازغہ'' بتایا ہے جو شمس بازغہ'' کے آخر میں چھپا تھا، یقیناً ایسی عظیم المرتبت شخصیت ہمارے انتہائی اعتناء واہتمام کی مستحق ہے، اور اسے یہ حق ہے کہ اپنے اخلاف سے اپنے مرتبہ کے مطابق خراج تحسین وعقیدت وصول کرے، قاضی اطہر صاحب نے اس قرض کی پہلی قسط چکا کر پوری قوم کی جانب سے فرض کفایہ انجام دیا ہے۔ لیکن قاضی صاحب کی کاوش کو حرف آخر قرار دینا خود ان کے رئیس التذکرہ کی تنقیص کے مترادف ہوگا۔ ملا محمود جونپوری کا فضل وکمال اتنا محدود نہیں ہے کہ ایک ہی محقق کا دامن قلم اسے سمیٹ سکے، اور یہی احساس ان چند سطور کی نگارش کا باعث ہوا۔ واللہ ہو الموفق،

مجھے جس ماخذ کو متعارف کرانا ہے، وہ نہ تو ''شیروشکر'' کی طرح قدیم یا اس سے اقدم ہے اور نہ قاضی صاحب کے گنائے ہوئے دوسرے ماخذوں کی طرح تفصیلی، بایں ہمہ قدیم بھی ہے اور اس میں فاضل جونپوری کی علمی زندگی سے متعلق ایسے واقعات بھی مذکور ہیں جو دوسرے تذکروں اور تراجم میں نہیں ملتے۔

امام الدین ریاضی عربی مدارس کے اساتذہ وطلبہ ہیں۔ التصریح فی الھیئتہ'' کے مصنف کی حیثیت سے مشہور ہیں، وہ تاج محل آگرہ کے مشہور معمار استاد احمد کے پوتے اور اس علمی خاندان کے ایک فرد فرید تھے، مگر ان کی صرف دو تین کتابوں ہی کا نام ملتا ہے۔

لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری میں ان کی ایک اور نادر تصنیف کا پتہ چلا ہے جو شعراء کے علاوہ علماء وفضلاء کے تذکرے پر بھی مشتمل ہے ان میں سے بہت سے فضلاء سے ان کے براہ راست تعلقات تھے۔ باقی کے حالات میں ان کا ماخذ اپنے پدر بزرگوار لطف اللہ مہندس کا تذکرہ

ہے، لطف اللہ مہندس اپنے عہد کے اکابر علماء میں تھے۔ اس لئے ان کے دوسرے معاصرین سے بھی تعلقات رہے ہونگے جہاں تک عہد شاہجہانی کے علماء وفضلاء کے حالات کا تعلق ہے، یہ تذکرہ بہت زیادہ مستند اور قابل اعتماد ہے، اس تذکرہ کا نام ''باغستان'' ہے اور اس میں ملا محمود جونپوری کے حالات اس طرح مذکور ہیں۔

''ملا محمود جونپوری در فروع واصول و معقول ومنقول بکمال رسیدہ بود، ودر تفسیر وحدیث وحکمت مہارت تمام داشت، مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی باوجود کمالِ خود بکمال جامعیت اورا اظہار و اقرار واعتراف بفضل ودانش اومی نمود، فاضل محقق وکامل مدقق بود، عالم متوحد وعارف موحد مولوی عبدالحکیم در مناظرہ علم توحید باوے مقاومت نداشت، دی فرمود کہ مولانا نفسِ قدسی است، تار وپود سخن را خاصہ منقولات بمنوالے بافتہ کہ کارنامہ دیگراں در پیش اومصدوقہ ان اوھن البیوت لبیت العنکبوت ست تراز نسج عنکبوت'' است''[1]

ملا محمود جون پوری فنون کے اصول وفروع اور معقول ومنقول میں حد کمال کو پہونچے ہوئے تھے، تفسیر وحدیث اور فن حکمت میں مہارتِ تام حاصل تھی۔ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی اپنی کاملیت فن اور علمی جامعیت کے باوجود ملا محمود کی فضیلت و دانش کا اظہار و اقرار اور اعتراف کرتے تھے، فاضل محقق اور کامل مدقق تھے، منفرد عالم و موحد عارف مولوی عبدالحکیم مناظرہ کے فن میں ان کا مقابلہ نہیں کر پاتے تھے وہ فرمایا کرتے تھے کہ مولانا محمود جون پوری نفسِ قدسی ہیں، شاعری کے تانے بانے کو خاص طور سے معقولات کے کرگھا پر ایسے بنتے تھے کہ دوسروں کے کارنامے ان کے سامنے مکڑی کے جالے کے مصداق کمزور تھے،

اس سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں،

(۱) تذکرہ باغستان کا سال تصنیف ۱۱۴۵ھ ہے اس لئے یہ مولانا غلام علی آزاد کے

---

[1] تذکرہ باغستان ص ۶۸۴ ب، الف ۶۸۵

دونوں تذکروں ''سبحۃ المرجان'' اور ''مآثر الکرام'' سے زیادہ قدیم ہے، امام الدین ریاضی ایک صاحب تصنیف عالم تھے اور اپنے روسائے تذکرہ کی علمی کاوشوں کو ذمہ داری کے ساتھ پرکھنے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے۔ مولانا غلام علی آزاد بھی ایک جید عالم تھے، مگر ان کے دوسرے مشاغل اس دقتِ نظر کی انھیں فرصت نہیں دیتے تھے۔ ہر چند آزاد کے دونوں تذکروں پر بعد کے لوگوں نے غیر مشروط اعتماد کیا ہے اور اس عہد کی سرگرمیوں کے سلسلے میں انھیں واحد ماخذ کی حیثیت دی ہے اس کے باوجود امام الدین ریاضی کا تذکرہ (باغستان) نہ صرف ان سے قدیم ہے بلکہ زیادہ مستند بھی ہے۔

(۲) ملا محمود جونپوری ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کے ہم عصر تھے دونوں کے سنین وفات سے خیال ہوتا ہے کہ شاید موخر الذکر مقدم الذکر سے عمر میں چھوٹے ہوں، [۱] کیوں کہ حسب تصریح مولانا غلام علی آزاد ملا محمود کا انتقال ۱۰۶۲ھ میں اور ملا عبدالحکیم کا ۱۰۶۷ھ میں ہوا تھا۔ لیکن عہد جہانگیری کے مشاہیر علماء وفضلاء میں علامہ سیالکوٹی کا نام تو ملتا ہے چنانچہ معتمد خان ساقی نے ''اقبال نامہ جہانگیری'' کے آخر میں ''ذکر فضلائے عہد'' کے زیر عنوان لکھا ہے ملا عبدالحکیم سیالکوٹی مگر اس ''ذکر فضلائے عہد'' میں ملا محمود جونپوری کا نام نہیں ملتا، ہوسکتا ہے کہ اسے جہانگیر کی بے توجہی پر محمول کیا جائے مگر اس کی توجیہ تو یہ کی جاسکتی ہے کہ جس زمانہ میں [۲] ''اقبال نامہ'' مرتب ہو رہا تھا ملا محمود جونپوری کم عمر تھے [۳] اور فارغ التحصیل ہوئے مشکل سے چار سال ہوئے تھے [۴]

---

[۱] حالانکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ ملا محمود جونپوری ۱۰۱۵ھ میں پیدا ہوئے جب ملا عبدالحکیم سیالکوٹی فارغ التحصیل ہو چکے تھے۔ [۲] شاہجہاں ۱۰۳۷ھ میں تخت نشین ہوا، اسی زمانہ مین جہانگیر نے وفات پائی اس سے کچھ پہلے غالباً ۱۰۳۶ھ کے قریب اقبالنامہ مرتب ہوا ہوگا۔ [۳] ملا محمود علی اصح الاقوال (حسب تصریح شیر وشکر بحوالہ معارف جون ۱۹۷۳ء صفحہ ۴۲۴) ۱۰۱۵ھ میں پیدا ہوئے تھے، اس لئے ۱۰۳۶ھ میں ان کی عمر اکیس سال ہوگی۔ [۴] ملا صاحب نے سترہ سال کی عمر میں فاتحہ فراغ پڑھا تھا۔ در ہفتدہ سالگی فاتحہ الفراغ خواندہ نقارہ علمائے اشراقیین وسلالۂ حکمائے مشائیں گشت'' (تجلی نور بحوالہ معارف جون ۱۹۷۳ء صفحہ ۴۳۰)۔

اس لئے شاید ان کے تجر علمی نے اتنی شہرت حاصل نہ کی ہو کہ ان کا ذکر خیر دربار کے وقائع میں ثبت کیا جاتا، انکے مقابلہ میں ملا عبدالحکیم بیس سال سے زائد عرصہ سے نہ صرف تعلیم و تدریس بلکہ تصنیف وتالیف میں بھی ید طولیٰ حاصل کر چکے تھے، البتہ حیرت اس پر ہے کہ عبدالحمید لاہوری نے بھی ''بادشاہ نامہ'' میں ملا محمود کو درخور اعتناء نہیں سمجھا حالانکہ جس زمانہ میں یہ تاریخ مرتب ہو رہی تھی[1] اس وقت وہ الامام الاعظم والمولیٰ المکرم السراج الوھاج فی الملة الحنفیة والبحر المواج فی العلو الحقیقیه ملك العلماء الراسخین [2] کا مصداق بن چکے تھے، اس کے برعکس ملا عبدالحکیم کا مستقل ترجمہ دونوں جلدوں کے آخر میں ''فضلائے عہد'' کے ضمن میں دیا ہے،[3] اس کے علاوہ دربار کے واقعات میں دومرتبہ بارگاہ شاہ جہانی میں ان کی آمد و باریابی اور انعام واکرام سے سرفرازی کا بھی ذکر کیا ہے۔ پہلی مرتبہ سال ۱۰۵۵ھ کے واقعات میں دوسری مرتبہ سال ۱۰۵۵ھ کے واقعات کے ضمن میں۔

ملا محمود جونپوری یقیناً صف دوم کے فاضل نہیں تھے، دربار شاہی میں انھیں بار حاصل تھا، مولانا غلام علی آزاد نے لکھا ہے کہ وہ شاہزادہ شجاع کے اتالیق تھے،[4] آزاد نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ بلخ کی فتح سے کچھ پہلے دارالسلطنت میں آئے تھے اور بادشاہ کو رصدگاہ کی تعمیر پر آمادہ کر لیا تھا۔ مگر وزیر اعظم کی دراندازی سے یہ تجویز بروئے کار نہ آسکی۔

اس سے اندیشہ ہوتا ہے کہ اس بے اعتنائی کے پس پردہ درباری سیاست کارفرما تھی، اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ عہد شاہجہانی کے وزیر اعظم علامی سعد اللہ خاں ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کے شاگرد رشید تھے، اگر چہ استاذ نے شاگرد سے کوئی غلط کام نہ کرایا ہوگا، مگر ظاہر ہے شاگرد نے

---

[1] عبدالحمید لاہوری نے ۱۰۶۵ھ میں وفات پائی، اس کے بادشاہ نامہ میں عہد جہانی کے پہلے بیس سال کی تاریخ ہے لہٰذا یہ تاریخ ۱۰۵۷ھ کے مابین مرتب ہوئی، اس وقت ملا محمود علمی دنیا میں اپنا منفرد مقام حاصل کر چکے تھے، وہ ۱۰۵۵ھ کے قریب شاہ جہاں کے دربار میں آئے تھے اور اسے رصد بندی کے لئے آمادہ بھی کر لیا تھا مگر وزیر کی دراندازی سے یہ منصوبہ پورا نہ ہوسکا [2] شیر و شکر بحوالہ معارف مئی ۱۹۷۳ء ص ۳۳۰، شیر و شکر ۱۰۵۷ھ کی تصنیف ہے یعنی بادشاہ نامہ کے مرتب ہونے سے پہلے کی، [3] بادشاہ نامہ جلد اول ص ۳۴۴ جلد دوم ص ۷۵۵ [4] مآثر الکرم ص ۲۰۳

ضرور حق شاگردی ادا کرنے میں کوئی دریغ نہ کیا ہوگا۔

(۴) عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ ملا محمود جونپوری فلسفہ و حکمت کے فاضل بے عدیل تھے۔ خصوصاً شمس بازغہ کے فلسفہ و حکمت کے اعلیٰ نصاب میں مشمول ہونے سے یہ خیال پختہ سے پختہ تر ہو گیا ہے۔ پھر مولانا غلام علی آزاد نے سبحۃ المرجان اور مآثر الکرام میں انہیں نقارۂ علماء اشراقیین وسلالۂ حکماء مشائین بتایا ہے جس سے وہ خالص حکیم و فلسفی ہی معلوم ہوتے ہیں، مگر امام الدین ریاضی کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ ملا محمود علوم حکمیہ کے بعد میں اور علوم دینیہ کے پہلے عالم یلمعی، و فاضل لوذعی تھے امام الدین ریاضی نے تفسیر و حدیث ہی میں ان کی دستگاہ عالی سے ان سے تجرّ علمی کے ذکر کی ابتدا کی ہے ''در تفسیر و حدیث و حکمت مہارت تمام داشت'' غالباً ملا محمود اپنی زندگی میں بھی بالخصوص اپنے خاندان میں عالم علوم دینیہ ہی کی حیثیت سے مشہور تھے، چنانچہ ان کے اولین سوانح نگار اور بہنوئی حاجی ابوالخیر فاروقی نے حسب تصریح قاضی اطہر مبارکپوری ان کے بارے میں لکھا تھا۔

'وہوالامام الاعظم ،والمولی المکرّم، جامع المناقب ،شمس المشارق والمغارب ،السراج الوہاج فی الملۃ الحنفیہ ،وبحرالمواج فی العلوم الحقیقیہ ، علم الہدیٰ والعلامۃ المقتدیٰ ، ملک العلماء الراسخین ،افتخار الملۃ والدین''

مگر قدرت کے کرشمے بھی عجیب ہیں، غالب جس اردو کے سہارے آج غالب سخن منوانے کے مستحق ٹھہرے اور جس کی بنا پر ان کا کلام وید مقدس کا ثانی قرار پایا، اپنی زندگی بھر اسے مجموعۂ بیرنگ من'' ہی کہتے رہے، اسی طرح ملا محمود جونپوری بھی اپنے تمہّر فی التفسیر والحدیث اور السراج الوہاج فی الملۃ الحنفیہ ہونے کے باوجود ''نقارہ العلماء الاشراقیین وسلالۃ الحکماء المشائین'' ہی کی حیثیت سے مشہور ہوئے اور ان کی ''الفرائد'' تو قبول در کنار معمولی شہرت بھی نہ حاصل کر سکی، شہرت نصیب ہوئی تو ان کی شمس بازغہ کو حتی کہ ذوق بھی فرما گئے۔

کہ شمس بازغہ کی جا پڑھے ہیں بدر منیر

(۴) ملا محمود جونپوری کو علم وادب کے علاوہ معرفت ومشیخت کا بھی ذوق تھا، جیسا کہ حاجی ابو الخیر صاحب نے لکھا ہے، ''والبحر المواج في العلوم الحقيقية'' ان کے خاندان میں اس حقیقت ومعرفت کا ہمیشہ سے چرچا تھا اوران کے اسلاف اس راہ کے رہرو بلکہ راہنما سمجھے جاتے تھے، مگر تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ اس ذوق کے ہوتے ہوئے بھی وہ اس عہد کے مروجہ منہاج توحید وجودی کے منکر، ان کے معاصر وحریف ملا عبد الحکیم سیالکوٹی اس کے علمبرداروں میں سے تھے ہندوستان کی اسلامی فکر میں وحدت الوجود کا عقیدہ عرصہ سے راسخ ہو چکا تھا، اس کی جڑیں فیروز شاہ تغلق کے زمانہ تک پہونچی ہیں مگر اکبر کی اندھی بے راہروی سے اس عقیدہ کی اشاعت کو بہت زیادہ مدد ملی، وہ خود شیخ تاج الدین زکریا اجودھنی سے خلوت خاص میں یہ تقریر سنا کرتا تھا، ملا عبد الحکیم سیالکوٹی اور ملا محمود جونپوری کے زمانہ میں شیخ محبّ اللہ الہ آبادی جو اس باب میں شہزادہ دارا شکوہ کے روحانی رہنما تھے، اس عقیدہ کے سرگرم مبلغ تھے اوراس میں دستگاہ عالی کی بنا پر شیخ ابن عربی ثانی کہے جاتے تھے۔

الہ آباد غازی پور اور جونپور ایک دوسرے سے قریب واقع ہیں اور ایک علاقہ کے اکابر کا دوسرے علاقہ کے اکابر سے متاثر ہونا فطری ہے، مگر ملا محمود جونپوری اپنی پختگی اور صلاحیت کی بنا پر توحید وجودی سے قطعاً متاثر نہ ہوئے، اوراس کی تردید کے سرگرم مبلغ بنے رہے یہاں تک کہ ملا عبد الحکیم سیالکوٹی بھی اپنے علمی تبحر اور توحید وجودی کی ترجمانی میں ید طولیٰ رکھنے کے باوجود انکے حریف پنجہ شکن نہ بن سکے، بلکہ اس موضوع پر مناظرے میں ان سے شکست فاش کھائی، اوراس کے اعتراف کے ساتھ ساتھ ملا محمود جونپوری کے تفوق علمی کا بھی اظہار کیا۔

زیر بحث موضوع کے نقطۂ نظر سے سب سے اہم محمد صالح کنبوہ کی ''عمل صالح'' ہے، جو اصولاً تو شاہجہاں کے عہد حکومت کی تاریخ ہے لیکن دوسرے مؤرخین کی روش کے مطابق اس کے آخر میں فضلائے عہد کے تراجم کا بھی التزام کیا گیا ہے، عہد شاہجہانی سے پہلے دس سال کی تاریخ مرزا امینائے قزدینی نے لکھی تھی، اس کے بعد پہلے بیس سال کی تاریخ عبد الحمید لاہوری نے لکھی اور

مؤرخین نے بھی اس عہد کی تاریخیں لکھیں، بعد میں عہد شاہجہانی کے تیس سال کی تاریخ محمد صالح کنبوہ نے ''عمل صالح'' کے نام سے مرتب کی۔ عمل صالح ۱۰۷۰ھ میں مکمل ہوئی اگر چہ بعد میں مصنف نے اس میں ۱۰۸۸ھ تک کے واقعات بڑھا دیئے مگر اصولاً یہ کتاب ۱۰۷۰ھ میں لکھی گئی، یعنی فاضل جونپوری کے سوانح حیات کے قدیم ماخذ ''شیر وشکر'' کے کوئی چودہ سال کے بعد۔

عبدالحمید لاہوری نے جن وجوہ سے بھی ہو ملا محمود جونپوری کو بادشاہ نامہ میں درخورذکرو اعتنا نہیں سمجھا، مگر محمد صالح نے اپنے پیشرو کے برخلاف ان کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے اور اس طرح اس کوتاہی کی تلافی کردی ہے جو اس باب میں عبدالحمید لاہوری سے ظہور میں آئی تھی۔ اگر چہ زمانہ کی عام روش کے مطابق ان کا انداز نگارش بھی تزئین عبارت کا بڑا حسین وجمیل مرقع ہے۔ مگر اس عبارت آرائی میں بھی بعض اوقات مختلف علماء وفضلاء کے متعلق بعض اہم تصریحات مل جاتی ہیں جن سے ان کی شخصیتوں کے نکھار میں خاصی مدد مل سکتی ہے۔ جہاں تک فاضل جونپوری کا تعلق ہے، یہ واقعات ان کی وفات کے آٹھ سال بعد ہی قلم بند ہوئے ہیں۔ ان کی صحت میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ محمد صالح کنبوہ نے ملا محمود جونپوری کے بارے میں لکھا ہے۔

''سر دفتر علمائے خطۂ وجود ملا محمود	ملا محمود جون پور خطۂ وجود کے علماء کے سر دفتر تھے، ان کا
کہ ضمیر پاکش معانی را مقام محمود	پاکیزہ دل معانی کے لئے مقام محمود تھا، وہ آسمانِ فضل
است و سپہر فضل و دانش را کوکب	ودانش کے مبارک ستارے تھے، صفائی سے بھرا ہوا شہر
مسعود، در شہر صفا پرور جونپور	جون پور ان کی طبیعت کو بھا گیا تھا، ان کے زمانۂ شعور
پزیرائی سرشت گردیدہ واز آغاز	کے آغاز ہی میں ان سے نئی نئی باتیں اور شاعری کے
ایام شعور در ابداع بدائع محسنات	نئے نئے پہلو سامنے آنے لگے تھے، وہ فضل سرمدی
سخن کوشیدہ، مظہر فضل سرمدی ومنبع	کے مظہر اور فیض ابدی کا منبع تھے، علوم وفنون کے مختلف
فیض ابدی بود، در انواع	شعبوں خصوصیت کے ساتھ علم معقول ومنقول
فنونِ دانش خصوص علم معقول و	ریاضیات وطبعیات اور علم الٰہیات میں اربابِ استعداد

منقول و در ریاضی طبیعی و الٰہی ہیچ کس از ارباب استعداد را قوت دعویٰ برابری با وے نبود، اگرچہ درخور دانش وبینش خود طلاقت زبان وتقریر لسان نداشت اما قلم فیض رقمش در حالت تحریر تفسیر آیاتِ کلامِ الٰہی وتعبیر حقائق اشیاء کماہی بعنوان تصنع وتفنن بکاری برد کہ بر نقش کلکش دعویٰ فضیلت معنی پردازی آن جناب راز بان می دہد و سخنان ار جمندش بعلاقۂ غرائب معنی در صدر انجمن دلہائے والا فطرتاں اقامت انداز گشتہ، ہر لفظش کہ در اثبات شرافت لطائف نفی؟ نطق ناطق ومخبرِ صادق است، ابواب حیرت بروئے روزگاری کشاید"[1]

میں سے کسی کو بھی ان کی برابری کا دعویٰ کرنے کی مجال نہیں تھی، اگرچہ وہ فلسفہ ومنطق اور دوسرے علوم وفنون کے بیان وتشریح میں ادب وانشاء کی چاشنی اور لسانی وفنی خصوصیات کو اولیت دینے کی صلاحیت رکھتے تھے مگر تقریر وبیان میں معذور تھے مگر ان کا زرنگار قلم کلام الٰہی کی آیتوں کی تفسیر اور حقائق اشیاء کی تعبیر وتفہیم میں نگینہ جڑنے کی ایسی صناعی کا اظہار کرتا تھا کہ ان کی تحریریں انشاء پردازی کا نمونہ بن جایا کرتی تھیں۔ ان کی زباندانی اور شعریت خاصے کی چیز ہوا کرتی تھی، جو اہل زبان کی بزم اور فطری خوبیوں کو پسند کرنے والوں کے دل میں جگہ بنا لیتی تھی، ان کا ہر لفظ نازک اور لطیف باتوں کی طرف اشارہ کرتا تھا، اور ان کا ہر لفظ نطق ناطق اور سچی اور صحیح مخبری کرنے والا ہے، اہل علم کی نگاہوں کے سامنے حیرت وتعجب کے دروازے کھولتا ہے

اس تذکرے سے فاضل جونپوری کے متعلق چند نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

(۱) ملا صاحب ''تفسیر وحدیث اور حکمت'' کے علاوہ فن ریاضی میں دستگاہِ عالی رکھتے تھے۔

درانواعِ فنونِ دانش خصوص علم معقول ومنقول وریاضی وطبیعی والٰہی ہیچ کس از اربابِ

---

۱ عمل صالح جلد دوم صفحہ ۳۸۳۔۳۸۴)

استعداد را قوت دعویٰ برابریٔ باوے نبود''

محمد صالح کی اس تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ علوم حکمیہ وفلسفیہ میں طبیعیات والٰہیات کے علاوہ ملا محمود کو ریاضیات میں بھی غیر معمولی دستگاہ حاصل تھی، وہ ریاضیات کی شاخ علم الھیئۃ'' میں بھی ممتاز مقام رکھتے تھے، مگر غالباً ان کی تحقیق پسند طبیعت اس فن میں آگے جانے والوں کی تقلید پر راضی نہیں ہوسکی اس لئے جیسا کہ آزاد بلگرامی نے لکھا ہے'' وہ بادشاہ کو رصد بندی کے لئے آمادہ کرنے کے لئے دہلی تشریف لے گئے مگر وزیر کی دراندازی سے ان کی تدبیر برروئے کار نہ آسکی۔

قرآن قریم کی تفسیر میں ملا صاحب کو ید طولیٰ حاصل تھا اس کی تصدیق امام الدین ریاضی کی تصریح سے بھی ہوتی ہے، جس کی جانب سابق میں اشارہ کیا جاچکا ہے، لیکن محمد صالح کنبوہ کی عبارت سے مزید معلوم ہوتا ہے کہ انھیں آیات قرآنی سے عجیب وغریب نکات پیدا کرنے میں کمال حاصل تھا، اور یہ نکتہ آفرینی کسی ''تفسیر بالرائے'' کی مصداق نہیں تھی، بلکہ معاصر علماء بھی اس کی توثیق وتصویب فرماتے تھے، محمد صالح کنبوہ نے لکھا ہے۔

قلم فیض رقمش درحالت تحریر تفسیر آیات کلام الٰہی وتعبیر حقائق اشیاء کماہی بعنوان تصنع وتفنن بکارمی برد کہ برنقش کلکش دعویٰ فضیلت معنی پردازی آن جناب راز بان می دہد وسخنان ارجمندش بعلاقۂ غرائب معنی درصدر انجمن دلہائے والافطرتاں اقامت انداز گشتہ[1]

(۳) البتہ اس سے ایک نیا انکشاف یہ ہوتا ہے کہ ان کی قوت تقریر اور طلاقت لسانی اس درجہ کی نہ تھی جس درجہ کی ان کی قوت تحریر تھی، محمد صالح لکھتے ہیں،

''اگرچہ درخور دانش وبنیش خود طلاقت زبان وتقریر لسان نداشت'' (ص ۳۸۴)

یہ بات قابل غور ہے کیونکہ امام الدین ریاضی نے باغستان میں لکھا ہے کہ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی ان کے علم وفضل کے ساتھ ان کی طلاقت لسان اور فن مناظرہ کے آداب میں ان کی مہارت تامہ کے معترف تھے، حالانکہ وہ وقت کے مانے ہوئے فاضل اور آداب مناظرہ کے ماہر تھے، انھوں نے بڑے بڑے فضلائے وقت کو مناظرہ میں ہرایا تھا بہر حال محمد صالح ان کی قوت تحریری کے

---

[1] (عمل صالح جلد اول صفحہ ۳۸۳)

مداح ہیں اور بجا طور پر مداح ہیں، ان کے سلیقۂ نگارش کی ایک قابل صد ہزار تعریف مثال ان کا وہ انداز بیان ہے، جس کے ساتھ انھوں نے میر باقر داماد سے نظریۂ حدوث دہری میں اختلاف کیا ہے۔ پہلے تو انھوں نے اپنے موقف کی مناسب طور سے ترجمانی فرمائی ہے پھر باقر داماد کے مخترعہ نظریۂ حدوث دہری کو بیان کر کے اس پر تنقید کی ہے، مگر انداز انتہائی سنجیدہ اور شریفانہ ہے مگر فاضل جون پوری نے میر باقر داماد کے نظریۂ حدوث دہری کو اپنے لفظوں میں بیان کرنے سے پہلے حریف کی عظمت فکر کی مدح سرائی کی ہے، ازاں بعد ان کے اس اختراع و بدعت طرازی کی بڑے اچھے انداز میں توجیہ کی ہے، مگر اس کی تفصیل سے پیشتر بمصداق تتبين الاشياء باضداد ها خود میر باقر کے انداز ''تنابز بالقاب'' پر ایک نظر ڈال لینا مستحسن ہوگا کہ وہ کس طرح علمی اختلاف سے یکا یک شعلہ زیر پا ہو کر بھڑک اٹھتے ہیں، ہوا یہ تھا کہ جب متکلمین نے فلاسفہ کے اس موقف پر کہ زمانہ قدیم ہے یہ اعتراض کیا کہ ''کان دیکون'' کا مفہوم جس طرح ممکنات و مادیات میں جاری ہوتا ہے اسی طرح واجب تعالیٰ اور مجردات میں جاری ہوتا ہے اس اعتراض سے بچنے کے لئے فلاسفہ نے سرمد و دہر اور زمان کی تدقیق کی اس پر امام رازی نے یہ تبصرہ کیا کہ یہ ''التھويل خالٍ عن التحصيل'' ہے اتنی سی بات پر میر باقر داماد آپے سے باہر ہو گئے اور افق المبین میں فرمایا۔

وهمٌ و تزييف اسمعتَ مشير فتنة التشكيك يقلد ضعفاء التعقل ويقول رادًّا على الفلاسفة ان هذاالتهويل خالٍ عن التحصيل وليس تسع فطنته ان يتفطَّن

یعنی ایک وہم اور اس کی تردید، کیا تم نے فتنۂ تشکیک کے مشیر کی بات سنی؟ جو ضعیف العقل لوگوں کی تقلید کرتا ہے اور فلاسفہ کی تردید میں کہتا ہے کہ یہ (سرمد دہر اور زمان کی تدقیق) بے سود و لایعنی ہے کیا اس کی عقل میں یہ بات نہیں سمائی کہ...... الخ

یہی تنابز بالالقاب'' کرنے والا دوسروں کو فتنۂ تشکیک کا ترجمان اور کم عقلوں کا مقلد بتانے والا جب ''حدوث دہری'' کا نظریہ پیش کرتا ہے تو ملا محمود ہر چند کہ اس نظریہ کی اصابت سے

منکر ہیں اور اسے ایک لایعنی ڈھکوسلے سے زیادہ نہیں سمجھتے مگر اس کی تنقید وتردید میں اطالتِ لسان کے کرشمے نہیں دکھاتے بلکہ پہلے تو حریف کی عظمت فکر کی مدح سرائی میں اپنے زورِ فصاحت اور قادرالکامی کی صلاحیتوں کو پورے طور پر صرف کرتے ہیں۔

بعض خیرة اللاحقین بالمهرة	(علم حکمت کے) ماہرین سابقین کے
السابقین مع توغله فی	بعد جو فضلاء ہوئے ان کا بہترین
سیاحته ارض الحقیقة،	فرد (میر باقر واماد) جسے حقائق کائنات کی
وتورطه فی سیاحة یم	سیاحت میں توغل تھا جو حکمت کے سمندر کی
الحکمة، وولوجه فی اعماق	تیراکی میں موجوں کے تھپیڑے کھا کھا کر
ثرا الملک باقدام انظاره	غوطے لگاتا تھا جو اپنی غائر نظروں سے ملکوت
الغائرة وعروجه عن طباق	کے زیریں حصوں کی گہرائیوں میں پہونچ
سماء الملکوت بقدوم	جاتا تھا اور جو اپنے بلند پرواز افکار کے
افکاره السافره،	بازوؤں سے سماء ملکوت کے مختلف طبقوں
(شمس بازغه ص ۱۱۷۔۱۱۸)	میں عروج پاتا اور چڑھتا چلا جاتا تھا۔

اس کے بعد ان کی اس نظریہ تراشی کو ایک نیک محمل پر محمول کرنے کے لئے باندازِ شائستہ اس کی توجیہ فرماتے ہیں، وہ اسے ان کے نظریات تراشی کا شوق فضول نہیں بتاتے جیسا کہ عام فلاسفہ میں اپنے حریفوں کے خلاف جذبۂ رشک وحسد کا دستور ہوتا ہے، ملا محمود میر باقر واماد کے معاصر متاخر تھے، بلکہ اسے ان کی قومی وملّی اور دینی وخاندانی غیرت کا تقاضا بتاتے ہیں کہ انھوں نے یہ جو کچھ کیا محض اپنے قومی وملّی عقیدہ کی تائید کے لئے کیا، فرماتے ہیں،

اذ نهض عرقه الهاشمی	جب ظاہر دین کے (لباس اصول وعقائد) کی
لحمایة وثار الظاهر من	حمایت اور حدوث عالم بشمول جملہ مافیہ جس پر
الدین والذب عن حِمی ما	جمہور اہل ملت کا اجماع ہے، ایسے حدوث کے

علیہ الجمہور من الملیین	عقیدے کی حفاظت کے لئے ان کی (میر
من حدوث العالم بقضیۃ	باقر داماد کی) رگ ہاشمی پھڑکی، ایسا حدوث جو محض
ومضیضۃ لا حدوثاً ذاتیاً بل	(فلاسفہ کا اصطلاحی نام نہاد) حدوث ذاتی نہیں
حدوثاً احسن من ذلک	ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ اچھا اور صحیح حدوث ہے
مصداقاً لسلب الوجود	جو اعیان و خارج میں (شے حادث پر) ایجاب
اصلاً فی الاعیان قبل صدق	صادق آنے سے پہلے قطعی سلب وجود کا مصداق ہو
الایجاب، ولم یرخصہ بصیرتہ	(یہ تھی ان میر باقر کی صلاحیت ایمانی ودینداری)
النقادۃ، وقریحتہ الوقادۃ	اور (معہٰذا) ان کی نقاد بصیرت اور ان کے علوم
ان یقول بالحدوث الزمانی	حکمیہ میں وقار ملکہ رُاسخہ (طبع روشن) نے انھیں
للزمان ابتدع القول	زمانہ کے واسطے حدوث زمانی (کا قائل
باالحدوث الدھری،	ہونے) کی بھی اجازت نہیں دی، لہٰذا (جمہور
(شمس بازغہ	فلاسفہ وحکماء کے علی الرغم) انھوں نے حدوث
ص ۱۱۸)	دہری'' کا نیا نظریہ پیش کیا،

یہ اسلوب بیان نہ صرف ساداتِ کرام کے ایک فرد سے عقیدت کا نتیجہ تھا جو انھوں نے اپنے نانا سے ورثہ میں پائی تھی بلکہ ان کے سلیقہ نگارش کا بھی ایک کرشمہ تھا اور یہ ایک ایسا اسلوب ہے جو کم از کم اس زمانہ میں کبریت احمر کا حکم رکھتا تھا۔

ملا محمود جونپوری کا رسالہ جبر واختیار

محترم جناب حافظ غلام مرتضٰی صاحب ایم. اے استاذ عربی الہ آباد یونیورسٹی نے میرے اور غوری صاحب کے مقالات کے بعد معارف مارچ ۱۹۷۴ء میں ایک مقالہ بعنوان ''ملا محمود جون پوری کا رسالہ جبر واختیار'' تحریر فرمایا جو ملا صاحب کے افکار ونظریات کا ترجمان ہے،

اور مختصر بھی ہے اس لئے ہم یہ پورا مقالہ ہی ملا صاحب کے سوانح حیات میں حافظ صاحب کے شکریہ کے ساتھ درج کرتے ہیں۔

۱۹۷۳ء کے معارف کی چند اشاعتوں میں ملک کے دو نامور اہل قلم جناب قاضی اطہر مبارکپوری اور جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری کے دو مبسوط اور پر مغز مقالے ملا محمود جونپوری کی سوانح حیات اور علمی تصنیفات سے متعلق شائع ہوئے، اس تفصیلی بحث کے بعد بظاہر اس موضوع پر مزید قیل وقال کی گنجائش باقی نہیں رہی، لیکن بمصداق "کم ترك الاول لآخر اس احقر کی رائے میں اب بھی ملا محمود کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے اور مجھے غوری صاحب کی مندرجہ ذیل رائے سے پورا اتفاق ہے۔

قاضی صاحب کی کاوش کو حرف آخر قرار دینا خود ان کے رئیس التذکرہ کی تنقیص کے مترادف ہوگا، ملا محمود جون پوری کا فضل وکمال اتنا محدود نہیں ہے کہ ایک ہی محقق کا دامنِ قلم اسے سمیٹ سکے، [1]

بہر کیف چونکہ راقم السطور کے پیش نظر ملا صاحب کا رسالہ جبر واختیار ہے، اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ سطور ذیل میں اس کا اجمالی تعارف کرا دیا جائے۔

اس رسالہ کا تذکرہ کرتے ہوئے قاضی صاحب موصوف نے لکھا ہے،

یہ رسالہ قضا وقدر کی تحقیق میں فارسی زبان میں ہے، جیسا کہ مولانا عبدالحئی فرنگی محلی نے لکھا ہے، اس کا اردو ترجمہ سر شاہ سلیمان نے الہ آباد میں ایک عالم سے کرایا تھا جس پر مولانا محمد شریف صاحب مصطفیٰ آبادی صاحب الافاضۃ القدسیہ نے تعاقب لکھ کر دوسرے کے نام سے شائع کیا تھا مولانا اس زمانہ میں مدرسہ مصباح العلوم الہ آباد میں صدر مدرس تھے، [1]

افسوس یہ اردو ترجمہ اور اس پر صاحب الافاضۃ القدسیہ کے تعقبات باوجود تلاش بسیار کے مجھے دستیاب نہیں ہوئے، البتہ اصل رسالہ بزبان فارسی مل گیا جسے الہ آباد یونیورسٹی کے سابق لکچرار شعبہ فلسفہ جناب علی مہدی خاں صاحب مرحوم نے ۱۹۳۴ء میں ایڈٹ کر کے دارہ

(معارف بابت اکتوبر ۱۹۷۳ء ص ۲۴۸)

جامع العلوم کے زیر اہتمام برکات اکبر پریس الہ آباد سے شائع کیا تھا، مقدمہ میں شہر جون پور کی سیاسی، معاشرتی اور علمی و ادبی تاریخ نیز ملا محمود صاحب کی سوانح حیات اور ان کی تصنیفات سے متعلق تفصیلی بحث کی گئی ہے، اور شروع میں سر شاہ محمد سلیمان مرحوم سابق چیف جسٹس الہ آباد ہائی کورٹ کا انگریزی میں ایک پیش لفظ ہے، رسالہ جبر و اختیار کا واحد نسخہ سر شاہ سلیمان کی ہی ملکیت میں تھا، جن سے علی مہدی خاں صاحب نے مستعار لیکر شائع کیا تھا۔

اصل رسالہ کی ابتدا میں حافظ عابد حسین کا عربی میں لکھا ہوا ایک فاضلانہ مقدمہ ہے حافظ صاحب ملا محمود ہی کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے علی مہدی خاں صاحب نے اپنے مقدمہ میں ملا محمود صاحب کا جو شجرۂ نسب دیا ہے، اس سے پتا چلتا ہے کہ حافظ صاحب ایک طرف ملا محمود کے بھانجے، ملا عبد الستار کے پوتے ملا سراج الدین محمد کے پر پوتے تھے تو دوسری طرف سر شاہ سلیمان کے نانا تھے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حافظ صاحب کو ملا محمود کے علمی کارناموں سے کس درجہ شغف رہا ہوگا، اور ان کی علمی یادگاروں کی تلاش میں کس قدر زحمت برداشت کی ہوگی۔

علی مہدی خاں صاحب اس رسالہ کے تعارف میں لکھتے ہیں کہ فطری طور پر ہمیں یہ توقع رکھنی چاہئے کہ اس کے نسخے ملا صاحب کے تلامذہ اور پسماندگان کے پاس رہے ہوں گے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے علمائے فلسفہ و حکمت نے اس رسالہ کو زیادہ اہمیت نہیں دی، کیوں کہ ملا صاحب کے بعد کے علماء میں بیشتر کے پاس اس کے نسخے مفقود تھے یہی نہیں بلکہ ملا صاحب کے سوانح نگاروں نے بھی ان کی تصانیف کی جو فہرستیں دی ہیں ان میں بھی اس رسالہ کا ذکر

---

[۱] معارف بابت جولائی ۱۹۷۳ھ ص ۲۶

نہیں ہے، یہاں تک کہ مولانا آزاد بلگرامی نے مآثر الکرام سبحۃ المرجان یا تذکرۃ العلماء میں اس کا ذکر نہیں کیا۔ سب سے پہلے مولانا عبدالحئی فرنگی محلی نے اس کا تذکرہ کیا ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا موصوف نے صرف اطلاع کی بنا پر اس کا تذکرہ کردیا، خود اس کی زیارت سے محروم رہے کیونکہ مولانا نے بجائے اصل نام رسالہ جبر و اختیار کے اس کو رسالہ فی تحقیق القضاء والقدر سے موسوم کیا ہے۔

مقدمہ حافظ عابد حسین

حافظ عابد حسین جو ملا محمود کے خاندان کے چشم و چراغ تھے ان کو حسن اتفاق سے ملا صاحب کے دو رسالے الہ آباد میں مل گئے ان میں سے ایک رسالہ عربی زبان میں عقائد سے متعلق اور دوسرا فارسی میں مسئلہ جبر و اختیار کے بارے میں تھا۔ جیسا کہ خود لکھتے ہیں۔

فلما ساعد فی الزمان غبّ اوقات وزمان ،وحلت الِالٰہ آباد حرسها الله عن الفساد والکساد افادنی الله تعالٰی بالرسالتین له بشقّ الانفس ، احدهما فی العقائد ، متن متین فی لسان عربی مبین و ثانیهمافی الجبر و الاختیار بالفارسیة ، نافعة القلوب الخاشعة والقاسیة ، فاغتنمتها وحمدت اللّٰه علیٰ ذلك حمداًکبیرا وحتمت ان یعم نفعهما کثیرا [1]

مقدمہ کی عبارت نہایت شستہ عربی میں ہے، اس کی مسجع مقفٰی عبارت سے عربی میں حافظ عابد حسین صاحب کی اعلیٰ درجہ کی مہارت کا پتہ چلتا ہے، ملا محمود کے علمی کمالات کو جی کھول کر سراہا گیا ہے، اور ان کو امام المحققین ، قدوۃ المدققین ، خاتم الحکماء ، رئیس العلماء اور خطیب الفصحاء جیسے بلند القاب سے یاد کیا گیا ہے، لیکن اس کے باوجود نہ تو مصنف کی زندگی کے متعلق کوئی تذکرہ ہے اور نہ ہی رسالہ کی تصنیف کے اسباب دعوامل سے بحث کی گئی ہے، حالانکہ حافظ صاحب اگر

---

[1] رسالہ جبر و اختیار ص ۵

چاہتے تو بڑی آسانی سے مصنف اور تصنیف سے متعلق مفید معلومات فراہم کر سکتے تھے، پھر بھی مقدمہ کی اہمیت اس لحاظ سے ضروری ہے کہ اس میں اس بات کی صراحت ہے کہ رسالہ کا اصل مخطوطہ کہاں اور کس طرح مقدمہ نگار کو دستیاب ہوا، مذکورہ بالا اقتباس کے آخری جملہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ حافظ صاحب ان دونوں رسالوں کو شائع کرنا چاہتے تھے، تاکہ اس کا فائدہ عامۃ الناس کو پہونچ سکے، لیکن ان کا یہ ارادہ پایۂ تکمیل کو نہ پہونچ سکا۔

تمہید رسالہ

خود مصنف نے رسالہ کی تمہید میں اس قسم کا کوئی اشارہ نہیں کیا ہے جس سے اندازہ ہو کہ انھوں نے یہ رسالہ کس کے لئے لکھا ہے ان کی سوانح حیات کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے۔ کہ شاہ جہاں کے علاوہ امیر الامراء آصف خان اور شائستہ خاں وغیرہ ان کے عقیدت مندوں میں تھے اور حسب تصریح مولانا آزاد بلگرامی ملا صاحب نے الفرائد لکھ کر شائستہ خاں کی خدمت میں پیش کیا تھا،[1] غالبًا رسالہ جبر و اختیار بھی انھوں نے شائستہ خاں یا آصف خاں کے لئے لکھا تھا اور یہ اس زمانہ کی تصنیف ہے جب ملا صاحب پر امراض کا ہجوم تھا اور ضعف و بیماری کی بنا پر دربار کی حاضری اور خدمت گزاری سے معذور ہو چکے تھے جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں۔

کمترین بندہ خیر اندیش اخلاص کیش	کمترین بندہ خیر اندیش اخلاص کیش ملا محمود
ملا محمود جون پوری اگر چہ از جہت	جون پوری اگر چہ نقاہت و بیماری کی وجہ
ناتوانی و بیماری در بجا آوردن لوازم	سے خدمت گزاری کے فرائض کی انجام
خدمت گزاری بہ کالبد جسمانی و پیکر	دہی سے قاصر ہے، کیونکہ جسمانی کمزوری
ہیولانی گرد تقصیر و غبار تشویر از چہرۂ حال	کے سبب حکم کی بجا آوری سے معذور ہوں
پر اختلال و ناصیۂ روزگار بے ہنجار خود	چہرے کے عوارض اور سانس پھولنے سے
نشستہ لکن از روئے راستگاری و	پریشان حال ہوں۔ لیکن راستگاری اور

[1] مآثر الکرام ص ۲۰۳

استواری درولا کیشی و وفاداری بجان	استواری کے اصول پر نیاز کیشی و وفاداری
نیازمندو درو ان مستمند وظائف دعاگوئی	بجان و دل کرتا رہوں گا۔ دعا گوئی کا فرض اور
درسم ہوا خواہی را تقدیم نمودہ بعرض بار	خیر خواہی کی رسم مقدم رکھوں گا، سعادت مسکن
یافتگان محفل سعادت مسکن و مجلس دولت	محفل اور دولت مامن مجلس میں حاضر ہونے
مامن می رساند	والوں کی خدمت میں یہ معروض پہونچادیں،

جہاں تک موضوع رسالہ کا تعلق ہے۔ وہ فکر اسلامی کی تاریخ میں مشکل ترین مسئلہ سمجھا جاتا ہے اور بقول ملا محمود۔ (از راہ تعارض دلائل غامض ترین مسائل است) اسکو مسئلۂ قضاء وقدر، مسئلہ حریت ارادہ مسئلہ جبر واختیار سے تعبیر کیا جاتا ہے، فلاسفہ متقدمین ومتاخرین دونوں نے اسے حل کرنے کی کوشش کی لیکن کما حقہ اس سے عہدہ برآنہ ہو سکے (بعثت اسلام سے قبل فلاسفۂ یونان نے بھی اس کو موضوع بحث بنایا تھا، چنانچہ ایک طبقہ جو ابیقو ربین کہلاتا تھا اس کے نزدیک ارادۂ انسانی خود مختار اور آزاد ہے، اس کے برخلاف بعض دوسرے فلاسفہ مثلاً رواقیین کا عقیدہ تھا کہ ارادۂ انسانی ایک خاص نہج پر چلنے پر مجبور ہے اس سے تجاوز کرنا اس کے لئے ناممکن ہے۔

معتزلہ اور ان کے اصول

اسلامی دور میں جب فتوحات کا سلسلہ ختم ہوا اور اسلامی خلافت کی بنیادیں استوار ہوگئیں تو مسلمانوں نے علوم وفنون کی طرف توجہ کی اور منجملہ دیگر علوم کے فلسفہ یونان کے طبیعیاتی اور مابعد الطبیعیاتی مسائل کا بھی مطالعہ کیا اور جب ملاحدہ دہریہ اور دیگر غیر اسلامی فرقوں کی طرف سے اسلامی عقائد پر فلسیانہ نقطۂ نظر سے اعتراضات شروع ہوئے تو علمائے اسلام نے اسی انداز میں ان کے جوابات دیئے۔ اسی کے نتیجہ میں علم کلام کا ظہور ہوا، جس میں عقائد اسلام کی تائید اور مخالفین کی تردید عقلی دلائل کی روشنی میں کی جاتی تھی اور علم کلام سے دلچسپی رکھنے والے علماء متکلمین کہلاتے تھے ان متکلمین کے مختلف فرقے تھے، مثلاً معتزلہ، مرجیۂ، شیعہ، اور خوارج وغیرہ لیکن ان

سب میں معتزلہ کو خاصی اہمیت حاصل ہے کیونکہ انھوں نے بہت سے مسائل پیدا کیے، ان کو شرح و بسط سے بیان کیا اور اپنے خاص اصول وضع کیے، جن میں سے پانچ اصول ایسے ہیں جو معتزلہ کی جملہ شاخوں میں مشترک ہیں جیسا کہ تیسری صدی ہجری کا مشہور معتزلی عالم الخیاط لکھتا ہے۔

ولیس یستحق احد منهم اسم	اور ان میں سے کوئی شخص معتزلی
الاعتزال حتی یجمع القول بالاصول	کہلانے کا مستحق نہیں ہے جب تک کہ
الخمسة التوحید والعدل والوعد	ان پانچ اصولوں کا قائل نہ ہو، اول
والوعید والمنزلة بین المنزلتین	توحید، دوم عدل، سوم وعدووعید،
والامر بالمعروف والنهی عن المنکر	چہارم المنزلة بین المنزلتین، پانچواں
(کتاب الانتصار ص١٦٦)	امر بالمعروف اورعن المنکر،

معتزلہ کا مسلک

ان اصول پنجگانہ میں اصل دوم عدل کا مسئلہ زیر بحث موضوع سے خصوصی تعلق رکھتا ہے اور اگر چہ عامۃ المسلمین عدل الٰہی کے قائل ہیں لیکن معتزلہ نے حسب معمول عدل کے مفہوم وحدود کی تفسیر میں غلو سے کام لیکر اس سلسلہ میں بہت سے مسائل پیدا کردئے اور بنیادی غلطی یہ کی کہ خالق کو مخلوق پر قیاس کیا جسے علم کلام کی اصطلاح میں قیاس الغائب علی الشاہد سے تعبیر کیا جاتا ہے مثلاً ان کا قول تھا کہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ انسانوں میں سے جو شخص جور کا مرتکب ہوتا ہے وہ جائر کہلاتا ہے اور جو ظلم کرتا ہے وہ ظالم کہلاتا ہے اسی طرح جو شخص دوسرے کو کسی فعل میں مدد کرے اور پھر اس پر سزا دے وہ بھی جائر کہلاتا ہے اور چونکہ عدل اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے اس لئے ظلم و جور سے وہ مبرّا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے، وما ربک بظلام للعبید یعنی تیرا رب اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے، اسی طرح دوسری جگہ فرمایا۔

وماظلمنا هم ولكن كانوا انفسهم يظلمون (اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے)

اس بحث کو جب اور زیادہ تفصیل میں لے گئے تو اس سے مختلف مسائل پیدا ہوئے جن میں سے اہم ترین مندرجہ ذیل ہیں،

ا۔ یہ کہ اللہ تعالےٰ مخلوق کو ایک خاص غرض کی جانب چلاتا ہے، اور وہ اسی بات کا ارادہ کرتا ہے۔ جس میں مخلوق کا خیر مضمر ہو۔

۲۔ یہ کہ اللہ تعالیٰ نہ تو شر کا ارادہ کرتا ہے۔ اور نہ شر کا حکم دیتا ہے۔

۳۔ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے نہ تو بندوں کے افعال حسنہ کو خلق کیا اور نہ افعال سیّئہ کو بلکہ انسان خود اپنے افعال کا خالق ہے۔ اسی بنا پر افعال حسنہ پر ثواب اور افعال سیّئہ پر عقاب پاتا ہے۔

مذکورہٗ بالا اصول کے نتیجہ میں معتزلہ نے دو مشہور نظریے اختیار کیے جن میں سے ایک نظریہ حسن و قبح عقلی ہے، اور دوسرا نظریہ صلاح و اصلح ہے، موخر الذکر نظریہ کے سلسلے میں امام ابوالحسن اشعری نے اپنے معتزلی استاذ ابوعلی الجبائی سے مناظرہ و مباحثہ کیا اور اپنے حسن استدلال سے استاذ کو لاجواب کر دیا،[۱] بعض مستشرقین مثلاً میکڈونالڈ کا خیال ہے کہ یہی مناظرہ امام اشعری کے معتزلی عقائد سے توبہ کرنے کا سبب ہوا، معتزلہ نے ان دونوں نظریہ کے ثبوت میں کیا دلائل پیش کیے اور اوران کے مخالفین نے کیا اعتراضات کیے ان کی تمام تفصیلات علم کلام کی کتابوں میں موجود ہیں اس سلسلہ میں مزید بحث ہم کو اصل موضوع سے بہت دور لے جائے گی۔

غرض جب اسلامی دور میں فلسفیانہ مباحث کا آغاز ہوا تو مسئلہ جبر و اختیار کو بھی موضوعِ بحث بنایا گیا، عقیدۂ جبر کے علمبردار جہم بن صفوان اور ان کے اشیاع اور اتباع کا خیال تھا کہ انسان مجبورِ محض ہے نہ اس کے لئے آزاد ارادہ ہے اور نہ ہی اس کو اپنے افعال کے خلق پر قدرت حاصل ہے، بلکہ خود اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھوں اعمال و افعال کا خالق ہے، اس کے برعکس معتزلی کا قول تھا کہ انسان کا ارادہ آزاد ہے، اور خود انسان کی قدت اس کے اعمال کی خالق ہے، اور کوئی فعل کرنا یا نہ کرنا اس کے اختیار میں ہے چنانچہ انسان جو چاہتا ہے کرتا ہے جیسا کہ ملا محمود نے لکھا ہے۔

اہل اعتزال نظر را براں مقصود داشتہ گمان — معتزلہ نے اس مقصد کو نگاہ میں رکھ کر گمان

---

[۱] طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۲۴۵

بردہ اند کہ انسان و سائر حیوانات در افعال اختیار یہ حرکاتِ ارادیہ مختار محض وقادر بحت اند اگر خواہند کنند و اگر نخواہند نہ کنند۔ نہ کردن بحدِّ وجوب رسیدہ دنا کردن بمرتبۂ ضرورت انجامید۔ و خالق بحق وقادر مطلق آدمی را مثلاً اقتدار دادہ وزمام قدرت در قبضۂ اختیارش نہادہ۔[1]	کیا ہے کہ تمام انسان وحیوانات اختیاری افعال اور ارادی حرکات میں مختار محض اور اصلاً قادر ہیں اگر چاہیں تو کریں اور نہ کرنا چاہیں تو نہ کریں، نہ کرنا واجب ہونے کی حد کو پہونچتا ہے اور رک جانا ضرورت کے درجے میں آتا ہے قادر مطلق نے انسان و حیوان کو اقتدار دیا اور قدرت کی لگام کو ان کے قبضۂ اختیار میں رکھا۔

اس اختلاف بین المسلمین کی وجہ یہ تھی کہ دلائل عقلیہ نیز نصوص شرعیہ بادی النظر میں باہم متضاد و متعارض ہیں مثلاً ایک طرف تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بندوں سے عمل کا مطالبہ کرتا ہے اور بعض امور کا حکم اور بعض سے نہی فرماتا ہے اور تعمیل احکام پر ثواب اور ارتکابِ منہیات پر عذاب فرماتا ہے، چنانچہ جابجا جنت کا وعدہ اور جہنم کی وعید کی گئی ہے، اور روزِ قیامت اللہ تعالیٰ گنہگاروں سے سوال کریگا کہ تم نے کیوں نافرمانی کی اور کیوں کفر کیا حالانکہ میں نے تمہارے لئے پیغمبروں کو بشیر و نذیر بنا کر بھیجا، اس کے بعد یہ عقیدہ کس طرح معقول سمجھا جائے کہ انسان کی قدرت کا کوئی اثر ہی نہیں اور اگر بالفرض انسان کو کوئی قدرت حاصل نہیں تو اس عمل کے مطالبہ کا کوئی موقع نہیں اور نہ ثواب وعقاب کے کوئی معنے رہ جاتے ہیں۔ اور جملہ تکالیف شرعیہ بالمحال کی مصداق ہوجاتی ہیں۔

لیکن دوسری طرف جب ہم یہ کہتے ہیں کہ بندہ اپنے اعمال کا خالق ہے تو اس سے یہ حکم مترتب ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت محدود ہے اور ہر شے پر حاوی نہیں نیز یہ کہ عالم کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے اس میں بندہ اللہ تعالیٰ کا شریک ہے حالانکہ یہ ممکن نہیں کہ شے واحد دو قدرتوں کا موردِ وجود ہو کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ کی قدرت نے اس شے کو خلق کیا تو اس میں انسان کا کوئی دخل نہیں اور اگر

---

[1] رسالہ جبر و اختیار ص ۱۰ و مابعد

انسان کی قدرت نے اس کو خلق کیا تو اللہ تعالیٰ کی قدرت بے دخل ہو جاتی ہے اور یہ بھی ممکن نہیں کہ کسی شے کا بعض تو اللہ تعالیٰ کی قدرت سے معرض وجود میں آوے اور بعض بندے کی قدرت سے اس لئے کہ شے واحد میں بعض کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، علاوہ ازیں بہت سی آیات قرآنیہ صاف طور سے اس پر دلالت کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کا ارادہ جملہ اشیاء کو شامل ہے، غرض معتزلہ نے عدل کے مفہوم کی مخصوص توضیح وتشریح کی بنا پر پہلا موقف اختیار کیا اور انسان کی قدرت اور آزاد ارادہ کے قائل ہو گئے، اور ان تمام نصوص کی تاویل پیش کی جن کا ظاہر ان کے موقف کے خلاف نظر آیا۔ اور فرقہ جبریہ نے دوسرا موقف اپنایا اس لئے کہ ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی قدرت اور ارادہ کو محدود کر دینا نازیبا تھا، لہٰذا اس نے انسان کی قدرت پر دلالت کرنے والی ساری آیات قرآنی کی تاویل اپنے طریقہ پر کی۔

امام اشعری اور نظریۂ کسب

لیکن بعض دوسرے متکلمین دونوں فرقوں کے دلائل سے مطمئن نہیں ہوئے منجملہ ان کے امام ابوالحسن اشعری ہیں، انہوں نے ایک درمیانی مسلک اختیار کیا ہے جس کا انھوں نے کسب نام رکھا اس کی تشریح اس طرح کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک عادت مقرر کر لی ہے کہ بندہ کی مرضی (محدثہ) قدرت اور ارادہ کے وقت فعل کا خلق کرتا ہے نہ کہ بندہ کی قدرت اور ارادہ کے ذریعہ۔ چنانچہ قدرت انسانی اور فعل کے مابین اقتران عادی کا نام ''کسب'' ہے، اس صورت میں فعل کا مکتسب بندہ ہے، اگرچہ اس کا فاعل اور خالق حقیقی اللہ تعالیٰ ہی ہے چنانچہ خود امام اشعری فرماتے ہیں:۔

اذکان المکتسب	جب کسی شے کا مکتسب بندہ اس لیے
مکتسباللشیء لانہ وقع بقدرۃ	مکتسب ہے کہ وہ اس کی
لہ علیہ محدثۃ ولم یجز ان	عارضی (محدثہ) قدرت کی وجہ سے واقع
یکون رب العالمین قادرا علی	ہوئی اور اللہ تعالیٰ کا اس شئے پر ایسی قدرت

الشیء بقدرة محدثة فلم یجز ان	کے ساتھ قادر ہونا جائز نہیں تو یہ بھی جائز نہ
یکون مکتسباً للکسب وان	ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اس کے کسب کا مکتسب ہو
کان فاعلا له فی الحقیقة ـ ۱	اگرچہ اس کا فاعل حقیقی وہی ہے

حالانکہ اس توجیہ وتعلیل سے بھی یہ مسئلہ حل نہیں ہوا کیونکہ اس میں صرف تعبیر کا فرق ہے ورنہ دراصل یہ بھی جبر ہی کی ایک نئی شکل ہوئی زیادہ سے زیادہ اسے جبر اختیاری کہا جا سکتا ہے،

بعض مسلم فلاسفہ کا مسلک

بعض مسلم فلاسفہ نے دونوں نظریہ جبر واختیار کے مابین تطبیق کے لئے ایک دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ ان کا قول ہے کہ جملہ عالم اسباب ومسببات پر مبنی ہے اور ارادۂ انسانی ان اسباب کا تابع ہے پس جب انسان کسی امر کا ارادہ کرتا ہے تو وہ بعض اسباب کی وجہ سے کرتا ہے، اور جب اس کا ارادہ نہیں کرتا تو وہ بھی بعض اسباب کی بنا پر ایسا کرتا ہے، مثلاً جب کوئی بھوکا انسان لذیذ غذا کو دیکھتا ہے تو بے اختیار اس کی خواہش کرتا ہے۔ اور جب کسی تکلیف دہ اور اذیت رساں شے کو دیکھتا ہے تو اس سے احتراز وفرار اختیار کرتا ہے، اس طرح ہمارے جملہ اعمال دو امر کا نتیجہ ہیں اول اسباب خارجی، دوم ارادہ انسانی اور چونکہ اسباب خارجی ایک مخصوص نظام کے تحت قائم ہیں، ان میں کبھی خلل واقع نہیں ہوتا اور چونکہ ہمارا ارادہ داخلی ان ہی اسباب کا تابع ہے اس لئے یہ ارادہ بھی ایک مخصوص نظام کے مطابق ہے اور اسباب خارجی اور داخلی کا یہی مخصوص نظام شریعت میں قضا وقدر سے تعبیر کیا گیا ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے مقرر کر دیا ہے اس لئے جب ہماری نظر اسباب خارجی کی طرف اٹھتی ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ انسان مجبور ہے اور جب صرف ارادہ انسانی پر نظر ڈالتے ہیں تو انسان صاحبِ اختیار نظر آتا ہے مشہور اسلامی فیلسوف ابن رشد نے یہی مسلک اختیار کیا ہے ۲

---

۱ اشعری، کتاب، اللمع ص ۷۳، ۷۴، ۷۷، قاہرہ ایڈیشن ۱۹۵۵ء ۲ مزید تفصیل کے لئے دیکھئے مناہج الادلہ ص ۱۰۷، ومابعد

ملا محمود کا مسلک

ملا محمود جون پوری نے بھی اپنے رسالہ کے آغاز میں معتزلہ کا موقف واضح کرنے کے بعد اسی مسلک کو بیان کیا ہے کہ انسان ایک لحاظ سے مجبور ہے لیکن دوسرے اعتبار سے مختار ہے کیونکہ اس کے جملہ افعال واعمال کسی علت کے محتاج ہیں، اور وہ علت اس کی قدرت وارادہ کا فعل سے تعلق ہے اور چونکہ ارادہ جانب وجود اور جانب عدم دونوں کا احتمال رکھتا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ کسی ایک جانب کے لئے کوئی علت مرجحہ ہو جو انسان کے قدرت وارادہ سے خارج ہو، لہٰذا لازمی طور پر اس علت کا تعلق قدرت وارادۂ الٰہی سے ہونا چاہئے، چنانچہ لکھتے ہیں۔

وارباب تحقیق فراتر ازین بے پردہ بہ	ارباب تحقیق نے اس کھلی ہوئی حقیقت کو اپنی نگاہ
باصرۂ بصیرت مشاہدہ نمودہ اند کہ	بصیرت سے پہلے ہی دیکھ لیا ہے کہ انسان مختار
انسان مختارے است مجبور، وقادرے	ہوتے ہوئے بھی مجبور ہے اور قادر ہوتے
است مضطر کہ افعالش اختیاری و	ہوئے بھی اضطراری ہے کیونکہ اس کے افعال
اختیارش اضطراری، چہ ہمچناں کہ	اختیاری ہیں مگر اس کا اختیار اضطراری ہے۔ اس
افعالش بہ واسطۂ امکان محتاج بعلت	طور سے کہ اس کے افعال امکان کے واسطہ سے
است کہ آن قدرت وارادۂ او بلکہ تعلق	علت کے محتاج ہیں اس کے وہ قدرت وارادہ
آن ارادہ وقدرت تواند بود	بلکہ اس ارادہ وقدرت کا تعلق ایسے ہی ہو سکتا ہے
ہمچناں کہ تعلق قدرت واختیار ممکن نہ	کہ ممکن قدرت واختیار کا تعلق نہ واجب جائز
واجب جائز است نہ ضروری پس بنا	ہے نہ ضروری، پس اسی وجہ سے لازمی طور پر
برین ناچار محتاج بود بہ مرجحے کہ جانب و	محتاج ہے ایک ایسے مرجح کا جو اس کے جانب
جودش را بر عدم ترجیح دہد، واز جہت قطع	وجود کو عدم پر ترجیح دے اور دور وتسلسل کے ختم
دور وتسلسل باید کہ آن مرجح منتہی گردد	ہونے کے اعتبار سے چاہئے کہ یہ مرجح ایک
بامرے خارج از قدرت وارادہ او کہ	ایسے امر پر ختم ہو جو اس کے ارادہ وقدرت سے

بقدرت وارادہ حق تعالیٰ منوط و مربوط بودلے	الگ ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کے قدرت و ارادہ سے مربوط رہے،

آگے چل کر فرماتے ہیں کہ اگر نظام عالم کا بغور مطالعہ کیا جائے تو قطعی طور پر یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ سارے اجزاءِ خلقت باہم علت و معلول کے سلسلہ سے وابستہ ہیں اور ہر معلول آخر علت ادنی سے اور اس کے ذریعہ علة العلل اور مسبب الاسباب سے قریبی تعلق رکھتا ہے اسلئے جس وقت قدرت وارادہ انسانی کا تعلق فعل کے ساتھ بشرط وجودِ جملہ اسباب خارجیہ پیدا ہوتا ہے لازمی طور پر فعل معرض وجود میں آجاتا ہے اور جب یہ تعلق معدوم ہوجاتا ہے تو وجود فعل محال ہوجاتا ہے، اس کی توضیح خود ملا صاحب کے الفاظ میں حسب ذیل ہے۔

واگر کسی نگاہ ژرف، از نظام عالم بکار بردہ از سوافل بعوالی واز ثوانی بہ اوائل سیر نماید، بہ یقین دریابد کہ آخر ایں سلسلہ بہ اولش در پیوستہ است ومنتہائے ایں رشتہ بمبداءاش باز بستہ۔ وچوں چنیں باشد پس ہنگام تعلق قدرت و ارادہ و اختیار بفعل، باوجود سائر شرائط واسباب، وجود فعل ضروری بود، وگرنہ تکلفِ معلول از علت لازم آید، ودروقت عدمِ ایں تعلق وجودِ فعل محال باشد، واگرنہ ممکن از علت مستغنی گردد۲	اگر کوئی شخص گہری نظر سے نظام عالم کو دیکھے اور نیچے سے اوپر تک اور دوسرے سے پہلے تک کی سیر کرے تو اسکو یقین ہوجائے گا کہ اس سلسلہ کا آخری سرا اس کے اول سے جڑا ہوا ہے اور اس تعلق کا منتہا اس کے مبدا سے پھر بندھ گیا ہے جب ایسا ہے تو قدرت اور کام کے ارادہ واختیار کے وقت تمام شرائط و اسباب کے باوجود فعل کا وجود ضروری ہے، ورنہ علت سے معلول کا تخالف لازم آئے گا۔ اور اس تعلق کے معدوم ہونے کے وقت میں وجود فعل محال ہوگا ورنہ ممکن علت سے بے نیاز ہوجائے گا

اور یہی حال خود تعلق قدرت وارادہ کا بھی ہے کہ اگر اس کی علت موجود ہوگی تو وہ تعلق بھی موجود ہوگا اور اگر علت معدوم ہوگی تو وہ بھی معدوم ہوگا چنانچہ فرماتے ہیں۔

---

۱ رسالہ جبر و اختیار ص ۱۳ و مابعد ۲ ایضاً ص ۱۶ و مابعد

وچنیں است سخن در تعلق قدرت وارادہ، کہ	اور یہی بات قدرت وارادت کے تعلق کی ہے
ہنگام وجودِ علتش واجب التحقیق است و	اس کی علت جب ہوگی تو وہ تعلق بھی ضرور ہوگا
وقتِ فقدان ضروری العدم [1]	اور اگر علت معدوم ہوگی تو وہ بھی نہیں ہوگا۔

معتزلہ متقدمین کا قول

بعض معتزلہ متقدمین کے نزدیک ارادہ ایک صفت ہے جس کا فعل سے تعلق نام ہے دو متساوبین میں سے کسی ایک کی ترجیح کا بغیر مرجح کے لہٰذا دو متساویین مثلاً نشستن اور برخاستن میں سے ہر ایک دوسرے پر بغیر کسی مرجح کے ترجیح پا سکتا ہے۔

ملا محمود اس قول کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگر ارادہ کا تعلق دو متساوبین میں سے ہر ایک کے ساتھ جائز ہوسکتا ہے تو جس وقت اس کا تعلق بجائے ایک کے دوسرے کے ساتھ ہوگا اس وقت دو متساوبین میں سے ایک کی ترجیح بلا مرجح لازم آئے گی۔ بالفاظ دیگر اگر کوئی امر کے ساتھ ارادہ کا تعلق اور عدم تعلق دونوں برابر ہونگے تو حصول تعلق ترجیح بلا مرجح ہوگا اور اس تعلق کا مرجح ارادہ نہیں ہوسکتا اسلئے کہ ارادہ کی ترجیح اس امر میں ہوتی ہے، جس کے ساتھ اس کا تعلق ہوتا ہے اور یہاں گفتگو عین تعلق کے بارے میں ہے، اور جو شخص امور اختیاری میں ترجیح بلا مرجح کو جائز رکھتے ہوئے اس کو امتناع ترجیح بلا مرجح کے قضیہ کلیہ سے مستثنیٰ قرار دیتا ہے وہ اس قابل نہیں کہ اس سے گفتگو کی جائے، کیوں کہ اس قسم کی تخصیصات قواعد وضعیہ اور مصطلحات لغویہ میں تو جاری ہوسکتی ہیں لیکن قوانین عقلیہ قطعیہ میں یہ ناممکن ہے،

مسئلہ تکالیف شرعیہ

یہاں ایک اعتراض وارد ہوتا ہے وہ یہ کہ ان حالات میں تکالیف شرعیہ عبث ہیں، اور ارسال رسل، انزال کتب، مواعظ علماء اور نصائح حکماء خلاف حکمت و مصلحت ہیں اس لئے کہ اگر

---

[1] رسالہ جبر واختیار ص ۱۸

تعلق ارادہ بفعل کی علت تامہ جو بندہ کے اختیار سے خارج ہے، موجود ہوگی تو بندہ کا ارادہ لازمی طور پر فعل سے متعلق ہو جائے گا، جس کو نہی وزجر کے ذریعہ روکا نہیں جا سکتا لیکن جب اس کی علت تامہ موجود نہ ہوگی تو تعلقِ ارادہ کا حصول اور فعل کا وجود محال ہوگا، اور امر محکم کے ذریعہ بندہ کو اس فعل پر نہیں لایا جا سکتا مختصر یہ کہ اگر چہ انسان اپنے افعال میں مختار ہے لیکن اس کا اختیار اضطرار سے وابستہ ہے اور تکلیف مضطر جائز نہیں۔

اس اعتراض کا جواب خود ملا صاحب کی زبان سے سنئے، فرماتے ہیں۔

''تکلیف از علل ناقصۂ تعلق ارادہ است بفعل، کہ چوں با دیگر شرائط و اسباب انضمام یابد، تعلق ارادہ بفعل ازاں مترتب گردد، واگر در بعض محل مثل تکلیف ابوجہل بایمان کہ بواسطۂ عدم انضمامِ دیگر اسباب، یاوجود موانع اثر براں ترتب نپذیرد، لازم نیاید کہ اصل تکلیف عبث باشد[1]۔	تکلیف شرعی بالفعل ارادہ کے ناقص تعلق کی وجہ سے ہے کیونکہ جب انضمام کے دوسرے شرائط واسباب ہونگے ارادہ بفعل کا ہر تعلق اس سے قائم ہو جائے گا اور اگر کچھ محل میں جیسے ابوجہل کا ایمان لانے کے لئے مکلّف ہونا دوسرے اسباب کے عدم انضمام کے واسطہ سے باوجود اس کے اثر کی روکاوٹوں کے اس پر مرتب نہیں ہوا۔ ضروری نہیں ہے کہ اصل تکلیف شرعی بیکار ہو۔

ایجاب ثواب وعقاب

معترضین کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ مذکورہ بالا مقررات کی روشنی میں عذاب وعقاب جورِ محض ہو جاتا ہے۔

اس کا جواب ملا صاحب نے یہ دیا ہے کہ عذاب کی حقیقت یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ عاصی سے عصیان وطغیان کی وجہ سے انتقام لیتا ہے، جیسا کہ عام طور پر لوگوں نے سمجھا ہے بلکہ عاصی

[1] رسالہ جبر واختیار ص ۳۵

بمنزلہٗ مریض ہے اور معاصی کی مثال اغذیۂ فاسدہ کی سی ہے معصیت کی وجہ سے جو ہیئت دل میں مرتسم ہو جاتی ہے، وہ بمنزلہ اخلاط ردیہ ہے اور حکیم مطلق بمنزلہٗ طبیب۔ لہٰذا جس طرح طبیب کی مخالفت اور غلط تدبیر سے درد والم پیدا ہوتا ہے (حالانکہ طبیب مریض سے کوئی انتقام نہیں لیتا) اسی طرح احکام الٰہی کے عدم امتثال سے آلام اخروی متفرع ہوتے ہیں، بغیر اس کے کہ اللہ تعالیٰ کوئی انتقام لیتا ہو یا نعوذ باللہ ظلم کرنا چاہتا ہو، جیسا کہ ارشادِ باری ہے وَمَا ظَلَمْنَاھم وَلٰکِن کَانُوا اَنْفُسَھُمْ یظلِمُوْن۔

ایجاب ثواب وعقاب جسمانی

اس کے بعد اگر یہ کہا جائے کہ یہ توجیہ عقاب روحانی کے بارے میں تو سمجھ میں آ جاتی ہے، لیکن جہاں تک عقاب جسمانی کا تعلق ہے جس کے متعلق شریعت حقہ نے خبر دی ہے اس کے بارے میں یہ توجیہ حد درجہ مشکل ہے کیونکہ مارو کثر دم کا لزوم اوامر کے ترک اور نواہی کے ارتکاب کی بنا پر کسی طرح تصور میں نہیں آتا۔

اس کی تردید میں ملا صاحب فرماتے ہیں کہ علمائے شریعت اور ائمۂ ملت ثواب وعقاب جسمانی پر دلالت کرنے والی آیات کو تمثیل معانی بہ صُور پر محمول کرتے ہیں، لیکن اگر ہم ایسا نہ کریں بلکہ ان کے ظاہری مفہوم ہی کو مراد لیں تو بھی ہو سکتا ہے کہ اس دنیا کے اعمال سیۂ اور آخرت کے مار دکثر دم کے درمیان ایک خاص قسم کا لزوم ہو جس کے ادراک واحاطہ سے ہماری عقول ناقصہ قاصر ہوں اس لئے کہ یہ ضروری نہیں کہ نفس الامر میں جو کچھ واقع ہو اس کی لم بھی ہم پر منکشف ہو جائے کیونکہ قرآن کریم فرماتا ہے۔

وما او تیتم من العلم الاقلیلا (ہم نے تم کو تھوڑا سا علم دیا ہے) ہو سکتا ہے کہ جس طرح مقناطیس کی خاصیت جذبِ آہن ہے اسی طرح اعمال سیۂ کی خاصیت مارو کثر دم ہو اور مومن خبر نبوت کی تصدیق کی وجہ سے اس کا اعتقاد رکھتا ہے اور محقق کشف وشہود کی بنا پر اس پر یقین کرتا ہے، اس کے بعد فرماتے ہیں۔

دہر کہ بقراط و جالینوس را در خواص ادویہ و عقاقیر بے ادراکِ لِمِ آن تصدیق نماید و محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم را در خواص اعمال بے دریافت وجہ لزوم تصدیق نہ کنندہ ہمانا کہ از ایمان بہ مراحل دور خواہد بود	بقراط و جالینوس دواؤں اور جڑی بوٹیوں کے خواص کی تصدیق ان دواؤں اور جڑی بوٹیوں کی حقیقت سمجھے بغیر نہیں کرتے ۔اور محمد ﷺ اعمال کے خواص میں وجہ لزوم کو جانے بغیر اس کی تصدیق نہیں کرتے اس طرح کہ کئی مرحلے میں ایمان سے دور ہو جائے گا۔

مسئلہ عفو عذاب

لیکن اس تقریر کے بعد بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر درد والم لازم معصیت ہے، اور لازم کا انفکاک ملزوم سے بحال ہے تو پھر عفو خداوندی کی گنجائش باقی نہیں رہتی اور نہ شفاعت سے کوئی فائدہ ہوگا۔

اس کا جواب ملا صاحب نے یوں دیا ہے کہ درحقیقت موجب الم اور باعث عقاب وہ ہیئتِ ردیّہ ہے جو نفس کے اندر معصیت کی وجہ سے راسخ ہو جاتی ہے، اور اس ہیئتِ کے رسوخ کے لئے چند شرائط اور موانع ہیں کیونکہ ہوسکتا ہے کہ بعض حالت میں معصیت کے باوجود بعض شرائط کے فقدان یا بعض موانع کے موجود ہونے کی وجہ سے وہ ہیئتِ ردیہ متحقق نہ ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ متحقق ہونے کی بعد اس کے ضد کے پائے جانے سے منتفی اور معدوم ہو جائے اور چونکہ فقدانِ شرائط یا وجود موانع اپنی ندرت وخفا کی وجہ سے ہماری ناقص اور جزئی عقل کے ادراک و احاطہ سے خارج ہے، اس لئے اس کو عفو الہٰی سے تعبیر کرتے ہیں، کیونکہ جملہ امور کا مرجع ومنتہا ذاتِ باری تعالیٰ ہے جیسا کہ بعض اسباب خفیہ و نادرہ کو بخت اور اتفاق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اور چونکہ نبوت پر اعتقاد کامل اور روحانیت نبی سے استمداد، ہیئتِ ردیہ کے رسوخ سے مانع ہے اس لئے شفاعت سے عام طور پر، اسی کی طرف اشارہ مقصود ہوتا ہے، یا اسی کا نام شفاعت ہے۔[1]

---

[1] رسالہ جبر واختیار ص ۳۲

اشارہ بہ مسلکِ صوفیہ

رسالہ جبر واختیار کے خاتمے پر ملا صاحب فرماتے ہیں کہ اسباب وعلل کا سلسلہ اور مشیت ایزدی تک اس کی انتہا دراصل اس مبتدی کے لئے ہے، جس کی محدود نگاہیں معلومات وعلل کی جزئیات سے آگے تجاوز نہیں کرسکتیں لیکن جو منتہی سارے عالمِ وجود کو بصیرت کی روشنی میں دیکھتا ہے اسکے نزدیک از اول تا آخر بجز ایک معلول کے کوئی دوسری علت اور بجز مسبب الاسباب کے کوئی دوسرا سبب نظر نہیں آتا، چنانچہ فرماتے ہیں:۔

دپوشیدہ مباد کہ آنچہ ازترتب	پوشیدہ نہ رہے کہ اسباب وعلل کا سلسلہ مشیت الٰہی
اسباب وانتہائے آں مشئیت رب	تک اس کی انتہا جو کچھ بھی اس رسالہ میں بیان کی
الارباب مذکور شد، درنظر کسے است	گئی ہے، اس آدمی کے لئے ہے جس کی آنکھ جملہ
کہ صدقہ بصیرتش از ملاحظۂ نظام	نظام عالم کو ایک ہی دفعہ دیکھنے سے تنگی نہ کرے۔ اس
جملی بیک دفعہ تنگی نمودہ نظرش از	نگاہ علل ومعلول کے جزئیات کو سمیٹ نہ سکے۔
جزئیات معلولات وعلل عبور نہ نماید،	لیکن جو شخص کہ سارے عالم وجود کو بصیرت کی
اما ہر کہ دیدار اورا گنجائش احاطہ کل	روشنی میں دیکھتا ہے اس کی نگاہ شہود میں ازل سے
عالم وجود بود، درنظر شہودش از ازل تا	ابد تک سوائے ایک معلول کے جو دیکھنے والے
ابد جز یک معلول کہ بافاضۂ عین	کے دامن نظر کو دھند اور غبار سے پاک کر کے
مقدسہ از شوائب امکان بخشش وجود	وجود کے تحفہ بلکہ وجوب کی دولت سے
بل وجوب یافتہ مسببے ومعلولے	بھردے۔ کوئی اور مسبب ومعلول نظر نہیں آتا
ملحوظ نہ بود وجز مسبب الاسباب	اور مسبب الاسباب کے علاوہ کوئی دوسری
علتے وسببے نہ۔	علت وسبب نہیں۔

دیدہ باید از سبب سوراخ کن   تا سبہا بر کند از بیخ و بُن [۱]

(غور کرنا چاہئے کہ جو سوراخ کرنے والا سبب ہے وہی اسباب کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکتا ہے)

[۱] رسالہ جبر واختیار ص ۳۴، ۳۵

رسالہ جبر واختیار کا جواجمالی خاکہ پیش کیا گیا اس سے ملا صاحب کی عظیم المرتب شخصیت اور فلسفیانہ اور کلامی مباحث میں انکی عبقریت کا پورا اندازہ ہوجاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جبر واختیار دقیق ترین اور نازک ترین مسئلہ ہے اسی لئے شارع علیہ السلام نے اس میں غور وخوض سے منع فرمایا ہے۔ لیکن ملا صاحب نے مسئلہ کے غوامض ودقائق کو ایسی وضاحت سے بیان فرمایا ہے، اور اس سے متعلق اعتراضات واشکالات کو ایسے دلائل سے دفع کیا ہے کہ یہ مسئلہ منقح ومجلیٰ شکل میں ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ اس لئے ملا صاحب حسب ذیل دعویٰ کے بجا طور پر مستحق ہیں۔

وہمانا کہ تا این ہنگام کسے از علماءِ اعلام در توضیح وتنقیح این مطلب شدت ومقصدِ شگرف بدین تدقیق وتحقیق سخن نگفتہ وخار وخاشاکِ دہم وشک از نہج برہان وطریق ایقان نرفتہ [1]	اور ایسے ہی ہے کہ اب تک علمائے اعلام میں سے کسی نے اس مضمون کی توضیح وتنقیح میں اتنی عمدگی اور اس تحقیق ودقت نظر کے ساتھ گفتگو نہیں کی اور وہم وشک کے خس وخاشاک کو دلیل کے طرز اور یقین کے راستے سے کوئی نہیں ہٹا سکا۔

[1] رسالہ جبر واختیار ص ۸

(۶)

مولانا حافظ امان اللہ بنارسیؒ

گزشتہ دور میں جونپور، ظفر آباد، لکھنؤ اور الٰہ آباد کی طرح بنارس بھی دیار پورب میں اسلامی علوم وفنون اور اربابِ فضل وکمال کا مرکز رہا ہے، اور یہاں کے علماء ومشائخ نے ہر زمانہ میں مدرسوں اور خانقاہوں کو اپنی علمی وروحانی سرگرمیوں سے آباد رکھا ہے، شیخ داود بن قطب بنارسی ۹۰۶ھ شیخ مبارک بن ازرانی بنارسی ۹۸۰ھ، شیخ محمد ماہ بنارسی، شیخ طیب بن معین بنارسی ۱۰۴۲ھ، شیخ یٰسین بن احمد بنارسی، شیخ نظام الدین بنارسی، حافظ امان اللہ بن مفتی نور اللہ بنارسی ۱۱۳۳ھ، مولانا محمد وارث رسول نما بنارسی ۱۱۶۶ھ مولانا ابوالبرکات بن فضل امام بنارسی ۱۲۸۹ھ مفتی ابراہیم ابن عمر بنارسی ۱۲۵۴ھ مفتی سخاوت علی بن مفتی ابراہیم بنارسی، ۱۲۸۱ھ مفتی واحد علی بن مفتی ابراہیم بنارسی ۱۲۷۹ھ شیخ عمر بن غوث بنارسی ۱۲۲۵ھ، مولانا فائق علی بنارسی، مولوی جلال الدین احمد بنارسی ۱۲۷۹ھ، وغیرہ اپنے اپنے دور میں یہاں کے مشائخ کبار اور علمائے فحول میں گزرے ہیں، ان میں جامع المعقول والمنقول صاحبِ تصانیف کثیرہ حضرت مولانا حافظ امان اللہ بن مفتی نور اللہ حنفی بنارسی، اپنے معاصرین میں خاص شہرت اور مخصوص مقام ومرتبہ کے مالک ہیں۔ آج کی بزم شرق میں ان ہی کا سرنامۂ داستان ہے۔

ہماری تحقیق میں ان کے سب سے قدیم تذکرہ نگار شیخ غلام علی آزاد بلگرامی ۱۲۰۰ھ ہیں، جنھوں نے ان کی وفات کے سینتالیس ۴۷ برس بعد مآثر الکرام میں ۱۱۸۰ھ میں ان کا تذکرہ کیا اور سبحۃ المرجان میں بھی ان کا حال لکھا ہے، ان دونوں کتابوں میں جو کچھ درج ہے وہی بعد کے سوانح نگاروں کا ماخذ ہے، چنانچہ تذکرۂ علمائے ہند اور نزہۃ الخواطر وغیرہ میں ان ہی کتابون کے حوالے سے ان کے حالات درج کئے گئے ہیں، اگر شاذ ونادر کوئی نئی بات دوسری کتابوں میں ملتی ہے تو ان کے معاصرین کے حالات کے ضمن میں ملتی ہے۔

نام ونسب وخاندانی حالات

حافظ امان اللہ بن مفتی نور اللہ بن حسین بنارسی کا سلسلۂ نسب اس سے زیادہ نہ مل سکا ان کا خاندان کہاں سے اور کب بنارس میں آکر آباد ہوا ؟ اس بارے میں بھی ان کے تذکرہ نویس خاموش ہیں۔ البتہ ان کے والد مفتی نور اللہ ابن حسین عہد عالمگیری میں بنارس کے قاضی ومفتی اور صوفی صافی بزرگ ہونے کے ساتھ فقہائے احناف میں شمار ہوتے تھے، سلطان عالمگیر ان کے بڑے معتقد تھے اور ان کے لئے مسجد اور خانقاہ تعمیر کرائی تھی، گنج ارشدی میں ہے کہ مفتی نور اللہ نے طریقت کی تعلیم وتربیت حضرت شیخ دیوان محمد رشید جون پوری ۱۰۸۳ھ سے حاصل کر کے ان کے فرزند حضرت شیخ محمد ارشد جون پوری ۱۱۱۳ھ سے خرقۂ خلافت ومشیخت پایا تھا، ان کا شمار مشاہیر فقہاء حنفیہ میں سے تھا اور وہ اپنے زمانے کے مشہور مشائخ چشت میں سے تھے، ۱۱۰۴ھ میں بنارس میں وفات پائی۔ سلطان عالمگیر نے مفتی صاحب کے لئے محلہ دارانگر تیرتھ تالاب کے پاس ۱۰۷۷ھ میں ایک شاندار سنگین مسجد تعمیر کرائی تھی۔ جو مسجد عالمگیری اور مسجد فوارہ کے نام سے آج بھی موجود ہے اس کی تعمیر مفتی صاحب کے مشورہ سے ہوئی تھی، محراب میں آیت "فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔ کندہ ہے جس سے تاریخ تعمیر نکلتی ہے، اس کی تعمیر کے تقریباً بیس سال بعد ۱۰۹۶ھ میں عالمگیر کے حکم سے مفتی صاحب کے لئے ایک عالیشان خانقاہ بھی تعمیر ہوئی اس کا مادۂ تاریخ ''دولت خانہ'' ہے جس سے ۱۰۹۶ھ نکلتا ہے، خیال ہے کہ یہی خانقاہ دار القضاء بھی رہی ہوگی، اس کی دیوار پر اب تک یہ کتبہ موجود ہے۔

زحکم شاہ سلطانِ شریعت — دلیل زہد، بُرہانِ طریقت
شہاب آسمانِ سرفرازی — محمد شاہ عالمگیر غازی
باستصواب نور اللہ مفتی — غلامِ درگہِ پیرانِ چشتی
بنائے خانقاہے ہست پیدا — ز''دولت خانہ'' تاریخش ہویدا

اس وقت مفتی صاحب کے فرزند حافظ امان اللہ سن رشد کو پہونچ چکے تھے اور انھوں نے

۱۰۹۶ھ ہی میں خانقاہ کی تعمیر کے وقت والد کی حیات میں ان کے لئے مقبرہ اور روضہ تیار کرالیا تھا، جس میں مفتی صاحب اور ان کے بعد خود حافظ صاحب بھی دفن کئے گئے۔[1]

حافظ صاحب کا مولد و منشا بنارس ہے، مگر کب پیدا ہوئے؟ اس کے بارے میں کوئی تصریح نہیں ملتی، اتنا معلوم ہے کہ انھوں نے ۱۰۹۶ھ میں خانقاہ کی تعمیر کے وقت اپنے والد کا روضہ تعمیر کرایا تھا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت ان کی عمر تیس چالیس سے کم نہ رہی ہوگی، اس حساب سے ان کی پیدائش ۱۰۵۰ھ کے حدود میں ہوئی ہوگی۔

تعلیم و تربیت

حافظ صاحب نے ایسے گہوارے میں آنکھ کھولی جو علم فضل کا مرکز تھا، آپ کے والد صوفی صافی بزرگ ہونے کے ساتھ عالم، فقیہ، مفتی اور قاضی بھی تھے، سلطان عالمگیر کی قدر شناسی اور علم پروری نے اس گھر میں جاہ وجلال بھی پیدا کردیا تھا، اس زمانہ میں پورب کا علاقہ عالمگیر کی توجہ سے خانقاہ اور مدرسہ بنا ہوا تھا شہر شہر قریہ قریہ میں علماء وفضلاء سکونِ قلب کے ساتھ اپنے کاموں میں مشغول تھے، خصوصاً جونپور اور اس کے اطراف مدارس کا بہت بڑا مرکز تھے معلوم ہوتا تھا کہ سلطان ابراہیم شاہ شرقی کا دور لوٹ آیا ہے، مولوی خیر الدین محمد جون پوری نے تذکرۃ العلماء میں شیخ محمد ماہ کے ذکر میں لکھا ہے۔

اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ خود عالم باعمل اور عامل باعلم بود قدردانی علماء بیش از بیش می نمود واز عہد شاہ زادگی منظور داشت، تا جون پور مثل زمانِ سلاطین شرقیہ از کثرت فضلاء و مشائخان وانبوہِ ہجوم طلبۂ علومِ و

حضرت اورنگ زیب عالمگیر عالم باعمل اور عامل باعلم تھے، شاہزادگی ہی کے زمانہ سے علماء کی زیادہ سے زیادہ قدردانی کرتے تھے، یہاں تک کہ اسی زمانہ میں جونپور سلاطین شرقیہ کے دور کے مانند ہوگیا اور علماء و مشائخ کی کثرت اور طالبان علوم وفیوض کے انبوہ سے

[1] (تاریخ آثار بنارس ص۱۵،۱۶) از ریاض نانا مرحوم

کاسبانِ فیوض رونق پذیر باشد چوں بر
سر پر سلطنت نشست یرلیغ واجب
التبلیغ بناظم جون پور جہت ترقیم احوالِ
مدرسان و مشائخان ایں شہر صادر گر
دایند و سوانح نگاران و وقائع نویسان و
احکام تہدید برائے تحققیات کوائف
بودو باش ایں گروہ فرستاد، القصہ جون
پور در عہد آنحضرت وقصبات ونواحی
آن مدرسہائے قدیم تاسیس یافتند و
بسے خانقاہ و مدرسہ تعمیر جدید شدند، [۱]

رونق پیدا ہوگئی، اور جب تخت سلطنت پر رونق
افروز ہوئے تو ناظم جون پور کے نام خصوصی
حکمنامہ جاری کیا تا کہ وہ یہاں کے اساتذہ و
مشائخ کے حالات لکھ کر روانہ کرے نیز وقائع
نویسوں کو سخت تاکید کی تا کہ وہ اس طبقہ کی
معاش و معیشت کی خبر گیری کریں الغرض عہد
عالم گیری میں جون پور گلزار ارم بن گیا اور اس
کے اطراف و جوانب کے شہر و قصبات میں
قدیم مدارس کی ترقی کے ساتھ نئے مدارس اور
خانقاہیں تعمیر ہوئیں۔

علم دین اور روحانیت کے اس دور شباب میں حافظ صاحب پروان چڑھے خود ان کا گھر اس کا نمونہ تھا۔

حافظ صاحب نے کس کس سے کہاں کہاں تعلیم حاصل کی؟ اس کے بارے میں بھی تفصیل نہیں ملتی ہے۔ آزاد نے سبحۃ المرجان میں اجمالی طور سے یہ لکھا ہے۔

والحافظ امان الله حفظ القرآن — حافظ امان اللہ نے قرآن حفظ کیا اور اپنے
واخذ العلوم من علماء الزمان [۲] — زمانہ کے علماء علماء سے علوم حاصل کئے۔

نزہۃ الخواطر میں اس اجمال کی کسی قدر تفصیل یوں ملتی ہے۔

انھوں نے حفظ قرآن کے بعد طلب علم کے لئے سفر کیا، اور شیخ محمد ماہ دیوگامی اور شیخ قطب الدین شمس آبادی وغیرہ سے کتبِ درسیہ پڑھیں۔ [۳]

ان بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ حافظ صاحب نے اپنے زمانہ کے کئی علماء سے پڑھا جن میں مذکورہ بالا دو حضرات خاص طور سے قابل ذکر ہیں اور تحصیل علم کے لئے بنارس سے باہر کا

---

[۱] تذکرۃ العلماء ص ۵۱، الطافی پریس کلکتہ [۲] سبحۃ المرجان ص ۷۸ [۳] نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۳۹،

سفر کیا ان کے علمی سفر کے سلسلے میں دو مقامات اہم ہیں۔ ایک جونپور جہاں ملا محمد ماہ دیوگامی نے پچیس سال تک درس دیا تھا، تجلی نور میں ہے۔

اگرچہ او باشندۂ قصبہ دیوگام ضلع اعظم گڑھ بود، الا بعد فراغ تابست و پنج سال در جونپور قیام ورزیدہ درس داد۔[1]	ملا محمد ماہ اگرچہ دیوگام ضلع اعظم گڑھ کے باشندے تھے مگر انھوں نے فراغت کے بعد پچیس سال تک جونپور میں قیام کر کے درس دیا،

حافظ صاحب کے سفر کی دوسری منزل شمس آباد ہے جہاں سید قطب الدین نے بود و باش اختیار کر لی تھی، مآثر الکرام میں ہے،

اصلش از سادات ایتی من مضافات اودھ است، از وطن خود نقل کردہ شمس آباد را مشرف انوار ساخت شمس آباد از توابع قنوج است۔[2]	در اصل وہ مضافات اودھ ایتھی کے سادات سے ہیں مگر اپنے وطن سے نقل مکانی کر کے شمس آباد میں سکونت اختیار کر لی تھی جو کہ قنوج کے توابع میں ہے،

اساتذہ

حافظ صاحب کو اپنے والد ماجد کے سایۂ عاطفت میں نشو و نما کا موقع ملا تھا اور غالباً حفظ قرآن کے بعد ابتدائی کتابیں انہی سے پڑھیں، پھر بنارس سے جونپور آ کر ملا محمد ماہ دیوگامی کے مدرسہ میں داخل ہوئے اور وہاں سے شمس آباد جا کر شیخ قطب الدین سے بقیہ کتابیں پڑھیں آزاد کے اس بیان: "من علماء الزمان" اور نزہۃ الخواطر کی عبارت "وعلی غیرھما من العلماء" سے پتہ چلتا ہے کہ حافظ صاحب نے دوسرے اساتذہ سے بھی تحصیل علم کی تھی، مگر ان کے ناموں کا پتہ نہیں چلتا۔

---

[1] تجلی نور ج ۲ ص ۶۲، [2] مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۱۰،

ملا محمد ماہ دیوگامی

ملا محمد ماہ دیوگامی حافظ صاحب کے والد مفتی نور اللہ کے استاذ بھائی تھے، دونوں نے شیخ محمد رشید جونپوری سے اکتسابِ فیض کیا تھا، تجلی نور میں ہے کہ ملا محمد ماہ اپنے دیار کے مشہور علماء میں سے تھے۔ ان کی جامعیت کا حال یہ تھا کہ ملا رکن الدین بحریا بادی سے تحصیلِ علم کے بعد مزید تکمیل و تحقیق ملا نور الدین مداری سے کی اس کے بعد دیوان محمد رشید سے فیض اٹھایا وہ اپنے دور کے عالم اکمل اور فاضل اجل تھے، اور پچیس سال تک جونپور میں درس و تدریس کی خدمت انجام دی اور سیکڑوں علماء وفضلاء ان کی درسگاہ سے پیدا ہوئے، ملا عبد الرسول سترکھی، حافظ امان اللہ بنارسی اور مفتی ابو البقاء جون پوری ان کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔ آخر عمر میں سلس البول کی بیماری میں مبتلا ہو گئے تھے، اسی میں انتقال کیا اور ایک قول کے مطابق بیاسی سال کی عمر میں ۲۵/جمادی الاخریٰ ۱۰۹۵ھ میں وفات پائی، ان کی مزار دیوگام اعظم گڑھ اور بنارس کے درمیان آج بھی موجود ہے[1]

ملا قطب الدین شمس آبادی

انکا اصل وطن امیٹھی تھا ملا قطب الدین سہالوی شہید ۱۱۰۳ھ کی درسگاہ کے فیض یافتہ تھے اور یہیں فاتحۃ الفراغ پڑھی تھی، ملا قطب الدین سہالوی اپنے شاگرد قطب الدین شمس کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ "کسیکہ خواہد مغز سخن را دریابد سید قطب الدین را ادراک نماید" فراغت کے بعد شمس آباد میں مسند تدریس بچھائی، آپ کے تلامذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے جن میں قاضی محب اللہ بہاری، حافظ امان اللہ بنارسی، اور سید طفیل محمد اترولوی خاص شہرت کے مالک ہیں، تقریباً ستر سال کی عمر میں ۱۱۲۱ھ میں فوت ہوئے[2]

---

[1] تجلی نور ج۲ص۶۲، [2] مآثر الکرام ج۱ص۲۱۰،

علمی تبحّر

حافظ صاحب نے حفظ قرآن کے بعد مروجہ علوم وفنون بنارس، جونپور اور شمس آباد وغیرہ کے مشہور اساتذہ سے حاصل کئے، طریقت ان کے گھر کی دولت تھی اور ورثہ میں ملی تھی مگر اس راہ میں آخر عمر میں اس وقت آئے جب افتاد زمانہ سے پریشان ہو کر دہلی گئے واپسی میں شیخ خوب اللہ الہ آبادی ۱۱۴۷ھ سے سلسلۂ نقشبندیہ میں بیعت کی، اس کی تفصیل بعد میں آئے گی، ان کے سوانح نگاروں نے ان کے علمی تجربہ کا تذکرہ شاندار الفاظ میں کیا ہے، آزاد سبحۃ المرجان میں لکھتے ہیں۔

وبرع فی المعقول والمنقول	وہ معقولات اور منقولات میں بہت آگے
وتبحّرفی الفروع والاصول!	اور اصول وفروع میں متجر عالم تھے۔

مآثر الکرام میں لکھا ہے۔

از حفاظ قرآن و از فحول علمائے ہندوستان است در معقول و منقول کوس شہرت می نواخت، درعلمِ فقہہ امتیازی افراخت۔[۲]	وہ حافظ قرآن ہونے کے ساتھ ہندوستان کے جید علماء میں سے ہیں، معقولات و منقولات میں ان کی شہرت کا ڈنکا بجتا تھا اور فقہہ میں ممتاز تھے۔

تذکرہ علمائے ہند میں ہے کہ وہ حافظ قرآن، جامع معقول و منقول حاوی فروع واصول تھے[۳]

اور نزہتہ الخواطر میں ہے کہ وہ شیخ عالم کبیر علامہ اور فقہ، اصول فقہ اور علم کلام کے مشہور علماء میں سے ایک ممتاز عالم تھے۔[۴]

فقہ اور اصول فقہ کا فن حافظ صاحب کو ورثہ میں ملا تھا، ان کے والد مفتی نور اللہ اپنے زمانہ کے مشہور فقہائے احناف میں سے تھے، اس لئے اس فن سے ان کو فطری تعلق تھا، اس کا ثبوت ان کی کتاب المفسّر اور ان کی شرح المحکم سے ملتا ہے اور معقولات و منقولات میں ان کی جامعیت ان

---

[۱] سبحۃ المرجان ص۸۷، [۲] مآثر الکرام ج۱ ص ۲۱۲، [۳] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۷، [۴] نزہتہ الخواطر ج۶ ص۳۹،

شروح حواشی سے ظاہر ہوتی ہے جو انھوں نے مختلف کتب کلامیہ ومعقولیہ پر لکھے ہیں حافظ صاحب سلوک ومعرفت کی بزم میں آخر عمر میں داخل ہوئے اور اس کے گوہر شب چراغ بنے، اور شیخ محبّ اللہ الہ آبادی کے رسالہ تسویہ کی شرح لکھی جو بڑی سخت مختلف فیہ کتاب تھی اور اس پر شدید ہنگامہ ہوا تھا۔

لکھنؤ کی صدارت

عالمگیر حافظ صاحب کے والد مفتی نور اللہ کے قدر دانوں میں تھے، اور بنارس میں ان کے لئے مسجد اور خانقاہ تعمیر کی تھی، اور وہاں کے عہدۂ قضا پر ان کو مامور کیا تھا۔ حافظ صاحب بھی فراغت کے بعد سلطان کی عنایات وتوجہات شاہی کے مستحق قرار پائے اور عالمگیر نے ان کو لکھنؤ کی صدارت عطا کی۔ سبحۃ المرجان میں ہے۔

حافظ صاحب سلطان عالمگیر کی طرف سے شہر لکھنؤ کی صدارت پر مامور تھے، اور قاضی محبّ اللہ بہاری وہاں کے قاضی تھے[1]

اور مآثر الکرام میں ہے۔ وہ کچھ دنوں خلد مکان سلطان عالمگیر کی طرف سے لکھنؤ کی صدارت پر فائز تھے، اس تقریب سے وہ اور عہدۂ قضا کی تقریب سے قاضی محبّ اللہ صاحب سلم اس شہر میں ایک ہی زمانہ میں تھے۔[2]

مغل دور میں صدارت کا عہدہ بڑی اہمیت رکھتا تھا، صدر صوبائی دار الحکومت میں رہتا تھا اور پورے صوبہ کے علماء ومشائخ ائمہ اور معذوروں کے حقوق اور ان کے سارے امور ومعاملات عطیات اور وظائف وغیرہ کی نگرانی اور دیکھ بھال اس کے متعلق ہوتی تھی، قاضیوں کی کارگزاری اور ان کے استحقاق وعدم استحقاق کا نگران ومحتسب بھی ہوتا تھا۔ ان کی تقرری بادشاہ کی طرف سے صدر الصدور کی توثیق کے بعد ہوتی تھی۔ قاضیوں کے فرائض نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور شرعی قضایا، معاملات مثلاً زوجین کے مسائل اور قرضہ جات کے مرافعات وغیرہ کی نگرانی تک محدود تھے، اس

---

[1] سبحۃ المرجان ۸۷ [2] مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۱۲

لئے حافظ امان اللہ کا عہدہ ان کے استاذ بھائی قاضی محبّ اللہ بہاری سے بڑھا ہوا تھا، قاضی محبّ اللہ بہاری فراغت کے بعد سلطان عالمگیر کی خدمت میں دکن جا کر لکھنؤ عہدۂ قضا کا پروانہ لائے تھے، اور حافظ صاحب کو بغیر کسی سعی و کوشش کے یہ منصب ملا تھا، اسی اعتبار سے ان کا پلہ بھاری تھا، مگر علم وتحقیق، فضل وکمال میں دونوں برابر تھے، اور ملا قطب الدین شمس آبادی کے فیض سے معقولات و منقولات میں ید طولی رکھتے تھے۔

حافظ امان اللہ اور قاضی محبّ اللہ کے درمیان علمی مباحثے

لکھنؤ میں تقرری کے بعد دونوں میں بحث ومباحثہ اور علمی مناقشہ کا دروازہ کھل گیا اور لکھنؤ علمی مباحثہ کا اکھاڑہ بن گیا، جانبین سے رسالہ بازیاں ہوئیں اور ایک نے دوسرے کے رد میں صفحات کے صفحات سیاہ کر دیئے، تذکرہ نویسوں نے اس نوک جھونک کا ذکر خاص طور سے کیا ہے۔ سبحۃ المرجان میں ہے کہ:

دونوں حضرات لکھنؤ میں رہتے تھے۔ اور ان میں علمی بحثیں جاری رہتی تھیں [1]

مآثر الکرام میں ہے کہ: وباہم طریق مباحثہ علمی سلوک می دانشمند" (ج ا ص ۲۱۲) ان مباحث کی کثرت کا اندازہ نزہۃ الخواطر کی تصریح سے ہوتا ہے کہ ان دونوں کے درمیان اس قدر زیادہ مباحثے اور مناظرے چلے کہ ان سے صفحات کے صفحات بھر جائیں [2]

ان مباحثوں کی تفصیل کتابوں میں درج نہیں ہے، اس لئے نہیں کہا جا سکتا ہے کہ کن کن مسائل پر بحثیں ہوتی تھیں۔ قیاس ہے کہ اس زمانہ کے ذوق کے مطابق ان کا تعلق فقہ، اصول فقہ، کلام اور منطق وفلسفہ کے مسائل سے رہا ہوگا لکھنؤ کی صدارت اور عہدۂ قضا سے دونوں حضرات جلد ہی الگ ہو گئے مگر بحث ومباحثہ کی سرگرمی اس کے بعد بھی جاری رہی اور تصانیف میں رد وقدح کا سلسلہ چلتا رہا، قاضی محبّ اللہ نے اپنی بعض کتابوں "قال الفاضل البنارسی سے حافظ صاحب ہی کو مراد لیا ہے۔

---

[1] سبحۃ المرجان ۷۸ [2] نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۳۹ ۔

بنارس میں تدریسی خدمات

غالباً اسی مناقشہ کے نتیجہ میں دونوں حضرات بہت جلد اپنے عہدہ سے الگ ہو گئے۔ حافظ صاحب نے اپنے وطن بنارس میں مدرسہ قائم کر کے درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا اور قاضی محب اللہ نے شاہی عہدے حاصل کیے، بقول آزاد قاضی محبّ اللہ کو بڑا عروج حاصل ہوا اور وہ بلند منصب کے مالک اور پورے ہندوستان کے صدر اور ''فاضل خاں'' کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔[1]

قاضی صاحب معزولی کے بعد دوبارہ دکن گئے اور حیدرآباد میں دوبارہ منصب قضا پر مامور ہوئے، پھر سلطان عالمگیر کے پوتے رفیع القدر بن شاہ عالم کے معلم بنائے گئے، اور جب سلطان عالمگیر نے شاہ عالم کو کابل کا صوبہ دار بنا کر بھیجا تو قاضی صاحب بھی اس کے ساتھ کابل گئے، ۱۱۱۸ھ میں عالمگیر کی وفات اور شاہ عالم کی تخت نشینی کے بعد ان کو بڑا عروج حاصل ہوا اور وہ پورے ہندوستان کے صدر الصدور کے جلیل القدر منصب پر سرفراز ہوئے، ان کے حریف حافظ صاحب اس سے پہلے صرف صوبہ اودھ کے صدر تھے، مگر اس کے بعد قاضی صاحب کی حیات مستعار کے دن بہت جلد پورے ہو گئے اور ۱۱۱۹ھ میں انھوں نے وفات پائی مآثر الکرام کے اس بیان سے کہ ''واو چندے از خلد مکاں بہ منصب صدرات بلدۂ لکھنؤ مامور بود'' اندازہ ہوتا ہے کہ حافظ صاحب زیادہ دنوں تک لکھنؤ کی صدارت کے عہدے پر نہیں رہ سکے اور اس سے علیحدہ ہوتے ہی اپنے وطن بنارس آکر مدرسہ قائم کیا اور درس و تدریس میں ایسے منہمک ہوئے کہ پھر کہیں کا رخ نہیں کیا، ان کے والد کے زمانہ سے ان کے خاندان پر جو شاہی عنایات تھیں ان ہی پر قانع رہ کر علمی و دینی خدمت میں لگے رہے، عمر کے آخری حصہ میں بعض حوادث کی وجہ سے دہلی گئے، مگر جلد ہی بنارس واپس آگئے، افسوس کہ حافظ صاحب کی تعلیمی و تدریسی خدمات کی تفصیل کتابوں میں نہیں ملتیں حالاں کہ ایک مدت دراز تک انھوں نے تشنگان علم و فن کو سیراب کیا اور بہتوں نے آپ

[1] مآثر الکرام ج ا ص ۲۰۲

سے تحصیل علم کی، البتہ حضرت ملا نظام الدین فرنگی محلی ۱۱۶۱ھ کے بارے میں مآثر الکرام میں تصریح ہے کہ وہ حافظ صاحب کے خاص شاگردوں میں ہیں اور اپنے والد کی شہادت کے بعد انہی سے تحصیل علم کی تھی۔

تحصیل علوم متعارفہ بعد از شہادت	انھوں نے اپنے والد کی شہادت کے بعد
والد ماجد خود از حافظ امان اللہ بنارسی	حافظ امان اللہ بنارسی اور مولوی قطب الدین
ومولوی قطب الدین نمود[۱]	سے علوم متعارفہ کی تعلیم حاصل کی،

ملا نظام الدین کے والد ماجد حضرت ملا قطب الدین سہالی کی شہادت ۱۱۰۳ھ میں ہوئی، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے پہلے حافظ صاحب لکھنؤ کی صدارت سے الگ ہو چکے تھے۔ اور اس وقت ان کی تدریسی خدمات کا شہرہ دور دور تک پھیل چکا تھا۔ نزہۃ الخواطر میں ہے کہ اس وقت ملا نظام الدین کی عمر چودہ پندرہ سال کی تھی قیام فرنگی محل لکھنؤ کے بعد جب اطمینان نصیب ہوا تو انھوں نے سب سے پہلے جائس جا کر ملا علی قلی جائسی سے کتب درسیہ پڑھیں پھر بنارس میں حافظ صاحب سے شرح مواقف کا درس لیا۔ نزہۃ الخواطر میں ہے۔

جائس کے بعد بنارس جا کر حافظ امان اللہ کی شاگردی کی اور ان سے شرح مواقف کا درس لیا۔[۲]

ملا نظام الدین جیسے فاضل روزگار کا حافظ صاحب کی درسگاہ سے پیدا ہونا ان کے دریائے فیض کا سب سے بڑا کرم ہے۔

دہلی کو روانگی اور واپسی پر شیخ خوب اللہ الٰہ آبادی سے بیعت وارادت

سلطان عالمگیر کی حکومت کا بیس سالہ دور (۱۰۹۸ھ سے ۱۱۱۸ھ تک) پورے ملک کے

---

[۱] مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۲۱، تذکرہ علمائے ہند ص ۲۷ [۲] نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۳۸۴،

لئے امن وامان عیش ورفاہیت کا دور تھا، خاص طور سے دیار پورب شاہی توجہات وعنایات سے اربابِ علم وفضل کے حق میں گلزار تھا۔ اسی زمانہ میں حافظ صاحب نے نشو ونما پائی خود انکا گھر بھی گلزار بنا ہوا تھا، اس پر عالمگیر کی خصوصی توجہ تھی، مگر سلطان کی آنکھ بند ہوتے ہی ایسا انتشار پیدا ہوا کہ پورے ملک میں ابتری پھیل گئی۔ دیارِ پورب کی علمی ودینی اور روحانی محفلیں اجڑنے لگیں، اور علماء وفضلاء اور مشائخ سکون کی نعمت سے محروم ہوکر مدرسوں وخانقاہوں سے نکلنے پر مجبور ہوگئے، ۱۱۳۱ھ میں محمد شاہ بادشاہ ہوا۔ اسی سال اس نے محمد امین نیشاپوری (برہان الملک سعادت خان نیشاپوری) کو اودھ کا حاکم بنایا جسنے یہاں آتے ہی ایک طوفان برپا کردیا قدیم خانقاہوں اور مدرسوں اور علماء ومشائخ کی جاگیریں ضبط کرلیں، ان کو طرح طرح سے پریشان کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ مدرسے اور خانقاہیں اجڑنے لگیں اور علماء ومشائخ پریشان ہوکر ادھر اُدھر کا رخ کرنے لگے۔ آزاد نے مآثر الکرام میں ملا نظام الدین فرنگی محلی کے تذکرہ میں لکھا ہے۔

> ۱۱۳۰ھ تک اس سرزمین میں علماء کی سرگرمی باقی رہی، یہاں تک کہ محمد شاہ کے آغاز جلوس میں برہان الملک سعادت خان نیشاپوری صوبہ اودھ کا حاکم ہوا اور صوبہ الہ آباد، جون پور، بنارس، غازی پور، کڑا مانک پور، کوڑا، جہاں آباد وغیرہ کے شہروں کو اپنی سلطنت میں شامل کرکے جدید وقدیم علمی اور دینی خانوادون کے وظائف یک قلم ضبط کرلئے، جس سے شرفاء ونجباء کو سخت پریشانی برداشت کرنی پڑی اور معاش ومعیشت کی پریشانی نے انھیں وہاں کے لوگوں کو علم سے باز رکھ کر سپہ گری کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کیا، اور پہلے کی طرح درس وتدریس کا رواج باقی نہیں رہا جو مدرسے قدیم زمانہ سے علم وفضل کے معدن تھے یک قلم ویران ہوگئے اور اربابِ کمال کی اکثر انجمنیں برباد ہوگئیں۔[1]

جونپور، الہ آباد، غازی پور، کڑا مانک پور اور کوڑا جہاں باد وغیرہ کی طرح بنارس کے اربابِ کمال بھی محمد امین نیشاپوری حاکم اودھ کے ظلم کا شکار ہوکر جاگیروں اور وظائف سے محروم ہوگئے۔ حافظ صاحب بھی اس کا نشانہ بنے، ان کے خاندان کو جو مراعات حاصل تھیں وہ ختم کردی

---

[1] مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۲۲،

گئیں، اس لئے ان کو آخری عمر میں محمد شاہ کے پاس دہلی جانا پڑا مگر یہ نہیں معلوم کہ دہلی میں ان کی شنوائی اور وظائف و جاگیر کی واپسی ہوئی یا نہیں ہوئی، البتہ واپسی پر الہ آباد میں حضرت شیخ خوب اللہ الہ آبادی سے بیعت و ارادت کا شرف حاصل ہوا، جو اس دور فتن و پریشانی میں سکونِ قلب کا باعث بنا مآثر الکرام میں مجمل طریقہ پر صرف اتنی تصریح ملتی ہے۔

در آخر ایام حیات از شاہجہاں آباد وارد الہ آباد شد، واز خدمت والائے شیخ محمد یحیی المدعو بہ شیخ خوب اللہ قدس سرہ استفادہ طریقہ انیقہ نقشبندیہ نمود و بآں مشغولی ورزید[1]	حافظ صاحب اپنی زندگی کے آخر ایام میں شاہجہاں آباد (دہلی) سے الہ آباد وارد ہوئے اور شیخ محمد یحییٰ المعروف بہ شیخ خوب اللہ قدس سرہ سے طریقہ نقشبندیہ کا استفادہ کر کے اس میں مشغول ہو گئے۔

سلوک و معرفت کی راہ بڑی پرسکون ہوتی ہے، اس راہ کے راہی غم زمانہ سے آزاد ہو کر عافیت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ مگر جہاں یہ چیز اشخاص وافراد کے حق میں نعمت ہے، اقوام وملل کے لیے نہایت پرخطر ہے، اگر پوری قوم اجتماعی طور سے اس راہ پر چل پڑے تو سکون کی تلاش تباہی کا ذریعہ بن جائے۔

حافظ صاحب کا سفر دہلی انتقال سے دو تین سال پہلے ہوا تھا، اس کے بعد انھوں نے درس وتدریس سے علیٰحدہ ہو کر سلوک و معرفت کی راہ اختیار کر لی، غالباً دہلی میں ان کو اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی، اس لئے تعلیم و تدریس کے ہنگامہ سے علیٰحدگی اختیار کر کے روحانی سکون واطمینان کی قلیل مدت میں طریقۂ نقشبندیہ کے اکابر مشائخ میں شمار ہونے لگے۔

شاہ خوب اللہ الہ آبادی کا اصل نام محمد یحییٰ ہے، وہ شیخ محمد افضل الہ آبادی ۱۱۲۴ھ کے برادرزادہ، داماد اور مرید وخلیفہ ہیں۔ اصل وطن سید پور ضلع غازی پور تھا، شاہ خوب اللہ تیرہ سال کی عمر میں علوم متعارفہ کی تحصیل سے فارغ ہو گئے تھے۔ علم شریعت وطریقت کے بحر زخار تھے، پوری عمر اپنے استاذ ومرشد کی تعلیم وتربیت کے مطابق بسر کی، رشد و ہدایت کے ساتھ تصنیف و

---

[1] مآثر الکرام ص ۲۱۱

تالیف کا بھی سلسلہ جاری رکھا، ۱۱ر جمادی الاولی ۱۱۳۲ھ میں الہ آباد میں وفات پائی، حافظ صاحب نے دہلی سے واپسی پر ان سے بیعت کی، اور طریقہ نقشبندیہ کے مطابق ریاضت کر کے چند دنوں میں ہی اعلیٰ مدارج پر پہونچ گئے، اور زندگی کے باقی دو تین سال اسی روحانی سفر میں بسر کیئے، ان کے روحانی ارتقاء میں خود ان کے خاندانی مذاق اور گھریلو تعلیم وتربیت کا بڑا دخل تھا، ان کے والد شیخ محمد رشید جون پوری اور ان کے بیٹے شیخ محمد ارشد جون پوری کے روحانی فیض سے ''غلام درگہِ پیران چشتی'' تھے اور مفتی وفقیہ اور قاضی کے لباس میں ایک صوفی صافی کی زندگی بسر کرتے تھے، حافظ صاحب اپنے والد کے روحانی فیض سے بہریاب تھے لیکن انھوں نے زندگی کا پیشتر حصہ دینی علوم کی تعلیم اور علماء کے انداز پر گزارا، آخر میں اس ہیزم خشک میں شاہ خوب اللہ کی ایک نگاہ نے آگ لگادی، مرشد کی نگاہ اور مسترشد کی استعداد سے تھوڑے ہی دنوں میں نسبتِ نقشبندیہ کے مخصوص اثرات بہ کمال وتمام ظاہر ہوگئے، مآثر الکرام میں ہے۔

بعد ظہور اثر معہود این طائفہ علیّہ حضرت شیخ فرمودند کہ ظاہراً بعد اجتماعے کہ سید سند را با خواجہ علاء الدین عطّار عُطّر مرقدہ اتفاق افتاد ایں قسم اجتماع نہ شدہ باشد لکن شما از سید درین طریق راجح اید، ومن در جنب خواجہ رتبہ ندارم	حافظ صاحب پر حضرت نقشبندیہ کے مخصوص اثر کے ظہور کے بعد حضرت شیخ نے فرمایا کہ سید سند اور خواجہ علاء الدین عطّار کے باہمی اجتماع کے بعد بظاہر میرے تمہارے درمیان اس قسم کا یہ دوسرا اجتماع ہے، مگر تم اس معاملہ میں سید سند سے سبقت لے گئے اور میں خواجہ علاء الدین عطّار کے مقابلہ میں کوئی مقام ورتبہ نہیں رکھتا۔

یہ سن کر حافظ صاحب نے عرض کیا۔

حافظ امان اللہ تواضع کرد کہ شما قدم بہ قدم خواجہ اید ومن با سید مساسے ندارم[1]	حضرت والا خواجہ علاء الدین کے ہم پلہ ہیں، البتہ میں سید سے کوئی نسبت نہیں رکھتا۔

مرشد ومرید کی اس گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ حافظ صاحب اگرچہ اس بزم میں بہت

---

[1] مآثر الکرام ج۱ص ۲۱۲،

دیر سے آئے مگر بہت جلد صف اول میں پہنچ گئے۔ اور شیخ محب اللہ الہ آبادی ۱۰۵۸ھ کے رسالہ تسویہ کی شرح لکھی جو اس زمانہ میں زبردست ہنگامہ کا باعث تھا، اور جس کی موافقت اور مخالفت میں کتابیں لکھی گئی تھیں، میر سید محمد ترمذی ۱۰۷۱ھ، شیخ محمد افضل الہ آبادی ۱۱۲۴ھ اور شیخ محمد بن عیسیٰ ہرگامی اکبر آبادی ۱۱۰۷ھ وغیرہ نے بھی اس کی شرحیں لکھیں، شیخ محب اللہ الہ آبادی مشاہیر علمائے صوفیہ میں ہیں۔ حضرت شیخ ابوسعید گنگوہی کے خلیفہ تھے۔ فن تصوف میں ان کی تحقیقات وتدقیقات مرتبہ اجتہاد کو پہونچی تھیں۔ رجب ۱۰۵۸ھ میں الہ آباد میں فوت ہوئے، تصوف کے اسرار وحکم پر ان کی متعدد کتابیں ہیں۔ جن میں سے ایک رسالہ تسویہ بھی ہے، مولوی عبدالحق نے مآثر الکرام کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ رسالہ تسویہ میں علاوہ اور امور کے جبرئیل ووحی کی حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

”جبریل محمد درذاتِ محمد بود صلی اللہ علیہ وسلم، وہمچنین جبریل باہر پیغمبرے در ذات دے بود، وآں قوت باطنی ایشان بود کہ درغلبہ آں قوت وحی برایشان نازل می گردید، لہٰذا جبریل باہر پیغمبرے بزبان دے سخن گفتے[1]	محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جبریل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات میں ہیں اور اسی طرح جبریل ہر پیغمبر کی ذات میں تھے اور وہ ان پیغمبروں کی قوت باطنی تھی اس باطنی قوت کے غلبہ میں ان پر وحی نازل ہوتی تھی، لہٰذا جبریل نے ہر پیغمبر سے انہیں کی زبان میں کلام کیا۔

اور آزاد نے میر سید محمد ترمذی کالپوی ۱۰۷۱ھ کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ میر صاحب نے واردات کے نام سے رسالہ تسویہ کی شرح لکھی تھی، اس زمانہ کے علمائے ظاہر نے شیخ محب اللہ آبادی کے رسالہ تسویہ پر ہنگامہ برپا کر کے سلطان عالمگیر کو خبر پہونچائی کہ اس رسالہ میں شریعت کے خلاف باتیں ہیں۔ سلطان نے حکم دیا کہ پورے ملک کے درویش اور مشائخ کو معسکر سلطانی میں حاضر کر کے سب سے اس کے متعلق سوال کیا جائے، اس موقع پر شیخ محمد افضل الہ آبادی کو میر سید محمد ترمذی کی کتاب واردات کے بارے میں تشویش ہوئی کہ غلبۂ حال میں یہ کتاب سپرد قلم ہوگئی ہے اور

[1] مقدمہ مآثر الکرام۔

رسالہ تسویہ کے بارے میں بہت زیادہ اشتعال پھیلا ہوا ہے، اس لئے واردات کو پانی میں ڈال دیا جائے، چنانچہ ایسا کیا گیا مگر کتاب محفوظ رہی، اور یہ نسخہ شیخ خوب اللہ (محمد یحییٰ) الہ آبادی کے پاس محفوظ رہا، آزاد نے لکھا ہے:۔

شیخ محمد یحییٰ الہ آبادی قدس سرہ در کتاب اعلام الانام می گوید من ایں رسالہ بعینہا بارسائل دیگر از تصانیف حضرت سید میر قدس سرہ یکجا جلد کردہ حرز جان وایمان دارم۔"[1]	شیخ محمد یحیٰ الہ آبادی قدس سرہٗ کتاب اعلام الانام میں کہتے ہیں کہ میں نے اس رسالہ کو حضرت سید میر قدس سرہٗ کے لکھے ہوئے دوسرے رسالوں کے ساتھ ایک جگہ مجلد کر کے جان وایمان کا تعویذ بنالیا ہے

علمائے شریعت کی طرح سلطان عالمگیر نے اس رسالہ پر شدید نکیر کی اور صوفیہ ومشائخ کے محضر میں شیخ محب اللہ کے مریدوں سے کہا کہ اس رسالہ کے مندرجات کو احکام شریعت کے مطابق کر کے بتاؤ، ورنہ شیخ کی بیعت وارادت سے توبہ کرو۔

ان تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ تسویہ کس قدر مختلف فیہ رسالہ تھا، اور اس کے مباحث بظاہر فلسفیانہ افکار ونظریات پر مشتمل تھے، اس کی شرح کے لئے قلم اٹھانا اور اس کے محتویات کو شریعت کے مطابق ثابت کرنا باطنی اسرار وحکم کے ماہرین ہی کا کام ہوسکتا ہے، اس لئے حافظ صاحب کی شرح تسویہ علوم باطنی میں ان کے تبحر کی بین دلیل ہے۔

تصانیف

حافظ صاحب علوم مروجہ وفنون متعارفہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے، اور تدریس کے ساتھ تصنیف وتالیف کا بھی شغل رکھتے تھے، فقہ، اصول فقہ، تفسیر، تصوف، کلام اور فلسفہ وغیرہ پر ان کی متعدد معیاری کتابیں ہیں۔

(۱) المفسر اصول فقہ میں عربی زبان میں نہایت جامع متن ہے، (۲) المحکم رسالہ مفسر کی

[1] مآثر الکرام ج ا ص ۲۱۲ و ۲۱۳۔

شرح ہے، محکم الاصول کا قلمی نسخہ حضرت مفتی محمد ابراہیم صاحب بنارسی کے کتب خانہ میں موجود ہے، مگر اس کی موجودہ بے ترتیبی کی وجہ سے اس کی زیارت نہیں ہوسکی، (۳) شرح رسالہ تسویہ شیخ محب اللہ الہ آبادی، (۴) ملا محمود جونپوری اور میر باقر استر آبادی کے درمیان حدوث دھری کے مباحث پر محاکمہ، (۵) حاشیہ تفسیر بیضاوی، (۶) حاشیہ حکمۃ العین، (۷) حاشیہ عضدی، (۸) حاشیہ بر حاشیہ قدیمہ (۹) حاشیہ تلویح (۱۰) حاشیہ شرح مواقف (۱۱) حاشیہ شرح عقائد ملا جلال ودانی (۱۲) حاشیہ رشیدیہ شیخ محمد رشید جونپوری، اس میں جابجا ابحاث باقیہ کا رد بھی ہے، اس کا قصہ یہ ہے کہ ملا محمود جونپوری اور شیخ محمد رشید جونپوری کے استاد ملا محمد افضل استاذ الملک نے ایک مرتبہ رسالہ شریفیہ کی تعریف کی، شیخ محمد رشید نے ان کے ہاتھ سے لے کر آٹھ دن میں انکی بہترین شرح لکھدی، جس سے ملا محمد افضل بہت خوش ہوئے، اس سے ملا محمود کو انقباض ہوا، اور انھوں نے اپنے ایک شاگرد ملا محمد باقی کو حکم دیا کہ تم رسالہ شریفیہ کی شرح لکھو، جس میں شیخ محمد رشید کی شرح کی بھی شرح ہو، چنانچہ ملا باقی نے چند دن میں شریفیہ کی شرح آداب باقیہ کے نام سے لکھ کر اپنے استاذ کی خدمت میں پیش کردی اور اسی کے ساتھ شیخ محمد رشید کی شرح کی ایک شرح ابحاث باقیہ کے نام سے لکھی، جس میں جگہ جگہ شیخ محمد رشید پر اعتراضات کیے، حافظ صاحب نے شیخ محمد رشید کی فن مناظرہ کی کتاب رشیدیہ کی شرح میں ملا محمد باقی کی کتاب ابحاث باقیہ کے ان ہی اعتراضات کا رد کیا ہے[1]، افسوس ہے کہ حافظ صاحب کی ان تصانیف میں سے کوئی کتاب راقم کی نظر سے نہیں گذر سکی کہ اس کا تفصیلی تعارف کرایا جاسکے، ان کی سب سے آخری تصنیف شرح تسویہ ہے۔

وفات ۱۱۳۳ھ

شیخ خوب اللہ الہ آبادی سے بیعت کے بعد حافظ صاحب دو تین سال تک ترک و تجرید کی زندگی بسر کر کے ۱۱۳۳ھ میں بنارس میں فوت ہوئے، مآثر الکرام میں ہے۔

عنقریب ہماں ایام در بنارس کہ مسقط الراس — قریب قریب ان ہی ایام میں اپنی

[1] تجلی نور ج ۲ ص ۶۲۔

اوست انتقال کرد، وکان ذالک فی سنتہ ثلث وثلثین ومأیۃ والالف، وہما نجامدفون گردید[1] | جائے پیدائش بنارس میں ۱۱۳۳ھ میں فوت ہوئے۔ اور اسی جگہ دفن کیے گئے۔

تمام تذکرہ نویسوں نے حافظ صاحب کا سنہ وفات اور مدفن یہی بتایا ہے، لیکن کسی نے مہینہ اور تاریخ کی صراحت نہیں کی ہے، اسی روضہ میں ان کا بھی مزار ہے جسے انھوں نے ۱۰۹۶ھ میں اپنے والد وغیرہ کے لئے تعمیر کرایا تھا۔ جو اس وقت علوی پورہ میں سٹی اسٹیشن کے جنوب میں سڑک کے اس پار واقع ہے، اسی کے پاس یتیم خانہ مظہر العلوم کی عمارت ہے۔ مقبرہ کے کتبہ میں یہ اشعار ہیں، جو حافظ امان اللہ بنارسی کے والد مفتی نور اللہ کے بارے میں ہیں ان کے مادۂ تاریخ سے ۱۰۹۶ھ نکلتا ہے:۔

نماند کسے دائم اندر جہان | ندارد بنا گنبد آسمان
بغلطند زیر زمیں مہوشاں | بخاک اندر آمیز گنجر وان
گداوشہ و قانع تاجراں | گزشتند چوں برق در یک زماں
بسا بادشاہِ سکندر نشاں | نشانش نماند دریں کاروان

در حقیقت دل است روضۂ دوست
ہر کہ صافش گرفت دوست ازاوست

دریں دہر ہر کس کہ آمد دراں | بدنیا کجا یافت آرامِ جاں
چہ شد آں سلیمان ونوشیرواں | چہ جمشید در آخرِ گلستاں
نہ آں شہ سوارانِ لشکر کشاں | نہ آثار ترکش، نہ تیر و کماں

روضۂ چشم کن صفاء اے دوست
ادست دہر مقام خلق ازوست

[1] مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۱۳۔

کجا خاک وکو باد وآبِ رواں؟ کجا آتشِ گرمی دیگراں

نہ افلاک پایندہ و سائباں مگر ذاتِ حق "کل یوم بشاں"

صاف کن روضۂ دلِ خوددوست

صوفی زروضۂ دل خود اوست

بنا کرد حافظ دریں بوستاں زبہر خدا مرقدِ دوستاں

مورخ زاید اوغیب اللساں نکو یافتہ "روضۂ طالباں"
۱۱۰۴ھ

چشم بکشادر آب روضۂ دوست

ہرچہ بینی بداں کہ مظہر اوست

ان اشعار میں جگہ جگہ فنی اور شعری اسقام ہیں جو انکے صحیح طور سے پڑھے نہ جانے کا نتیجہ ہیں۔

برہان الملک سعادت خاں کے پرآشوب دور میں آپ کا خاندان محفوظ رہا مگر بعد میں نوابانِ اودھ کی کوشش سے دوسرے سنّی خاندانوں کی طرح آپ کے خاندان کے افراد بھی شیعہ ہو گئے۔

☆ ☆ ☆ ☆

(۷)

مولانا شیخ غلام نقشبند رحؒ گھوسوی لکھنؤی

شیراز ہند پورب میں ہزاروں علماء وفضلاء اور مشائخ پیدا ہوئے۔ جن کے دم قدم سے یہاں کے شہر وقصبات مدرسوں اور خانقاہوں سے معمور تھے، اور یہ خطہ بغداد اور قرطبہ کی ہمسری کررہا تھا۔

سلاطین شرقیہ جونپور کے دور سے مغل دور سلطنت تک کی پوری مدت پورب میں علمی بہار کا دور تھا، خصوصاً سلطان ابراہیم شاہ شرقی، شاہ جہاں اور اورنگ زیب عالم گیر کے زمانہ میں یہاں علم وعلماء کی بڑی چہل پہل تھی، عالمگیر نے اپنی شاہزادگی اور سلطنت کے ایام میں جونپور کے علماء وفضلاء پر خاص نظر رکھی اور اس پورے علاقہ کو ان کی توجہ نے علم کا باغ ارم بنا رکھا تھا، مولوی خیرالدین محمد جونپوری نے اس دور کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

> ''اورنگ زیب بادشاہ عالم باعمل اور عامل باعلم تھے، انھوں نے علماء کی زیادہ سے زیادہ قدردانی کی، اور زمانہ شاہزادگی سے انکا خاص خیال رکھا، شاہان شرقیہ کے دور کی طرح علماء ومشائخ کی کثرت اور طالبان علم وفیض کی زیادتی کے باعث جونپور میں علمی ودینی رونق پیدا ہوگئی۔ اور جب عالمگیر تخت سلطنت پر بیٹھے تو اس شہر کے مدرسین ومشائخ کے حالات کی تحقیق کے لئے ناظم جونپور کو حکم نامہ روانہ کیا اور تہدیدی تاکید کی کہ اس جماعت کے احوال سے فوراً مطلع کیا جائے۔ اس طرح شہنشاہ عالمگیر کے دور میں یہ خطہ گلزار ارم کا نمونہ بن گیا، اطراف وجوانب کے تمام شہر وقصبات کے قدیم مدرسوں کی تاسیسِ نو ہوئی۔ اور بہت سی نئی خانقاہیں تعمیر کی گئیں، خاص شہر جونپور کے محلّہ محلّہ میں درس وتدریس کا سلسلہ جاری ہوا، اور جگہ جگہ مدرسے قائم ہوئے۔ مفتی محلّہ میں میر ابوالبقاء، سید مبارک، ملا حفیظ اور محلّہ شاہ مدار میں مولانا امیر الدین اور محلّہ دریبہ میں میر عبدالباری اور محلّہ سپاہ میں ملا محمود کے فرزند درس وتدریس کی

خدمت انجام دیتے تھے، نیز جونپور کے ہر محلہ میں مدرسہ موجود تھا، جہاں مدرسین طالب علموں کو تعلیم دیتے تھے، اور ہر کوچہ میں خانقاہ تھی جہاں درویش طالبانِ فیض کی رہبری کرتے تھے۔"[1]

اسی طرح عہد عالمگیری میں دیار پورب میں سیکڑوں علماء ومشائخ اپنے اپنے حلقہ میں کام کررہے تھے، چنانچہ اس عہد کے مدرسین میں حافظ امان اللہ بنارسی ۱۱۳۳ھ، قاضی محبّ اللہ بہاری ۱۱۱۹ھ ملا قطب الدین شمس آبادی ۱۱۲۱ھ ملا جیون، امیٹھوی (احمد بن ابوسعید) ۱۱۳۰ھ، سید سعد اللہ سلونی ۱۱۳۸ھ قاضی عصمت اللہ لکھنوی ۱۱۱۳ھ، شیخ غلام محمد لکھنوی ۱۱۳۶ھ اور شیخ غلام نقشبند گھوسوی لکھنوی ۱۱۲۶ھ وغیرہ ہمعصر علماء تھے، جن کی تعلیمی وتدریسی سرگرمی سے پورا دیار مشرق دار العلم بنا ہوا تھا، ان میں حضرت شیخ غلام نقشبند گھوسوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے تدریسی وتعلیمی کارناموں کی وجہ سے ممتاز شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ موجودہ ضلع اعظم گڑھ کے مشرقی علاقہ میں قصبہ گھوسی کے رہنے والے تھے۔ ان کے ہم وطن اور ہم عصر علماء میں شیخ اسمٰعیل بن مولانا ابوالخیر بھیروی ۱۱۰۶ھ، شیخ عبداللطیف مٹھن پوری (نظام آباد) میر قیام الدین سگڑوی ۱۱۲۸ھ، شیخ مرتضیٰ چریا کوٹی ۱۱۰۹ھ، شیخ محمد شاہ بھیروی ۱۱۱۴ھ مشاہیر وقت تھے۔ اور یہ تمام اکابر پندرہ بیس میل کے حلقہ میں اپنے مدرسوں اور خانقاہوں سے علم ومعرفت کی دولت تقسیم کرتے تھے۔ البتہ شیخ غلام نقشبند نے گھوسی سے لکھنؤ جاکر اپنا فیض جاری کیا، شیخ صاحب اپنے تدریسی وتعلیمی وتدریسی فیض جاری ہے۔ اس وقت دیار پورب کے اسی شیخ الکل فی الکل کا تذکرہ مقصود ہے۔

ان کے تذکرہ کا اصل ماخذ میر غلام علی آزاد بلگرامی کی دو کتابیں مآثر الکرام اور سبحۃ المرجان ہیں، انکے نانا اور استاد میر عبدالجلیل بلگرامی شیخ غلام نقشبند کے مخصوص تلامذہ میں تھے۔ اور میر غلام علی آزاد نے شیخ غلام نقشبند کی وفات کے بائیس سال بعد ملا نظام الدین سے ۱۱۴۸ھ میں لکھنؤ میں ملاقات کی تھی۔ جو شیخ غلام نقشبند کے تلمیذ رشید تھے۔ اور شیخ صاحب کی وفات پر چون سال گزرنے کے بعد ۱۱۸۰ھ میں مآثر الکرام لکھی، اس لئے انھوں نے شیخ صاحب کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۵۱،

وہ پوری واقفیت سے لکھا ہے۔ اور گویا اپنے گھر کی باتیں لکھی ہیں، انھوں نے دونوں کتابوں میں شیخ صاحب کا مستقل تذکرہ کیا اور مآثر الکرام میں میر عبدالجلیل کے تذکرہ کے ضمن میں انکے بعض اہم واقعات درج کیے ہیں، بحر زخار میں بھی شیخ صاحب کے حالات ہیں۔ مگر وہ گویا ناپید ہے۔ البتہ اس کی بعض باتیں نزہتہ الخواطر میں آگئی ہیں، تذکرہ علمائے ہند اور نزہتہ الخواطر میں بھی انکا تذکرہ موجود ہے، بہرحال شیخ صاحب کے بارے میں فی الحال جو کچھ مل سکا ہے مرتب شکل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

نام ونسب اور خاندانی حالات

حضرت مولانا شیخ غلام نقشبند بن مولانا شیخ عطاء اللہ ابن شیخ قاضی حبیب اللہ بن شیخ احمد بن شیخ ضیاء الدین بن شیخ یحییٰ بن شیخ شرف الدین ابن شیخ نصیر الدین بن مفتی حسین عثمانی اصفہانی گھوسوی جونپوری لکھنوی رحمہم اللہ کا سلسلۂ نسب امیر المومنین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ تک پہونچتا ہے حضرت ابان بن عثمان یا حضرت عمر بن عثمان کی نسل سے ہیں، اصفہانی کی نسبت سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ صاحب کے آباؤ اجداد عرب سے اصفہان آئے، پھر وہاں سے کوئی بزرگ ہندوستان آکر دیار جونپور میں آباد ہوئے، یہ کون صاحب تھے اور کب یہاں آئے اس کے بارے میں تذکرہ نویس خاموش ہیں، البتہ اتنا معلوم ہے کہ شیخ صاحب کے دادا قاضی حبیب اللہ سب سے پہلے گھوسی کے قاضی مقرر ہوئے اور یہیں رہ بس گئے، آزاد بلگرامی نے اس سلسلہ میں صرف اتنا لکھا ہے،

آباء کرام آن جناب از قصبہ گھوسی تابع جونپور د از عظماء آن مکان اند۔[1]	شیخ غلام نقشبند کے آباء علاقۂ جونپور قصبہ گھوسی کے تھے، اور وہاں کے معزز لوگوں میں شمار کیے جاتے تھے۔

[1] مآثر الکرام ج ا ص ۲۱۳

دادا قاضی حبیب اللہ

شیخ صاحب کے آباؤ اجداد صاحب علم وفضل تھے۔ان کے ناموں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے اپنے زمانہ کے مشاہیر علماء میں تھے،ان میں مفتی حسین صاحبِ درس وافتاء تھے۔شیخ صاحب کے خاندان میں ان کے دادا قاضی حبیب اللہ سب سے پہلے گھوسی کے قاضی بنائے گئے۔ غالباً ہمایوں (۹۳۷ھ ۹۶۳ھ) کے دور سلطنت میں ان کو یہ منصب دیا گیا ہے،وہ عالم،فقیہہ اصولی اور ادیب تھے،اور ان علوم میں مہارت وشہرت رکھتے تھے،حضرت میر علی عاشقان سرائمیری متوفی ۹۵۰ھ سے بیعت وارادت رکھتے تھے۔گھوسی میں عہدۂ قضا پر مامور ہو کر وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔

والد شیخ عطاء اللہؒ

شیخ صاحب کے والد مولانا شیخ عطاء اللہ گھوسی میں پیدا ہوئے،اور یہیں پروان چڑھے۔ اپنے زمانہ کے مشہور عالم ملا محمود بھیروی جونپوری متوفی ۱۰۶۲ھ اور دیگر اساتذۂ عصر سے تعلیم حاصل کی اور شاہ عبدالقدوس جونپوری خلیفہ شاہ عبد القدوس متوفی ۱۲ شوال ۱۰۵۲ھ کی خدمت وصحبت میں رہ کر ان کے خلیفہ ہوئے۔انتصاح عن ذکر اہل الصلاح میں ہے۔

وخلفائے ایشان بسیار اند یکے دیوان عبدالرشید جونپوری و دیگر قدوۃ العلماء وعمدۃ العرفاء شیخ عطاء اللہ والد مولوی غلام نقشبند سجادہ نشین شیخ حسام الدین مانک پوری اند[1]	شاہ عبدالقدوس جونپوری ۱۰۵۲ھ کے خلفاء میں سے ایک دیوان عبدالرشید جونپوری اور دوسرے قدوۃ العلماء عمدۃ العرفاء شیخ عطاء اللہ جونپوری جو مولوی غلام نقشبند کے والد ہیں۔وہ شیخ حسام الدین مانک پوری کے سجادہ نشین بھی تھے،

شیخ عطاء اللہ علم ومعرفت میں قدوۃ العلماء اور عمدۃ العرفاء تھے،اور اپنے والد کی طرح

---

[1] انتصاح ص۱۶،

فقہ، اصول فقہ، علم کلام اور ادب وعربیت وغیرہ میں مہارت وشہرت رکھتے تھے، تقویٰ اور دینداری میں ممتاز تھے۔ روحانی کشش نے آخر میں حضرت شیخ پیر محمد جونپوری لکھنوی متوفی ۱۰۸۵ھ کی خدمت میں لکھنؤ پہونچا دیا اور یہیں کے ہو رہے۔ گھوسی سے ترک وطن کر کے لکھنؤ میں آباد ہو گئے۔ اور یہیں ۵؍ربیع الثانی ۱۰۶۳ھ کو انتقال کیا،[1] ان کے تلامذہ میں میر محمد شفیع دہلوی متوفی ۱۱۰۹ھ مشہور علماء میں تھے، جنھوں نے شیخ غلام نقشبند کی خاک کو اکسیر بنانے میں اہم کردار ادا فرمایا تھا۔ ان کا مفصل حال آگے آتا ہے۔

قدوۃ العلماء عمد العرفاء مولوی عطاء اللہ	وارث انبیاء شیخ غلام نقشبند سجادہ نشین
والد بزرگوار وارث الانبیاء شیخ غلام نقشبند	حضرت شیخ پیر محمد لکھنوی کے والد قدوۃ
کہ سجادہ نشین حضرت شیخ پیر محمد لکھنوی	العلماء، عمد العرفاء مولوی عطاء اللہ علامۂ
ست، علامۂ وقت بود در علم ظاہری شاگرد ملا	وقت تھے اور ظاہری علوم میں ملا محمود جون
محمود جونپوری ست، بیعت در سلسلۂ	پوری کے شاگرد تھے۔ سلسلۂ بندگی نظام الدین
بندگی نظام الدین امیٹھوی دارد وخلافت	امیٹھوی میں بیعت تھے اور سلسلۂ قلندریہ
سلسلۂ قلندریہ از خدمت شیخ عبد القدوس	میں خلافت شیخ عبد القدوس
قدس سرہٗ یافتہ و وے بتاریخ پنجم	قدس سرہٗ کی خدمت میں رہ کر حاصل کی
ربیع الآخر سنہ یکہزار وشصت وسہ ۱۰۶۳ھ	تھی انھوں نے ۵؍ربیع الآخر ۱۰۶۳ھ میں
وفات یافتہ مزار وے در لکھنؤ[2]	وفات پائی لکھنؤ میں ان کا مزار ہے۔

پیدائش اور نشوونما

شیخ غلام نقشبند اپنے والد کے قیام لکھنؤ سے پہلے ہی گھوسی میں ۱۹؍ذی الحجہ ۱۰۵۱ھ میں پیدا ہوئے، نزہۃ الخواطر میں ہے،

---

[1] نزہۃ الخواطر جلد ۵ ص ۸۵، ۲۷۴ [2] (اصول المقصود ص ۸۶)

ولد لاحدی عشرة بقین من ذالحجه سنة احدی و خمسین والف بقریة گھوسی ۱؎

وہ ۱۹ ذوالحجہ ۱۰۵۱ھ میں گھوسی میں پیدا ہوئے،

بقول آزاد بلگرامی باپ نے بہ اشارۂ روحانیت اپنے بیٹے کا نام غلام نقشبند رکھا، بچپن کا زمانہ گھوسی میں گزرا اور گھر کے دینی وعلمی اور روحانی ماحول میں پرورش پائی، گیارہ بارہ سال کے ہوئے تو سر سے والد کا سایۂ عاطفت اٹھ گیا اور وہ اپنے والد کے تلمیذ رشید میر محمد شفیع کے ظلِ تعلیم وتربیت میں چلے گئے۔

زمانۂ طالب علمی میں منامی بشارت

شیخ غلام نقشبند کا بیان ہے کہ میں نے زمانہ طالب علمی کی ابتداء میں ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ آپ ﷺ اپنے دست مبارک سے میرے سینہ کا بٹن کھول رہے ہیں، اور خواب ہی میں اس خواب کی تعبیر یوں سمجھ میں آئی کہ آپ شرح صدر فرما کر مجھ پر علم کا دروازہ کھول رہے ہیں ۲؎

شیخ صاحب نے اپنے والد کی وفات ۱۰۶۳ھ کے بعد میر محمد شفیع کی خدمت میں رہ کر ابتداء سے انتہاء تک پوری تعلیم وتربیت حاصل کی، اور اٹھارہ سال کی عمر میں جملہ علوم وفنونِ مروجہ کی تحصیل سے فراغت پائی، اس کے بعد بطور یمن وبرکت کے اپنے والد کے مرشد شیخ پیر محمد جونپوری لکھنوی سے تھوڑا سا پڑھ کر ان ہی سے سند فراغت لی، اس وقت شیخ صاحب کی عمر اکیس سال کی تھی، آزاد بلگرامی نے لکھا ہے:۔

آنجناب از ابتداء تا انتہاء درظلِ تربیت میر محمد شفیع قدس سرہ کہ برخے نزد شیخ عطاء اللہ والد شیخ غلام نقشبند تلمذ کردہ بود جا گرفت،

شیخ صاحب نے اپنے والد کے شاگرد میر محمد شفیع قدس سرہ کے سایۂ تعلیم وتربیت میں شروع سے آخر تک رہ کر کمالات وفضائل

۱؎ ایضاً ج ۶ ص ۲۱۳ ۲؎ مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۱۳

وہمت بہ احراز فضائل صرف کردہ درسن	کی تحصیل میں کوشش کی، اور اٹھارہ سال کی
ہزدہ ۱۸ سالگی منتی الجموع فنون کمال کردید، ودر	عمر میں جملہ علوم وفنون میں کمال حاصل کیا
سن بست ویک سالگی تیمناً قدرے نزدیک	اور اکیس سال کی عمر میں بطور برکت کے
شیخ الشیخ خود شیخ پیر محمد قدس سرہ خواندہ رسم فاتحہ	اپنے شیخ الشیخ حضرت پیر محمد قدس سرہ سے
بجا آورد[1]	فاتحہ الفراغ پڑھی۔

اساتذہ

سبحۃ المرجان میں بھی اختصار کے ساتھ یہی درج ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ شیخ صاحب ۱۰۵۱ھ میں پیدا ہوئے اور اپنے والد کی تعلیم وتربیت میں گیارہ بارہ سال تک رہے، پھر ۱۰۶۳ھ میں والد کے انتقال کے بعد چھ سات سال تک میر محمد شفیع کی خدمت میں رہ کر پوری تعلیم حاصل کی اور اٹھارہ سال کی عمر میں فراغت پائی، اس کے بعد شیخ پیر محمد سے شرف تلمذ حاصل کر کے اکیس سال کی عمر میں ۱۰۷۲ھ میں باقاعدہ سند فراغت حاصل کی، یعنی ان کے والد کے علاوہ انکے دو اور استاد ہیں۔نزہتہ الخواطر کی تصریح کے مطابق شیخ صاحب نے شیخ پیر محمد سے قدوری، شرح چغمینی اور تفسیر بیضاوی کا ایک حصہ پڑھا[2]۔

شیخ پیر محمد جونپوری لکھنوی

حضرت شیخ پیر محمد بن اولیاء ۲۶ رمضان ۱۰۲۷ھ میں جونپور کے ایک دیہات منڈیا ہو میں پیدا ہوئے بچپن ہی میں والد کا انتقال ہو گیا چچا نے پرورش کی، مانک پور جا کر وہاں کے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی، وہیں شیخ عبداللہ سیاح دکنی سے ملاقات ہوئی، ان سے طریقت وروحانیت کی تربیت حاصل کر کے ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے، وہاں سے لکھنؤ آکر قاضی عبدالقادر لکھنوی متوفی ۱۰۷۷ھ سے بقیہ کتب درسیہ پڑھیں، اس کے بعد دوبارہ شیخ عبداللہ سیاح کی

---

[1] مآثر الکرام ج ۱ ص ۱۳ و سبحۃ المرجان ۸۷ [2] نزہتہ الخواطر جلد ۶ ص ۲۱۳۔

خدمت میں رہ کر طریقۂ چشتیہ میں مرتبۂ کمال کو پہونچے، شیخ عبداللہ سیاح نے انکو تاکید کی کہ پہلے علمی و تعلیمی اشغال میں کوشش کریں، پھر طریقت کے معاملات میں مشغول ہوں، اس نصیحت کے مطابق شیخ پیر محمد دہلی آگئے اور شیخ حیدر کی خدمت میں رہ کر کتب درسیہ کی تکمیل کی یہاں بھی انکی ملاقات شیخ عبداللہ سیاح سے ہوئی اور انھوں نے شیخ پیر محمد کو طریقت کے تمام طرق وسلاسل اور عوارف المعارف و جواہر خمسہ کی اجازت دی، علوم ظاہری اور علوم باطنی کی تحصیل و تکمیل کے بعد لکھنؤ واپس آکر تعلیم و تدریس اور ارشاد و تلقین کا مشغلہ اختیار کیا اور گیارہویں صدی میں دیارِ مشرق کے مشاہیر علماء و مشائخ میں شمار کئے گئے، ان کی تصانیف میں حاشیۂ ہدایہ، مجموعہ فتاوی، سراج الحکمۃ حاشیہ ہدایت الحکمۃ اور منازل اربعہ مشہور کتابیں ہیں، ان سے بہت سے علماء و مشائخ نے فیض پایا جن میں شیخ غلام نقشبند کے والد شیخ عطاء اللہ نمایاں ہیں۔

۱۴ر جمادی الاخری ۱۰۸۵ھ میں لکھنؤ میں وفات پائی اور دریائے گومتی کے کنارے ایک ٹیلہ پر دفن کئے گئے جو بعد میں ٹیلہ پیر محمد شاہ کے نام سے مشہور ہوا۔[1]

میر محمد شفیع دہلوی

میر محمد شفیع بن محمد مقیم حسینی دہلوی لاہور میں پیدا ہوئے بچپن ہی میں والد کا انتقال ہوگیا، اور اپنی والدہ کے چچا محمد طاہر کے ساتھ جونپور چلے آئے، اور شیخ جلال الدین حسین پوری سے بیعت کر کے کچھ دنوں جونپور میں مقیم رہے۔ جب محمد طارق لکھنوی کی وقائع نگاری پر مقرر ہوئے تو ان کے ہمراہ لکھنو جا کر شیخ عبدالقادر لکھنوی متوفی ۱۰۷۷ھ سے بعض کتابیں پڑھیں، اس وقت شیخ پیر محمد کی ذات مرجع بنی ہوئی تھی، میر محمد شفیع کچھ دنوں ان کی خدمت میں رہے اور ان ہی کے مشورے سے دوبارہ جونپور جا کر وہاں کے اساتذہ سے کتبِ درسیہ کی تحصیل و تکمیل کی، اور واپس آکر شیخ پیر محمد سے باقاعدہ بیعت کی اور ان کی خدمت میں رہے۔ اس کے بعد جب محمد طاہر کی تقرری گورکھپور میں ہوئی تو ان کے ہمراہ گورکھپور چلے گئے، یہاں حاکم شہر فدائی خاں ان کا معتقد ہوگیا، اسی دوران میں

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۳۴، ۳۵، نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۹۶، ۲۷۔

شیخ پیر محمد لکھنوی نے میر محمد شفیع کو مشورہ دیا کہ وہ دہلی میں مستقل قیام کر کے خلق اللہ کی نفع رسانی کریں، چنانچہ وہ دہلی چلے گئے، فدائی خاں بھی دہلی چلا گیا اور اس نے اپنے لئے ایک شاندار مدرسہ اور خانقاہ تعمیر کی، ۱۰۸۵ھ میں اپنے مرشد شیخ پیر محمد کے وصال پر لکھنؤ آئے اور اپنے شاگرد رشید شیخ غلام نقشبند کو انکا سجادہ نشین بنایا، اس کے بعد حج و زیارت سے مشرف ہوئے، اور ۸/ محرم ۱۰۰۹ھ کو دہلی میں فوت ہوئے[۱]

جامعیت

شیخ غلام نقشبند علم و عرفان اور شریعت و طریقت میں جامع شخصیت رکھتے تھے، علوم دینیہ کے علاوہ علوم عقلیہ، علوم ادبیہ نحو، لغت، اشعارِ عرب، ایامِ عرب اور شعر و ادب میں اپنے دور و دیار کے سب سے بڑے عالم مانے جاتے تھے، وہ بیک وقت مدرس، مرشد، مصنف اور شاعر سب کچھ تھے ان کے اوصاف و کمالات نے ان کو طالبان علوم اور طالبان فیوض دونوں کا مرجع بنا دیا تھا آزاد بلگرامی نے مآثر الکرام میں لکھا ہے:۔

علامہ ایست جامع عجائب و غرائب علوم خدا رسی، خازن اسرار العلوم مکتوم[۲]	وہ ایسے علامہ ہیں جو خدا تک پہونچانے والے علوم کے عجائب و غرائب کے جامع اور علوم مخفیہ کے اسرار کے دانا ہیں۔

سبحۃ المرجان میں ہے:۔

ھو اوحد الزمان، والجامع بین العلم والعرفان،[۳]	وہ یکتائے زمانہ اور علم و عرفان کے جامع ہیں:۔

تذکرہ علمائے ہند میں ہے:۔

یگانۂ روزگار، جامع شریعت و طریقت بود،[۴]	وہ یگانۂ روزگار اور شریعت و طریقت کے جامع تھے،

---

[۱] نزہۃ الخواطر جلد ۶ ص ۳۱۹، [۲] مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۱۳، [۳] سبحۃ المرجان ص ۷۸، [۴] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۵۸،

صاحب نزہۃ الخواطر لکھتے ہیں:۔

الشیخ العالم الکبیر العلامة کان من کبار الاساتذه لم یکن فی زمانه اعلم منه بالنحو واللغة والاشعار وایام العرب وما یتعلق بها، متون اعلیٰ علوم الحکمة [1]	وہ شیخ، عالم کبیر علامہ اور کبار اساتذہ میں سے تھے ان کے زمانہ میں نحو، لغت، اشعار، ایام عرب اور ان کے متعلقات کا ان سے بڑا عالم نہیں تھا نیز علوم حکمت وفلسفہ سے حصہ وافر رکھتے تھے۔

شیخ صاحب اکیس سال کی عمر میں ۱۰۷۲ھ میں تحصیل وتکمیل سے فارغ ہوئے، ۱۰۸۵ھ میں شیخ پیر محمد کی وفات کے بعد ان کے جانشین بنے اور تعلیم وتدریس اور ارشاد وتلقین میں مصروف ہوئے اس سے پہلے بارہ تیرہ سال کی مدت غالباً درس وتدریس میں گزری اور ۱۰۸۵ھ سے وفات ۱۱۲۶ھ تک اپنے مرشد کی جگہ مسلسل چالیس سال تک علمی اور دینی خدمات انجام دیں،

شیخ پیر محمد کی وفات اور شیخ غلام نقشبند کی سجادہ نشینی

حضرت شیخ پیر محمد کی وفات کے بعد شیخ غلام نقشبند کی جانشینی شیخ صاحب کی دینی اور علمی زندگی کے لئے مبارک ثابت ہوئی اسی کے بعد انکو قبول عام حاصل ہوا، اسی سلسلہ میں ان کے والد کے شاگرد اور خود ان کے استاد میر محمد شفیع نے اخلاص وایثار کا جو مظاہرہ کیا ہے وہ استادی اور شاگردی کی دنیا کا اہم واقعہ ہے جو آج کل کے اساتذہ وتلامذہ کے لئے سبق آموز ہے۔

آزاد بلگرامی نے مآثر الکرام اور سبحۃ المرجان میں اسکی تفصیل یہ بیان کی ہے کہ شیخ پیر محمد قدس سرہ کی وفات کے بعد ان کے تمام خلفاء اور مریدوں نے باتفاق رائے میر محمد شفیع کو ان کا سجادہ نشین منتخب کر کے ان کے دہلی سے آنے تک سجادہ کو تہ کر کے رکھ دیا، میر محمد شفیع نے لکھنؤ آکر چاہا کہ اپنے بجائے اپنے شاگرد رشید شیخ غلام نقشبند کو سجادہ نشین بنائیں، مگر اس کو اسطرح چھپائے رکھا کہ شیخ غلام نقشبند کو بھی اس کی خبر نہیں دی، اور اس رسم کے لئے ایک دن مقرر کیا، جب لوگ جمع ہو گئے

[1] نزہۃ الخواطر جلد ۶ ص ۲۱۳،

تو سجادہ کو خلفاء و مریدین کے سامنے بچھا کر شیخ غلام نقشبند کا ہاتھ پکڑا اور سجادہ پر بٹھا دیا، اور ان کے سامنے آداب مریدی سے مؤدب ہو کر بیٹھ گئے، ان کو دیکھ کر تمام حاضرین نے ایسا ہی کیا، آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:۔

قدر و منزلتِ شیخ غلام نقشبند از ینجا تواں دریافت کہ اور اشایستہ خلافت دیدہ بجائے پیر نشاند، وآداب مریدانہ بجا آورد، فی الواقع شیخ غلام نقشبند سجادہ را رونق دیگر داد و مرجع طلاب ظاہری و باطنی گردید و جہانے را بہ یمن تربیت از کمالات جہتیں گران مایہ ساخت سلسلۂ اکثر فضلائے عصر بہ آنجناب منتہی می شود۔[1]	شیخ غلام نقشبند کی قدر و منزلت اسی سے معلوم کرنی چاہیئے کہ میر صاحب نے ان کو سجادہ نشینی کے قابل سمجھ کر اپنے پیر کی جگہ پر بٹھایا اور خود آداب مریدی بجالائے، واقعہ یہ ہے کہ شیخ غلام نقشبند نے سجادہ کو کچھ اور ہی رونق بخشی اور علوم ظاہری و باطنی کے طالب علموں کے مرجع بن کر ایک دنیا کو اپنی تربیت کی برکت سے علمی و روحانی کمالات سے مالا مال کیا، اس زمانہ کے اکثر علماء وفضلاء کا سلسلۂ درس انہی پر ختم ہوتا ہے۔

سبحۃ المرجان میں لکھتے ہیں،" ومن ھھنا یعرف علو منزلة الشیخ حیث وجده المیرا ھلاً للسجادة واٰثره علیٰ نفسہٖ فی الجلوس علیھا ،فزینھا الشیخ بالتمکین ونفع خلقاً کثیرا بالتدریس والتلقین وسلسلة الا کثرین من علماء العصر تنتھی الیه،[2]

نزہۃ الخواطر میں بھی شیخ غلام نقشبند کے حالات میں انہی کی جانشینی کی تصریح کی ہے، مگر میر محمد شفیع کے ذکر میں لکھا ہے کہ انھوں نے اپنے پیرو مرشد کی مسند پر محمد آفاق بہاری کو بٹھایا جو خلافِ واقعہ معلوم ہوتا ہے

[1] مآثر الکرام ص ۲۱۴، [2] سبحۃ المرجان ص ۷۸،

میر محمد شفیع سے خصوصی نسبت اور ان کا احترام

میر محمد شفیع نے اپنے یتیم استادزادے شیخ غلام نقشبند کی تعلیم و تربیت اور عزت وشہرت میں جس اخلاص و محبت کا ثبوت دیا، شاگرد نے ہمیشہ اس کا پورا لحاظ رکھا، چنانچہ میر صاحب کی وفات کے بعد بھی جب لکھنؤ سے دہلی جاتے تھے۔ تو ان کے مزار پر فاتحہ پڑھ کر ایصالِ ثواب کرتے تھے، آزاد بلگرامی نے لکھا ہے:۔

محل اقامت میر محمد شفیع شاہجہاں آباد بود،	میر محمد شفیع کا قیام دہلی میں تھا، اور ان کا تکیہ
وتکیۂ ایشان دراں مصر جامع مشہور است، شیخ	وہاں مشہور ہے، شیخ غلام نقشبند میر صاحب
غلام نقشبند برائے زیارت میر قدس سرہ ہم	کی زندگی میں اور ان کے انتقال کے بعد
درایام حیات وہم بعد از ممات او بہ شاہجہاں	بھی انکی زیارت کے لئے جایا کرتے تھے
آبادمی رفت وکسب برکات می نمود،[1]	اور کسب برکات فرماتے تھے۔

شیخ صاحب نے میر صاحب کی مدح میں عربی میں تیس اشعار کا ایک قصیدہ بھی کہا ہے، جس کا مطلع یہ ہے

خلیلیَّ هل هاتان دارۃ جُلبُل   ودارۃ سلمیٰ فی قفافِ عُقَنقُل

استاد کی شفقت اور شاگرد کے احترام کو دینی و علمی افادہ واستفادہ کے درمیان واسطۃ العقد کی حیثیت حاصل ہے اور تعلیم و تعلم کا بھرم اسی ربط و تعلق سے قایم ہے، شیخ صاحب اور میر صاحب کا باہمی ربط اس کی بہترین مثال ہے۔

تدریس وافادہ

شیخ غلام نقشبند اپنے اقران ومعاصرین میں تعلیمی خدمات، تلامذہ کی کثرت اور علمی سلسلہ کی افادیت و وسعت میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ یوں تو ان کے دور میں دیار پورب میں

---

[1] مآثر الکرام ص ۲۱۴

بہت سے علماء و فضلاء اور مشائخ تعلیم و تلقین میں مصروف تھے مگر شیخ صاحب کے تعلیمی و تدریسی سلسلہ سے جتنا فیض پہونچا وہ انکا طرۂ امتیاز ہے، آزاد بلگرامی کا یہ بیان گزر چکا ہے ''سلسلۂ اکثر فضلائے ہند بہ آن جناب منتہی می شود'' سبحۃ المرجان میں ہے ونفع خلقاکثیرابالتدریس والتلقین وسلسلة الاكثرين من علماء العصر تنتهي اليه،

تذکرہ علمائے ہند میں ہے۔

وتمام عمر گرامی خود بافادہ وتدریس طلبۂ	شیخ صاحب نے اپنی پوری زندگی طالب
علوم بسر بردہ جمع کثیر از افاضل نامدار	علموں کے افادہ اور تدریس میں بسر کی، اور
بسایۂ تربیتش بمراد خود رسید ند وسلسلۂ	فضلاء کی ایک بڑی جماعت انکے زیر
تعلیم اکثر علمائے ہندوستان بدوی	تربیت رہ کر بامراد ہوئی ہندوستان کے اکثر
پیوندد۔[1]	فضلاء کا سلسلہ تعلیم ان پر منتہی ہوتا ہے۔

صاحب نزہۃ الخواطر نے کان من کبادالاساتذہ'' کے جامع الفاظ میں شیخ صاحب کی تعلیمی وتدریسی خدمات کو بیان کیا ہے۔

شیخ غلام نقشبند نے شیخ پیر محمد کی وفات کے بعد انکی جگہ سنبھالی اور تقریباً چالیس سال تک تعلیمی مشغلہ جاری رکھا، یہ چالیس سالہ دوران کی علمی زندگی کا حاصل ہے، ان کی درسگاہ میں طلبہ کی کثرت اور سرگرمی نے ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے دور کی یاد تازہ کروی، یوں تو ان کی درسگاہ سے صدہا طلبہ عالم وفاضل بن کر نکلے اور اپنے اپنے دیار میں علمی شہرت کے مالک ہوئے۔ مگر ملا نظام الدین متوفی ۱۱۶۱ھ بانی درس نظامیہ ان سب میں شیخ صاحب کے سچے جانشین ثابت ہوئے، ان کے واسطہ سے شیخ صاحب کا تعلیمی سلسلہ پورے ہندستان میں جاری وساری ہوا۔

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۵۸

تلامذہ کے ساتھ شفقت ومحبت

شیخ غلام نقشبند بڑے شفیق مدرس تھے ،تلامذہ کے علم وفضل کا اعتراف کر کے خوش ہوتے تھے ،ان کی ترقی درجات کے لئے دعائیں اور نیک تمنائیں کرتے تھے ،استاد کی اس شفقت سے طالب علموں کو بڑا فیض پہونچتا تھا ،اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو ،''میر عبدالجلیل بلگرامی شیخ صاحب کے نامور شاگرد تھے ،جن کے فضل وکمال کا وہ کھلے الفاظ میں اعتراف کرتے تھے ،اور انکی تعریف وتوصیف میں رطب اللسان رہتے تھے ۔آزاد بلگرامی میر عبدالجلیل کے تذکرہ میں لکھتے ہیں :۔

شیخ غلام نقشبند لکھنوی ہمیشہ تعریف وتوصیف می نمود ،	شیخ غلام نقشبند ہمیشہ ان کی تعریف وتوصیف کیا کرتے تھے ،

پھر یہ واقعہ درج کیا ہے کہ ایک مرتبہ شیخ غلام نقشبند نے ایک تاریخی دائرہ بنا کر اپنے شاگرد میر عبدالجلیل کے پاس بھیجا اور حروف ابجدی سے اعداد وتواریخ نکالنے کا طریقہ نہیں لکھا ،میر صاحب نے اس تاریخی دائرہ کا حل معلوم کرلیا اور خود ہی ،اس طرح کا ایک دائرہ بنا کر استاد کی خدمت میں بھیجا تو استاد نے اپنے شاگرد کی فہم وفراست پر خوش ہوکر یہ خط تحریر فرمایا۔

میر والا مدارج انسانی مجمع فیوضات ربانی علامت ! گرامی نامہ خلت شامہ مشتمل بررسیدن بلگرام وتفویض خدمت بخشی گری وقائع نگاری گجرات رسید ،مسرت فراوان بخشید الحمدللہ کہ بروفقِ خواہش دوستان باجمعیت این طرف تشریف آوردند فقیر را مخلص صمیم دانستہ از دیادِ دعا غافل ندانند ، حق سبحانہٗ ہمیشہ در ترقی جمعیتِ نشائیں دارد ، دیگر رسالہ اعجاز از دوائر رسید ، زبان	صاحبِ مدارج انسانی مجمعِ فیض ربانی جناب میر صاحب ! آپ کا محبت آمیز گرامی نامہ پہونچا جس میں بلگرام پہونچنے اور گجرات میں بخشی گری اور وقائع نگاری پر تعیناتی کی خبر ہے جس سے بہت زیادہ خوشی ہوئی الحمدللہ کہ دوستوں کی خواہش پر آپ یہاں تشریف لائے ۔فقیر کو اپنا مخلص سمجھئے اور اسے یاد اور دعا سے غافل نہ سمجھئے ،اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ علم ومعرفت کی ترقی عطا فرمائے دوسری بات یہ

از مدحتِ آن قاصر است، حقا کہ ذاتِ	ہے کہ دوائر کا نقشہ معجز نما پہونچا، اس کی تعریف
سامی آیات دریں زمانہ بے عدیل	سے زبان قاصر ہے، واقعہ یہ ہے کہ آپ کی
است، اللہ تعالیٰ ایں افادہ مستدام	ذات بلند صفات اس زمانہ میں بے مثل ہے،
دارد، زہے فطرت صائب وذہن ثاقب	اللہ تعالیٰ آپ کی افادیت کو قائم ودائم رکھے، کیا
کہ سرش معلوم نمودہ، دائرہ از خود وضع	ہی فطرت صائب اور ذہن ثاقب ہے، آپ
نمودند، غرضکہ کمال سامی از تحریر بیرون	نے خود دائرہ بنایا ہے، الغرض آپ کا کمال تحریر
است دیگر از اشتیاقِ گرامی صحبت	سے بالاتر ہے، دوسری بات یہ ہے کہ آپ کی
چہ بر گذارد، اللہ تعالیٰ بوجہ احسن	صحبتِ گرامی کا بیحد اشتیاق ہے، اللہ تعالیٰ
میسّر آرد، والسلام[1]	بخیر وخوبی اس کا موقع دے،

شیخ صاحب کے اس ایک مکتوب سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے شاگردوں پر کس قدر شفیق تھے۔ اوران کے فضل وکمال کا کس کشادہ دلی سے اعتراف کرتے تھے۔

شاہ عالم بادشاہ کی قدردانی

شیخ غلام نقشبند نے تین سلاطین مغلیہ کا دور پایا ہے، ان کی پیدائش شاہ جہاں کے دور (۱۰۳۶ھ تا ۱۰۹۸ھ) میں ہوئی، اسی دور میں تحصیل وتکمیل سے فراغت کے بعد لکھنؤ میں شیخ پیر محمد کے سجادہ نشین اوران کے مدرسہ کے مدرس ہوئے، اورنگ زیب عالم گیر کے دور (۱۰۹۸ھ تا ۱۱۱۸ھ) میں ان کے درس وافادہ کا شباب تھا۔ ان کی وفات سے دو سال پہلے تک شاہ عالم بن عالمگیر کا دور ۱۱۱۸ھ تا ۱۱۲۴ھ تھا، اس کے بعد مغل سلطنت کا زوال شروع ہوا، شاہجہاں اور عالمگیر دونوں خصوصاً عالمگیر علماء وفضلاء کا بڑا قدرداں تھا، مگر ان دونوں سے شیخ غلام نقشبند کے تعلق کا پتہ نہیں چلتا، البتہ شاہ عالم کے بارے میں تصریح ہے کہ اس نے شیخ صاحب کے علمی کمالات کا شہرہ سن کر ملاقات اور بڑی قدردانی کی۔ مآثر الکرام میں ہے:۔

---

[1] مآثر الکرام ص ۲۵۹ ذکر میر عبدالجلیل بلگرامی،

شاہ عالم بہادر شاہ ایشاں را تکلیف ملاقات کرد۔ اعزاز واکرام بیش از حد بہ تقدیم رسانید۔ ۱	شاہ عالم بہادر شاہ نے ان کو ملاقات کی تکلیف دی اور حد سے زیادہ تعظیم وتکریم کا مظاہرہ کیا۔

سبحۃ المرجان میں ہے۔

وکلفہ شاہ عالم بن السلطان عالمگیر الملاقاۃ واقبل علیہ فی نہایۃ التعظیم والمداراۃ	شاہ عالم بن عالم گیر نے ان کو ملاقات کی تکلیف دی اور ان کے ساتھ نہایت خاطر مدارات سے پیش آیا۔

مگر اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ ملاقات دہلی میں ہوئی یا لکھنؤ میں البتہ نزہۃ الخواطر میں ہے کہ لکھنؤ میں ہوئی،

شاہ عالم بن عالمگیر الدھلوی ان لقیہ بمدینۃ لکھنؤ واکرمہ غایۃ الاکرام۔ ۲	شاہ عالم بن عالگیر دہلوی نے ان سے شہر لکھنؤ میں ملاقات کر کے نہایت تعظیم وتکریم کی۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ ملاقات وقتی اکرام واحترام تک محدود رہی اور شیخ صاحب نے کوئی جاگیر یا منصب قبول نہیں فرمایا،

شرعی امور ومعاملات میں شدت

شیخ غلام نقشبند خالص دینی اور علمی ماحول کی پروردہ تھے۔ ان کے دادا گھوسی کے قاضی اور میر علی عاشقاں سرائمیری کے مرید تھے، ان کی ذات شریعت وطریقت کی جامع تھی، ان کے والد علوم نقلیہ وعقلیہ میں کمال کے ساتھ تقویٰ میں نمایاں مقام رکھتے تھے، شیخ عبدالقدوس نظام آبادی اور شیخ پیر محمد لکھنوی سے روحانی واحسانی نسبت رکھتے تھے۔ غرض شیخ صاحب کا گھرانہ علم ومعرفت کا مجمع البحرین تھا، اور شریعت کے اوامر ونواہی پر شدت سے عمل کرتا تھا، خود شیخ صاحب علوم شرعیہ کے

۱ مآثر الکرام ص ۲۵۹ ذکر عبدالجلیل بلگرامی ۲۱۴ ۲ سبحۃ المرجان ص ۷۸۔

نامور عالم اور مدرس ہونے کے ساتھ علوم باطنیہ میں بھی کامل تھے، شریعت کے معاملات میں مطلق رد رعایت نہیں کرتے تھے۔ البتہ ان کے علم دین کے جلال میں احسان وتصوف کا جلال بھی تھا، شرعی تقصیر پر سخت نکیر کرتے مگر توبہ کے بعد دلداری ودلجوئی میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے تھے، مآثر الکرام میں ہے۔

مزاج اقدس ہمہ مصروف حفظ شریعت بود، وبروفق 'الحب للہ والبغض للہ'' چون از کسے امرے نا ملائم شرع سر می زد، غبار سخت بردامن خاطر والا می نشست، واگر آن کس توفیق توبہ می یافت زیادہ تراز سابق مورد الطاف می گردید۔[1]	آپ کا ذہن ومزاج ہمہ تن شریعت کی حفاظت میں مصروف رہتا تھا اور ''الحب للہ والبغض للہ'' کے مطابق اگر کسی آدمی سے کوئی بات خلاف شرع سرزد ہوجاتی تو سخت برہم ہوتے اور اگر وہ آدمی توبہ کی توفیق پا جاتا تو پہلے سے زیادہ انکی شفقت ومحبت کا مستحق ہوجاتا۔

سبحۃ المرجان میں ہے۔

وكان الشيخ حاميا لحمى الشريعة الغراء وحارساً لبيضة الملة البيضاء ،[2]	شیخ صاحب شریعت غراء اور ملت بیضاء کے محافظ ونگراں تھے۔

مآثر الکرام اور سبحۃ المرجان میں درج ہے کہ ایک دن ایک قلندر جو قید شریعت سے آزاد تھا شیخ صاحب کی مجلس میں آیا آپ نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ:

این طائفہ رانہ دیدار خدا میسر می شود ونہ شفاعت محمد صلی اللہ علیہ وسلم	اس طبقہ کو نہ خدا کا دیدار نصیب ہوگا اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت میسر ہوگی،

یہ سن کر قلندر نے برجستہ جواب دیا کہ شیخ! ہم قلندروں کو دیدار خداوندی اور شفاعت نبوی میسر ہوگی، البتہ آپ لوگوں کو کچھ نہیں ملے گا۔ شیخ صاحب نے اس کی وجہ دریافت کی، قلندر نے کہا کہ آپ حضرات نے زندگی بھر گناہ نہیں کیا ہے، اسلئے کل قیامت میں بلا مواخذہ بہشت میں

[1] مآثر الکرام ص ۲۱۴ [2] سبحۃ المرجان ص ۷۸،

داخل ہو جائیں گے، اور ہم قلندر غرق عصیان ہیں، اس لئے ہم کو رب العزت تعالیٰ شانہٗ کے حضور میں پیش کیا جائیگا، اور ہم مٹھی بھر گناہگاروں کی شفاعت کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قدم رنجہ فرمائیں گے، یہ سنتے ہی شیخ صاحب پر رقت طاری ہوگئی اور جلال کی کیفیت جمال میں بدل گئی،[1] مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ شیخ صاحب اس کے قائل ہو گئے، واقعہ یہ ہے کہ رحمت خداوندی اور شفاعت نبوی پر بھروسہ کر کے غضب خداوندی کا کام جائز نہیں ہے۔

شعر و شاعری

شیخ غلام نقشبند زندہ دل شاعر و ادیب بھی تھے، وہ لسانی و ادبی علوم کے مشہور عالم اور اشعارِ عرب کے ماہر تھے، الشعر العربی فی الهند میں ان کو نمایاں مقام حاصل تھا۔ وہ عربی زبان کے اچھے شاعر تھے، ان کی شاعری میں قدیم رنگ پایا جاتا ہے اور وہ بڑی حد تک عجمی رنگ و اثر سے مبرّا ہے اس سلسلہ میں تیس اشعار کا ایک قصیدہ ان کے استاد میر محمد شفیع کے مناقب و فضائل میں ہے اور عرب کے مشہور جاہلی شاعر امرء القیس کے معلقہ کے ہموزن و ہم قافیہ ہے، اس قصیدہ سے شیخ صاحب کے شاعرانہ ذوق و معیار کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے،

خلیلی هل هاتان دارة جلجلِ ودارة سلمیٰ فی قفاف عقنقلِ

علیها سواری المزن سحت مطیرة فسحت مبایذها محوح المهلهلِ

أرُبع الحبیبة صار للوحش موطناً فیا عجبا من صنع دهرِ محوّلِ

امنزل سلمیٰ هل تفرج غمّتی وتکشف عمانلعن ذات التدللِ

علی ای ارض خیمت ذات هولة تهول بوجهِ کالضحا متهللِ

فمنذ غداة البین قدبت فی الهوٰی بصدر جوی او بقلب مقتلِ

أعینی مهلا عبرة الوجد والجوٰی أانکما از معتما الیوم مقتلِ

وهل ینفع الملیکیٰ عیو ناوذ ارفا اذا او جهت سلمیٰ وکاب التبتلِ

---

[1] مآثر الکرام ص ۲۰۵، سبحۃ المرجان ص ۹۰۔

حبيب اذا ماجود الفنج عينها — فما المحى فيه واحد موئل؟

لها عارض تبريقة غير عارض — اسيل صيقل حسنه كالسجنجل

علام؟ تمنيني وفيك تلون — وحتام؟ تلهيني بوعدٍ مخيل

مواعيد عرقوب تقرمط بينها — كقرمطة النحلان نحل المنول

له همة عليا تنوف على السمآء — ومجد مجيد نيله لم يسهل

بجيل جليل من شفيع كاسمه — ومن جده خير الورىٰ خير مرسل

لزهرة زهراء ووردة حيدرٍ — ويهزء خلقا عطر دارالتجمل

لنورٌ به الا فلاك والارض نورت — وتشويد تسويد وشرق مكلل

اذا ما هداة الناس عدت فراسهم — وهاديهم المقدام من كل أمثل

وبينا سبيل الحق يمشون ظلمة — اذا انبلجت شمس هذه التنجل

معارف جلت معاليه قد علت — اشم جبال يا نفخم مفضّل

لديه علوم لا يرام فناء ها — واسرار لوح فى الاساديرتجتل

ولد يوثر الدنيا الدنى نعيمها — وينعم عندالله احسن مفصلٍ

لقد دام بالرحمٰن حفظ شهوده — تجنى جنا العرفان غير معللٍ

تجلى له فى كل آنٍ تجليا — لديه تجلى الور لم تيجملِ

ومن سرة قد ذاق يعلول طاهرالسرائه — منه فهو بالنور ممتلِ

شفيعى ليوم الحشر حرزيومائلى — ووجهة قلبى غوث كل مومل

لكل عصام واعتصامى بفضله — كنانى قواماً ذات يوم التجلجل

ماثره لا يهدين بعدها؟ — ومحصى الرمال وجندل

يطوف حواليه المكارم والعلى — طواف حبحيج حول بيت مهجلِ

تلامذہ

شیخ غلام نقشبند کی مختلف الجہات شخصیت تعلیم و تدریس میں ممتاز مقام رکھتی ہے، ان کا حلقۂ درس مشہور تھا، بہت سے افاضل نے انکے دامن میں تعلیم و تربیت حاصل کی، ہندستان کے اکثر علماء کا تعلیمی سلسلہ ان کی ذات پر ختم ہوتا ہے، وہ فقہ، اصول فقہ، عربی ادب اور حکمت و فلسفہ کے زبردست عالم تھے، اور ان کی درسگاہ سے بقول آزاد بلگرامی ایک جہاں اور خلقِ کثیر نے فیض اٹھایا ۱۰۸۵ھ سے ۱۰۲۶ھ تک تقریباً چالیس سال علوم اسلامیہ کا درس دیا، اور ہزاروں طلبہ نے ان سے تعلیم حاصل کی، ان میں سے چند مشہور تلامذہ کے مختصر حالات درج کیے جاتے ہیں [1]۔

ملاّ نظام الدین لکھنوی

حضرت ملا نظام الدین بن ملا قطب الدین شہید سہالوی لکھنوی شیخ صاحب کے ارشد تلامذہ میں ہیں جن کی ذات سے شیخ صاحب کا سلسلۂ درس پورے ہندستان میں جاری ہوا، اس اعتبار سے ملا نظام الدین اپنے استاد کے صحیح جانشین اور وارث ہیں، والد ماجد کی شہادت کے بعد سہالی سے لکھنؤ چلے آئے، ملا قطب الدین شمس آبادی اور حافظ امان اللہ بنارسی وغیرہ سے پڑھ کر شیخ غلام نقشبند سے لکھنؤ میں پڑھا اور ان ہی کی خدمت میں رہ کر سند فراغت حاصل کی، طریقت کی تلقین و تربیت شیخ عبدالرزاق ہانسوی اور میر اسمٰعیل بلگرامی سے پائی، فراغت کے بعد فرنگی محل لکھنؤ میں مسند تدریس بچھائی اور پورے ہندستان کو علمی فیض پہونچایا، وہ واقعی بقول آزاد "استاد جہاں اور تحریر زماں" تھے مآثر الکرام میں ہے،

وتمام عمر بہ تدریس و تصنیف اشتغال ورزید، واعتبار واشتہار عظیم یافت، امروز اکثر قطر ہندستان نسبت تلمذ	شیخ صاحب نے تمام عمر تدریس و تصنیف کا مشغلہ جاری رکھا اور اس میں اعتماد و شہرت پائی، ان دنوں ہندستان کے اکثر علماء

[1] نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۲۱۳، ۲۱۴

بمولوی دارند، وکلاہ گوشۂ تفاخر می شکنند وکسے کہ سلسلۂ تلمذ بادمی رساند بین الفضلاء علم امتیازی افروز مردم بسیار را دیدہ شد کہ تحصیل جاہائے دیگر کردند، وبرائے اعتبار فاتحہ فراغ از مولوی گرفتند۔[1]

ملا صاحب سے تلمذ کی نسبت رکھتے ہیں، اور اس پر فخر کرتے ہیں، جو شخص ان سے اپنا سلسلہ ملاتا ہے علماء وفضلاء میں ممتاز شمار کیا جاتا ہے بہت سے لوگوں کو دیکھا گیا کہ دوسری جگہ پڑھ کر سند فراغت ملا صاحب سے لی تا کہ معتمد ومعتبر عالم مانے جائیں،

ملا صاحب کی وفات چہار شنبہ ۹/ جمادی الاول ۱۱۶۱ھ کو لکھنؤ میں ہوئی ان کے تلامذہ پورے ہندستان میں پھیلے ہوئے تھے، اور انکے استاد شیخ غلام نقشبند کے وطن کے اطراف میں بھی ان کے کئی شاگرد تھے جن میں مولانا محمد احسن چریاکوٹی اور مولانا غلام فرید محمد آبادی زیادہ مشہور ہیں، مولانا محمد احسن بن محمد اکرام بن سلطان احمد عباسی چریاکوٹ میں پیدا ہوئے اور وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کر کے ملا نظام الدین کی خدمت میں لکھنؤ گئے اور ان سے علوم مروجہ پڑھ کر سند فراغت حاصل کی بڑے ذہین وطبّاع عالم تھے۔ علوم عقلیہ میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ فراغت کے بعد دہلی گئے جہاں ان کی علمی شہرت عام ہوئی اور بہت سے امراء ان کے معتقد ہو گئے اس سے بعض معاصرین کو حسد ہوا اور انکو زہر دے دیا گیا۔[2]

مولانا غلام فرید محمد آباد میں پیدا ہوئے اور لکھنؤ جا کر ملا نظام الدین سے کتب درسیہ کی تعلیم حاصل کی اور ان ہی سے طریقت وروحانیت کا فیض پایا، اس کے بعد وطن آ کر زہد وقناعت کی زندگی بسر کی، ایک دن کے ناغہ سے روزہ رکھتے تھے اپنی روزی خود کماتے تھے، نہایت باوقار اور صالح انسان تھے، زندگی بھر شادی نہیں کی اپنی والدہ کے ہاتھ کا پکایا ہوا کھانا کھاتے تھے، ان کی زبان میں اتنا اثر تھا کہ جو بات منھ سے نکلتی تھی وہ پوری ہوتی تھی، اودھ کی نوابی کے زمانہ میں نواب فضل علی خاں حاکم غازی پور نے چکلہ اعظم گڑھ کا ایک حصہ فتح کر کے مولانا غلام فرید سے مزید کے لئے دعا کی درخواست کی، فریدآباد ان کے نام پر مشہور محلّہ ہے۔[3] ملا صاحب کے استاذ زادے

---

[1] مآثر الکرام ص ۲۲۰، ذکر ملا نظام الدین۔ [2] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۷۶، ۱۷۷ [3] تجلی نور

شیخ احمد بن شیخ غلام نقشبند بھی انکے شاگرد تھے۔ جن کا وطن اصلی گھوسی تھا، انکا تذکرہ آگے آرہا ہے،

میر عبدالجلیل بلگرامیؒ

میر عبدالجلیل بن سید احمد حسینی بلگرامی بھی شیخ صاحب کے خاص تلامذہ میں بڑے پایہ کے عالم تھے، ابتدائی کتابیں میر طفیل محمد اترولی بلگرامی کی معیت میں میر سعد اللہ بلگرامی سے پڑھیں اور قصبات پورب میں متوسطات کی تعلیم حاصل کر کے شیخ غلام نقشبند کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے اور یہیں سے فراغت پائی، حدیث، تفسیر، لغت، عربیت، تاریخ اور موسیقی میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ حافظہ اسقدر قوی تھا کہ عربی لغت کی مشہور اور ضخیم کتاب القاموس زبانی یاد کرلی تھی، استاد شاگرد کی تعریف وتوصیف میں بڑی لذت محسوس کرتے تھے، دونوں بزرگوں میں خط و کتابت رہا کرتی تھی۔

میر عبدالجلیل ابتداء میں تحصیلِ علم کے لئے میر طفیل محمد کے ساتھ آگرہ گئے جہاں نواب فضائل خاں سابق میر منشی سے ملاقات ہوئی جو شاہی ملازمت ترک کر کے گوشہ نشین ہو گئے تھے، کچھ دنوں کے بعد شاہ حسین خاں سرکار لکھنؤ کے دیوان مقرر ہوئے اور اس سلسلہ میں دکن سے آگرہ آئے تو میر عبدالجلیل اور میر طفیل محمد ان کے ہمراہ لکھنؤ چلے آئے، شاہ حسین خاں نے ان دونوں حضرات کے ساتھ بڑی مراعات کیں، اسی زمانہ میں میر عبدالجلیل نے شیخ غلام نقشبند سے شرف تلمذ حاصل کیا، اورنگ زیب عالمگیر کے زمانہ سے فرخ سیر کے دور تک فوج میں وقائع نگاری کے منصب پر فائز رہے، عربی، فارسی، ہندی، ترکی زبانوں کے ماہر تھے اور اوران تمام زبانوں میں انکی تصانیف ہیں، ۲۳ ربیع الآخر ۱۱۳۸ھ میں دہلی میں فوت ہوئے اور بلگرام میں دفن کئے گئے۔[1]

سید فرید الدین بلگرامی

سید فرید الدین بلگرامی سید بدلی کے نام سے مشہور تھے، ۱۱۱۳ھ میں میر قادر بلگرامی کے

---

[1] مآثر الکرام ص ۲۵۸ تا ۲۶۰، وتذکرہ علمائے ہند ص ۱۰۸۔

ساتھ ملا جیون امیٹھوی کے حلقۂ درس میں پہونچے اور ان سے تعلیم حاصل کر کے شیخ غلام نقشبند کی درسگاہ میں حاضر ہوئے، سید فرید الدین نے یہیں بقیہ کتب درسیہ پڑھ کر فراغت پائی، ۱۱۲۰ھ میں فوت ہوئے۔[1]

شیخ محمد قاسم کاکورویؒ

شیخ محمد قاسم بن عبدالکریم بن اللہ داد حسینی جونپوری کاکوروی کاکوری میں پیدا ہوئے لکھنؤ میں شیخ غلام نقشبند سے علوم شرعیہ کی تعلیم حاصل کر کے ان کی خدمت وصحبت میں مدتوں رہے، اور معرفت وطریقت میں درجۂ کمال کو پہونچے، وہاں سے کاکوری آئے، اپنے وقت کے مشہور مشائخ میں سے تھے، ان کی روحانی طاقت بہت بڑھی ہوئی تھی۔ ان سے کشوف وکرامات کا صدور بھی ہوتا تھا، والد کے انتقال کے بعد بجنور (نواح لکھنؤ) میں اقامت اختیار کر لی تھی اور وہیں ۲۵ محرم ۱۱۰۵ھ میں انتقال کیا۔[2]

سید قادری بلگرامی

سید قادری بلگرامی نے ابتدا میں اپنے والد سید ضیاء اللہ بلگرامی سے حفظ قرآن وتجوید کی تعلیم حاصل کی اور ان سے ابتدائی کتابیں پڑھنے کے بعد سید فرید الدین بلگرامی کے ساتھ ملا جیون امیٹھوی سے پڑھا اور بقیہ کتابیں شیخ غلام نقشبند سے پڑھیں، فراغت سے پہلے حرمین شریف گئے، اور دوبارہ حج وزیارت کی سعادت سے بہرہ ور ہو کر کربلا اور بغداد کے مشائخ سے قادریہ، رفاعیہ اور شاذلیہ سلاسل میں بیعت ہوئے شب پنجشنبہ ۱۳ ربیع الاول ۱۱۴۵ھ میں بلگرام میں فوت ہوئے۔[3]

---

[1] مآثر الکرام ص ۱۴۳، ونزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۲۶۳ [2] نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۳۴۶ [3] مآثر الکرام ص ۱۴۴، ۱۴۵، و سبحۃ المرجان ص ۲۵۳۔

شیخ نور الہدیٰ امیٹھوی

شیخ نور الہدیٰ بن مودود بن عبد الواسع عثمانی امیٹھی میں پیدا ہوئے، حفظ قرآن کے بعد شیخ غلام نقشبند اور دیگر علماء سے پڑھ کر پندرہ سال کی عمر میں جملہ علوم کی تحصیل سے فارغ ہوئے، نہایت ذہین وطباع اور دین ودیانت میں پختہ تھے۔ علمی بحث ومباحثہ میں دلچسپی رکھتے تھے، پوری زندگی اپنے استاد کی طرح درس وتدریس میں بسر کی، اور ۱۳/رجب ۱۱۳۳ھ میں فوت ہوئے۔[1]

مفتی شرف الدین لکھنویؒ

مفتی شرف الدین بن محی الدین بن صدر الدین اعظمی لکھنوی نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے پائی، اور شیخ غلام نقشبند سے تفسیر بیضاوی کے چند اسباق پڑھ کر ان ہی سے طریقت کی تعلیم حاصل کی، بڑے عالم وفقیہ تھے، شاہی خدمات کے صلہ میں عالم گیر نے چہار صدی ذات کے منصب سے نوازا جو محمد شاہ کے دور تک قائم رہا، بعد میں اس میں سہ ہزاری ذات کا اضافہ ہوا، فدائی خاں حاکم بہار کے نائب بھی رہے، حاشیہ شرح مواقف اور حاشیہ تفسیر بیضاوی ان کی تصانیف میں مشہور ہیں، ذوالحجہ ۱۱۳۳ھ میں فوت ہوئے۔[2]

تصانیف

شیخ غلام نقشبند تعلیم وتدریس کے ساتھ صاحب تصنیف وتالیف بھی تھے، متعدد علوم وفنون میں ان کی تصانیف ہیں، تذکرہ نگاروں نے حسب ذیل کتابوں کے نام لکھے ہیں۔

(۱) انوار القرآن، اس میں ربع قرآن کی تفسیر مع حاشیہ کے ہے (۲) فرقان الانوار (۳) تفسیر سورۂ اعراف مع حواشی (۴) تفسیر سورۂ کریم، (۵) تفسیر سورۂ طٰہٰ (۶) تفسیر سورۂ محمد

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۳۹۷، [2] نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۱۰۵،

(۷) تفسیر سورۂ یوسفؑ (۸) تفسیر سورۂ رحمٰن (۹) تفسیر سورۂ عم مع حواشی (۱۰) تفسیر سورۂ کوثر (۱۱) تفسیر سورۂ اخلاص (۱۲) تفسیر آیت اللہ نور السمٰوات والارض (۱۳) تفسیر آیت انا عرضنا الا مانۃ (۱۴) تفسیر آیت افحسبتم (۱۵) تفسیر آیت لا تقولن لشیئ انی فاعل ذالک غداً (۱۶) تفسیر آیت الرحمٰن علی العرش استویٰ (۱۷) تفسیر آیت کلوا واشربوا (۱۸) لامعہ عرشیہ (مسئلہ وحدۃ الوجود میں) (۱۹) شرح قصیدہ خزرجیہ (علم العروض میں)، آزاد بلگرامی نے ان کتابوں کے نام لکھ کر وغیرہ ذلک" لکھا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے علاوہ شیخ صاحب کی اور تصانیف بھی ہیں۔[۱]

وفات ۱۱۲۶ھ

شیخ غلام نقشبند کے سوانح نگار متفق ہیں کہ ان کی وفات آخری رجب ۱۱۲۶ھ میں لکھنؤ میں ہوئی، اور اپنے استاد مرشد حضرت شیخ پیر محمد لکھنوی کے مزار کے قریب ٹیلہ محمد شاہ میں دفن کیے گئے۔ ان کی پیدائش ذوالحجہ ۱۰۵۱ھ میں ہوئی تھی، اس حساب سے وفات کے وقت تقریباً ۷۵ سال کی عمر تھی،

اولاد

اولاد امجاد میں صرف ایک صاحبزادے شیخ احمد کا حال معلوم ہے، جو اپنے والد کے انتقال کے بعد ان کے مدرسہ اور خانقاہ میں ان کے جانشین ہوئے لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے۔ پہلے اپنے والد شیخ غلام نقشبند سے پڑھا، پھر ملا نظام الدین سے تکمیل کر کے شیخ پیر محمد کے مدرسہ اور خانقاہ میں تدریس ومشیخت کی مسند پر بیٹھے اور تعلیم وتدریس کا سلسلہ جاری کیا اپنے والد کی طرح شیخ احمد بھی فقہ، اصول فقہ، عربیت وغیرہ میں نامور تھے، بہت سے علماء نے ان سے استفادہ کیا، ۱۱۵۹ھ میں فوت ہوئے اور ان کے صاحبزادے شیخ قطب الہدیٰ بن شیخ احمد بن شیخ غلام نقشبند نے تدریس وارشاد کی جگہ سنبھالی۔[۲]

---

[۱] مآثر الکرام ص ۲۱۶، وسبحۃ المرجان ص ۷۸، تذکرہ علمائے ہند ص ۱۸۵، نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۲۱۴،

[۲] نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۲۴، [۲] نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۵۲،

مولانا محمد علی عثمانی لکھنویؒ

اس خاندان کے ایک اور لکھنوی عالم اور بزرگ کا تذکرۃ نزہۃ الخواطر میں ہے جن کا نام مولانا محمد علی بن عبدالعزیز بن حمید الحق بن بشیر الحق گورکھپوری ثم لکھنوی ہے، یہ قاضی حبیب اللہ گھوسوی کی نسل سے تھے ان کی ولادت اور نشو و نما لکھنؤ میں ہوئی تھی، انھوں نے حدیث کی تعلیم مولانا مرزا حسن لکھنوی سے حاصل کی تھی، عالم و محدث اور نہایت صالح اور نیک تھے، تدریس و تعلیم کا مشغلہ رکھتے تھے۔ ان کے شاگردوں میں شیخ عبدالعزیز بن احمد کشمیری اور شیخ عبدالغفار بن عالم علی کانپوری کے علاوہ اہل علم کی ایک جماعت ہے، مولانا محمد علی عثمانی گھوسوی کا انتقال لکھنؤ میں آخری شوال ۱۲۶۷ھ کو ہوا۔

صاحب نزہۃ الخواطر کو مولانا محمد علی کے یہ حالات ان ہی کے خاندان کے ایک فرد منشی حامد علی نے بتائے ہیں۔[۲]

اس عثمانی خانوادہ کے گھوسی سے لکھنؤ منتقل ہونے کے بعد اس دیار میں اس کے کسی فرد کا پتہ نہیں چلتا ہے، اس کے باوجود اس علاقہ کے عالم لوگ اپنے کو عثمانی کی نسبت سے مشہور کرتے ہیں۔ جس کے لئے کوئی علمی اور تاریخی دلیل نہیں ہے۔

(۸)

مولانا شاہ ابوالغوث گرم دیوان بھیروی لہراویؒ

دیار پورب میں آخری دور میں میں محبوب الرحمٰن حضرت مولانا شاہ ابوالغوث گرم دیوان متوفی ۱۱۷۸ھ اور ان کے صاحبزادے شہیر آفاق مولانا شاہ حافظ ابواسحاق متوفی ۱۲۳۴ھ خانوادہ فاروقیہ سہروردیہ سلطان پور بھیرا کے مشہور علماء ومشائخ میں گزرے ہیں۔

اس دیار میں یہ خانوادہ جس قدر قدیم اور مردم خیز ہے اس کے اعتبار سے مورخوں اور سوانح نگاروں نے اس پر توجہ نہیں کی۔ اس کے علماء ومشائخ کے حالات میں اسی کے حلقہ میں صرف دو کتابیں لکھی گئیں، ایک شیر وشکر'' نامی ہے جسے اسی خاندان کے ایک مشہور ومتبحر عالم وفاضل حاجی شاہ ابوالخیر بن شاہ ابوسعید بھیروی متوفی ۱۰۵۹ھ نے اپنے سفر حرمین شریفین کے موقع پر ۱۰۵۶ھ میں لکھا تھا، اس کتاب کے چار ابواب تھے، تیسرے باب میں انھوں نے اپنے خاندانی حالات لکھے تھے۔

"باب سوم در ذکر نسب آل فاروق، وبرخے از سوانح احوال خانوادہٴ فاروقیاں، وسبب توطنِ قبیلہٴ کاتب الحروف بولایت جونپور وغیرہ کہ بدان احوال دارد"

تیسرا باب آلِ فاروق کے نسب کے ذکر میں اور سوانح کے ضمن میں فاروقی گھرانے کے احوال، کاتب الحروف کے قبیلہ کی جون پور میں سکونت کا سبب جو قابل ذکر ہے۔

اس باب میں شاہ ابوالخیر نے اپنے آباء واجداد کے حالات، ان کے دہلی سے جونپور آنے اور وہاں سے پرگنہ محمد آباد میں جاگیر ملنے کے بعد یہاں آباد ہونے کی تفصیل بیان کی ہے۔

دوسری کتاب ''مناقب غوثی'' کے نام سے شاہ ابوالغوث گرم دیوان کے مرید وخلیفہ شیخ شمس الدین حیدری نے ۱۱۴۴ھ میں لکھی، جس میں دیوان صاحب کے ذاتی حالات وسوانح کے

علاوہ ان کے بزرگوں کے حالات بھی تحریر کیے، خاص طور سے شاہ ابوالخیر اور ان کے بعد کے بزرگوں کا حال اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے، شیخ حیدری نے یہ کتاب لکھ کر اپنے داماد شیخ نور محمد کامیاب سرحدی جونپوری کو، جو اچھے ادیب و شاعر تھے، دی، تا کہ وہ اس کو لفظی بدائع وصنائع سے مرصع کریں اس کتاب کے مقدمہ میں اس کے مندرجات کے بارے میں لکھا ہے۔

”و ایں کتاب مشتمل است بر باب اول در بیان ولادت با سعادت حضرت مرشد حقیقی از صغر سن گرفتہ تا ابتدائے بلوغ و آنچہ بدان مناسبت وارد، باب دوم در بیان ایام بلوغ و ظہور منشائے شوق الٰہی، و بر آمدن آنحضرت از خانہ در طلب مرشد، و بہرہ یافتن از انفاس متبرکۂ مرشد، و آنچہ بدانی تعلق وارد باب سوم در عقد مناکہ آنحضرت و آنچہ بدان تعلق وارد، باب چہارم داخل شدن کاتب الحروف در سلک منتسبان آستان فیض نشان و مبذول تلطفات آن محبوب الرحمٰن بہر حال این طالب صادق باب پنجم در بیان رضاء و تحمل و قناعت و توکل آنحضرت، باب ششم در بیان کرامات و خوارق عادات آنحضرت، باب ہفتم مشتمل بر

یہ کتاب ”مناقب غوثی“ آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب شاہ ابوالغوث گرم دیوان کی ولادت سے تعلق رکھتا ہے جس میں ان کے بچپن سے ابتدائے بلوغ تک کے احوال بیان کئے گئے ہیں۔ دوسرا باب ایام بلوغ، تصوف و روحانیت کی طرف مائل ہونے۔ مرشد کی خدمت میں حاضری اور ان کی صحبت میں رہ کر استفادہ کرنے اور دوسرے متعلقہ امور و مسائل پر مشتمل ہے۔ تیسرا باب شادی اور دیگر متعلق ومنسلک حالات کے بیان میں ہے۔ چوتھا باب کتاب کے مؤلف شمس الدین حیدری کے مرید ہونے اور حیدری پر گرم شاہ کے لطف و مہربانی کے بیان سے تعلق رکھتا ہے۔ پانچواں باب گرم دیوان شاہ کے رضا و تحمل، قناعت و توکل کے ذکر میں ہے۔ چھٹا باب کشف و کرامات اور خوارق عادات کے بیان میں ہے۔ ساتواں باب گرم دیوان شاہ کے خلفاء کو لکھے گئے خطوط پر مشتمل ہے۔ آٹھواں باب گرم دیوان

مکاتبات کہ آنحضرت بخلفائے خود نگاشتہ بودند، باب ہشتم در بیان احوال اجداد بزرگوار آنحضرت ومشتمل برذکر بعضے بزرگان این دیار''	شاہ کے اجداد بزرگوار اور اس دیار پورب کے چند بزرگوں کے تذکرے پر مشتمل ہے۔

شیخ حیدری نے بعد میں اس میں اضافہ بھی کیا ہے، چنانچہ دیوان صاحب کے وصال ۱۱۷۸ھ کی کیفیات اور تاریخہائے وفات بھی ان ہی کے قلم سے ہیں۔

اس کتاب کا طرز تحریر معتقدین ومتوسلین کے انتہائی غلو کا نمونہ ہے، القاب وخطابات کی ارزانی، مقفی ومسجع عبارتوں کی بھرمار اور جابجا اشعار کی کثرت سے کتاب طویل ہوگئی ہے، اگر صرف واقعات وحالات کو اخذ کیا جائے تو نصف کتاب سے کم ہی میں تمام باتیں آجائیں، اس خاندان کے بعض بزرگوں کے مختصر حالات تجلی نور، تذکرۂ علمائے ہند اور نزہۃ الخواطر میں بھی ہیں مگر انکا ماخذ بھی یہی دونوں کتابیں یعنی شیر وشکر اور مناقب غوثی ہیں، جواب تک غیر مطبوعہ اور نادر ونایاب ہیں ،تاریخ مکرم میں بھی ان بزرگوں کے حالات ہیں مگر وہ بھی ناپید ہے، شاہ ابوالغوث گرم دیوان کے آباء واجداد میں شیخ خضر فاروقی دہلوی، شیخ محمد بن خضر جونپوری، شیخ مشیّد بن شیخ محمد، شیخ معروف بن شیخ مشید وغیرہ کے حالات ملا محمود جونپوری کے تذکرہ میں مختصر طور پر بیان کئے جاچکے ہیں نیز اسی ضمن میں سلطان ابراہیم شاہ شرقی کی طرف سے پرگنہ محمد آباد میں جاگیر ملنے کا ذکر گزر چکا ہے، اس لئے دیوان صاحب کے حالات میں مولانا حاجی شاہ ابوالخیر اور ان کے بعد کے بزرگوں کا تذکرہ کیا جارہا ہے، مگر برسبیل تقریب چند سطروں میں ان سے پہلے کے حالات کا خلاصہ پیش کرنا ضروری ہے۔

آباء واجداد

اس خاندان کے مورث اعلیٰ شیخ خضر فاروقی نے طریقہ سہروردیہ حضرت شیخ ابوالفتح رکن الدین بن شیخ الاسلام زکریا ملتانی سے حاصل کیا تھا، فتنۂ تیموری میں اپنے صاحبزادے شیخ محمد بن خضر کو ساتھ لیکر دہلی سے جونپور آئے یہ سلطان ابراہیم شاہ شرقی جیسے نیک وعادل، علم دوست اور علماء نواز کا

دور سلطنت تھا، سلطان موصوف اور عوام میں باپ بیٹے دونوں کو قبول تام وعام حاصل ہوا، شیخ محمد بن خضر کے صاحبزادے شیخ مشید نے بھی اپنے باپ دادا کی راہ پر چل کر طریقت ومشیخت کی زندگی بسر کی، اوران کو سلطان ابراہیم شاہ شرقی نے پرگنہ محمد آباد (ضلع اعظم گڑھ) میں بارہ گاؤں کی جاگیر عطا کی، شیخ مشید کے دو صاحبزادے شیخ معروف اور شیخ علی نے ولید پور کے قریب سلطان پور بھیرا کے نام سے ایک بستی بسائی، اوران کی اولاد نے یہاں آکر جاگیرداری اور زمینداری کا نظام سنبھالا، ساتھ ہی ظاہری و باطنی علوم ومعارف حاصل کر کے طریقۂ سہروردیہ اور دیگر روحانی طرق وسلاسل کی امانت سنبھالی،

خاندان کے افراد کے بڑھ جانے کے بعد شیخ معروف اور شیخ علی کی اولاد میں جاگیر تقسیم ہوگئی۔ شیخ معروف بن شیخ مشید خاندانی بزرگوں کی طرح سلوک ومعرفت کے اعلیٰ درجہ پر فائز رہے، ان کے بیٹے شیخ چاند نے بھی باپ کی طرح سلسلۂ سہروردیہ میں ارشاد وتلقین کی خدمت انجام دی، ان کے بعد ان کے بیٹے شیخ ماہ خلیفہ ہوئے، اوران کے لڑکے شیخ عثمان تھے جنھوں نے خانوادہ سہروردیہ کی امانت ونعمت کی حفاظت کر کے اپنے آباؤ اجداد کے طریقہ پر زندگی بسر کی، وہ مجاہدات وریاضات میں بہت آگے تھے۔ ان کے بعد ان کے بیٹے شیخ معروف ثانی کو خلافت ملی، ان میں بھی صوری ومعنوی کمالات موجود تھے۔ اور وہ سلوک وتصوف کے معاملات میں سخت احتیاط برتتے تھے۔ ان کے بعد شیخ ابوسعید بن شیخ معروف ثانی خلیفہ وجانشین ہوئے جن کے صاحبزادے مولانا حاجی شاہ ابوالخیر جیسے عالم وفاضل تھے۔

مولانا شاہ ابوالخیرؒ

مولانا حاجی شاہ ابوالخیر بن شیخ ابوسعید بن شیخ معروف ثانی بن شیخ عثمان بن شیخ ماہ بن شیخ چاند بن شیخ معروف بن شیخ مشید بن شیخ محمد بن شیخ خضر فاروقی فرخشاہی بھیروی شاہ ابوالغوث گرم دیوان کے پردادا اور گیارہویں صدی کے علمائے کبار میں سے ہیں۔

شاہ ابوالخیر کی ولادت ۱۰۰۸ھ میں بھیرا میں ہوئی، ان کے دادا شیخ معروف ثانی نے ان

کا نام بہت پہلے یوں رکھا تھا کہ جس وقت ان کو اپنے صاحبزادے ابوسعید کی پیدائش کی خبر ملی وہ کسی کتاب کا مطالعہ کررہے تھے، اسی حال میں نومولود بچہ کا نام تلاش کیا تو دو نام سامنے آئے، ابوسعید اور ابوالخیر، دادا نے کہا کہ اس بچہ کا نام ابوسعید ہے اور اللہ تعالیٰ اس کو جو بچہ دیگا اس کا نام ابوالخیر ہوگا،

شاہ ابوالخیر نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کر کے طلب علم میں مختلف شہروں کا سفر کیا اور متعدد علماء سے استفادہ کر کے مروجہ علوم وفنون کی تکمیل کی، نیز جوانی ہی میں مولانا شیر محمد برہانپوری متوفی ۱۰۸۲ھ سے بیعت وخلافت کا شرف پایا، مولانا شیر محمد بن حسن حسینی برہانپوری مشہور مشائخ میں سے تھے، عالمگیر دکن کی صوبہ داری کے زمانہ میں ان کو جلوت وخلوت اور سفر میں ہمیشہ ساتھ رکھتا تھا۔ شاہ ابوالخیر کی علمی شہرت ان کے ایام شباب ہی میں ہوگئی تھی، اور دیار پورب سے لیکر دہلی تک ان کے علم وفضل کا تذکرہ ہونے لگا حتیٰ کہ ۱۰۳۶ھ میں شاہ جہاں تخت نشین ہوا تو انھوں نے دہلی کا سفر کیا۔ امیر الامراء نواب شائستہ خاں نے نہایت ادب واحترام کے ساتھ ان کو اپنے یہاں رکھا، اور ان سے حدیث، تفسیر اور تصوف کی تعلیم حاصل کی، شاہجہاں نے بھی ان کے ساتھ نیازمندی اور قدردانی کا معاملہ کیا، اور نواب شائستہ خاں کے ذریعہ درخواست کی کہ وہ کوئی شاہی منصب یا جاگیر قبول کرلیں، مگر انھوں نے استغناء کا اظہار کیا، نواب شائستہ خاں کی والدہ نیک عورت تھی اور شاہانہ جاہ وجلال میں رہنے کے باوجود کسب حلال کے لئے دستکاری کرتی تھی اسنے شاہ ابولخیر کی خدمت میں اپنی کچھ پسماندہ رقم نذر کرنی چاہی مگر انھوں نے اسے بھی قبول نہیں کیا۔

ایک مرتبہ شاہ ابوالخیر شاہ جہاں کے ہمراہ سیالکوٹ گئے، شاہجہاں نے وہاں کے مشہور بزرگ شاہ میرؒ کی خدمت میں نذرانہ پیش کیا، شاہ ابوالخیر موجود تھے۔ شاہ میر نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ اس ہدیہ کے مستحق شاہ ابوالخیر ہیں۔ انھوں نے بڑی محنت سے علم حاصل کیا ہے۔ شاہ میر کا یہ جملہ کام کرگیا۔ اور اس سے شاہ ابوالخیر کے احساس پر اس قدر بار گذرا کہ اسی وقت شاہی دربار سے بے تعلقی کا تہیہ کرلیا۔

شاہ ابوالخیر نے ۱۰۵۶ھ میں حج وزیارت کا ارادہ کیا، اس موقع پر نواب شائستہ خان نے عرض کیا کہ میرا جہاز بیت اللہ کو جارہا ہے اگر آپ اجازت دیں تو افسروں اور ملازموں کو خدمت

کے لئے کچھ ہدایات کردوں، شاہ ابوالخیر نے یہ کہہ کر اس پیش کش کو بھی نامنظور کر دیا کہ ''وائے برہمت وے کہ درراہ دوست وسیلہ غیر درمیان آرد'' ﴿اس کے عشق پر افسوس ہے جو محبوب سے ملنے کے لئے دوسرے کو ذریعہ بناتا ہے﴾

اسی موقع پر شاہ ابوالخیر نے شیر وشکر کے نام سے فارسی زبان میں ایک کتاب تصنیف کی، جس میں چار ابواب ہیں۔ جن میں حرمین شریفین کی تاریخ، حج وزیارت کے مناسک ومسائل، اور اپنے خاندانی حالات درج کئے اس موضوع پر شاید یہ پہلی کتاب تھی جو اس دور و دیار میں لکھی گئی۔

شاہ صاحب نے حج وزیارت کے بعد کچھ مدت حرمین شریفین میں رہ کر وہاں کے علماؤ مشائخ سے فیض حاصل کیا، اور واپسی پر علائق دنیا سے یکسو ہو کر بھیرا میں گوشہ نشینی اختیار کر لی، مناقب غوثی میں ہے کہ

معاودت بوطن فرمود، وبلباس آزادانہ	وطن واپس آئے، عام لباس میں ولید پور تشریف
درولید پور تشریف آورد، درسلطانپور کہ الآن	لائے اور سلطان پور میں جس کو ان دنوں بھیرا
بہ بھیرا مشہور است بار اقامت نہاد۔	سے شہرت ملی ہوئی ہے، سکونت اختیار کی۔

شاہ ابوالخیر کے نکاح میں یکے بعد دیگرے تین بیویاں تھیں، پہلی بیوی شیخ عبداللہ چریاکوٹی کی صاحبزادی تھیں جن کے بطن سے شاہ اسمٰعیل پیدا ہوئے، دوسری بیوی ملا محمود جونپوری کی بہن اور تیسری بیوی شیخ محمود قریشی بائسی مبارک پوری کی صاحبزادی تھیں، ان دونوں کے بطن سے کوئی اولاد باقی نہیں رہی، مناقب غوثی میں ہے۔

سہ زن در سلک ازدواجش درآمدہ	شاہ ابوالخیر کے نکاح میں تین بیویاں تھیں۔ پہلی
بودند، اول دختر شیخ عبداللہ کہ	بیوی شیخ عبداللہ چریاکوٹی کی صاحبزادی تھیں
از وفرزند آن قدوۃ العارفین شیخ	جن کے بطن سے شیخ اسمٰعیل پیدا ہوئے۔ شیخ
اسمٰعیل قدس سرہ بود، شیخ اسمٰعیل	اسمٰعیل بہت عالی مرتبت انسان اور صاحب
مردے درغایت عالیشان، صاحب	کمال بزرگ تھے چریاکوٹ میں ان کا مزار مرجع
کمالات بود، چنانچہ مزار متبرک او	خلائق ہے۔ مخدوم اسمٰعیل قدس سرہ، شیخ عبداللہ

درقصبہ چریاکوٹ حاجت روائے خلق است، مخدوم اسمٰعیل قدس سرہ از دختر شیخ عبداللہ بود، دیگر دختر شیخ محمد، اخت ملا محمود جونپوری امااز ان صدف گوہرے بہ ساحل سلامت نرسید، دیگر دختر شیخ محمود قریشی المعروف بانسی مبارکپوری از دہم فرزندے باقی نماند'

چریاکوٹی کی دختر کے بطن سے تھے۔ شاہ ابوالخیر کی دوسری بیوی شیخ محمد کی دختر اور ملا محمود جون پوری کی بہن تھیں لیکن ان کے صدف سے بھی کوئی گوہر ساحل حیات پر سلامتی کے ساتھ نہیں آیا۔ ان کی تیسری رفیقۂ حیات شیخ محمود قریشی بانسی مبارک پوری کی صاحبزادی تھیں، ان سے بھی کوئی بیٹا باقی نہیں رہا۔

شاہ ابوالخیر کا آستانہ سلطان پور عرف بھیرا میں دریائے ٹونس کے کنارے آبادی کے مغرب میں نہایت پرفضا مقام پر تھا، انھوں نے اپنے مکان کے سامنے صحن میں برگد کا درخت لگایا تھا، جس کے نیچے چبوترہ تھا، اسی پر اٹھتے بیٹھتے تھے۔ مناقب غوثی میں ہے کہ شاہ ابوالخیر ایک دن احباب کے ساتھ اسی چبوترے پر بیٹھے تھے، اور یکبارگی اٹھ کر اسی کے قریب اپنی چھڑی سے قبر کا نشان بنادیا، لوگوں نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی، اتفاق کی بات کہ اسی دن بخار میں مبتلا ہوئے اور اسی مرض میں ۱۲ رشوال ۱۰۵۹ھ کو انتقال کر گئے، اس وقت ان کی عمر اکاون سال کی تھی، اور صاحبزادے اسمٰعیل نے ان کو قبر کے نشان کی جگہ دفن کیا۔

جیسا کہ گذر چکا ہے شاہ ابوالخیر علوم ظاہری و باطنی میں نہایت بلند مقام کے مالک تھے اور انھوں نے شاہجہاں بادشاہ اور نواب شائستہ خاں کے دربار میں باریاب ہوکر ایک مدت تک شہرت و ناموری کی زندگی بسر کی، مگر آخر میں ان پر طریقۂ سہروردیہ کا رنگ اتنا گہرا چڑھا کہ بہ قول شیخ شمس الدین حیدری وہ ان صفات کے حامل ہو گئے تھے۔

آں کاشف اسرار دقائق، آں واقفِ اشارات حقائق، آں ممتاز بخلقت ''اولیاء[1] امتی کانبیاء بنی

وہ اسرار دقائق کے کھولنے والے، حقیقت کے اشارات کے واقف کار، وہ اولیاء اللہ میں علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل'' (میری امت کے بعض علماء

[1] حدیث میں ''علماء امتی'' ہے۔

اسرائیل ''آن سرفراز بمناصب ''العلماء ورثۃ الانبیاء بے قیل وقال، آں سالکِ مقامات تجرید' آن مستغرقِ مشاہدات توحید، مصفّی از آلائش خیالِ غیر' حضرت حاجی ابوالخیر قدس سرہ'

امتی کانبیاء بنی اسرائیل'' (میری امت کے بعض علماء بنو اسرائیل کے نبیوں کی طرح ہیں) کے لقب سے ممتاز، وہ ''العلماء ورثۃ الانبیاء (علماء دینی علوم میں نبیوں کے وارث ہیں) کے منصب پر بغیر حجت وتکرار کے سرفراز ہیں وہ مقاماتِ تجرید کے سالک، وہ مشاہداتِ توحید میں ڈوبے ہوئے، وہ خیالِ غیر کی آلودگی سے پاک حضرت ابوالخیر قدس سرہ'

مولانا مخدوم شاہ اسمٰعیل

مخدوم مولانا شاہ اسمٰعیل بن ابوالخیر ۲۲؍رمضان ۱۰۳۴ھ کو بھیرا میں پیدا ہوئے، ان کی والدہ شیخ عبداللہ چریاکوٹی کی دختر تھیں، ایام طفولیت میں اپنے والد وغیرہ سے تحصیل علم کرکے اپنے والد کے شیخ ومرشد میر سید شیر محمد برہان پوری کی خدمت وصحبت سے اکتساب فیض کیا، اور وطن واپس آکر عبادت وریاضت میں لگ گئے۔

ان کا خاندان طریقۂ سہروردیہ کا علم بردار تھا، وہ خود اسی سلسلہ میں اپنے والد کے خلیفہ وجانشین تھے، ان کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اکثر اوقات حالتِ سکر میں رہا کرتے تھے جس کی وجہ سے بعض نامناسب اور بظاہر غیر شرعی امور کا صدور ہوجاتا تھا اور جب حالتِ صحو میں ہوتے تو ان کو اس کا احساس ہوجاتا تھا، شمس الدین حیدری نے لکھا ہے کہ چونکہ طائفۂ سہروردیہ کے یہاں کرامت کا اخفاء صراطِ مستقیم ہے، اسلئے مخدوم اسمٰعیل نے ''خود را در فرقۂ ملامتی انداخت'' یعنی اپنے کو فرقۂ ملامتیہ میں شامل کرلیا تھا، حتی کہ ان کے خلاف فضا پیدا ہوگئی اور قاضی کو احتساب کے لئے آنا پڑا، اس وقت بھی وہ شغلِ جام وسبو میں تھے، اور انھوں نے قاضی کو دیکھ کر یہ شعر پڑھا۔

عیب رنداں مکن اے زاہد پاکیزہ سرشت   کہ گناہِ دیگراں بر تو نخواہند نوشت

اور ایک جام قاضی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

تابر رخِ زیبائے تو افتاد زاہد را نظر تسبیح زہدش یکطرف ملّا و مصلّیٰ یکطرف

اس کے نتیجہ میں قاضی نے اپنے دل سے فاسد خیالات کو دور کر دیا۔

یہ عجیب بات ہے کہ حیدری نے مخدوم اسمٰعیل کی غیر شرعی حرکتوں کو ستر کرامت کا سبب بتا کر ان کے بارے میں اس قسم کی باتیں نقل کی ہیں اور چند سطروں کے بعد ان کی عجیب وغریب کرامات کا دفتر کھول دیا ہے، جن میں سے بعض ''حسن اتفاق'' کے قبیل سے ہیں اور بعض کی صحت مشکل ہے، پھر نیک مقصد کے لئے غیر شرعی اور نا مناسب روش اختیار کرنا طریقت وولایت کیسے ہوسکتا ہے حقیقت یہ ہے کہ مخدوم اسمٰعیل کے بارے میں اس قسم کی باتیں ان کے غلبۂ حال کی وجہ سے مشہور ہوئیں ان کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اکثر اوقات استغراق میں رہا کرتے تھے۔جس کی وجہ سے بعض نامناسب امور سرزد ہوجاتے تھے، جن پر ان کے صاحبزادے شیخ محمد شاہ شدید نکیر کرتے تھے اور وہ کہتے تھے کہ محمد شاہ حق پر ہے، ایک مرتبہ مخدوم اسمٰعیل نتھوپور (گھوسی) اپنی سسرال جارہے تھے، راستہ میں ایک فقیر، ملا جو شرعی حدود سے باہر تھا، اس نے مخدوم اسمٰعیل کو فرقۂ ملامتیہ سے سمجھ کر یہ کہتے ہوئے بھنگ کا پیالہ پیش کیا کہ بعض نادان اسے حرام سمجھتے ہیں، مخدوم اسمٰعیل نے یہ سن کر کہا کہ ''این حرام، تو حرام، و پیر تو حرام''

گرمی کے دنوں میں عام طور سے صرف ستر پوشی کی حد تک کپڑا پہنتے تھے، کسی کو برہنہ دیکھتے تو اپنے بدن کے کپڑے اتار کر دیدیا کرتے تھے، ایک مرتبہ صاحبزادے محمد شاہ نے ایک کپڑا یہ کہ کر دیا کہ یہ تبرک آپ مجھے عنایت فرمائیں گے، اس لئے وہ قبا بچ گئی اگر کوئی اسے مانگتا تو کہتے کہ یہ میرے لڑکے کی ہے، یہ قبا سبز رنگ کی تھی، مخدوم اسمٰعیل کے پوتے شاہ ابوالغوث گرم دیوان کے پاس متروکات وتبرکات میں تھی، اس کو شمس الدین حیدری نے دیکھا تھا۔

صاحبزادے محمد شاہ اپنے والد کی کیفیات کا بڑا لحاظ رکھتے تھے، تاکہ ان کے معمولات میں فرق نہ آنے پائے، مخدوم اسمٰعیل کبھی کبھی رعایا کی خبر گیری یوں کیا کرتے تھے کہ ان سے دریافت کرتے کہ تم لوگ میرے لڑکے محمد شاہ کو لگان وغیرہ ادا کرتے ہو؟ اور جب وہ نفی میں جواب

دیتے تو کہتے کہ ایسا ہی ہونا چاہئے زمین اللہ تعالیٰ کی ہے، تم لوگ اس پر قابض ومتصرف رہو اور محمد شاہ کے کارندوں کو روپیہ پیسہ نہ دیا کرو، جاگیر کا سارا انتظام محمد شاہ ہی کرتے تھے انھوں نے رعایا سے کہہ دیا تھا کہ اگر والد صاحب تم لوگوں سے لگان وغیرہ کے بارے میں کچھ پوچھیں تو کہنا کہ ہم سرکاری آدمیوں کو کچھ نہیں دیتے ہیں۔

عالمگیر مولانا سید محمد برہان پوری کے معتقدوں میں سے تھا، اس کو جب سلطنت ملی تو ان کو دربار میں آنے کی دعوت دی، انھوں نے بادشاہ کو اپنے مرید مخدوم اسمٰعیل کے مقام ومرتبہ سے مطلع کیا، بادشاہ نے الہ آباد کے ناظم خانجہاں کو حکم دیا کہ مخدوم اسمٰعیل کو ادب واحترام کے ساتھ اردوئے معلّی میں لانے کی کوشش کرو، اس وقت مخدوم اسمٰعیل بھیرا میں تھے۔ خاں جہاں نے حکم شاہی کے مطابق کوشش کی مگر مخدوم اسمٰعیل نے بے نیازی کے ساتھ انکار کر دیا۔[1]

امیر الامراء نواب شائستہ خاں مخدوم اسمٰعیل کے والد شاہ ابوالخیر کے معتقدوں میں تھا، وہ مخدوم اسمٰعیل کی روحانیت ومشیخت کا شہرہ سن کر حاضر خدمت ہوا اور کمال عقیدت کا اظہار کیا، مخدوم اسمٰعیل نے اس کو اپنی خاص تسبیح عنایت کی۔

شیخ محمد واصل شمس پوری کا بیان ہے کہ میں جس زمانہ میں ناظم جونپور کے ماتحت سپہ گری کی ملازمت کر رہا تھا، مجھے مخدوم اسمٰعیل سے ملاقات کا شوق پیدا ہوا، اسی درمیان میں دائرۂ لشکر محمد آباد گوہنہ میں وارد ہوا، جہاں سے بھیرا قریب تھا اور ہم چند سپاہی مخدوم اسمٰعیل کی زیارت کے لئے چلے، راستہ میں سب نے اپنی اپنی مرادیں بیان کیں میں نے صرف زیارت کا اشتیاق ظاہر کیا جب ہم ان کی خدمت میں پہونچے تو مجھ سے کہا کہ ''بابا بیشتر بیا کہ طالبِ دوستان حق تو ئی''

قاضی نور اللہ گوپال پوری کا بیان ہے کہ ایک دن میں اور میرے بھائی قاضی خوب اللہ دونوں مخدوم اسمٰعیل کی خدمت میں بھیرا پہونچے جب واپسی کی اجازت چاہی تو انھوں نے کہا کہ آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ فقیر کے یہاں سوکھی روٹی ملے گی۔ اس لئے آگے جا کر لذیذ غذا کی

---

[1] نواب خانجہان گوپاموی متوفی ۱۱۶۲ھ عالمگیر اور آصف جاہ کے امراء میں سے تھے، عالمگیر نے انکو ''انورالدین خاں'' کا خطاب دیا تھا، نہایت دیندار، متقی اور بزرگ امیر تھے۔

خواہش ہے، اس کے بعد ہم دونوں بھائی وہاں سے نکلے، راستہ میں معلوم ہوا کہ ملا چھتن جونپوری ایک تقریب میں محی الدین پور آئے (بھیرا کے قریب ہی دریائے ٹونس کے کنارے کڑھا محی الدین پور واقع ہے،) میں نے اپنے بھائی خوب اللہ سے کہا کہ ہم نے ایک مدت تک ملا چھتن صاحب سے فیض اٹھایا ہے، ان کی ملاقات کے لئے چلنا چاہئے، چنانچہ ہم دونوں بھائی محی الدین پور پہونچے اس وقت دوپہر کے کھانے کے لئے دستر خوان چنا جارہا تھا اور ملا صاحب کے ساتھ ہم نے انواع واقسام کے کھانے کھائے۔

قاضی نور اللہ ہی کا بیان ہے کہ میں ایک مرتبہ مخدوم اسمٰعیل کی خدمت میں حاضر تھا باتوں باتوں میں میرے بھائی قاضی خوب اللہ کا ذکر آیا، میں نے کہا کہ فی الحال وہ گھر پر بے کار ہیں۔ مخدوم اسمٰعیل نے کہا کہ انھوں نے محنت سے تعلیم حاصل کی، وہ بہت اچھے عالم ہیں، مگر اس دیار میں ان کی قدر نہیں ہے، میرا خیال ہے کہ ان کے بارے میں حاکم سے بات چیت کروں، اگر اس سے کام نہ چلے تو بادشاہ کے یہاں سلسلہ جنبانی کروں، اس واقعہ کے چند ہی دنوں کے بعد راجہ عظمت خاں نے بہ آرزوئے تمام قاضی خوب اللہ کو یہاں عظمت گڑھ بلا کر ان کا وظیفہ مقرر کر دیا مگر کچھ دنوں کے بعد حالات سے مجبور ہو کر وظیفہ بند کر دیا، اور قاضی خوب اللہ برداشتہ خاطر ہو کر دہلی چلے گئے جہاں بادشاہ کی عنایت کے مستحق ہوئے، اس کے بعد مخدوم اسمٰعیل کی وہ باتیں مجھے یاد آئیں جن کا تذکرہ ایک مجلس میں انھوں نے کیا تھا۔[1]

---

[1] راجہ اعظم خاں اور راجہ عظمت خاں مینہ نگر کے نومسلم خاندان سے دو بھائی تھے، راجہ اعظم خاں نے حدود ۱۰۷۶ھ میں اعظم گڈھ آباد کیا، اور راجہ عظمت خاں نے عظمت گڈھ بسایا، اور ۱۱۰۰ھ میں یوں فوت ہوا کہ نواب ہمت خاں بہادر الہ آبادی کے عامل مرزا محمد طاہر کو راجہ عظمت خاں نے اپنے یہاں قلعہ میں قید کر دیا تھا۔ جب اس کی خبر الٰہ آباد پہونچی تو نواب ہمت خاں بہادر پانچ سو سواروں کی فوج لیکر چلا، اور جونپور منڈی میں ٹھہر کر منت مانی کہ اگر میں اس مہم سے کامیاب واپس ہوا تو رشید آباد کی چہار دیواری بنواؤنگا، چنانچہ نواب مذکور جب فوج لیکر عظمت گڑھ پہونچا تو راجہ عظمت خاں نے راہ فرار اختیار کی، اور کشتی پر سوار ہو کر دریائے گھاگھرا کے قریب اس پار جانا چاہا مگر کشتی ڈوب گئی اور کسی کا پتہ نہ چلا، (گنج فیاضی)

مخدوم اسمٰعیل ۷۲ سال کی عمر میں ۱۶/ جمادی الثانیہ ۱۱۰۶ھ کو بروز چہار شنبہ بوقت چاشت فوت ہوئے، انتقال سے پہلے جو خاندانی اور روحانی تبرکات از قسم خرقہ وامانت محفوظ تھے ان کو صاحبزادے محمد شاہ کے حوالے کیا پھر تیمّم کرکے تکیہ سامنے رکھا اور قبلہ رو ہو کر ایک رکعت نماز ادا کی اور دوسری رکعت میں جاں بحق ہوگئے، اور بھیرا میں اپنے والد کی قبر کے پاس دفن کئے گئے،

تقریباً سارا بیان مناقب غوثی سے ماخوذ ہے، نزہتہ الخواطر میں تاریخ مکرم کے حوالہ سے مخدوم اسمٰعیل کی ولادت ۱۰۴۳ھ میں درج ہے جب کہ مناقب غوثی میں ۱۰۳۴ھ ہے، اس طرح نزہتہ الخواطر میں تاریخ وفات ۱۵/ جمادی الاخریٰ ہے۔[1]

آج بھی باپ بیٹے دونوں بزرگوں کی قبریں برگد کے درخت کے نیچے ایک خستہ حال چہار دیواری میں موجود ہیں، برگد کا درخت چمگادڑوں کا مسکن ہے، اتر جانب گڑھی ہے، آس پاس ویرانہ ہے، عجیب حسرت وعبرت کا مقام ہے۔

شیخ محمد شاہ

شیخ محمد شاہ بن مخدوم اسمٰعیل اپنے زمانہ کے رئیسوں اور جاگیرداروں میں سے تھے، اور رئیسانہ زندگی بسر کرتے تھے، جب تک انکے والد زندہ رہے بیٹے کی ناز برداری کرتے رہے، بیٹے نے بھی باپ کی خدمت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، والد کے انتقال کے بعد ان کے خلیفہ اور جانشین بنے۔

شیخ محمد شاہ ایک مرتبہ اپنے رئیسانہ تزک واحتشام کے ساتھ شیخ فرید بن شیخ بھوج بن شیخ محمد ماہ جونپوری کی شادی میں مگہر گئے۔ اس تقریب سے واپس آنے کے بعد ذہن ومزاج میں تبدیلی پیدا ہوگئی، اور دوسرے ہی دن پالکی پر سوار ہو کر سفر کے لئے نکلے، عبدالکریم نامی منصرم نے ساتھ چلنے کی خواہش کی، مگر شیخ محمد شاہ نے یہ کہہ کر روک دیا کہ تم جاگیر اور گھر کا انتظام دیکھو میں جلد ہی واپس آجاؤنگا، اور شاہراہ سے ہٹ کر اُوسَر کے راستہ سے بنارس کے لیے روانہ ہوئے، دریا پر

[1] نزہتہ الخواطر ج ۶ ص ۳۴۔

پہونچ کر بدن کے اچھے کپڑے کمہاروں کو بطور انعام دیدیئے، اور خود سادہ لباس پہن کر بنارس پہونچے، وہاں کچھ رہکر عظیم آباد اور بنگالہ گئے ان مقامات کے مشائخ کی خدمت وصحبت سے فیض پایا اور واپس آ گئے پھر کچھ دنوں کے بعد دوسرا سفر الٰہ آباد کا کیا اور وہاں کے علماء ومشائخ کی زیارت کی۔

قیام الٰہ آباد کے زمانہ میں بیمار پڑ گئے اور بیماری کی حالت میں وطن آئے تو دیکھا کہ ان کے باغ کے کنارے غیر مسلم رعایا نے ایک چبوترہ بنا کر اس پر مٹی کا ہاتھی بٹھا رکھا ہے۔ اور اس کی پوجا پاٹ کرتے ہیں، یہ حرکت شیخ محمد شاہ کو سخت ناگوار گزری، اور اس جگہ عمدہ سا چبوترہ بنوایا جس پر صبح شام بیٹھا کرتے تھے اور اسی پر نماز بھی پڑھتے تھے۔

اسی مرض میں ۱۵ر صفر ۱۱۱۴ھ کو ان کی وفات ہوئی ''محمد شہ بہشتی'' تاریخ وفات ہے، یہ تمام احوال مناقب غوثی سے لئے گئے ہیں،

حضرت مولانا شاہ ابوالغوث گرم دیوانؒ کی پیدائش اور نشوونما

محبوب الرحمٰن حضرت مولانا شاہ ابوالغوث گرم دیوان بن شیخ محمد شاہ فاروقی بھیروی لہراویؒ خاندان فاروقیہ سہروردیہ بھیرا کے حسنات وبرکات میں سے ہیں، اور آخری زمانہ میں اس دیار میں ان کی ذات بابرکات سے بڑا فیض پہونچا، انکی ولادت شب دوشنبہ، شب ماہ ربیع الاخر ۱۱۰۰ھ میں بھیرا میں ہوئی، ان کی والدہ ماجدہ شیخ میر خاں صدیقی نتھوپوری کی دختر تھیں، اس وقت ان کے دادا مخدوم اسمٰعیل زندہ تھے، انھوں نے پوتے کی پیدائش کی خوشخبری سن کر دعائیں دیں اور بشارت کے کلمات کہے،

دیوان صاحب سے پہلے ان کے ایک بھائی پیدا ہوئے تھے جو نہایت حسین وجمیل تھے مگر بچپن ہی میں ان کا انتقال ہو گیا تو انکی دادی نے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ محمد شاہ کو کوئی بے شکل وصورت ہی

کی اولاد دیدے، چنانچہ اس کے بعد دیوان صاحب پیدا ہوئے جو بظاہر قبول صورت نہیں تھے۔

والد سے بیعت وارادت

دیوان صاحب کے بچپن میں ان کے والد محمد شاہ جاگیر اور زمینداری کے انتظامات دیکھتے تھے، اوران کو بچہ کی تعلیم وتربیت کی فرصت بہت کم ملتی تھی، اس لئے دادا مخدوم اسمٰعیل نہایت پیار اور توجہ کے ساتھ پوتے کی پرورش اور تعلیم وتربیت پر نظر رکھتے تھے، دیوان صاحب چھ سال کے ہوئے تو دادا انتقال کر گئے، اس کے بعد والد نے ان کی تعلیم وتربیت پر پوری توجہ دی، دیوان صاحب بچپن سے بلوغ تک جسمانی امراض میں مبتلا رہے اس کے باوجود بچپن ہی سے خاندانی روایات کے حامل تھے۔ خرافات وبدعات سے بچپن ہی سے نفرت تھی دس سال ہی کی عمر سے روزہ، نماز، اور نوافل میں پیش پیش رہا کرتے تھے، روحانیت کا خاندانی ذوق بھی اسی عمر میں پیدا ہوگیا تھا، گیارہ سال کے ہوئے تو والد نے ترک وتجرید کی زندگی اختیار کر لی، اور علائق دنیا سے یکسو ہوکر تصفیۂ باطن اور عبادت وریاضت میں مشغول ہوگئے، اسی زمانہ میں دیوان صاحب کو طریقۂ سہروردیہ کے بعض اشغال اور وظائف کی تعلیم وتلقین کی، اور تیرہ سال کی عمر میں اتنی استعداد وصلاحیت پیدا ہوگئی کہ والد نے ۱۲/ربیع الثانی ۱۱۱۳ھ میں ان سے بیعت لے کر آباء اجداد کی روحانی وراثت ان کے حوالہ کردی اس کے بعد ایک سال بھی گزرنے نہیں پایا تھا کہ والد نے ۱۵/صفر ۱۱۱۴ھ کو انتقال کیا۔

دیوان صاحب کا بیان ہے کہ عمر کے تیرہویں سال میرے دل میں خیال گزرا کہ والد کی زندگی کے دن اب کم ہی رہ گئے ہیں، وہ دو سال سے علائق دنیا سے الگ ہو چکے ہیں اسلئے ان سے بیعت کر کے خاندانی روحانیت کی وراثت حاصل کر لینی چاہئے مگر والد کا ادب واحترام اس کی گزارش سے مانع ہوا، ان کی ہیبت کا حال یہ تھا کہ میں ان سے نظر نہیں ملا سکتا تھا، اس لئے ایک صاحب کے ذریعہ بات کرائی اور کچھ دنوں کے بعد ان کے دل میں یہ بات آئی کہ اگر چہ ابوالغوث پر روحانی اسرار ورموز کا انکشاف دوسری جگہ سے ہوگا، لیکن فی الحال بطور برکت کے انکو روحانیت سے تعلق ہو جانا چاہیے، چنانچہ والد نے میری گزارش پر مجھے اپنی بیعت وارادت سے نوازا۔

بنارس، غازی پور اور کچھوچھہ کے تعلیم اسفار

دیوان صاحب کی عمر ان کے والد کے انتقال کے وقت چودہ سال کی تھی، ابتدائی تعلیم خاندانی مدرسہ میں اپنے والد وغیرہ سے حاصل کر چکے تھے، اور ان کے انتقال کے بعد تحصیل و تکمیل کے لئے باہر گئے۔ انھوں نے چند ہی سال پہلے دیکھا تھا کہ ان کے والد نے بنارس غازی پور وغیرہ کا علمی و روحانی سفر کیا تھا، اس لئے دیوان صاحب نے اپنے تعلیمی سفر کی پہلی منزل بنارس کو بنایا، مگر وہاں کے مدرسوں اور خانقاہوں سے دلبستگی نہ ہوسکی، اس لئے وہاں سے غازی پور آکر وطن واپس آگئے۔ اس درمیان میں گھر سے کارندوں کے خطوط آتے تھے جن میں جلد آنے کی تاکید رہتی تھی،

بنارس اور غازی پور سے واپس آکر کچھ دنوں وطن میں رہے، پھر کچھوچھہ جاکر دیوان صاحب نے کن علماء اور مشائخ سے تعلیم حاصل کی اور دینی و روحانی فیض پایا، سوائے مولانا شاہ رمضان کے کسی بزرگ کا نام معلوم نہیں نیز اسی دور میں ایک بزرگ میر سید غلام احمد صاحب سے دیوان صاحب نے تعلیم حاصل کی جو محمد آباد میں رہتے تھے اور دیوان صاحب کے خانگی معاملات میں بہت دخیل تھے، مناقب غوثی میں ہے "واُو علمِ ظاہری از سید الواصلین" محبوب العاشقین میر سید غلام احمد کہ بزرگ ترین اولا د سلطان التارکین، سید العابدین حضرت شاہ موسیٰ عاشقان اودھی است، قدس سرہ حاصل نمودہ" ﴿انھوں نے ظاہری علم سید الواصلین، محبوب العاشقین میر سید غلام احمد سے حاصل کیا جو سلطان التارکین، سید العابدین حضرت شاہ موسیٰ عاشقان اودھی کے بڑے بیٹے تھے﴾

مولانا شاہ فتح محمد الہ آبادیؒ سے بیعت وخلافت

دیوان صاحب کچھ مدت وطن میں گزارنے کے بعد پھر بنارس گئے اور وہاں سے الہ آباد پہونچے یہاں ان کے استاذ میر سید غلام احمد سے ملاقات ہوئی، وہ بڑی محبت وشفقت سے پیش آئے، دیوان صاحب نے ان سے اپنا مقصد بیان کیا کہ وہ یہاں روحانی مرشد و مربی کی تلاش میں آئے ہیں میر سید غلام احمد نے مولانا شاہ فتح محمد کی طرف رہنمائی کی، اور دیوان صاحب ان کی

خدمت میں حاضر ہوئے، مولانا فتح محمد نے عزت واحترام کے ساتھ دیوان صاحب کا استقبال کیا اور ان کو طریقۂ چشتیہ کے جملہ اعمال واشغال کی تلقین کر کے تھوڑے ہی دنوں میں درجۂ کمال کو پہونچا دیا اور خلافت بھی دیدی، اس کے بعد دیوان صاحب بھیرا آ کر اپنے آباؤ اجداد کے انداز پر ارشاد وتلقین اور عبادت وریاضت میں مصروف ہوگئے۔

مولانا سید فتح محمد حسینی سیدانوی الہ آبادیؒ اپنے زمانہ کے علمائے کبار اور مشائخ عظام میں تھے۔ علمائے عصر سے تعلیم حاصل کر کے طریقۂ چشتیہ کی تلقین وتربیت راجہ سید ابراہیم بن راجہ سید عبدالحق بن راجہ سید یٰسین مانک پوری سے حاصل کی، جو راجہ سید مبارک بانی مبارک پور کی اولا دامجاد میں سے تھے ان کو مریدوں کی تربیت میں ملکۂ وہبی حاصل تھا، کئی کتابوں کے مصنف ہیں، رجب ۱۱۴۲ھ میں سیدانہ مضافات الہ آباد میں فوت ہوئے۔[1]

گرم دیوان کا خطاب

دیوان صاحب کا خطاب گرم دیوان ہے، اس سلسلہ میں تذکرۂ علمائے ہند میں ہے کہ ''وے را گرم دیوان از ان گویند کہ جسم مبارکش در بعض اوقات بخرق عادت بدرجۂ غایت گرم می شد کہ نان گندم بر اں تو اں پخت''[2] یعنی ان کو گرم دیوان اس لئے کہتے ہیں بعض اوقات خرق عادت سے جسم اس قدر گرم ہوجاتا تھا کہ اس پر گیہوں کی روٹی پکائی جاسکتی تھی، یہ روایت آج بھی ہمارے دیار میں اس قدر مشہور ہے کہ ہر خاص وعام کو معلوم ہے، بلکہ معلوم ہوا ہے کہ ان کے خاندان والوں کے پاس جسم پر پکی ہوئی روٹی کا ٹکڑا اب تک موجود ہے اور بیماروں کے کام آتا ہے، حالانکہ یہ واقعہ نہیں ہے بلکہ یہ خطاب مولانا فتح محمد الہ آبادی کا عطیہ ہے، دیوان صاحب کے غالی عقیدت منداور ان کے خلیفہ شیخ شمس الدین حیدری نے مناقب غوثی میں لکھا ہے کہ ''بامر الٰہی از جناب ولایت مآب حضرت شاہ فتح محمد مرشد خود بخطاب ''گرم دیوان'' سرفرازی یافت'' یعنی دیوان صاحب بحکم خداوندی اپنے مرشد حضرت شاہ فتح محمد کی طرف سے گرم دیوان کے خطاب

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۲۱۷ [2] تذکرہ علمائے ہند ص ۵۔

سے سرفراز ہوئے نیز حیدری نے مناقب غوثی میں دیوان صاحب کی کرامتوں کے مستقل باب میں بہت سی کرامتوں کا بیان کیا ہے مگر ان میں روٹی کی کرامت کا تذکرہ نہیں ہے، اگر کوئی بات رہی ہوتی تو وہ اسے ضرور بیان کرتے۔

اساتذہ وشیوخ

دیوان صاحب کے اساتذہ وشیوخ میں ہم کو ان حضرات کے نام معلوم ہو سکے ہیں بھیرا میں ان کے والد شیخ محمد شاہ، کچھوچھہ میں مولانا شاہ رمضان، محمد آباد میں میر سید غلام احمد، الہ آبادی سیدانہ میں مولانا فتح محمد، اور جیسا کہ معلوم ہوگا دیوان صاحب نے لُہرا آنے کے بعد راجہ سید خیر اللہ اوران کے بھائی راجہ سید دانی سے طریقۂ چشتیہ میں خرقۂ خلافت پایا،

متاہلؔ زندگی کا آغاز

جیسا کہ معلوم ہوا دیوان صاحب نے اپنے والد ماجد کے انتقال کے بعد مختلف شہروں کے اساتذہ وشیوخ ظاہری و باطنی سے علوم ومعارف حاصل کئے۔ اور تقریباً چوبیس سال کی عمر میں فاتحۃ الفراغ پڑھ کر مولانا سید محمد سید انوی الہ آبادی کے خلیفہ ہوئے، نیز انھوں ہی نے دیوان صاحب کو گرم دیوان کا خطاب مرحمت فرمایا، اس کے بعد دیوان صاحب کی متاہلؔ زندگی کا آغاز ہوا، والد نے زندگی ہی میں صاحبزادے کی نسبت ان کے ماموں شیخ منور خاں بن شیخ میر خان صدیقی ساکن نتھو پور سیاہ کی دختر فاطمہ سے طے کر دی تھی، دیوان صاحب کی فراغت کے بعد ان کے ماموں زاد بھائی شیخ عبد اللہ نے کوشش کی کہ نکاح وغیرہ سے فرصت مل جائے، نیز دیوان صاحب کی والدہ ماجدہ کی یہی خواہش تھی، مگر وہ ٹال مٹول کرتے رہے، آخر راجہ سید خیر اللہ مانک پوری ساکن محمد آباد (جو بعد میں دیوان صاحب کے مرشد ہوئے) کی کوشش سے نکاح کے لئے آمادہ ہوگئے، اور رسم ورواج سے دور رہکر نہایت سیدھے سادھے طریقہ سے یوں شادی ہوگئی کہ دیوان صاحب تاریخ مقررہ پر مولانا سید غلام اور چند دیگر ارباب علم وفضل کو لیکر سیاہ پہونچ گئے حتی

کہ اپنے دونوں بھائی شیخ احمد شاہ اور شیخ محمد واجد کو بھی ساتھ نہیں لیا، اور نہایت سادگی سے شادی کی تقریب انجام پاگئی،

مسلسل حوادث اور مرشد کی خدمت میں حاضری

دیوان صاحب کی شادی کے تھوڑے دنوں کے بعد ایک لڑکی پیدا ہوئی جسکی نسبت بچپن ہی میں ان کے بھانجے شیخ عبدالحکیم خان صدیقی ساکن سپاہ سے طے ہوگئی تھی وہ مرگئی، اس کے بعد علی اکبر نام کا ایک بچہ پیدا ہوا جو بچپن ہی میں فوت ہوگیا، اس کے بعد ۱۹/ربیع الثانی ۱۱۲۵ھ کو زوجہ کا بھی انتقال ہوگیا، اس کے بعد دوسرے سال ۲۱/ربیع الثانی ۱۱۲۶ھ کو دیوان صاحب کی والدہ ماجدہ بھی دنیا سے رخصت ہوگئیں، ان مسلسل حوادث کی وجہ سے دیوان صاحب سخت پریشانی میں مبتلا ہوگئے اور جمعیت خاطر میں شدید انتشار پیدا ہوگیا، اس لئے قلبی سکون کی تلاش میں اپنے پیر و مرشد مولانا فتح محمد کی خدمت میں الہ آباد گئے، مولانا فتح محمد ان کو لیکر اپنے گاؤں سیدانہ گئے اور چند روز اپنے ساتھ رکھ کر تسلّی و تشفی دی اور مشورہ دیا کہ دیوان صاحب اپنے وطن واپس چلے جائیں، چنانچہ دیوان صاحب وہاں سے وطن واپس آگئے،

اس کے بعد دیوان صاحب کی دوسری شادی شیخ غلام رسول ساکن مصطفٰے آباد کی دختر سے ہوئی، شیخ غلام رسول اپنی بستی کے اعیان واشراف میں تھے۔ تصوف وصوفیہ کے رموز واسرار کے آشنا اور حسب ونسب میں اونچے تھے، مصطفٰے آباد مبارک پور کے ملحقات میں ہے۔

وحدت آباد عرف لُہرا میں مستقل سکونت

دیوان صاحب کے آباء و اجداد کو سلطان ابراہیم شاہ شرقی کیطرف سے جو بارہ مواضعات پرگنہ محمد آباد گوہنہ میں ملے تھے، ان میں ایک گاؤں لُہرا بھی تھا جو مبارک پور سے چند فرلانگ پر بہ جانب جنوب واقع ہے، اس کے پاس ہی گجہڑا اور فخرالدین پور نامی گاؤں ہیں۔

ہمارے بچپن کے زمانہ تک اس کے قریب بہت بڑا بن تھا، جو اب کھیت بن گیا ہے، اور جس طرح

بھیرا کا نام سلطان پور تھا، لُہرا کا نام وحدت آباد تھا، مگر یہ دونوں نام عام رواج نہ پاسکے، دیوان صاحب جاگیرداری اور زمینداری کے جھمیلوں سے یکسوئی حاصل کرنے کے لیے بھیرہ سے وحدت آباد لُہرا چلے آئے اور گھر اور جاگیر کے انتظام کے لئے اپنے چھوٹے بھائی شیخ احمد شاہ کو بھیرا میں رکھا، یہاں آنے کے بعد ایک حجرہ بنا کر ذکر و شغل اور رشد و ہدایت میں منہمک ہو گئے، شیخ شمس الدین حیدری نے اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

"وخود مجردانہ آزادانہ ازانجا برآمد، در لُہرہ پہلوئے جنگل استقامت گرفت تنہا با محبوب حقیقی خلوت داشت، چنانچہ از احوال او مطلع نبود؟ و این وحدت آباد لُہرا جائے است بغایت، فرحت ناک درعین شارع مابین محمد آباد گوہنہ اعظم گڈھ پہلوئے جنگل واقع است طرف جنوب موضع مذکور کہ جنگل روح افزا اور راحت رسا بود، بدستور سابق مُرتَع، آہوان چشم اہل شوق و ذوق است، حجرہ، خاص برائے عبادت بنا کرد بے تکلف تعرضات خویش و بیگانہ دران زاویہ نا پرسان بفراغ باطن مست از بادۂ عرفان تکیہ برتوکل زد"	گرم دیوان شاہ اہل و عیال سے علاحدہ ہوکر آزادانہ طریقے پر بھیرا سے چلے آئے۔ جنگل کے پہلو میں آباد لہرا میں اقامت گزیں ہو گئے۔ اکیلے اپنے محبوب حقیقی سے خلوت رکھی۔ چنانچہ لوگ ان کے احوال سے مطلع نہیں ہوئے اور یہ وحدت آباد لہرا محمد آباد اور اعظم گڈھ کے بیچ میں عین شارع عام کے قریب نہایت فرحت بخش جگہ ہے۔ یہ جنگل کے بغل میں واقع ہے۔ لہرا کے دکھنی طرف نہایت سکون بخش اور جاں فزا جنگل حسب زمانۂ سابق اہل تصوف و صاحبانِ ذوق وشوق کے آہو چشموں کی چراگاہ ہے۔ خاص عبادت کے لئے حجرہ کی تعمیر ہوئی ہے بلا روک ٹوک اپنے اور پرائے اس ناپرساں زاویہ میں ذہنی الجھنوں سے آزاد ہوکر بادۂ عرفان سے مست توکل وقناعت کے تکیہ پر پڑے رہیں،

دیوان صاحب بھیرا سے لُہرا کب آئے، اس کی تصریح نہیں ملی، بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ دوسری شادی کے بعد یہاں آنا ہوا تھا۔

معمولات زندگی

لُہرا میں سکونت کے بعد دیوان صاحب کے فیض و برکات کا چرچا عام ہوگیا، اور اہل حاجت دور دراز مقامات سے ان کی خدمت میں حاضری دینے لگے اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا میں بڑا اثر دیا تھا اور ان کی ذات کو نفع رسان بنایا تھا، جب لوگوں کی بھیڑ بھاڑ بہت زیادہ بڑھ گئی اور جس مقصد کے لئے گھر بار چھوڑ کر تنہائی اختیار کی تھی اس میں خلل پڑنے لگا تو ایک خاص دن ان کے لئے مقرر کر دیا اور ہر جمعرات کو عوام کی حاجت روائی کے لئے بیٹھنے لگے، نیز ہر شب جمعہ کو خاندانی آثار وتبرکات کی زیارت کرتے کراتے تھے۔ محفل میلاد منعقد ہوتی تھی۔ بارگاہ رسالت میں صلوٰۃ وسلام پیش کئے جاتے تھے، اور حمدیہ ونعتیہ قصائد سنے اور سنائے جاتے تھے، اس وجہ سے ہر پنجشنبہ اور شب جمعہ کو ان کے آستانے پر بڑی رونق اور خیر و برکت رہا کرتی تھی۔ مگر ان امور میں قدم جادۂ شریعت سے باہر نہیں ہوتا تھا، اور بدعات وخرافات سے سخت پرہیز رہا کرتا تھا، اس سلسلہ میں دیوان صاحب اپنے استاد ومرشد مولانا شاہ فتح محمد صاحب کی وصایا وہدایات پر پورے کاربند تھے اور ''الاطاعۃ فوق الادب'' کے مطابق ان کی ہر بات پر شدت سے عمل کرتے تھے۔

اتباع سنت اور بدعت سے اجتناب

دیوان صاحب کا خاندان کئی صدیوں سے اربابِ علم وفضل کا گہوارہ رہا ہے اس میں شاہ ابوالخیر، ملا محمود، قاضی منجھن جیسے بہت سے علوم شرعیہ کے علماء وفضلاء اور روحانی واحسانی معدن کے مشائخ وعرفاء گزرے ہیں اور طریقۂ سہروردیہ اس خاندان کا ورثہ رہا ہے، جس کی وجہ سے شریعت وطریقت گویا ایک حقیقت کے دو نام تھے۔ دیوان صاحب بھی اپنے آباء کرام کی طرح شریعت وطریقت کے جامع بن کر رہے بلکہ مزید برآں انھوں نے طریقۂ چشتیہ میں کمال پیدا کیا، اور زندگی کے ہر مرحلہ پر اتباع سنت کے ساتھ بدعات وخرافات سے اجتناب فرمایا، صاحب مناقب غوثی کا بیان ہے۔

نقل است کہ در جمیع رسمیات لابدی وے　　　　بیان کیا جاتا ہے کہ تمام ضروری رسمیں

مثل نمک چشتی ، وختنہ ومکتب وغیرہ	جیسے نمک چکھنا ختنہ اور بسم اللہ خوانی وغیرہ کی
تکالیف بدعت بوقوع نیامدہ،	رسوماتِ بدعت وقوع پذیر نہیں ہوئیں،

دیوان صاحب نے اپنی جوانی میں شادی کی جو ہر قسم کے تکلفات سے پاک اور سادگی کا نمونہ تھی، بقول صاحب مناقب غوثی اس کی وجہ یہ تھی کہ

از انجا کہ حضرت مرشد حقیقی	حضرت مرشد حقیقی گرم دیوان شاہ نے شریعت
برآئین شریعت قدم استوار	کے آئین پر مضبوطی سے قدم جمایا تھا۔وہ
داشت بر بدعتہائے خلاف سنت	خلافِ سنت بدعتوں پر کسی طرح راضی نہیں
راضی نشد	ہوتے تھے،

راجہ سید خیر اللہ، اور راجہ سید دانی سے طریقۂ چشتیہ میں بیعت وخلافت

ابتداء ہی سے ہمارے دیار میں روحانی ''طرق وسلاسل میں دو طریقے خاص طور سے نمایاں تھے ایک طریقہ سہروردیہ، جس کا علم بردار دیوان صاحب کا خاندان تھا، اور دوسرا طریقۂ چشتیہ جس کی قیادت وسیادت مانک پور کے خانوادۂ حامدیہ چشتیہ کو حاصل تھی، اور اس دیار میں مانک پوری راجگان چشت اس کو فروغ دیتے تھے، اور خانوادۂ سہروردیہ کے مشائخ خانوادۂ چشتیہ سے اکتساب فیض کرتے تھے، چنانچہ دیوان صاحب کے خاندان کے ایک بزرگ شیخ بڑے ''راجہ سید ابراہیم مانک پوریؒ سے طریقۂ چشتیہ میں بیعت وخلافت رکھتے تھے۔نیز دیوان صاحب کے پیرومرشد مولانا شاہ فتح محمد راجہ سید ابراہیم مانک پوری کے مرید وخلیفہ تھے، اس وجہ سے اس دیار میں سہروردیت اور چشتیہ کا حسین امتزاج پایا جاتا تھا اور دونوں طریقوں میں گہرا تعلق تھا۔

حسن اتفاق سے دیوان صاحب کے زمانہ میں مانک پور کے راجگان چشت میں سے دو بزرگ اس علاقہ میں موجود تھے۔اور ارشاد وتلقین کی خدمت انجام دیتے تھے، ایک راجہ سید غلام

معین الدین عرف راجہ دانی متوفی ۱۱۳۰ھ جون پور میں اور دوسرے ان کے بھائی راجہ سید غلام نظام الدین عرف راجہ خیر اللہ متوفی ۱۱۲۸ھ محمد آباد گوہنہ میں، دیوان صاحب نے ان دونوں حضرات سے طریقہ چشتیہ حاصل کر کے خلافت پائی جس سے ان ہر سہ حضرات میں تعلقات نہایت خوشگوار واستوار تھے، اور راجہ خیر اللہ تو دیوان صاحب کے ذاتی اور خاندانی امور ومعاملات تک میں دخیل تھے، جیسا کہ اس کی تفصیل ''خانوادۂ حامدیہ مانک پور'' کے بیان میں گزر چکی ہے۔

سفرِ غازی پور، نواب فضل علی خاں کے یہاں قیام اور اس کے اسباب

دیوان صاحب نے ۱۱۶۷ھ میں قیام لہرا کے دوران میں ایک تکلیف دہ واقعہ سے متاثر ہو کر غازیپور کا سفر کر کے کچھ دنوں نواب فضل علی خاں حاکم غازی پور کے یہاں قیام کیا۔ صورت یہ ہوئی کہ نواب اودھ ابوالمنصور صفدر جنگ کے دوران حکومت '۱۱۵۱ھ تا ۱۱۶۷ھ' میں چکلہ اعظم گڈھ کے حاکم نے آستانہ وحدت آباد لہرا سے متعلق ایک آدمی پر زیادتی کی جس کی وجہ سے دیوان صاحب کو لہرا چھوڑنا پڑا، مناقب غوثی میں اس واقعہ کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ دیوان صاحب نے صرف شیخ شمس الدین حیدری سے کہا کہ وہ بیت اللہ کے سفر کا ارادہ رکھتے ہیں، تم میرے متعلقین کو یہاں سے ی دوسری جگہ منتقل کر دینا، مگر شدہ شدہ اس کی خبر غازی پور تک پہونچ گئی اور دیوان صاحب کے معتقدین ومتوسلین نے اس کا تذکرہ نواب فضل علی خاں والیٔ غازی پور سے کیا نواب موصوف نے فوراً خط لکھ کر دیوان صاحب کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دی، دیوان صاحب نے جواب دیا کہ میں درحقیقت سفر بیت اللہ کا عزم رکھتا ہوں، اور اس دیار ناقدر شناس میں اپنے بال بچوں کو چھوڑنا نہیں چاہتا ہوں، ان شاء اللہ اسی سلسلہ سفر میں آپ کے یہاں آؤں گا۔

اس کے بعد ایک دن بے شان وگمان حجرہ سے تنہا نکل کر پا پیادہ محمد آباد چلے گئے، ان کے بھتیجے اور خلیفہ شاہ عبدالحق تلاش میں نکلے تو معلوم ہوا کہ محمد آباد میں اپنے استاد مولانا شاہ غلام

احمد صاحب کے یہاں مقیم ہیں، دوسرے دن ایک گھنٹہ رات باقی تھی کہ پالکی پر سوار ہو کر مئو چلے گئے، اسی درمیان میں نواب فضل علی خان کی طرف سے پیغام ملا کہ بندہ ان دنوں اطراف و جوانب کے انتظام میں بے حد مشغول ہے، اسلئے قدم بوسی کے لئے حاضر نہ ہوسکا، آپ فی الحال میرے مکان واقع قاسم آباد میں قیام فرمائیں بعد میں آپ کی مرضی کے مطابق قیام کا بندوبست کر دیا جائے گا، نیز نواب موصوف نے قاسم آباد کے کار پردازوں کو تاکید کی کہ دیوان صاحب کے لئے آرام و راحت کا انتظام کیا جائے، ان میں ایک بزرگ حافظ محمد علی تھے جو شاہ احمد عبدالحق ردولوی کے خاندان سے تھے اور دیوان صاحب کے شاگرد بھی تھے، ان کو حکم ہوا کہ چوں کہ وہ دیوان صاحب کے مزاج شناس ہیں اس لئے ان کی خدمت میں حاضر باش رہا کریں، چنانچہ حافظ محمد علی نے دیوان صاحب کو قاسم آباد کے باغ میں ایک عمدہ مکان میں اتارا اور ہر طرح کا آرام پہونچایا اور نواب صاحب کو دیوان صاحب کی تشریف آوری اور قیام کی تفصیل بتائی، اس کے بعد نواب صاحب نے چند سرکاری ملازموں کو حکم دیا کہ وہ دیوان صاحب کے گھر جائیں اور ان کے بال بچوں کو لُہرا سے اپنی حفاظت میں لائیں۔ چنانچہ وہ لوگ لُہرا پہونچے جب چکلہ اعظم گڈھ کے عامل کو خبر ملی کہ یہ لوگ دیوان صاحب کے بال بچوں کو لینے آئے ہیں تو اس نے اپنے آدمیوں کو بھیج کر روکنا چاہا، مگر اتفاق سے اسی دن اس کے گھر کا کوئی آدمی فوت ہوگیا اس لئے اس کے آدمی نہ آسکے اور دیوان صاحب کے بال بچے مئو پہونچ گئے۔

اس کے بعد نواب فضل علی خاں نے پوری مستعدی اور توجہ سے آرام و راحت کے جملہ سامان فراہم کئے اور دیوان صاحب وہاں کچھ دنوں سکون و اطمینان سے رہ کر لُہرا واپس آئے۔

ہمارے خیال میں اس سفر کے اسباب و وجوہ ملکی و سیاسی نوعیت کے ہیں، ایک آدمی کے ساتھ چکلہ اعظم گڈھ کے عامل کی زیادتی پر دیوان صاحب کا گھر بار خفیہ طور سے چھوڑ دینا اور بال بچوں کو لُہرا سے نکالنے کی تاکید کر کے والیٔ غازیپور نواب فضل علی خاں کے یہاں جانا اور بال بچوں کو بلانا، یہ سب باتیں بتارہی ہیں کہ انکے پردے میں کوئی اہم واقعہ کارفرما ہے، حالات اور قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا سبب نوابان اودھ کی شیعہ گردی اور اہل سنت علماء و مشائخ کی جاگیروں کی

ضبطی ہے، اور نواب ابوالمنصو رصفدر جنگ کے حاکم چکلہ نے اس خاندان کی جاگیر کی ضبطی کے سلسلہ میں کوئی سخت کاروائی کی تھی، جس سے معاملہ نے یہاں تک طول کھینچا کہ نواب فضل علی خاں دائی غازی پورکو دیوان صاحب کا طرفدار بننا پڑا اور انھوں نے دیوان صاحب کی جاگیر کے دو پٹوں کو جنھیں حاکم چکلہ نے ضبط کرنا چاہا تھا یا ضبط کرلیا تھا طاقت کے ذریعہ اپنے قبضہ میں کر کے مولانا شیخ غلام فرید محمد آبادیؒ سے مزید فتوحات کے لئے دعا کی درخواست کی، جب نواب فضل علی خاں کو حاکم چکلہ کی زیادتی کا پتہ چلا تو انھوں نے خطہ اعظم گڈھ پر حملہ کر دیا، اسی دوران میں دیوان صاحب چکیے سے لُہرا سے نکل کر غازی پور نواب موصوف کے پاس پہونچے اور نواب موصوف نے ان کے بال بچوں کو لُہرا سے لانے کا بندوبست کیا۔ حاکم چکلہ مزاحم ہوا مگر ایک حادثہ کی وجہ سے وہ ناکام رہا۔ واضح ہو کہ نواب فضل علی خاں کے والد شیوخ محمد آباد میں سے تھے، اور اس کی والدہ بھی یہیں کی تھی، نواب موصوف کا خطۂ اعظم گڈھ پر حملہ اور دیوان صاحب کا لُہرا سے نکلنا ایک ہی زمانہ میں تھا، مناقب غوثی میں ہے کہ اسی زمانہ میں نواب صاحب نے دیوان صاحب کو لکھا کہ:

''این غلام در بندوبست اطراف ملک مشغول است، ازین باعث بہ سعادت پابوسی مستعد نگردید، مقصر ماندہ توقع آن است کہ حضرت چوں، الخ''	''یہ غلام نواحی ملک کے انتظام و بندوبست میں مشغول ہے اسی وجہ سے قدم بوسی کی سعادت حاصل کرنے کے لئے سرگرمی نہیں دکھا سکا معذور ہو کر اس امید میں ہے کہ جب حضرت الخ''

اور اسی زمانہ میں مولانا غلام فرید محمد آبادی سے مزید قبضہ کی دعا چاہی، مظہر الاحدیہ میں ہے۔

''ہماں فضل علی خاں دو تپّہ از چکلہ اعظم گڈھ بقبضۂ خود آورد، بآن حضرت (شیخ غلام فرید) عریضہ نوشت کہ تمنائے حکومت مسلّم چکلہ دارم بہ ہمت بزرگانہ امداد فرمایند'' [1]	''اس وقت فضل علی خاں نے چکلہ اعظم گڑھ کے دو تپّہ پر قبضہ کرلیا اور شیخ غلام فرید محمد آبادی کو عریضہ لکھ کر یہ خواہش ظاہر کی کہ میں پورے چکلہ کی حکومت چاہتا ہوں اپنی دعائے بزرگانہ سے امداد کریں''

---

[1] مظہر الاحدیہ ص ۱۵۱ و ۱۵۲

ان واقعات کی کڑیوں کے ملانے سے معلوم ہوتا ہے کہ دیوان صاحب کا ترک وطن اور نواب فضل علی خاں کا ''بندوبست اطراف ممالک'' دونوں دیوان صاحب کی موروثی جاگیر کی ضبطی کے سلسلہ میں تھے۔ نوابان اودھ نے اپنے پورے دورِ حکومت میں سب سے بڑا کارنامہ یہی انجام دیا ہے کہ شیعیت کو فروغ دیکر سنیوں کی جاگیر و جائداد ضبط کر لی،

خلفاء و تلامذہ

دیوان صاحب نے پوری زندگی تعلیم و تلقین میں بسر کی، اور بہت سے اہل دل و دماغ نے ان سے استفادہ کیا، جن میں سے صرف چھ تلامذہ و خلفاء کے نام معلوم ہو سکے۔

مولانا حافظ ابو اسحاق لہراوی

دیوان صاحب کے صاحبزادے ہیں، مفصل تذکرہ بعد میں آرہا ہے،

شاہ عبدالحق بھیروی

دیوان صاحب کے بھتیجے ہیں، شمس الدین حیدری نے سفر غازی پور کے ضمن میں ایک مقام پر ان کے بارے میں لکھا ہے

''خلیفۂ برحق شاہ عبدالحق برادرزادۂ حقیقی آنحضرت کہ دراں وقت در کسبِ حقائق بخدمت ممتاز بودند، محرم راز ساختند''

''دیوان صاحب کے حقیقی بھتیجے اور خلیفۂ برحق شاہ عبدالحق ان دنوں روحانی علوم حاصل کرنے میں ان کی خدمت میں ممتاز مقام رکھتے تھے اور علوم تصوف کے رازدار ہوئے''

شاہ معشوق علی غازی پوری

صاحب تذکرہ علمائے ہند نے دیوان صاحب کے دو نامور خلفاء کا نام درج کیا ہے،

ایک شاہ معشوق علی غازی پوری اور دوسرے ان کے صاحبزادے شاہ ابواسحٰق لہراوی،

وے را دو خلیفہ نامور بودند، یکے شاہ معشوق علی غازی پوری، دوم فرزند ارجمندش مظہر محاسن اخلاق شاہ ابواسحاق [1]

ان کے دو نامور خلیفہ ہوئے۔ ایک شاہ معشوق علی غازی پوری اور دوسرے ان کے فرزند ارجمند مظہر محاسن اخلاق شاہ ابواسحٰق

احسن الانساب بنوالعباس چریاکوٹ (قلمی) میں محمد نبی عباسی چریاکوٹی نے لکھا ہے

از شیخ محمد غلام اسمٰعیل یک پسر شیخ غلام محمد، ازیشان یک پسر شیخ محمد روح الامین خوش لیاقت بود، تاریخ نیکو گفت، از شیخ محمد علی صاحب مرحوم عم بزرگوار راقم اوراق نقل است کہ شیخ محمد روح الامین معمر گردیدہ بود، مگر اولادے نداشت، بے متفکر و ملول می بود، جناب شاہ عبدالرحمٰن صاحب عرف گرم دیوان بھیروی کہ درویش صاحبِ کرامات بود، جناب شاہ معشوق علی ساکن مہتور آباد ضلع غازی پور از ارشد مریدانِ و خلیفہ اجل واکبر بود، شاہ صاحب موصوف محبتے تام و شفقت مالا کلام باد مبذول داشتے حالانکہ باوجود موجودگی خلف لائق و فائق مولانا شاہ محمد ابواسحاق صاحب کہ عالم و حافظ و قاری و محدث بود، تاریخ

شیخ محمد غلام محمد اسمٰعیل کے لڑکے شیخ غلام محمد تھے۔ ان کے ایک صاحبزادے شیخ محمد روح الامین تھے جن کی لیاقت بہت اچھی تھی اور تاریخ گوئی میں بھی بہت اچھا کہتے تھے۔ راقم الحروف (محمد نبی عباسی چریاکوٹی) کے محترم چچا شیخ محمد علی مرحوم عباسی بیان کرتے تھے کہ شیخ محمد روح الامین معمر ہو گئے تھے مگر کوئی اولاد نہیں تھی۔ کافی اداس اور رنجیدہ رہا کرتے تھے۔ جناب شاہ عبدالرحمٰن صاحب عرف گرم دیوان بھیروی صاحبِ کرامت درویش تھے۔ شاہ معشوق علی ساکن مہتور آباد ضلع غازی پور ان کے ارشد مرید و خلیفہ تھے۔ گرم دیوان ان پر کافی شفقت فرماتے تھے حالانکہ ان کے لڑکے شاہ ابواسحٰق لائق و فائق ہونے کے ساتھ عالم و حافظ اور قاری و محدث تھے۔ ان حضرت شاہ ابواسحٰق

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۵

وفات ایں حضرت از آخر مصرعۂ قطعہ برآید۔	کی تاریخ وفات قطعہ کے آخری مصرع سے برآمد ہوتی ہے۔

شاہ ابواسحاق آں عالی تبار رفتہ از دنیا سوئے دار القرار

بہر تاریخ وفاتش فکر بود ناگہاں آوازے در گوشم کشود

گفت ہاتف آہ رفتہ ایں امام کرد اندر جنت الماوی مقام

﴿عالی رتبہ شاہ ابواسحٰق دنیا سے دار القرار کی جانب گئے۔ ان کی تاریخ وفات کی فکر تھی' ناگہاں میرے کان میں ایک آواز آئی۔ فرشتہ نے کہا کہ آہ وہ امام رخصت ہوا جس نے جنت الماوی میں مقام بنالیا۔﴾

نعمت درویشی بہ شاہ معشوق علی صاحب عطا فرمودہ و منصب سجادہ نشینی عقب خود تجویز نمودہ و شب و روز بدر حجرہ خود حاضر می داشت، و آن تیز بطیّب خاطر خدمت پیر خود می کرد، و بعد ارتحال و وصال شاہ صاحب ممدوح بصلاح و صوابدید روسائے گرد و پیش قرار یافت کہ منصب بزرگ سجادہ نشینی جز شاہ ابو اسحاق صاحب دیگرے رانمی زیبد، کس باید گماشت کہ از درِ حجرہ شاہ معشوق علی را حرکت دہد، مگر جرأت و مبادرت کسے در ہیچو امرِ سبک نمی افتاد کر از ہر بود کہ بمقابلہ ہمچنیں درویش صاحبدل سوءِ ادبی کند، مگر	شاہ گرم دیوان نے ان شاہ معشوق علی کو نعمت درویشی عطا فرمادی اور سجادہ نشینی کا منصب اپنے بعد ان کے لئے تجویز فرمایا۔ دیوان صاحب رات دن انہیں اپنے در حجرہ پر حاضر رکھتے تھے اور وصال کے بعد گرد و پیش کے رئیسوں کے صلاح و مشورہ اور صوابدید سے یہ طے پایا کہ سجادہ نشینی کا عظیم منصب شاہ ابواسحٰق صاحب کے علاوہ کسی اور کو زیب نہیں دیگا۔ کس کو مقرر کیا جائے کہ وہ شاہ معشوق علی کو در حجرہ سے ہٹائے مگر کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ اس نازک امر کو انجام دے۔ کس کی ہمت تھی کہ ایسے صاحبدل درویش کے سامنے بے ادبی کرے مگر روح الامین نے خود یہ خدمت انجام دی بلا تامل حجرہ کے دروازہ پر گئے اور

روح الامین این خدمت خود تجویز نمودہ بے محابا تا درِ حجرہ رفتہ و دستش گرفتہ گفت این جائے شاہ ابواسحاق است، ہمون وقت شاہ معشوق علی صاحب برخواست و دعائے بدکرد ”ہر کہ مرا از قرب پیر جدا کرد از خانمانِ خود جدائی و آوارگی نصیب او باشد“ چنانچہ دعائش بدرجہ اجابت رسید مکانیکہ در چریاکوٹ داشت بیک ناگاہ برافتاد، تامدت العمر مکان ازان خاص نصیبش نشد و آوارہ می گشت، وبعد برخواستگی سوئے درحجرہ با جماع کثیر خرقۂ جناب شاہ گرم دیوان بہ شاہ ابواسحاق خلفِ شان پوشانیدند، ہموں وقت شیخ محمد روح الامین تاریخ سجادہ نشینی برآوردہ خواند	ان کا ہاتھ پکڑ کر کہا یہ جگہ شاہ ابواسحٰق کی ہے۔ فوراً شاہ معشوق علی اُٹھ گئے اور یہ بد دعا دی کہ جس نے مجھے پیر کی قربت سے دور کردیا ہے اس کو اپنے گھر سے جدائی اور آوارگی نصیب ہوگی۔ چنانچہ ان کی دعا کو قبولیت کا درجہ ملا۔ چریاکوٹ میں روح الامین کا جو مکان تھا یک بیک گر گیا اور زمانۂ دراز تک ان کو کوئی خاص مکان حاصل نہیں ہوا اور وہ ادھر ادھر مارے مارے پھرتے رہے۔ شاہ معشوق علی کے چلے جانے کے بعد دروزاۂ حجرہ کے پاس کثیر لوگوں کے ساتھ جناب گرم دیوان شاہ کا خرقہ ان کے صاحبزادے شاہ ابواسحٰق کو پہنایا گیا۔ اسی وقت شیخ روح الامین نے سجادہ نشینی کی تاریخ کہہ کر پڑھی۔

ہزاراں درود و ہزاراں سپاس — کہ اسحاق پوشید نبوی لباس

برآوردہ تاریخ روح الامیں — سپر دندگو ہر بجو ہر شناس

﴿ہزاروں درود اور ہزاروں شکر کہ ابواسحٰق نے نبوی لباس پہنا، روح الامین نے تاریخ نکالی کہ جو ہر شناس کو موتی سپرد کیا گیا ہے﴾

از مصرعہ آخر تاریخ سجادہ نشینی برمی آید، مولانا بمرتبہ غایت مسرور گردید و مبتہج	آخری مصرع سے سجادہ نشینی کی تاریخ نکلتی ہے۔ مولانا بے پناہ خوش ہوئے اسی خوشی کے

شدہ دست برداشتہ برائے اولاد او	عالم میں شیخ روح الامین کا ہاتھ پکڑ کر ان کے
دعا کرد۔ مستجاب گردید و یک پسر شیخ	لئے اولاد کی دعا فرمائی یہ دعا قبول ہوئی اور
محمد یحییٰ وجود گرفت، عابد وزاہد بود،	ایک لڑکا شیخ محمد یحییٰ وجود میں آیا۔ عابد وزاہد
غصہ وافر داشت، متعصب النسب	تھا، بہت غصہ والا تھا نسبی تعصب بھی بہت تھا۔
بحدے بود، اکثر بہ خاندانہا بخوانده	اکثر خاندانوں کی غیبت کر کے اپنا وقت ضائع
غیبی تضیع اوقات کرد،	کرتا تھا۔

شیخ شمس الدین حیدری

مناقب غوثی کے مصنف ہیں، انھوں نے مولانا غلام احمد بن شاہ ابوالفتح بن شیخ نظام الدین بن شیخ فتح اللہ بن شیخ عبداللہ بن شیخ راجو قتال سے بیعت کر کے خلافت حاصل کی تھی بعد میں دیوان صاحب کے بھی مرید وخلیفہ ہوئے۔ مناقب غوثی کے باب ہفتم میں دیوان صاحب کے کئی مکتوب درج ہیں۔ جو شمس الدین حیدری کے نام ہیں، ویسے وہ بچپن ہی سے دیوان صاحب کے عقیدت مندوں میں سے تھے، اور دونوں حضرات میں گونا گون تعلقات تھے۔ مناقب غوثی کے مقدمہ میں لکھا ہے

امابعد چنیں گوید حقیر بندۂ پُر تقصیر، طالب	اس مقالہ کا لکھنے والا اور اس رسالہ کا جامع حقیر
ارشاد ورہبری شمس الدین حیدری کہ	بندۂ پر تقصیر، طالب ارشاد و رہبری شمس الدین
قائل این مقالہ وجامع این رسالہ	حیدری عرض کرتا ہے کہ جناب ولایت مآب
است کہ چوں ایام صغرسنی بانواع	مظہر انوار احدیت مہبط آثار فردیت آلودگی وخطا
تلطفات جناب ولایت مآب، مظہر	سے مبرا قطب حضرت شاہ ابوالغوث اللہ تعالیٰ
انوار احدیت، مہبط آثار فردیت، مبرا	ان کے فضائل کے سایہ کو دراز فرمائے مجھ پر کرم

(احسن الانساب بنوالعباس چرکوٹ، از شیخ محمد بنی عباسی چریاکوٹی متوفی ۱۸۸۷ء
قلمی صفحہ ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷)

از شوائب ولوث قطب حضرت شاہ	عمری ہی سے گوناگوں مہربانیاں فرماتے رہے
ابوالغوث مدّ اللہ ظلال افضالہ تربیت	اور انھیں کے سائے میں رہکر میں نے تربیت و
و پرورش یافتم"	پرورش پائی ہے۔

پوری کتاب میں دیوان صاحب کو مرشد حقیقی" کے خطاب سے یاد کیا ہے۔

شیخ محمد روح الامین عباسی چریاکوٹی

شیخ غلام محمد عباسی چریاکوٹی کے صاحبزادے، خوش لیاقت اور تاریخ گوئی میں مہارت رکھتے تھے۔ محمد نبی عباسی چریاکوٹی نے "اصول اسماعیلیہ" قلمی میں اپنے چچا محمد علی عباسی کے حوالے سے لکھا ہے کہ شیخ محمد روح الامین معمر ہو گئے تھے مگر ان کے کوئی اولاد نہ تھی جسکی وجہ سے کافی متفکر اور اُداس رہا کرتے تھے۔ شاہ عبدالرحمٰن عرف گرم دیوان بھیروی (۱۱۰۰ھ۔۱۱۷۸ھ) جو کہ درویش اور صاحب کرامت بزرگ تھے۔ شاہ معشوق علی ساکن مہتور آباد ضلع غازی پور ان کے ارشد مرید اور خلیفہ تھے۔ شاہ گرم دیوان معشوق علی پر کافی شفقت فرماتے تھے۔ حالانکہ ان کے لڑکے شاہ ابواسحاق صاحب حافظ وقاری اور عالم ومحدث تھے۔ شاہ گرم دیوان نے اپنی سجادہ نشینی کیلئے بھی اُنھیں معشوق علی کو تحریری طور پر منتخب کیا۔ لیکن گرم دیوان کے انتقال کے بعد سربرآوردہ لوگوں کے صلاح ومشورہ سے یہ طے پایا کہ سجادہ نشینی کا عظیم منصب سوائے ابواسحاق کے کسی اور کو زیب نہیں دے گا۔ مگر کسی میں یہ جرأت نہیں تھی کہ درِ پیر سے معشوق علی صاحب کو ہٹا سکے۔ شیخ روح الامین حجرہ میں گئے اور انکا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ یہ جگہ شاہ ابواسحاق کے لئے ہے۔ اُسی وقت وہ بددعا کرتے ہوئے نکل آئے کہ جس نے مجھے قربِ پیر سے جدا کیا ہے وہ خانماں برباد ہو جائے چریاکوٹ میں روح الامین کا جو مکان تھا وہ گر گیا اور مدت تک انھیں گھر نصیب نہیں ہوا۔ اِدھر اُدھر پھرتے رہے۔ شاہ ابواسحاق نے ان کے قطعۂ تاریخ سجادہ نشینی پر اپنی پسندیدگی کا اظہار فرمایا اور انکے حق میں اولاد کی دعا فرمائی، اللہ نے انھیں ایک فرزند عطا کیا، جو شیخ محمد یحییٰ کے نام سے پکارے جاتے تھے۔

بہت عابد وزاہد مگر بہت غصہ ور تھے اور نسبی تعصب رکھتے تھے

ہزاراں درود و ہزاراں سپاس — کہ اسحاق پوشید نبوی لباس
برآوردہ تاریخ روح الامیں — کہ "گوہر سپردند بجوہر شناس"[1]

۱۱۷۸ھ

شیخ نور محمد کامیاب سرحدی

شیخ نور محمد کامیاب سرحدی جونپوری شیخ شمس الدین حیدری کے داماد اور دیوان صاحب سے فیض یافتہ تھے، کامیاب صاحبِ ذوق شاعر وادیب تھے انھوں نے مناقب غوثی کی تہذیب وتنقیح کر کے مقفیٰ و مسجع عبارتوں سے آراستہ کیا ہے، کتاب کی ابتداء میں دیوان صاحب سے اکتساب فیض کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے "امابعد فیقول راجی الی رحمۃ رب الارباب نور محمد کامیاب غفر اللہ ولوالدیہ کہ چوں این احقر الانام دریں ایام فرخندہ انجام بدریافت سعادت عتبہ علیہ حضرت قبلۂ اقطاب وافراد، محبوب الرحمٰن شاہ ابوالغوث گرم دیوان مدّ ظلہ السامی بہرہ مندِ دارین گردید، وبشرف ملازمتِ قبلۂ کونین مشفقی مکرمی شیخ شمس الدین حیدری مشرف گشت" الخ

حافظ محمد علی

ایک اور بزرگ حافظ محمد علی دیوان صاحب کے صحبت یافتہ اور تلمیذ تھے، وہ شاہ احمد عبدالحق ردولوی کی نسل سے تھے اور سفر غازی پور کے سلسلہ میں نواب فضل علی خاں کی طرف سے دیوان صاحب کے قیام وآرام پر مامور کیے گئے تھے، مناقب غوثی میں ہے کہ "حافظ محمد علی ازاولاد کبار قدوۃ السالکین شاہ احمد عبدالحق ردولی کہ سوائے حقوق استادی صحبت مصاحبت گرم داشتہ، مامور شد کہ بملازمت حضرت دام ظلہ مشرف شدہ ہمرکاب سعادت انتساب درقاسم آباد آمدہ، ہر یک را از جہت تاکیدات بلیغ نمودہ بہ تعجیل تمامتر پیش من آیند، حافظ محمد علی حسب الامر بعمل آوردہ آنحضرت را در باغ

---

[1] (اصول اسماعیلیہ ص ۳۷، قلمی از محمد بنی عباسی چریا کوٹی)

قاسم آباد کہ مکانے راحت افزا است باحترام تمام جادادند، وبہر یک امور کہ مامور بودند بکار گزاران تاکید بلیغ فرمودہ بحضور نواب معاودت نمودند“

وفات ۱۱۷۸ھ

حضرت شاہ ابوالغوث گرم دیوان ۲۵ رجمادی الاخریٰ ۱۱۷۸ھ کو شب جمعہ میں عشاء کے بعد فوت ہوئے، رحمہٗ اللہ چند دن پہلے بدن میں شدید قسم کا درد پیدا ہوا۔ جس سے جوڑ جوڑ میں سخت تکلیف ہوگئی تھی اور لہرا میں مکان و خانقاہ کے پاس والے باغ میں کھرنی کے درخت کے نیچے دفن کیے گئے، شیخ شمس الدین حیدری نے آپ کی وفات پر دو منظوم تاریخیں لکھی ہیں۔

خمسہ عشرین از جماد اخیر — نیم شب از ادینہ شو آگاہ

گفتہ ہاتف بگوشِ اہل سخن — گشتہ محبوبِ حق فنا فی اللہ

دیگر

شاہ ابوالغوث آں گرامی شاہ — بود در وقتِ خویش ظل اللہ

شرح احوالِ او نمی گنجد — اندرین صفحہ کاغذِ کوتاہ

مصرع آخرین زتارتخش — برکمالاتِ حالِ اوست گواہ

نزہۃ الخواطر میں تاریخ مکرم کے حوالہ سے دیوان صاحب کا نام ابوالغیث درج ہے۔ جو صحیح نہیں ہے، اسی طرح تاریخ وفات کے سلسلہ میں ۱۱۷۷ھ اور مدفن ولید پور درج ہے اور یہ بھی صحیح نہیں ہے،

مزار کے علاقہ کو آجکل روضہ کہتے ہیں آس پاس مسلمان کاشکاروں کے مکانات ہیں مزار اور خانقاہ کا حصہ ویران ہے مسجد کی دیواریں کھڑی ہیں، دکھن جانب خانقاہ اور مدرسہ کی عمارت مٹی کا ڈھیر بن رہی ہے، بعض کمروں کی دیواریں اور دروازے ابتک موجود ہیں صحن میں قدیم زمانہ کے کئی درخت اور کھجوروں کا جھنڈ ہے، یہاں روحانیت اور حسرت کا عجیب منظر ہے،

مولانا حافظ شاہ ابو اسحاقؒ

شہیر آفاق حضرت مولانا حافظ شاہ ابو اسحاق بن شاہ ابو الغوث گرم دیوان محدث لُہراوی اپنے والد کے خلیفہ و جانشین ہیں، ان کی والدہ ماجدہ غالباً شیخ غلام رسول مصطفےٰ آبادی کی دختر تھیں، پیدائش بھیرا میں ہوئی تھی، تعجب ہے کہ مناقب غوثی میں حافظ صاحب اور ان کے بھائی عبدالعلیم کا تذکرہ ضمناً بھی کہیں نہیں ہے، جب کہ دیوان صاحب کی دونوں بیویوں، ایک لڑکی، صاحبزادہ علی اکبر، دو بھائی شیخ احمد شاہ اور شیخ محمد واجد، اور بھتیجے شیخ عبدالحق وغیرہ کا تذکرہ ضمناً سہی موجود ہے۔

حافظ صاحب نے اپنے والد ماجد سے قرآن مجید حفظ کر کے ان ہی سے ابتدائی کتابیں پڑھیں نزہۃ الخواطر میں ہے۔

وحفظ القرآن وقرء العلم علیٰ	انھوں نے قرآن اور دیگر علوم اپنے والد
ابیه وعلیٰ غیره من العلماء[۱]	اور دیگر علماء سے پڑھے

چنانچہ ان کے اساتذہ میں مولانا قاضی عبدالصمد بن ابوالحسن چریاکوٹی متوفی ۱۱۷۱ھ بھی ہیں، تذکرہ علمائے ہند میں قاضی صاحب کے ذکر میں ہے۔ "یگانہ آفاق حافظ ابو اسحاق از تلامذہ اوست"[۲]

محمد بنی عباسی چریاکوٹی متوفی ۱۸۸۷ء نے بھی اس کی تصدیق کی ہے لکھتے ہیں

قاضی مولانا عبدالصمد پسر قاضی ابوالحسن در	قاضی مولانا عبدالصمد پسر قاضی ابوالحسن علم
علم و ہنر طاق و یگانہ آفاق بود مولانا شاہ محمد	و ہنر میں طاق اور یگانہ آفاق تھے مولانا شاہ
اسحاق خلف الرشید شاہ عبدالرحمن عرف شاہ	ابو اسحاق خلف رشید شاہ عبدالرحمن عرف شاہ
گرم دیوان از ارشد تلامذہ او بود[۳]	گرم دیوان ان کے ارشد تلامذہ میں تھے

قاضی عبدالصمد چریاکوٹی نے دہلی میں تعلیم پائی تھی، محمد شاہ بادشاہ نے ان کو چریاکوٹ اور

---

[۱] نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۸، [۲] تذکرۃ علمائے ہند ص ۱۲۱، اس میں غلطی سے ابو اسحاق کے بجائے محمد اسحاق درج ہے

[۳] احسن الانساب بنو العباس چریاکوٹ قلمی ص ۱۰۷ از شیخ محمد بنی عباسی چریاکوٹی

اس کے نواح کا قاضی مقرر کیا تھا۔

ان کے اساتذہ میں مولانا محمد ناصح کو بھی بعض اہل علم نے شمار کیا ہے جو مولانا محمد فاخر الٰہ آبادی کے تلامذہ میں سے تھے،[1]

انھوں نے اپنے والد ماجد کی طرح آخر میں الٰہ آباد کا سفر کر کے براہ راست مولانا محمد فاخر متوفی ۱۱۶۴ھ سے تعلیم حاصل کی، اور ان ہی کے طریقہ پر عملی اور علمی زندگی بسر کی، مولانا فاخر الٰہ آبادی اپنے زمانہ کے زبردست محدث و بزرگ تھے، اپنے چچا شیخ محمد افضل اور بھائی شیخ محمد طاہر سے کتب درسیہ کی تکمیل کی، اور اپنے والد مولانا محمد یحییٰ سے روحانی فیض حاصل کر کے بائیس سال کی عمر میں ان کے خلیفہ ہوئے، اس کے بعد ۱۱۴۹ھ میں حرمین شریفین کی حاضری کے موقع پر شیخ محمد حیات سندھی مدنی متوفی ۱۱۶۳ھ سے صحیحین وغیرہ پڑھ کر سند و اجازت لی، مولانا فاخر فقہی مسائل میں مجتہدانہ شان رکھتے تھے، کتاب و سنت اور اجتہاد پر عمل کرتے تھے، ان کے تلمیذ رشید حافظ ابو اسحاق پر بھی یہی رنگ غالب ہوا، وہ زہد و تقویٰ کے ساتھ کتاب و سنت کا بے حد اہتمام کرتے تھے، ان کی ذات وصفات اور علم و عمل کے بارے میں صاحب تذکرہ علمائے ہند نے لکھا ہے کہ مظہر محاسن اخلاق شاہ ابو اسحاق کی ذات شریف نادرۂ روزگار تھی۔ صحابہ کبار کی یاد تازہ کرتی تھی، زہد و تقویٰ ان کا شعار اور اسرار شریعت ان کا دثار تھے، احادیث کی تصحیح میں وہبی ملکہ رکھتے تھے۔ علوم ظاہری و باطنی سے مزین تھے، سنت رسول کی پابندی میں ذرا بھی غفلت روا نہیں رکھتے تھے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے معاملہ میں چھوٹے بڑے اور امیر و غریب کی تمیز نہیں کرتے تھے۔ قرآن حکیم کے بعد صحیح بخاری کو اصح الکتب قرار دے کر اس سے بہت زیادہ اعتناء کرتے تھے۔[2]

مولانا فاخر الٰہ آبادی سے سند فراغت لیکر لہرا میں آئے اور اپنے والد ماجد سے خرقۂ خلافت حاصل کر کے ان کے خلیفہ و جانشین بنے، اور مدت العمر یہیں رہ کر تعلیم و تلقین میں زندگی بسر کی کسی روایت سے ان کا باہر جانا معلوم نہیں ہوتا۔ بلکہ اپنے والد کے مدرسہ اور خانقاہ میں رہکر درس و تدریس اور ارشاد و تلقین کرتے رہے یہاں تک کہ ۱۲۳۴ھ میں غازی پور میں انتقال فرمایا اور

[1] حاشیہ سیرت البخاری ص ۳۸ و تراجم علماء اہل حدیث ص ۳۸۲ [2] تذکرہ علمائے ہند ص ۵

وہیں دفن کئے گئے،

مولانا شاہ محمد ابو اسحاق صاحب کہ عالم و حافظ و قاری و محدث بود تاریخ وفات این حضرت آخر مصرعہ قطعہ برآید۔

شاہ ابو اسحاق آں عالی تبار	رفتہ از دنیا سوئے دار القرار
بہر تاریخ و فاتش فکر بود	ناگہاں آوازے در گوشم کشود
گفت ہاتف آہ رفتہ ایں امام	کرد اندر جنت الماویٰ مقام

(احسن الانساب ص ۳۵)

بعض اہل حدیث علما نے ان کی تصنیف میں عربی زبان میں ایک رسالہ نور العینین فی اثبات رفع الیدین بتایا ہے اور اس سے حافظ صاحب کا یہ قول بھی نقل کیا ہے: وقلت فی ذالك لما اتبعت رسول الله صلی الله علیه وسلم .لم ابلِ نعمان و السفیان والزهری ۔[۱] اور یہ کہ رسالہ بہار کے بعض کتب خانوں میں تھا، شاید یہ رسالہ حافظ صاحب کے استاد مولانا محمد فاخر الٰہ آبادی کا ہو جو حافظ صاحب کے پاس رہا ہو اور اس پر ان کا نام رہا ہو، مولانا محمد فاخر کی تصانیف میں ایک رسالہ قرة العینین فی رفع الیدین (تذکرہ علمائے ہند ص ۲۰۶ یا قوة العینین فی اثبات رفع الیدین .(نزهته الخواطر ج ٦ ص ۳۴۱) بھی ہے۔

حافظ صاحب کے تلامذہ و مریدین میں چند لوگوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں جن میں مولانا احمد علی عباسی چریا کوٹی متوفی ۱۲۷۲ھ مشہور عالم ہیں تذکرہ علمائے ہند میں ان کے بارے میں لکھا ہے ''اعمال مسلوکہ درویشان از برگزیدۂ آفاق حضرت حافظ شاہ ابو اسحاق ساکن بھیرا گرفتہ''[۲] ان کی ولادت ۱۲۰۰ھ میں ہوئی تھی۔ ابتدائی کتابیں حافظ غلام علی چریا کوٹی سے پڑھ کر فنون ریاضیہ مولوی غلام جیلانی سے حاصل کیے اور تجوید و قرات میں قاری نسیم رامپوری کے شاگرد تھے،

حافظ صاحب کے مبارک پوری تلامذہ میں تین حضرات کے نام معلوم ہو سکے ہیں مولانا حکیم امان اللہ متوفی ۱۲۹۹ھ اپنے زمانہ کے طبیب حاذق اور قصبہ مبارک پور کے سردار تھے، ان کے

---

۱ حاشیہ سیرت البخاری ص ۳۸ ۔ ۲ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۷

نواسے مولانا عبدالسلام مبارکپوری نے سیرت البخاری کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ میرے نانا کا نام امان اللہ تھا، وہ قوم کے سربراہ اور طبیب ہونے کی وجہ سے خلائق کے مرجع تھے ۱۲۹۹ھ میں فوت ہوئے، انھوں نے شہیر آفاق شاہ ابواسحاق لہراوی سے شرف تلمذ حاصل کیا تھا۔[1]

حافظ عبداللطیف امام جامع مسجد مبارکپور کے والد شاہ ابواسحاق صاحب کے ارشد تلامذہ میں سے تھے، چونکہ وہ رئیس اور مالدار تھے اسلئے وہ دھنّا سیٹھ کے خطاب سے مشہور تھے، اور مولوی دھنّا کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ نہایت نیک و متقی عالم تھے۔ ان کے کتب خانہ میں نہج البلاغہ کا نہایت عمدہ قلمی نسخہ تھا، نیز تحفہ اثناعشریہ کا قلمی نسخہ تھا جسے راقم نے دیکھا ہے،

مولوی نیرھو شیعی مبارک پوری بھی حافظ صاحب کے شاگردوں میں تھے، استاد اور شاگرد اگرچہ مسلک کے اعتبار سے مختلف تھے مگر تعلقات نہایت خوشگوار تھے استاد نے ان کو اہل سنت سے اتنا قریب کر دیا تھا کہ وہ بلا تکلف سنیوں کے ساتھ نماز باجماعت پڑھتے تھے، لوگ ان کو مسجد کی طرف آتے دیکھ کر اقامت سے رک جاتے تھے تاکہ وہ وضو کر کے جماعت میں شریک ہو جائیں، ۱۲۲۸ھ (۱۸۱۳ء) کی ہندو مسلم جنگ میں فسادیوں نے مولوی نیرھو کا گھر بھی لوٹا تھا، اس کا ذکر عرضداشت میں یوں ہے۔ ''گور پرشاد جمعدار تھانہ پرگنہ کہ ادھم سی عدد ۳۰ تھا نہائے مشروع و چیزے ریشم وتسر، و پارچہ ملبوس از جھلی، و رمضان، و نیرھو نوربافان غارت گری کردہ بود''[2]

مولانا شاہ محمد علی بھیرویؒ

مولانا شاہ محمد علی بن عبدالعلیم بن شاہ ابوالغوث گرم دیوان بھیروی، شاہ ابواسحاق کے بھتیجے ہیں، نہایت نیک اور متقی عالم تھے، ابتدائی کتابیں اپنے وطن میں پڑھ کر ارکاٹ (مدراس) گئے جو نواب والا جاہ کی علمی قدر دانی اور ملا بحرالعلوم عبدالعلی فرنگی محلی متوفی ۱۲۳۵ھ کی تدریسی شہرت کی وجہ سے مرجع بنا ہوا تھا، وہاں ملا بحرالعلوم عبدالعلی فرنگی محلی سے مروجہ علوم وفنون کی تکمیل کی، اس کے بعد حج وزیارت کو تشریف لے گئے اور تین سال تک مدینہ منورہ میں قیام کر کے حرمین شریفین کے

---

[1] حاشیہ سیرت البخاری ص ۳۸، [2] تذکرہ علمائے مبارکپور ص ۹۳ تا ۹۶ وص ۱۱۷ وص ۱۱۸ ص ۱۱۹

علماء ومشائخ سے حدیث وغیرہ کی تعلیم حاصل کی، اور ۲۳ سال کے بعد وطن واپس آئے، نواب والا جاہ محمد علی خاں والیِ ارکاٹ نے ان کا وظیفہ جاری کیا تھا۔ تھوڑی مدت وطن میں رہ کر یہیں انتقال کیا۔[1]

مولانا شاہ علی احمد بھیرویؒ

مولانا شاہ علی احمد بن نعمت اللہ بن محمد اطہر بن محمد واجد بھیروی شاہ ابواسحاق لہرادی کے نواسے اور ان کے خلیفہ وجانشین ہیں ان کے پردادا شیخ محمد واجد شاہ ابوالغوث گرم دیوان کے بھائی ہیں، ان کی پیدائش ۱۲۲۹ھ میں بھیرا میں ہوئی جیسا کہ علمائے ہند میں ہے کہ مگر نزہتہ الخواطر میں ۱۲۳۸ھ لکھا ہے، انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے والد شیخ نعمت اللہ سے حاصل کر کے اپنے نانا کے مرید وخلیفہ مولانا احمد علی چریاکوٹی متوفی ۱۲۷۲ھ اور مولانا قاضی محمد سلیم مچھلی شہری متوفی ۱۲۶۶ھ قاضی دارالقضا محمد آباد گوہنہ سے پڑھا، بعد میں اپنے نانا شاہ ابواسحاق سے بیعت کر کے ان کے خلیفہ ہوئے،

مولانا احمد علی صاحب نہایت ذہین وذکی اور قوی الحافظہ عالم تھے زہد وتقویٰ اور اتباع سنت میں اپنے نانا کی مثال تھے، قوام وصوام بزرگ تھے، ان کی مجلس ذکر الٰہی سے معمور رہا کرتی تھی کسی کی مجال نہیں تھی کہ ان کے سامنے دوسرے کی غیبت کرے، ۱۶؍ صفر ۱۳۱۲ھ کو بھیرا میں انتقال کیا اور جامع مسجد کے باہر صحن میں دفن کئے گئے۔ ان کی تعلیم کے بارے میں تذکرہ علمائے ہند میں ہے۔

> ''اکثر کتب درسیہ از فاضل ادیب مولوی محمد سلیم مچھلی شہری مرحوم آموختہ وچندے از ان از مولوی احمد علی عباسی چریاکوٹی رحمتہ اللہ علیہ گرفتہ''

اسی کتاب میں مولانا محمد فاروق چریاکوٹی کا یہ بیان درج ہے کہ بندہ تیس سال سے زائد مدت سے ان کی خدمت سراپا برکت سے فیض یاب ہے مگر آج تک ان کی زبان سے کوئی ایسی بات

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۷

نہیں سنی جس میں کسی کی شکوہ شکایت ہو اور ان کی مجلس ذکر الہٰی سے کبھی خالی نہیں دیکھی، [1]

کہنا چاہیئے کہ مولانا علی احمد صاحب خانوادہ سہروردیہ بھیرا کے حسنات و برکات کے آخری نمونہ تھے، ہمارے بچپن تک ان کے علم و فضل اور زہد و تقویٰ کے واقعات سنے سنائے جاتے تھے، مولانا کی ذات اپنے زمانہ میں دینی امور در جال کا مرجع تھی اور ارباب دین و دیانت شرعی معاملات میں ان کو حجت قرار دیتے تھے۔

نوادہ (مبارک پور) کے مشہور بزرگ حافظ ضیاء اللہ صاحب متوفی ۱۳۵۴ھ مولانا کے خاص معتقدوں میں سے تھے۔ اور اکثر ان کی خدمت میں حاضری دیتے تھے، وہ حسب عادت ایک مرتبہ مولانا کی زیارت کے لئے بھیرا گئے ان کے ساتھ ایک اور شخص تھا، ولید پور پہونچ کر اس شخص نے ایک صاحب سے سلام و مصافحہ کے بعد ان کے ہاتھ کا بوسہ لیا جو عرس و قوالی اور سرود و نغمہ کی حد تک صوفی تھے، اس کے بعد جب دونوں مولانا علی احمد صاحب کی خدمت میں بھیرا پہونچے تو مولانا نے حافظ ضیاء اللہ صاحب سے سلام کے بعد مصافحہ فرمایا اور جب دوسرے شخص نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا تو مولانا نے یہ کہہ کر اپنا ہاتھ کھینچ لیا کہ سلام تو ہر شخص کے لئے ضروری ہے، کیا ہر شخص سے مصافحہ بھی ضروری ہے اور واپس ہونے کے وقت بھی مولانا نے یہی کہہ کر اس سے مصافحہ نہیں کیا،

مولانا محمد عزیز بھیرویؒ

مولانا شاہ محمد عزیز بن مولانا شاہ علی احمد بھیروی کی ولادت اور نشو و نما بھیرا میں ہوئی، ابتدائی کتابیں اپنے والد ماجد مولانا علی احمد صاحب سے پڑھ کر مدرسہ حنفیہ جونپور میں مولانا عبد الحلیم فرنگی محلی متوفی ۱۲۸۵ھ سے منقولات و معقولات کی مروجہ کتابیں پڑھیں، اس کے بعد سہارن پور جاکر مولانا احمد علی محدث سہارن پوری سے حدیث کی تعلیم حاصل کی، پھر دہلی جاکر مولانا نذیر حسین دہلویؒ سے حدیث کی سند لی، نیز لکھنؤ میں حکیم محمد ابراہیم لکھنوی سے علم طب حاصل کیا،

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۴۳ و نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۲۶، ۲۲۷

مولانا عزیز بھی اپنے والد کی طرح نہایت صالح اور بزرگ عالم تھے ساتھ ہی ظاہری شکل وصورت کے اعتبار سے نہایت وجیہہ وشکیل تھے، ذہانت وفطانت میں بہت آگے تھے۔ اپنے والد ماجد کے وصال سے دوسال پہلے ہی ۱۳۱۰ھ میں وفات پائی۔[1]

حضرت شاہ ابوالغوث گرم دیوانؒ کا ایک نہایت نادر تذکرہ بحر زخّار مصنفہ شیخ وجیہ الدین اشرف لکھنویؒ میں ملا ہے، جو دیوان صاحب کی وفات ۱۱۷۸ھ کے ۶۲ سال بعد ۱۲۴۰ھ میں لکھا گیا ہے، یہ تذکرہ مختصر ہونے کے باوجود کئی نادر معلومات پر مشتمل ہے، اس لیے ہم اسے پورا نقل کرتے ہیں۔

حضرت شاہ ابوالغوث مشہور بہ گرم دیوان اعظم خلیفہ شاہ فتح محمد است، در بذل وسخاو زہد، وورع ممتاز بود، فنا دست وتواضع شعار داشت، درتربیتِ طالبان دستے قوی داشت، ازطفیل او بہرہ ور معرفت شدند، در ہند اکثر درویش را دیوان گویند، از جہت جلالِ خاطرش گرم دیوان می گفتند، ویرا مریدان خوب بودند، مثل مولوی رحمت اللہ قدوائی برادر شاہ بدر عالم قادری قدوائی صاحب تزکیہ وتصفیہ قلب مرتاض بزہد وممتاز تقویٰ؟ و میر غلام محمد محمد آبادی، و میر احمد اللہ گورکھپوری وشاہ عبدالکریم دکھنی، وشاہ

حضرت شاہ ابوالغوث مشہور بہ گرم دیوان، شاہ فتح محمدؒ کے خلیفۂ اعظم ہیں، جو دوسخا اور ورع و تقوی میں ممتاز۔ تواضع اور داد و دہش میں نمایاں، اور طالبانِ رشد وہدایت کی تعلیم و تربیت میں بہت آگے تھے؛ اور وہ ان کے طفیل میں معرفت سے بہرہ ور ہوئے، اور ہندوستان میں اکثر مشائخ اور درویشوں کو دیوان کہتے ہیں، ان کے طبعی جلال کی وجہ سے ان کو گرم دیوان کہتے تھے، بہت اچھے اچھے حضرات ان کے مرید تھے جیسے (۱) مولوی رحمت اللہ قدوائی برادر شاہ بدر عالم قادری قدوائی جو تزکیۂ نفس اور صفائی قلب اور زہد وتقویٰ میں ممتاز عابد تھے (۲) میر غلام محمد محمد آبادی (۳) میر احمد اللہ گورکھپوری (۴) شاہ عبدالکریم دکھنی

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۴۳

نور محمد ہیزم فروش اکبر آبادی و شاہ عبداللطیف، وشاہ ولی وغیرہ مراتبات فقر کامل داشتند، چون حضرت گرم دیوان وفات یافت درقریہ ولید پور بھیرہ توابع اعظم گڑھ وطن خود مدفون شد، بالفعل شاہ عبداللہ خلیفۂ او قائمقام است در عبادت بنماز معکوس خیلے مائل (بحر زخار ورق ۱۶۰ قلمی) [۱]

(۵) شاہ نور محمد ہیزم فروش اکبر آبادی (۶) شاہ عبداللطیف (۷) شاہ ولی وغیرہ فقر و مشیخت میں درجۂ کمال پر تھے، حضرت گرم دیوان وفات کے بعد اپنے وطن قریہ ولید پور بھیرا (اعظم گڑھ) میں دفن ہوئے (۸) فی الحال (۱۲۴۰ھ میں) ان کے خلیفہ شاہ عبداللہ سجادہ نشین ہیں جو نماز معکوس کے ذریعے عبادت کرنے میں بہت زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔

اس تذکرۃ میں سب سے اہم بات حضرت گرم دیوان کے آٹھ مریدین وخلفاء کے نام کی تصریح ہے جو بالکل نئے ہیں، البتہ میر غلام محمد محمد آبادی کا ذکر ہم نے مناقب غوثی کی تصریح کے مطابق میر غلام احمد محمد آبادی کے نام سے کر کے ان کو گرم دیوان کا استاذ بتایا ہے جب کہ بحر زخار میں ان کو خلیفہ و مرید بتا کر نام غلام محمد رکھا گیا ہے۔

نیز اس سے بھی گرم دیوان کے لقب کے سلسلہ میں پشت پر روٹی پکانے کی روایت غلط ثابت ہوتی ہے اور اصل یہ ہے کہ ''از جہت جلال خاطرش گرم دیوان می گفتند''

اس میں گرم دیوان کی وفات اور قبر قریہ ولید پور بھیرا میں بتائی گئی ہے، جو صحیح نہیں ہے، ان کی وفات لہرا میں ہوئی اور وہیں قبر بھی ہے،

شیخ عبداللہ بن شیخ منور بن شیخ میر صدیقی ساکن موضع سیاہ (گھوسی) دیوان صاحب کے ماموں زاد بھائی اور سالے تھے، ممکن ہے، بحر زخار کی تصنیف کے وقت ۱۲۴۰ھ میں وہی شاہ عبداللہ ان کے خلیفہ اور سجادہ نشین رہے ہوں۔

---

[۱] یہ تذکرہ عزیزہ گرامی مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی مصنف ''تذکرۂ علمائے اعظم گڑھ'' کے ذریعہ ملا ہے۔
(قاضی اطہر مبارک پوری بنارس دوشنبہ ۱۰ شعبان ۱۳۹۸ھ)

شاہ گرم دیوان اور شاہ محمد کاظم قلندر میں ملاقات

شاہ تراب علی کی کتاب اصول المقصود مشائخ قلندریہ کے حالات میں ہے، اس میں شاہ باسط علی قلندر الہ آبادی کے خلیفہ شاہ محمد کاظم قلندر متوفی ۱۲۲۱ھ کے حالات میں لکھتے ہیں۔

روزے نزد درویشے از یارانِ شاہ گرم دیوان صاحب حسن علی نام ساکن کرسی (بارہ بنکی) کہ با ایشان بسیار محبت و موافقت داشتند نشستہ بودند، ناگاہ شیخ مسیح اللہ نامی مذکور کہ از یاران پدر بزرگوار و شفیق و غمخوار ایشاں بودند، دیدند، از غصہ طپانچہ بر روئے شاہ مذکور زدند و گفتند کہ شما ایشان ترغیب دادہ خراب می کنید، اوشان ہیچ نہ گفتند و تحمل کردند، مگر در تنہائی از حضرت ایشان گفتند کہ سر این زاجر از تن جدا می بینم، آخر ہمچنان شد کہ گفتہ بود (ص ۲۲۱)

ایک دن حسن علی ساکن کرسی (بارہ بنکی) شاہ گرم دیوان صاحب کے چند درویش دوستوں کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ حسن علی گرم دیوان سے کافی محبت وعقیدت رکھتے ہیں، ناگاہ انھوں نے شاہ مسیح اللہ نامی مذکور کو دیکھا جوان کے والد گرامی کے دوستوں میں تھے، انھوں نے غصہ میں گرم دیوان کو طمانچہ مارا اور کہا کہ آپ ان لوگوں کو غیبی راز بتا کر برباد کرتے ہیں۔ ان سے انھوں نے کچھ نہیں کہا اور برداشت کرلیا مگر تنہائی میں ان حضرت سے کہا کہ میں اس ڈانٹ ڈپٹ کرنے والے کا سر بدن سے الگ دیکھتا ہوں۔ آخر ایسا ہی ہوا جیسا کہ فرمایا تھا۔

شاہ محمد کاظم

می فرمودند کہ من از بررونہ (پڈرونہ) جدا شدہ از راہ اعظم گڑھ بالہ آبادی رفتم در راہ از شاہ گرم دیوان صاحب کہ درویشے باکمال و صاحب کشف وحال

شاہ محمد کاظم فرماتے ہیں کہ میں پڈرونہ سے چل کر اعظم گڑھ کے راستے سے الہ آباد جا رہا تھا۔ راستے میں شاہ گرم دیوان سے ملاقات ہوگئی، وہ ایک باکمال صاحب کشف وحال درویش تھے، موضع

بودند در موضع لہرہ سکونت می داشتند
ملاقات شد، دران زمان شاہ موصوف
از بینائی معذور بودند، معمول بود کہ بعد
ہفتہ از خانہ برآمدہ بیرون می نشستند تا
مریدان و طالبان خود را و دیگر کساں کہ می
رفتند آن روز از دیدار خود مستفیض
میساختند، چوں خبر فقیر رسید خلاف او
زمعمول از خانہ برآمدہ ملاقات کردند،
واین حرکت خلاف عادت محض برائے
خاطر فقیر بود، فرمودند کہ شمارا ارادۂ بیعت
باکسے ہست؟ گفتم آرے بخدمت
حضرت شاہ باسط علی قلندر آلہ آبادی ،
لہذا اہماں جامی روم، گفتند خوب است،
وبرائے شما ہمیں مصلحت ست، پس بر
حال فقیر بسیار توجہ کردند، وگفتند کہ وقت
مراجعت نیز از ہمیں راہ باید رفت کہ باز
ملاقات خواہد شد، لیکن بار دیگر اتفاقم نشد،
ہر چند یکبار دیگر از شاہ حسن علی صاحب
کہ از مریدان خاص اوشان بودند، اقرار
کردہ بودم کہ باوشما، ہمراہ شدہ ازین جا
خواہیم رفت، تاہم اتفاق نیفتاد (۲۳۱)
وتعریف شاہ گرم دیوان صاحب بسیار از

لہرا میں انکی سکونت تھی، اس وقت شاہ موصوف
بینائی سے معذور تھے۔ ان کا معمول تھا کہ وہ
ایک ہفتہ کے بعد گھر میں سے نکل کر باہر
بیٹھتے تھے تاکہ مرید و طالبان اور دوسرے آنے
والوں کو وہ اپنے دیدار سے اس دن مستفیض
فرمائیں جب فقیر کے آنے کی انھیں اطلاع
ہوئی تو خلاف معمول اپنے گھر سے نکل کر
ملاقات فرمائی اور یہ خلاف عادت بات
صرف فقیر کی خاطر کے لئے تھی۔ انھوں نے
فرمایا کیا آپ کو کسی سے بیعت ہونے کا ارادہ
ہے؟۔ میں نے عرض کیا ہاں حضرت شاہ
باسط علی قلندر الہ آبادی سے۔ لہذا وہیں جارہا
ہوں۔ فرمایا اچھا ہے۔ اور آپ کے لئے یہی
مصلحت ہے پس فقیر کی حالت پر کافی توجہ
فرمائی اور کہا کہ واپسی کے وقت بھی اسی راہ
سے جائیے گا تاکہ دوبارہ ملاقات ہوجائے۔
لیکن دوسری بار مجھے اتفاق نہیں پڑا۔ ہر چند
ایک بار پھر انکے مرید خاص شاہ حسن علی
صاحب سے اقرار کیا تھا کہ ایک ساتھ میں
اور آپ یہاں سے چلیں گے۔ تاہم اتفاق
نہیں پڑتا۔
میں نے شاہ گرم دیوان صاحب کی بہت تعریف

زبان حضرت صاحب شنیدہ ام در خاندانِ اوشان طریق سلوک ہمیں ست کہ اول کسب برزخ شیخ راتعلیم ی نمایند، یعنی نسبتِ فنا فی الشیخ ، بعد فنا فی الرسول ، بعدہٗ فنائی اللہ ،چنانچہ شاہ حسن علی راخوب فنائی الشیخ درست شدہ بود کہ بہ ہر چیزے کہ می خواستند در اندک تامل از مرشد خود می پرسیدند چنانچہ این فقیر کاتب الحروف نیز بچشم خود دیدہ بود، از باعث رابطۂ درستی حضرت صاحب قبلہ گاہی بعد چند ماہ بکاکوری ی آمدند آخر کار گوش کہ شدہ بودند، ہر چہ کہ کسی راگفتنی بودے نوشتہ دادے، درقحط سالی تشریف آوردہ بوند ، حضرت صاحب قبلہ قرض دار بودند، گفتند کہ برزخِ شاہ گرم دیوان صاحب فرمایند کہ برائے رفع قرض تراب علی یازدہ بار سورۂ مزمل خواندہ باشند،فقیر ازانِ وقت تا ایں دم کہ قریب بسی سال می رسدمی خواند، (ص۲۳۲)

حضرت قبلہ کی زبان سے سنی ۔ان کے خاندان میں سلوک کا یہی طریقہ رائج ہے کہ سب سے پہلے شیخ کے کسبِ برزخ کی تعلیم دی جاتی ہے یعنی نسبت فنافی الشیخ،اس کے بعد فنافی الرسول، تب فنافی اللہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔چنانچہ شاہ حسن علی کوفنافی الشیخ کا طریقہ اچھی طرح سے حاصل ہو چکا تھا جس معاملے میں بھی وہ چاہتے تھوڑی دیر تک تصور شیخ کر کے اپنے مرشد سے معلوم کر لیتے تھے۔چنانچہ اس فقیر کاتب الحروف (شاہ تراب علی) نے بھی خود اپنی آنکھ سے دیکھا کہ رابطۂ دوستی کے سبب حضرت صاحب قبلہ گاہی چند مہینے کے بعد کاکوری تشریف لائے آخر کار جو بات دیکھی گئی وہ ہر آدمی سے کہنے کے لائق ہے لکھی جاتی ہے۔ وہ قحط میں تشریف لائے تھے حضرت صاحب قبلہ قرضدار تھے۔فرمایا کہ برزخ سے شاہ گرم دیوان صاحب فرماتے ہیں کہ تراب علی کے رفع قرض کے لئے گیارہ مرتبہ سورۂ مزمل پڑھا کریں فقیر اس وقت سے ابتک تقریباً تیس برس سے پڑھ رہا ہے۔

(اصول المقصود اصح المطابع لکھنؤ ۱۳۱۲ھ) دارالعلوم دیو بند یکم ربیع الثانی ۱۴۱۰ھ

(۹)

مولوی حسن علیؒ ماہلی

ماہلی علماء و مشائخ

موجودہ ضلع اعظم گڑھ کے مغرب میں پندرہ بیس میل پر قصبہ ماہل مشہور بستی ہے، جو شاہان شرقیہ کے دور سے سواد جونپور میں علماء و مشائخ اور ارباب علم و فن کا مرکز رہی ہے، علمی تاریخ میں سب سے پہلے پرگنہ ماہل کا نام سلطان ابراہیم شاہ شرقی (۸۰۴ھ تا ۸۴۴ھ) کے دور میں سنا گیا، جبکہ سلطان نے حضرت شیخ فتح اللہ اودھی متوفی ۸۲۱ھ کو یہاں جاگیر دی اور انھوں نے اس علاقہ میں دو گاؤں بہاؤالدین پور اور کندھیارا (شاید کندھرا پور؟) آباد کئے اس کے بعد شیخ صدرالدین قریشی ظفرآبادی چراغ ہند کی اولاد سے ایک بزرگ شیخ خیرالدین ظفرآبادی ترکِ وطن کرکے ماہل آئے، اور اپنے نام پر ایک گاؤں خیرالدین پور آباد کرکے مقیم ہوئے، ان کے صاحب زادے شیخ مبارک محمدی ماہلی متوفی ۹۸۳ھ کے نام پر اس دیار میں مبارکپور ایک گاؤں آباد ہوا، اسی دور میں شیخ نصرالدین قلندر ظفرآبادی متوفی ۹۱۵ھ ماہل کے قریب نیگون میں اقامت پزیر ہوئے جہاں ان کا مزار ہے، آخری دور میں شیخ گلشن علی ماہلی متوفی حدود ۱۲۰۰ھ اور مولانا حسن علی متوفی ۱۲۵۸ھ گزرے ہیں، موخرالذکر دونوں حضرات فارسی شعراء میں ممتاز مقام کے مالک ہیں، غرض شرقی دور سلطنت سے یہ قصبہ علم و فضل اور علماء و فضلاء کا مسکن رہا، مغل دور میں بھی اس کا تعلق سرکار جونپور کے محال اور پرگنہ جات سے تھا اور اودھ کے نوابی کے دور میں دوسرے علاقوں کی طرح یہاں کے اہل علم و فن وظائف اور جاگیروں کی ضبطی کی وجہ سے شدید پریشانی میں مبتلا ہوئے، کہنا چاہئے کہ اسی دور میں یہاں سے علم و علماء کا دور ختم ہوگیا

برطانوی دور میں پرگنہ ماہل انتظامی امور میں مختلف علاقوں سے متعلق رہا لارڈ ولزلی اور نواب سعادت علی خاں کے درمیان ایک صلح نامہ کی وجہ سے ۱۰ر نومبر ۱۸۰۱ء (۲ر رجب ۱۲۱۶ھ) میں) چکلہ اعظم گڑھ، پرگنہ ماہل اور پرگنہ مئو کو ایسٹ انڈیا کمپنی میں شامل کر کے برطانیہ کے نئے ضلع گورکھپور سے متعلق کر دیا گیا، پھر ۱۸۲۰ء (۱۲۳۶ھ) کی ابتداء میں دیو گاؤں، نظام آباد، اور پرگنہ ماہل وغیرہ کو گورکھپور سے علیحدہ کر کے جونپور میں شامل کیا گیا، اور ۱۸ر دسمبر ۱۸۳۲ء ۱۲۴۸ھ میں اعظم گڈھ مستقل ضلع قرار دیا گیا مگر اب بھی دیو گاؤں اور ماہل جونپور کے کلکٹر کے ماتحت رہے، پھر کچھ دنوں کے بعد انکو بھی اعظم گڈھ میں شامل کر دیا گیا۔ [1]

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں باشندگان ماہل نے بڑی بہادری دکھائی اور تین ماہ تک اس دیار پر اپنا قبضہ رکھا، ۲ر جون کو اعظم گڈھ میں ہندوستانی رجمنٹ نے بغاوت کی تو ادارت جہاں نے فوج تیار کر کے نائب ناظم جونپور ہونے کا دعویٰ کر دیا اور ماہل کی تحصیل پر قبضہ کر کے شمس آباد تحصیل پھولپور تک چودہ کوس کا علاقہ اپنے زیر تصرف کر لیا، انگریزی فوج کو اعظم گڈھ کی شورش سے فرصت ملی تو ۷ر ستمبر ۱۸۵۷ء کو کرنل راٹن بھاری فوج لیکر ادارت جہان سے مقابلہ کے لئے ماہل سے متصل مبارکپور نامی گاؤں میں پہونچا، جہاں ادارت جہاں نے مضبوط پناہ گاہ بنا رکھی تھی، جانبین میں سخت مقابلہ ہوا مگر کرنل راٹن نے ادارت جہاں کو گرفتار کر کے پھانسی دیدی، اور ماہل پر انگریزی قبضہ ہو گیا۔ [2]

یہ ہے ماہل کے قصبہ و پرگنہ کی مختصر گذشتہ تاریخ، اب ہم یہاں کے علماء فضلاء شعراء اور مشائخ کے جو حالات مل سکے ہیں لکھتے ہیں۔

شیخ فتح اللہ انصاری اودھیؒ

حضرت شیخ فتح اللہ انصاری اودھی دہلی کے علمائے کبار اور مدرسین عظام میں تھے، ابتداء میں مینارہ شمسی کے عقب میں واقع جامع مسجد میں درس دیتے تھے، پھر حضرت شیخ نصیر الدین چراغ

---

[1] اعظم گڑھ گزیٹیر ۱۹۱۱ء ۱۳۳۰ھ۔ [2] اعظم گڑھ گزیٹیر۔

دہلی کے خلیفہ شیخ صدرالدین حکیم کے حلقۂ بیعت و ارادت میں شامل ہو گئے۔ مگر جب مجاہدہ وریاضت کے باوجود سلوک و معرفت کے اسرار و رموز منکشف نہیں ہوئے، تو اپنے مرشد کو صورتِ حال سے آگاہ کیا، انھوں نے حکم دیا کہ تم درس و تدریس اور کتابوں سے یکسوئی حاصل کرلو، انھوں نے اس پر عمل کیا، مگر کچھ کتابیں اب بھی ان کے مطالعہ میں رہیں جسکی وجہ سے مرشد کی نصیحت پر پورے طور پر عمل نہیں ہوسکا آخر میں ان کتابوں سے علیٰحدگی کے بعد شیخ فتح اللہ پر احسان و تصوف کی راہ صاف ہوگئی۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان پر معرفت کے دروازے کھول دیئے، شیخ صدرالدین نے ان کو خلافت دیکر علاقۂ اودھ کی طرف روانہ کیا جہاں سلاطین شرقیہ کی قدر دانی اہل علم و فضل کے لئے چشم براہ تھی، یہاں آنے کے بعد شیخ فتح اللہ بیعت و ارشاد کے ذریعہ خدمت خلق میں مشغول ہو گئے۔ اس وقت ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی جونپور کی تعلیمی و تدریسی فضا پر چھائے ہوئے تھے۔ شیخ فتح اللہ نے اپنے نوعمر مرید و مسترشد شیخ محمد بن عیسیٰ تاج کو پہلے قاضی صاحب کے مدرسہ میں داخل کرا کے علوم شرعیہ کی تعلیم دلائی پھر ان کو سلوک و معرفت کی تلقین کی۔

صاحب مشکوٰۃ النبوت نے شیخ فتح اللہ کو عارف باللہ اور قدوۃ اہل اللہ کے لقب سے یاد کیا ہے، اور ان کے بارے میں لکھا ہے،

اوسرِ حلقۂ مشائخ اودھ بود، و کرامات وخوارق عادات دے مشہور است''	وہ مشائخ اودھ کے امیرِ حلقہ تھے۔ ان کی کرامتیں اور خوارق عادات مشہور ہیں

بعض تذکرہ نگاروں نے ان کے تعارفی القاب میں ''صوفی'' لکھا ہے، ان کا حلقۂ ارشاد و تلقین بہت وسیع تھا، ان کے مریدین و خلفاء میں بڑے بڑے اہل فضل و کمال تھے، جن میں شیخ محمد بن عیسیٰ جونپوری، شیخ قاسم بن برہان الدین دہلوی اودھی مصنف آداب السالکین اور شیخ سعدالدین اودھی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ شیخ فتح اللہ اودھی ۲۶؍ ربیع الثانی ۸۳۱ھ میں فوت ہوئے۔ [۱] ان کے بارے میں ان کے خاندان کے ایک عالم مولوی علی حسن ماہلی ۱۲۵۸ھ

---

[۱] اخبار الاخیار ص ۱۶۳ و صفحہ ۱۶۴، مشکوٰۃ النبوت قلمی ص ۱۵۸ تا ص ۱۶۰، تذکرہ علماء ص ۱۵۹، نزہۃ الخواطر بحوالہ گنج ارشدی جلد۳ ص ۱۲

نے اپنی خودنوشت سوانح میں لکھا ہے کہ راقم کے اجداد میں سے ایک بزرگ شاہ فتح اللہ انصاری بن عبداللہ انصاری سلطان تغلق کے دور میں دہلی آئے، کچھ دنوں وہاں رہنے کے بعد سیر وسیاحت کرتے ہوئے جونپور پہنچے جو ان دنوں سلاطین شرقیہ کا دارالسلطنت تھا، یہاں ان کے ارشاد وتلقین کا شہرہ عام ہوا، اور حاکم وقت ان کی زیارت کا مشتاق ہوا۔ ایک دن جامع مسجد میں ان سے ملا، اور مہینہ میں دو بار ان کی مجلس وعظ میں حاضر ہوتا رہا، کچھ دنوں کے بعد سلطان نے شاہ فتح اللہ کی اولاد کے گذر بسر کے لئے چند مواضع پرگنہ ماہل میں جو جونپور کے پرگنات ومضافات میں ہے بطور جاگیر عطا کیے۔ انھوں نے پرگنہ مذکور میں اپنے بڑے صاحبزادے شاہ بہاء الدین کے نام سے بہاء الدین پور، اور کندھیارا (کندھراپور؟) دو گاؤں آباد کئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کی، ان کا مزار بھی اسی قریہ میں ہے۔ [1]

ہمارے نزدیک شیخ فتح اللہ اودھی اور شاہ فتح اللہ انصاری ایک ہی شخصیت ہیں انکے سب سے پہلے تذکرہ نگار شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں اور بعد کے سب تذکرہ نگاروں نے اپنی کتابوں میں ان کو صرف اودھی کی نسبت سے یاد کیا ہے۔ کسی نے انصاری نہیں لکھا ہے، شاہ صاحب نے نہ ان کی ولدیت لکھی ہے، نہ سنہ وفات اور نہ ہی مدفن کا ذکر کیا ہے، نزہۃ الخواطر میں گنج ارشدی کے حوالے سے انکی تاریخ وفات ۲۶ ربیع الثانی ۸۲۱ھ بتائی ہے، مگر مشکوٰۃ النبوت میں ہے کہ ”سنہ وفاتش درنظر نیامدہ ولیکن معاصر سلطان ابراہیم شرقی بود“ سلطان ابراہیم کا دور حکومت ۸۰۴ھ سے ۸۴۴ھ تک ہے نزہۃ الخواطر میں ان کے والد کا نام نظام الدین درج ہے۔ اور مولوی حسن ماہلی نے شاہ عبداللہ انصاری لکھا ہے، ہوسکتا ہے کہ نظام الدین لقب اور عبداللہ نام ہو، بعد کے کئی مؤرخوں نے ان کا مزار اودھ میں بتایا ہے، مگر مولوی حسن علی نے لکھا ہے۔ ”باجملہ در پرگنہ مذکور ازنام شاہ بہاؤالدین پسر بزرگ خود قریہ بہاؤالدین پور وکندھیارا آبادان ساختہ دران سکونت اختیار کردند، مزار متبرکہ شاہ فتح اللہ موصوف در ہماں قریہ واقع است“ ان دونوں اقوال میں یہ تطبیق ہوسکتی ہے کہ یہ علاقہ اس زمانہ میں اودھ میں شمار ہوتا تھا، اس کے علاوہ کسی اور فتح اللہ

---

[1] تذکرہ صبح وطن، ص ۵۷۔

نامی بزرگ کا نام کتابوں میں نہیں ملتا ہے، البتہ علامہ فتح اللہ ملتانی اس دور کے مشہور عالم تھے، جن کا مولد ومنشا اور مدفن ملتان ہے شیخ فتح اللہ اودھی کا یہ شعر بہت مشہور ہے۔

یک دوست پسند کن چوں یک دلداری   گر مذہب مرد مانِ عاقل داری

شیخ نصیر الدین بن قلندر ظفر آبادیؒ

شیخ نصیر الدین بن محمد بن رفیع الدین عباسی سمرقندی ظفر آبادی سلسلۂ قلندریہ کے مشائخ کبار میں ہیں، ان کے حالات انتصاح عن ذکر اہل الصلاح، کشف النقاب عن الاحوال والانساب، اصول المقصود، فصول مسعودیہ، بحر زخار، تجلی نور اور نزہۃ الخواطر وغیرہ میں ہیں، شیخ قطب الدین بینا دل قلندر جونپوری کے اجل خلفاء میں ان کا شمار ہوتا ہے، ظفر آباد سے ترک وطن کر کے قدیم پرگنہ ماہل کے مقام نگوں میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی، اور یہیں فوت ہوئے [۱] اس علاقہ میں ان کو حکومت وقت سے کئی مواضع بطور جاگیر عطا ہوئے تھے۔ قلندری روایت کے مطابق شیخ عبدالعزیز مکی علمبردار کے واسطہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم مبارک شیخ بینا نصیر الدین کو ملا تھا جو بطور تبرک محفوظ تھا، واللہ اعلم شیخ نصیر الدین کی بیوی ان کے مرشد شیخ قطب الدین بینا دل کی صاحبزادی تھیں، ان کے صاحبزادے شاہ نور قلندر بن شاہ نصیر قلندر کو شیخ قطب الدین بینا دل اور اپنے والد دونوں بزرگوں سے خلافت حاصل تھی، انتصاح میں ہے کہ شاہ نصیر نے اپنے صاحبزادے شاہ نور کے علوئے مرتبت کو دیکھ کر ان سے کہا کہ دو آفتاب ایک جگہ نہیں رہ سکتے ہیں، اس لئے شاہ نور نے نگوں چھوڑ کر سُر ہُر پور (فیض آباد) میں سکونت اختیار کر لی تھی، اور وہیں فوت ہوئے ان کا مزار بھی وہیں ہے، شیخ نصیر الدین کا وصال ۲۵ جمادی الاولیٰ ۹۱۵ھ میں نگوں میں ہوا اور وہیں دفن کئے گئے، مزار پر شاندار روضہ ہے، ان کی تاریخ وفات میں یہ اشعار کسی نے کہے ہیں،

آنکہ شاہِ نصیر دیں بودہ   صاحبِ صدق وہم یقیں بودہ

اوز بینائے دل خلافت یافت   علمِ پیر را بصدق افراشت

---

[۱] آجکل یہ علاقہ حدود سرائنیر میں شمار ہوتا ہے،

بعد چندے بہ قصبۂ نگوں | کرو از حکمِ پیرِ خویش سکوں
بست و پنج از جمادی اولیٰ بود | کہ ز دنیائے دوں سفر فرمود
سال تاریخ او بجا باشد | گفتہ ام ۔ شاہد خدا باشد[1]

شیخ مبارک محمدی ماہلی

شیخ مبارک بن شیخ خیر الدین ماہلی جونپوری، شیخ صدر الدین قریشی ظفر آبادی چراغ ہند کی اولاد سے ہیں، ان کے والد شیخ خیر الدین ظفر آباد سے ترک وطن کر کے پرگنہ ماہل میں چلے آئے، اور اس کے قریب اپنے نام پر خیر الدین پور گاؤں آباد کر کے باپ بیٹے رہنے لگے، شیخ مبارک نے بعض کتابیں اپنے والد سے پڑھیں اور جونپور کے اساتذہ وشیوخ سے تحصیل وتکمیل کی۔ طریقت وروحانیت کی تلقین وتربیت اپنے والد سے پائی، اس زمانہ میں میر علی عاشقان سرائمیری متوفی ۹۵۰ھ کی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر تھا، دور دور کے تشنگان علم وعرفان اس چشمۂ شافی سے سیراب ہو رہے تھے، میر صاحب شیخ مبارک کے ہموطن تھے، ماہل اور سرائمیر کے درمیان معمولی سا فاصلہ ہے، شیخ مبارک نے بھی میر علی عاشقان کے آستانہ پر حاضری دی اور ان کی خدمت وصحبت میں رہ کر خلافت ومشیخت کا مرتبہ پایا، مرشد نے مسترشد کو خلافت کے ساتھ محمدی کے لقب سے بھی نوازا، اس کے بعد شیخ مبارک نے میر صاحب کے حکم سے جونپور کے محلّہ سپاہ میں خانقاہ تعمیر کی اور علائق دنیا سے یکسو ہوکر زہد وتقویٰ اور عبادت وقناعت میں پوری زندگی گذاری، آپ کی ذات سے ایک مخلوق نے فیض اٹھایا، تجلی نور میں ہے کہ شیخ مبارک نے خاندانی فیوض وبرکات کے علاوہ میر سید علی قوام سے تمام سلاسل مروجہ کے فیوض حاصل کئے اور اس قدر نفس کشی اور ریاضت کی کہ ان کے مشاہیر خلفاء میں شمار کئے گئے، انھوں نے ارشاد وتلقین اور باطنی اشغال کے ساتھ تعلیم وتدریس اور ظاہری علوم کا مشغلہ بھی رکھا اور ان کی خانقاہ علمی درسگاہ اور روحانی تربیت گاہ دونوں تھی ۱۴ رشوال ۹۸۳ھ میں جونپور میں فوت ہوئے "فخر زمانہ" تاریخ وفات ہے۔[2]

---

[1] انقاح عن ذکر اہل الصلاح ص ۱۹ نزہۃ الخواطر ۴ ص ۲۷۶، نیز بعض حالات جناب سلطان احمد صدیقی گورکھپوری نے اوجھ[illegible]انہ کئے ہیں۔ [2] تجلی نور ج ۱ ص ۷۶ نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۲۷۸۔

شیخ گلشن علی ماہلی

شیخ گلشن علی بن شیخ عطاء اللہ انصاری ماہلی کا تذکرہ محمد قدرت گوپامئوی کی کتاب تذکرہ نتائج الافکار (تصنیف ۱۲۶۱ھ) میں مل سکا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شیخ فتح اللہ اودھی (شاہ فتح اللہ انصاری) کی اولاد سے ہیں، بارہویں صدی کے مشہور فارسی شعراء میں ان کا شمار ہوتا ہے، محمد قدرت گوپامئوی کا بیان ہے کہ شیخ گلشن علی پسر شیخ عطاء اللہ انصاری ماہلی کی ولادت ۱۱۷۰ھ میں ہوئی، انھوں نے فارسی کی کتابیں اپنے والد سے پڑھیں اور نحو وصرف کی تعلیم اپنے دیار کے بعض اساتذہ سے حاصل کی، خوش نویسی کی مشق بھی کی، اور خط نستعلیق وشکستہ وثلث بہت اچھا لکھتے تھے، بعد میں دہلی گیے، اور میر افضل ثابت کی خدمت میں رہ کر مشقِ شعر وسخن کی۔ انکے انتقال کے بعد شمس الدین فقیر کو اپنے اشعار دکھانے لگے، علی حزین سے بھی شاعری میں اکتساب فیض کیا، ایک مدت تک دہلی میں نواب شیر افگن خان باسطی اور چند سال نواب علی قلی خان والہ کی خدمت میں رہے۔ آخر میں ماہل میں آکر گوشہ نشین ہو گئے اور یہیں ۱۲۰۳ھ کے اواخر میں انتقال کیا، شیخ گلشن علی کے چند اشعار یہ ہیں،

رفتی از بزم وطرب رفت وتمنا باقی است ۔ بادہ شد صرف وہوا در دل مینا باقی است

لالہ در دشت نشانی ست ز مجنوں کہ ہنوز ۔ داغ ہائے غمِ او بر دلِ صحرا باقی است

دلم از اختلاطِ یار با اغیار می نالد ۔ کہ چوں بلبل بہ بیند پہلوئے گل خار می نالد

در چشم فتنہ سازتو باشد بلا نگاہ ۔ باز آفتِ نگاہِ تو دارد خدا نگاہ

رباعیات

(۱)

گر غنچۂ گل تنگ دہانی دارد ۔ چوں لعل تو کے گہر افشانی دارد

ہر چند کہ سرو مصرعہ موزوں کرد ۔ چوں قامتِ تو کجا روانی دارد

شام آن بت مہ طلعت وخورشید غلام　　آمد بہ نظارہ مہ نو بر بام

اورا بفلک نظر، مرا بر رویش　(۲)　آں شوخ ہلال دید و من ماہ تمام[1]

مولوی محمد حسن علی ماہلی

آخری دور کے ماہلی علماء وفضلاء میں مولانا محمد حسن علی صاحب حسن انصاری ماہلی متوفی ۱۲۵۸ھ کو خاصی شہرت وناموری حاصل ہوئی ان کو اپنے دور کے فارسی شعراء میں ممتاز مقام حاصل تھا، متعدد تذکرہ نگاروں نے ان کا حال لکھا اور انتخاب کلام درج کیا ہے۔ سب سے پہلے محمد قدرت گوپا مئوی نے نتائج الافکار سنہ تصنیف ۱۲۴۱ھ میں ان کا حال لکھا، اس کے بعد نواب والا جاہ محمد غوث خاں اعظم نے تذکرہ صبح وطن (بلاغت ۱۲۵۹ھ) میں ان کے خود نوشت حالات درج کئے اور گلزار اعظم میں ان کا تذکرہ کیا، یہ تینوں کتابیں مولوی صاحب کی زندگی میں لکھی گئیں اس کے بعد نواب علی حسن خاں بن نواب صدیق حسن خاں نے صبح گلشن میں (طباعت ۱۲۹۵ھ) ان کا حال لکھا ہے، حدیقۃ المرام نام کی کسی کتاب میں بھی ان کا حال درج ہے جس سے صاحبِ نزہۃ الخواطر نے استفادہ کیا ہے صبح وطن'' کا تذکرہ سب سے زیادہ مفصل اور بعد والوں کا ماخذ ہے، پھر بھی دوسرے تذکروں میں بعض نئی معلومات ہیں۔

مولوی محمد حسن علی بن شیخ نوازش علی حنفی انصاری ماہلی کا تخلص حسن ہے ۱۱۹۶ء میں ماہل میں ہیدا ہوئے، بنارس میں تعلیم حاصل کی فراغت کے بعد کلکتہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے مدرسہ میں مدرس ہوئے، کچھ دنوں کے بعد مدراس کے کمپنی کے مدرسہ میں چلے گئے اور مدرسہ ٹوٹ جانے کے بعد مدراس کی عدالت کے صدر مفتی ہوئے، اس عہدہ پر تھے کہ ۲۹/ رجب ۱۲۵۸ھ میں مدراس ہی میں فوت ہوئے۔

[1] نتائج الافکار ص ۶۰۸، ۶۰۹،

خاندانی حالات

صبح وطن میں انھوں نے اپنی خودنوشت سوانح عمری میں لکھا ہے کہ قریہ بہاء الدین پور میں ان کے جدامجد شاہ فتح اللہ انصاری کی اولاد و احفاد بزرگان دین وفضل کے انداز پر موجود تھی۔ان میں سے اکثر متوکل اور گوشہ نشین اور بعض شاہان دہلی کے مناصب جلیلہ وخدمات عمدہ پر مامور تھے،میرے جدامجد نے کبھی دائرۂ توکل سے باہر قدم نہیں رکھا،اور فقروفاقہ میں اپنی عمر بسر کی،البتہ مجھ کو سیروسیاحت اور شہروں کے عجائب وغرائب کے مشاہدہ کا شوق دامن گیر ہوا۔

’’درایام طفولیت از وطن مالوف برآمد،در بنارس تحصیل کتب درسیہ فارسیہ بخدمت ملا محمد عمر کہ بلاواسطہ نسبت تلمذ بہ سراج الدین علی خاں آرزو و شیخ علی حزیں داشتند درسن پانزدہ سالگی کردم او بمرور ایام دلیالی تحصیل علوم عقلیہ ونقلیہ جابجا کردہ درسن بست وپنج سالگی فراغ نمودم،نسبت تلمذ در علوم متداولہ معقول ومنقول بیک واسطہ بمولوی الہ آبادی قدس سرہ کہ از علمائے فحول بودند میرسد۔

اتفاقاً بعداز تحصیل علوم قائد تقدیر بہ مملکت بنگالہ رسانید درانجا شطرے از اوقات را بدرس وتدریس علوم مروجہ گذرانیدم وارادۂ مراجعت

میں بچپن ہی میں وطن مالوف سے نکل گیا اور بنارس میں پندرہ سال کی عمر تک ملا محمد عمر کی خدمت میں رہ کر فارسی ودرسی کتابوں کی تحصیل کی۔ملا محمد عمر سراج الدین علی خان آرزو اور شیخ علی حزیں سے بلاواسطہ نسبت تلمذ رکھتے تھے۔روز وشب گزرنے کے ساتھ جا بجا علوم عقلیہ ونقلیہ کی تحصیل کر کے پچیس سال کی عمر میں سند فراغت حاصل کی۔رائج علوم معقول ومنقول میں میری شاگردی کا سلسلہ ایک واسطہ سے مولوی برکت الہ آبادی قدس سرہٗ تک پہنچتا ہے جو علمائے فحول سے تھے۔اتفاقاً تعلیم حاصل کر لینے کے بعد قائد تقدیر نے بنگال پہنچا دیا۔

بوطن [illegible]

وحسب طلب حکام وقت در ۱۲۳۲ھ یکہزار و دوصد سی و دو سال دارِ مدراس حرسہ اللہ عن الاوناس گردیدہ سنگ بموزہ ام افتاد و از عرصہ بست سال وکسرے در اینجا رحل اقامت افگندم مجملے از حالِ من آوارہ دور از دیار انیست۔“ [1]

تدریس وتعلیم میں وقت گزارا۔ اور وطن واپسی کا ارادہ کیا مگر نہیں آسکا اور حکام وقت کی خواہش پر ۱۲۳۲ھ میں مدراس گیا اور بیس برس سے زیادہ ہوگیا ہے کہ یہیں اسباب اقامت میں نے ڈال رکھا ہے۔ مجھ آوارہ اور وطن سے دور کا یہ مجمل احوال ہے۔

طلبِ علم اور اساتذہ

اس مجمل سوانح عمری سے معلوم ہوا کہ وہ بچپن ہی میں وطن سے نکل کر بنارس پہونچے اور پندرہ سال کی عمر میں یعنی (۱۱۹۶ھ میں پیدائش کے حساب سے) ۱۲۱۰ھ میں فارسی کی تعلیم سے فارغ ہوئے، اس کے بعد مختلف مقامات پر علوم مروجہ کی تحصیل کر کے پچیس سال کی عمر میں یعنی ۱۲۲۰ھ میں عالم و فاضل ہوگئے، اس کے بعد ہی کلکتہ میں مدرس ہوئے، جہاں کم وبیش بارہ سال تک تدریسی خدمات انجام دیں اور ۱۲۳۲ھ میں کلکتہ ہی سے مدراس جا کر وہاں کے سرکاری مدرسہ میں بیس سال سے زائد تک تعلیم دی، یہ واقعات ۱۲۵۲ھ تک کے ہیں، اس کے بعد صدر مفتی ہوئے، اور چار سال اس عہدہ پر رہ کر ۱۲۵۸ھ میں راہی ملکِ عدم ہوئے۔

اس بیان میں تحصیل علم کے سلسلہ میں صرف ایک مقام بنارس اور ایک استاد ملا محمد عمر بنارسی کا نام ہے اس کے بعد جا بجا علوم متداولہ کی تحصیل کی اور بیک واسطہ مولوی برکت الہ آبادی سے شرف تلمذ کی تصریح کی ہے ظاہر ہے کہ جا بجا مختلف اساتذہ سے استفادہ کیا ہوگا، مگر ان میں سے ایک کے علاوہ کسی کا نام نہیں لیا اس کی کوئی خاص وجہ ان کے نزدیک رہی ہوگی۔

مولوی ملا محمد عمر بن غوث عمری بنارسی ۱۱۳۳ھ میں مرزا پور کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی، پھر دہلی جا کر وہاں کے علماء سے کسب فیض کیا، اسکے بعد

[1] صبح وطن ص ۵۸۔

سراج الدین خاں آرزو اکبرآبادی ولادت ۱۱۰۱ھ وفات ۱۱۶۹ھ اور فارسی کے مشہور شاعر علی حزیں بنارسی سے شاعری میں استفادہ کیا ملا محمد عمر صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ انھوں نے گنج شائگان کے نام سے فارسی شعراء کے حالات میں ایک کتاب بھی تصنیف کی ۹۲ سال کی عمر میں ۱۲۲۵ھ میں بنارس میں انتقال کیا، جہاں انھوں نے فراغت کے بعد مستقل سکونت اختیار کرلی تھی اور درس وتدریس کا مشغلہ جاری کیا تھا۔

مولانا محمد برکت بن عبدالرحمٰن کا خاندان امیٹھی سے الہ آباد جاکر آباد ہوگیا تھا، انھوں نے شیخ کمال الدین فتح پوری وغیرہ سے تعلیم پائی اور علوم ریاضیہ میں خاص طور سے مشہور ہوئے پوری عمر درس وتدریس میں بسر کی، ریاضی کی مشہور متداول کتابوں پر ان کے حواشی ہیں۔

علمی قابلیت

مولوی حسن علی صاحب نہایت ذہین وطباع اور ذی علم تھے۔ ان کے حالات عام طور سے فارسی شعراء کے تذکروں میں درج ہیں اسلئے ان کی شاعری کا پہلو زیادہ اجاگر ہوا اور ان کی دوسری علمی حیثیات ابھر نہ سکیں محمد قدرت گوپامئوی نے ان کو ’’جامع علوم عقلی ونقلی‘‘ کے لقب سے یاد کیا ہے اور لکھا ہے۔

’’ذہن نقاد در جمیع این فنون مہارت شائستہ وممارست بابستہ حاصل ساخت‘‘[1]

علوم مروجہ متداولہ میں مہارت کے ساتھ ریاضی اور شاعری سے خاص تعلق تھا، اور ان میں وہ استاذ وقت مانے جاتے تھے ریاضی میں ان کی متعدد کتابیں اور رسائل ہیں نواب والا جاہ نے لکھا ہے۔’’ حسن تخلص مولوی محمد حسن علی است کہ در علم فارسی وعربی وریاضی استاد وقت خود است، رسالہ تبصرۃ الحکمہ در طبعیات والٰہیات بنام این راقم السطور مرقوم ساختہ، ورسالہ منتخب التحریر درعلم ریاضی ورسائل تکسیر وجفر ورمل وغیرہ از مولفات اوست[2]

غالب گمان ہے کہ تبصرۃ الحکمۃ کے ساتھ منتخب التحریر اور تکسیر وجعفر اور رمل وغیرہ کے

---

[1] نتائج الافکار ص ۱۷۲ [2] صبح وطن ص ۵۶

رسائل بھی مدراس میں طبع ہوئے ہونگے، نواب والا جاہ سے مولوی صاحب کے خوشگوار تعلقات تھے اور از راہ قدردانی نواب صاحب نے ان کی کتابوں کی طباعت کا انتظام کیا ہوگا۔

مدراس میں مولوی صاحب کو علمی ماحول ملا اور ان کی پوری قدردانی ہوئی، اور وہ شعروشاعری اور فارسی زبان کے ساتھ علوم ریاضیہ کے استادیگانہ ومنتخب زمانہ'' قرار پائے نواب والا جاہ نے گلزار اعظم میں لکھا ہے۔

''بتدریس کتب فارسیہ خصوصاً کلام متقدمین وعلم ریاضی استادیگانہ ومنتخب زمانہ'' (ص ۱۶۰)

اسی کے ساتھ بڑے شریف ونجیب اور با اخلاق عالم تھے، عزتِ نفس وشرافتِ طبع حلم وانکسار کے پیکر تھے، نواب والا جاہ جامع انداز میں ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''نورِ شرافت از مہر جبینش پیدا بودے، نجابت از گل حلقش ہویدا۔ حلمش با انکسار توام واخلاقش با کرام ہمدم''[1]

دینی علوم میں بھی اپنے معاصرین میں ممتاز تھے، کتاب وسنت اور فقہ میں ان کو مہارت تامہ حاصل تھی مدراس میں صدر مفتی ہونا اس کی دلیل ہے، معلوم ہوا یہ وصف بعد میں نمایاں ہوا جب کہ شعروسخن، ریاضی دان اور مدرسی کی شہرت عام ہوچکی تھی، اس لئے ان کے تذکرہ نگاروں نے ان ہی گوشوں کو زیادہ اجاگر کیا۔

اصل میں وہ ایک کامیاب مدرس اور استاد وقت تھے، شعروشاعری ان کا خاص مشغلہ نہیں تھا، مگر یہ عجیب بات ہے کہ اسی میں انکو زیادہ شہرت ونا موری حاصل ہوئی، شعر کبھی کبھی کہتے تھے، مگر طبیعت موزوں پائی تھی، اس لئے جو کچھ کہتے تھے اچھا کہتے تھے، انکے تلامذہ میں اچھی خاصی تعداد ان شعراء کی ہے جو تیرہویں صدی میں جنوبی ہند کے آسمان شعر پر نمایاں تھے۔

تدریسی وتعلیمی خدمات

ایام طفولیت میں وطن سے نکلنے کے بعد ان کو واپسی کا موقع نہیں ملا، ممکن ہے فراغت

[1] گلزار اعظم ص ۱۶۰

کے بعد ایک آدھ بار وطن آنے کا اتفاق ہوا ہو۔ ورنہ بقول ان کے تحصیل علوم کے بعد قائد تقدیر نے ان کو کلکتہ پہونچا دیا وہاں سے وطن کی مراجعت کا ارادہ کیا مگر اس کا موقع نہ مل سکا اور ادھر ہی سے مدراس چلے گیے اور وہیں کے ہو کر رہ گئے، غالباً انھوں نے مدراس میں متاہل زندگی بسر کی ہوگی، اور انکے بال بچے رہے ہوں گے مگر ان کا حال معلوم نہیں باوجودیکہ مدراس میں ان کو بہترین ماحول ملا قدر دانی بھی ہوئی، اونچا عہدہ پایا مگر اپنے وطن والوں سے مہجوری اور اپنی مجبوری کی وجہ سے ہمیشہ دل گرفتہ رہے اور اپنے کو ''آوارہ دوراز دیار'' ہی سمجھتے رہے،

قائد تقدیر'' کی قیادت میں اس آوارۂ دوراز دیار'' کا دور نہایت پر آشوب تھا، علماء و فضلاء سخت ابتلاء و آزمائش میں مبتلا تھے، نوابان اودھ کی اہل علم و فضل کے ساتھ زیادتی اور نظام سلطنت کی ابتری عام تھی، اس دور پُر فتن کا پورا نقشہ علامہ آزاد بلگرامی نے کھینچا ہے۔

''۱۱۳۰ھ تک اس سرزمین کی مٹی میں علم و علماء کی سرگرمی باقی رہی، یہاں تک کہ محمد شاہ عالم کے آغاز جلوس میں برہان الملک سعادت خاں نیشاپوری صوبہ اودھ کا حاکم ہوا، اس نے یہاں کے اکثر بڑے بڑے شہروں جیسے جونپور، بنارس، غازیپور، کڑا مانک پور، کوڑا جہاں آباد وغیرہ کو اپنی حکومت میں شامل کر کے قدیم و جدید خانوادوں کے وظائف اور جاگیروں کو یکسر ضبط کر لیا۔ جس کی وجہ سے شرفاء و نجباء نے بڑی پریشانی اٹھائی لوگوں کو معاش و معیشت کی الجھنوں نے کسب علم سے باز رکھ کر پیشہ سپہ گری میں ڈال دیا، اور درس و تدریس کا رواج یوں ختم ہوگیا کہ جو مدارس قدیم زمانہ سے معدنِ علم و فضل تھے بالکل ویران ہوگئے، اور اکثر ارباب کمال کی بھری انجمنیں اجڑ گئیں، برہان الملک کے بعد اس کے بھانجے ابوالمنصور صفدر جنگ کو حکومت ملی وظائف اور جاگیریں بدستور ضبط رہیں، اور جب محمد شاہ کے آخری عہد ۱۱۵۹ھ میں الہ آباد کی صوبہ داری بھی اس کے حوالہ کر دی گئی تو اس صوبہ کی جاگیریں اور وظیفے بھی باقی نہ رہ سکے، احمد شاہ کے زمانہ میں صفدر جنگ وزیر بنا تو صوبہ اودھ وغیرہ کے نائب نے وظیفہ یاب طبقہ پر سختی کی جس کے باعث یہ دیار پامال ہوگیا۔[1]

---

[1] مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۲۲

پھر آخری دور میں انگریزی اقتدار کے عروج اور پورے ملک میں عام بے چینی کی وجہ سے ہر طرف ابتری پھیلی ہوئی تھی اس لیے ارباب علم وفن نوابوں، امیروں اور راجوں کے دروازوں کا رخ کرنے لگے بہتوں نے برطانوی مدرسوں سے تعلق پیدا کرلیا، چنانچہ مولوی حسن علی ماہلی اور ان کے دیار کے کئی علماء نے کلکتہ مدراس اور ارکاٹ وغیرہ کا رخ کیا، ان کا انتقال مدراس کی عدالت کی صدارتِ افتاء کے دور میں ۱۲۵۸ھ میں ہوا گلزار اعظم میں ہے۔

" بعد چند سال لوائے خدمت افتائے صدر مفتی عدالت افراخت، ودر ہماں کارگزاری در سال ۱۲۵۸ھ کوس رحلت ازیں دار سراسر وحشت نواخت" (ص ۱۶۰)

سب تذکرہ نگاران کی وفات ۱۲۵۸ھ میں لکھتے ہیں۔

نزہۃ الخواطر میں حدیقۃ المرام کے حوالہ سے ۲۹ر رجب ۱۲۵۸ھ درج ہے۔

شعروشاعری

مولوی صاحب تمام علوم متداولہ اور عقلیہ ونقلیہ میں استادِ یگانہ اور منتخبِ زمانہ ہونے کے ساتھ ایک کامیاب شاعر کی حیثیت سے مشہور ہوئے جوان کے فطری ذوق کا نتیجہ تھا، اس ذوق نے بنارس میں ملا محمد عمر کی صحبت میں اور جلاء پائی، مگر وہ کبھی کبھی شاعری کرتے تھے۔ محمد قدرت گوپا مئوی نے لکھا ہے۔

" چوں کہ درفنون نظم ہم طبع بلند دارد تلاشِ ارجمند گاہ گاہ بفکر سخن ملتفت می شود [1]

نواب والا جاہ نے بھی یہی لکھا ہے، باقتضائے موزونیتِ طبع گاہ گاہ بفکر سخن ہم مشغول بودہ مشاطۂ طبع رسالیش باین زیبائش حسن شاہد کلام می افزاید (گلزار اعظم ص ۱۶۰)۔ نمونۂ کلام یہ ہے،

دکانِ دلبران بے رونق از روئے نگارم شد	بلے قدرے بہ پیش مہر کے رباشا چراغاں را
نزاکت آں قدر دارد کفِ پائے نگارینش	کہ برگِ گل بجائے خار باشد پائے جاناں را
پر از مشکِ ختن می بینم امشب کوہ وصحرا را	مگر باد صبا واکرد آن زلفِ چلیپا را
از روئے خود فگن صلما! این نقاب را	پوشیدہ کس ندید رخِ آفتاب را

---

[1] (نتائج الافکار ص ۲۰۷)

ہائے اے حسن! وصال ازاں مہر رخ مجو — در بر گرفتہ است کسے آفتاب را
از بسکہ وحشی است دل بے قرار ما — رم می کند ز سایۂ مردم غبار ما
در بر نہالِ قامت او نشاندہ ایم — گل کرد صد بہار ز باغ کنار ما
تا جلوۂ رخ تو ملکِ دلم بتافت — آئینہ زار گشت ز حیرت دیار ما
روزے بہر قدم گذارائے سنگدل کہ آہ — از حد گذشت مرتبۂ انتظار ما
برروئے زرد ماست رواں اشک لالہ گوں — یکجا بہم شدہ است خزاں و بہار ما
دوش رفتم بسر کوئے صنم استادم — دید و گفتا کہ کدامی، و چہ کار است اینجا
اے حسن اسیرِ گلستان چہ ضرور است ترا — گوشۂ دامنت از گریہ بہار است اینجا
نادیدہ است گل بچمن روئے یارِ من — از پنجہ ہائے خار گریباں دریدہ است
سبزہ بروئے دلبرِ من نیست اے حسن — طوطی بآب چشمۂ حیوان رسیدہ است
دوش چون بے رحمی ظالم، دل من یاد کرد — من جدا فریاد کردم، دل جدا فریاد کرد
از سرشکِ لالہ گون گشتم چو گل رنگیں لباس — نورِ چشم من لباسِ دیگرم امداد کرد
قطرۂ اشکم بخاک افتاد و وصلش روند اد — دیدہ اینُ درِّ یتیمم رایگاں برباد کرد
اے حسن! پیک دیار آن صنم اینک رسید — مرحبا کہ خانۂ ویرانہ ام آباد کرد
اے باد پیش یار بردبا ادب بگو — کیں دل برائے دیدنِ تو زاری طپد
چشمِ تو دوست دارم اگرچہ چشم بجا است — تیمار دار را ز غمِ بیماری طپد
دوشینہ در بر آن بُتِ عیار داشتم — خوش طالعے کہ دولتِ بیدار داشتم
کالم، پُر از حلاوتِ دنیا است اے حسن! — شاید بخواب لب بلب یار داشتم
اے حسن داغِ دلِ من رونقِ من بس بود — احتیاج شمع دیگر نیست در کاشانہ ام
شاید کہ بتِ ما گذر و بر سرِ راہے — بر خاک نشیلیم بامید نگاہے
ہر چند ضعیفیم دلے حامی عشقیم — سر تیزی آتش بود از برگ گیاہے

ہم نے یہ اشعار صبح وطن سے نقل کیے ہیں، دوسری کتابوں میں ان ہی کا مختصر انتخاب درج ہے۔

تلامذہ

مولوی حسن علی صاحب کی پوری زندگی وطن سے دور کلکتہ اور مدراس میں گذری ان ہی دونوں جگہوں میں ان کے کمالات علم و ادب کے میدان میں ظاہر ہوئے مدراس میں ان کو زیادہ مدت تک قیام کرنے اور کام کرنے کا موقع ملا اس لیے یہیں ان کی علمیت وقابلیت کے جوہر نمایاں ہوئے۔ چنانچہ ان کے کئی تلامذہ کے حالات کتابوں میں ملتے ہیں، جن کا تعلق جنوبی ہند سے ہے۔ یا وہ ان کے دیار کے تھے اور مدراس وغیرہ میں رہ بس گیے تھے۔ ان میں سے چند یہ ہیں۔

قاضی یعقوب علی بن فضل علی عثمانی سندیلوی گوپا مئوی رمضان ۱۲۰۷ھ میں پیدا ہوئے۔ اپنے دیار کے علمائے عصر سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد مدراس کا سفر کیا اور وہاں مولانا تراب علی، خیر آبادی اور مولانا حسن علی ماہلی اور قاضی ارتضا علی گوپامئوی سے پڑھ کر سند فراغت پائی، اور ان ہی اطراف رہ کر بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے، ابتداء میں مالابار میں مفتی ہوئے، پھر مچھلی بندر کے قاضی بنے اور آخر میں راجمندری میں صدر کا منصب پایا، ان مناصب جلیلہ پر رہ کر مدتوں دینی و علمی خدمات انجام دیں، آخر عمر میں حرمین شریفین کا سفر کیا اور حج و زیارت سے فراغت کے بعد راجمندری میں گوشہ نشینی اختیار کر لی اور وہیں ۲۰ ر رمضان ۱۲۸۳ھ میں فوت ہوئے۔[1]

ولاؔ تخلص اور مولوی سید حمید الدین بن سید ابو طیب خاں نام ۱۲۱۳ھ میں رحمت آباد میں پیدا ہوئے، مدراس کے مشہور علماء مولوی محمد سعید اسلمی مدراسی مولوی علاء الدین لکھنوی، مولوی تراب علی خیر آبادی، اور مولوی حسن علی ماہلی سے علوم عربی کی تحصیل کی تھی، (صبح وطن ص ۲۱۷)

بہجتؔ تخلص مولوی محمد تاج الدین حسین بن غیاث الدین خاں خوشنویس نام ۱۲۱۴ھ میں مدراس میں پیدا ہوئے بیس سال کی عمر کے بعد سے بارہ سال تک مدرسہ کمپنی میں مولوی حسن علی ماہلی، اور مولوی علی نامی سے علوم عربی و فارسی کی تحصیل کی (گلزار اعظم ص ۱۳۰)

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۵۲۳

بلیغ تخلص، شاہ محمد روح اللہ بن شاہ محمد نور اللہ نقشبندی خوش نویس نام ۱۲۳۰ھ میں پیدا ہوئے، کتب فارسی، فن عروض وقوافی و بیان و بدیع ونجوم و رمل وتکسیر وغیرہ مولوی حسن علی ماہلی، اور مولوی حاجی محمد محی الدین میران سے حاصل کیے، اور ان ہی دونوں سے شعر وسخن کی مشق کی، (گلزار اعظم ص ۱۳۳)

حیران تخلص، مولوی حاجی محی الدین بن فقیر محمد، ساکن کرنول، نواب عمدۃ الامراء بہادر کے مطبخ کے داروغہ تھے، ۱۲۱۰ھ میں مدراس میں پیدا ہوئے سن شعور کے بعد اکتساب علم کا شوق پیدا ہوا۔ مولوی حسن علی ماہلی، اور مولوی سید عبد القادر حسینی سے فارسی وعربی علوم پڑھ کر فراغت کے قریب پہونچے، (گلزار ابراہیم ص ۱۶)

صاحب تخلص، مولوی غلام علی المخاطب بہ منشی الملک دبیر الدولہ اعتماد خاں بہادر، عطارد جنگ بن محمد ناطی المخاطب بہ دبیر الملک مشیر الدولہ راز دار خاں بہادر محوز جنگ ۱۲۱۷ھ میں مدراس میں پیدا ہوئے، مولوی حسن علی ماہلی اور مولوی ارتضی خاں بہادر کی خدمت میں رہ کر کتب عربیہ کی تعلیم حاصل کی (ص ۲۴۷)

قادر تخلص، مولوی قادر علی بن حاجی تراب علی نائی، ۱۲۳۲ھ میں مدراس میں پیدا ہوئے، کتب عربیہ ہدایہ تک مولوی حسن علی ماہلی، مولوی سید عبد الودود عاشق، مولوی سید عبد القادر حسینی اور مولوی یوسف علی خاں سے پڑھیں (ص ۲۹۵)

سرگذشت راجگان اعظم گڈھ

''سرگذشت راجگان اعظمگڈھ'' کو میر سید علی رضوی ساکن میہان (مینہ نگر) پرگنہ نظام آباد نے فارسی زبان میں ۱۸۳۷ء میں لکھا، اس کا ایک نسخہ لندن گیا (غالباً انڈیا آفس میں) وہاں سے محمد عبد العزیز ساکن بھتری سید پور ضلع غازی پور نے طلب کر کے ۱۹۰۷ء میں اردو ترجمہ کیا اور ایک انگریز افسر بندوبست اعظم گڈھ کو پیش کیا، اس کا فوٹو مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی نے حاصل کیا، اسی سے یہ معلومات لی گئی ہیں۔

راجہ جہاں خان پسر راجہ	راجہ ارادت خان نے بھی دو بیٹے ایک جہاں خان،
ارادت خان پسر بابو مہابت	دوسرا عالم خان باقی چھوڑ کر انتقال کیا اور ٹیکہ راج
خان پسر بابو عظمت خان پسر	جہاں شاہ کو ہوا اور راجہ مذکور نے اپنے راج میں
راجہ بکر ماجیت سنگھ پسر راجہ	عالم خان بھائی کو زہر دلا کر جان سے مارا اور تمام
دھرنی دھر پسر راجہ ہربنس	راج پر قابض ہوا۔ اور مہاراج گنج، اور جہاناں گنج
سنگھ پسر ساگر سنگھ پسر چندر	اور شاہ گڑھ آباد کیا اور اب تک یہ سب موجود اور
سین رائے	آباد ہیں،

بابو صوفی بہادر ولد بابو مہابت خان ولد عظمت خان ولد راجہ بکر ماجیت سنگھ ولد راجہ دھرنی دھر ولد راجہ ہربنس سنگھ ولد ساگر سنگھ ولد چندر رائے مورث اعلیٰ، مبارک پور میں محلّہ پورہ صوفی غالبًا ان ہی کے نام پر ہے پرانے کاغذات میں محلّہ صوفی بہادر ملتا ہے۔

جامعہ اسلامیہ بنارس ۲ ذی قعدہ ۱۴۱۴ھ

۱۶/اپریل ۱۹۹۴ء

راجہ اکرام خان راجۂ اعظم گڑھ

راجہ اکرام خان راجۂ اعظم گڑھ مرید شاہ فتح قلندر[1]	راجہ اکرام خان راجۂ اعظم گڑھ شاہ فتح قلندر کا مرید تھا
(شاہ باسط علی قلندر الہ آبادی) روزے بعد نماز عصر بشاہ روشن علی کہ مرتبہ فنافی الشیخ داشت وصاحب تصرف بود فرمودند کہ اے روشن علی درین ولا بخاطر آید کہ ترا بقلندر پور	(شاہ باسط علی قلندر الہ آبادی نے) ایک دن نماز عصر کے بعد شاہ روشن علی سے جو فنافی الشیخ کا مرتبہ رکھتے تھے اور صاحب تصرف تھے، فرمایا کہ اے روشن علی اس وقت خیال

[1] فصول مسعودیہ ص ۱۷۷

فرستادہ شود الخ (ص ۱۲۱)
روزے حین استقامت شاہ مذکور
بخدمت صاحبزادگان خبر رسید کہ امروز
راجہ اعظم گڑھ کہ از آباء و اجداد
ارادت درسوخت بجناب شاہ فتح
قلندر می داشت بنا بر زیارت و
ملازمت صاحبزادگان می آید، خادمان
فرش بگسترایندند، ومنتظر بآمدن راجہ
مذکور بودند کہ شخصے دیگر رسید وگفت کہ
راجہ می آید، باز معلوم شد کہ مراجعت
بخانہ کرد، کیفیت چنان شد کہ چون راجہ
بنا برزیارت از خانہ روانہ شد، دراثناء
راہ یکا یک بخاطرش گذشت کہ امروز
فلان کار درپیش ست بخانہ باید رفت،
بروز دیگر بنابر زیارت وملازمت
صاحبزادگان خواہم رسید، باستماع
این معنی بہ صاحبزادگان از گسترایندن
فروش حجاب آمدہ، شاہ روشن علی بمجرد
درک این معنی بگفت کہ حالا فروش
برداشتن نازیباست، اگر حکم شود راجہ را
بازگردانیم، صاحبزادگان بگفتند کہ

پیدا ہورہا ہے کہ تجھ کو قلندر پور بھیج دیا جائے۔[1]
ایک دن شاہ مذکور کے دوران قیام
صاحبزادوں کو یہ اطلاع پہنچی کہ آج راجہ
اعظم گڑھ جس کے آباء واجداد شاہ فتح قلندر
سے بیعت وتعلق رکھتے تھے اسی وجہ سے وہ
ان کے لڑکوں کی زیارت وخدمت گزاری
کے لئے آرہا ہے۔ نوکروں نے فرش
بچھادیئے اور راجہ کے آنے کا انتظار کرنے
لگے۔ ایک دوسرا شخص آیا اور اس نے بتایا کہ راجہ
آتا ہے۔ پھر معلوم ہوا کہ وہ اپنے گھر لوٹ گیا۔
حالت یہ ہوئی کہ جب راجہ اپنے گھر سے زیارت
کی نیت سے چلا تو راستے میں اچانک
اس کے دل میں یہ بات پیدا ہوئی کہ
آج فلاں کام درپیش ہے۔ گھر لوٹ جانا
چاہئے کسی دوسرے دن صاحبزادوں کی
خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔ یہ خبر سننے
کے بعد ان کے صاحبزادوں کو فرش کے
بچھادیئے جانے پر شرمندگی سی ہونے لگی۔
شاہ روشن علی نے اس خبر کی اصلیت
کا علم رکھنے کی وجہ سے فرمایا کہ
ابھی فرش اٹھانا مناسب نہیں ہے۔

---

[1] فصول مسعودیہ ص ۱۲۱

وقوع این معنی پسندیدہ و مرغوب است، شاہ مذکور گفت کہ می آید، چوں راجہ متوجہ بخانہ شد فوراً بخاطرش رسید کہ بدین قرب رسیدہ اکنوں بسعادت زیارت و ملاقات صاحبزادگان نرسیدن از طریقۂ ادب بعید است، پس باز گردید، وبسعادت زیارت فائز گردید، و از ہمگین صاحبزادگان ملاقات کرد، تصرف شاہ مذکور صاحبزادگان دیدہ بسیار شاد وخوشنود شدند ہماں وقت راجہ را پیش شاہ مذکور کہ مراتب در مجلس نشستہ بود آوردہ آواز دادند کہ اے شاہ روشن علی راجہ بر بنا معانقہ استادہ است، شاہ مذکور جواب داد کہ سینہ ام از سعادت معانقہ حضرت پیر و مرشد برحق شرف گردیدہ است، بسگانِ دنیا ملوث نمی توانم کرد، ہر چند مکرر گفتند ہر بارعین جواب داد، وناچار راجہ کوچ کرد۔[1]

شاہ روشن علی (زمیندار ملتھوا) بن شیخ فیض اللہ (ص ۱۳۳)

اگر حکم ہو تو راجہ کو واپس بلالوں۔ صاحبزادوں نے کہا کہ ایسا وقوع پزیر ہونا پسندیدہ اور بہتر ہے۔ شاہ روشن علی نے فرمایا کہ آرہا ہے۔ جب راجہ اپنے گھر کی طرف مڑا تو فوراً اس کے دل میں یہ بات سما گئی کہ اتنے قریب آجانے کے بعد صاحبزادوں کی خدمت میں حاضری نہ دینا اور ان کی زیارت کی سعادت کے لئے نہ پہنچنا طریقۂ ادب سے بعید ہے پس پھر گیا۔ اور زیارت کی سعادت سے فائز ہوا۔ اور تمام صاحبزادوں سے ملاقات کی۔ صاحبزادوں نے شاہ روشن علی کی کرامت کو دیکھ کر کافی خوشی ظاہر کی۔ اس وقت راجہ کو شاہ مذکور کے سامنے لایا گیا جو کہ معزز جگہ پر مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے اور آواز دی گئی کہ اے شاہ روشن علی راجہ معانقہ کے لئے کھڑا ہے شاہ مذکور نے جواب دیا کہ میرا سینہ میرے برحق پیر و مرشد کے معانقہ کی سعادت سے مشرف ہو چکا ہے۔ میں دنیا کے کتوں سے ملوث نہیں کرسکتا۔ جتنی بار کہا گیا انھوں نے ہر بار یہی جواب دیا۔

[1] فصول مسعودیہ ص ۲۲ [2] (ص ۱۳۳)

راجہ مہابت خان

راجہ اعظم خان کے بھائی راجہ عظمت خان بانی عظمت گڑھ کے بیٹے راجہ مہابت خان نے مدھوبن سے اترولہ تک اپنی حکومت قائم کی تھی، نواب سعادت علی خان سے جنگ کر کے گرفتار ہوئے اور گورکھپور میں بحالت قید ۱۷۳۱ء میں انتقال کیا۔

در مناقب الاصفیاء است کہ از جملہ کشف و کرامت سید محمد وارث مدظلہ العالی (برادر کلان سید شاہ باسط علی قلندر الہ آبادی) آن ست کہ فرقتے کہ نواب سعادت علی خان برہان الملک برائے اخراج راجہ مہابت خان راجۂ اعظم گڑھ دران ضلع آمدہ بجنگ در پیوست، اہل کہ دران وقت حاضر بودند گفتند کہ فتح بابو مہابت خان خواہد شد، حضرت شاہ پیر محمد قدس سرہ (بن شاہ فتح قلندر) از ایشان پرسیدند کہ شمارا چیزے معلوم می شود[1]

ایشان گفتند کہ فتح نواب سعادت علی خان خواہد شد، وجنگ زیادہ از شش پاس از ابتدائے این وقت نخواہد گذشت، حضرت شاہ پیر محمد قدس سرہ فرمودند کہ اہل رجل احقر بخلاف این گویند، ایشان گفتند کہ

مناقب الاصفیاء میں ہے کہ سید محمد وارث مدظلہ العالی (برادر کلاں سید شاہ باسط علی قلندر الہ آبادی) کی جملہ کشف و کرامت میں سے یہ بھی ہے کہ جب نواب سعادت علی خاں برہان الملک راجہ مہابت خاں راجۂ اعظم گڑھ کو بھگانے کے لئے اس ضلع اعظم گڑھ میں آکر جنگ کرنے لگا تو جو اہل اللہ اس وقت حاضر مجلس تھے کہتے تھے کہ بابو مہابت خان کو فتح ہوگی۔ حضرت شاہ پیر محمد قدس سرہ (بن شاہ فتح قلندر) نے ان بزرگوں سے پوچھا کہ آپ لوگوں کو کچھ معلوم بھی ہوتا ہے؟ ان لوگوں سے انھوں نے کہا کہ فتح نواب سعادت علی خاں کو ہوگی اور حضرت شاہ پیر محمد قدس سرہ نے فرمایا کہ اہل رجل وجفر اس کے خلاف بتا رہے ہیں۔ لوگوں نے کہا کہ اس کو

[1] ص ۱۶۸

آنہا را بفر مائید کہ علم واوراق خود را بسوزانند ایں بیقین وکشف این امر غیبی شدنی را دیدہ می گویم، بعدش بمان شد کہ حضرت سید محمد وارث می فرمودہ اند[۱]

فرمائیے کہ اپنے علم واوراق کو جلادیں میں یقین اور کشف سے اس ہونے والے امر کو دیکھ کر کہتا ہوں۔اس کے بعد وہی ہوا جیسا کہ حضرت سید محمد وارث فرمارہے تھے۔

حضرت شاہ فتح قلندر

ودر قلندر پور قریہ آباد کردۂ خود مقیم بود، اعظم خان راجۂ آنجا بوجہے از آن حضرت خصومت کرد، از قریہ برآمد و جائے مراقب نشست، وگفت کہ بعد ہیزدہ روز اعظم خان خواہد مُرد، چوں وعدہ منقضی شد خلق را از خلاف وقوعِ قولِ او استعجاب روداد کہ اعظم خان زندہ است، بعد ہزدہ ماہ سر از مراقبہ برآورد، و فرمود اعظم خاں بمرد، تاریخ قلم بند کردند ۱۷۱۵ء مطابق افتاد، دویم شعبان وفات[۲]

حضرت شاہ فتح قلندر نے قلندر پور گاؤں کو آباد کر کے وہیں قیام فرمایا راجہ اعظم خاں کسی وجہ سے ان سے دشمنی رکھتا تھا، یہ گاؤں سے نکلے اور مراقبہ والی جگہ پر مراقب ہوئے، فرمایا کہ اٹھارہ دن کے بعد اعظم خاں مرجائے گا جب انکی بات پوری نہیں ہوئی تو لوگوں کو ان کے خلاف واقعہ قول پر حیرت ہوئی کہ اعظم خاں زندہ ہے اٹھارہ مہینے کے بعد مراقبہ سے سر اٹھایا اور کہا کہ اعظم خاں مرگیا ۲ رشعبان کو "تاریخ قلم بند کردند" کے مطابق وفات ہوئی۔ ۱۷۱۵ء

---

۱ اصول المقصود ص ۱۷۰ (دار العلوم دیوبند ۵ ربیع الثانی ۱۴۱۰ھ) ۲ (بحر زخار ص ۸۳۳)

مورّخِ اسلام حضرت مولانا

قاضی اطہر مبارکپوری کی مطبوعہ تصانیف کی فہرست

عربی تصانیف

(۱) رجال السند والهند الى القرن السابع:

ہندوستان سے تعلق رکھنے والے ساتویں صدی ہجری تک کے ارباب فضل وکمال کا تذکرہ جو تاریخ وتذکرہ اور سیرت وجغرافیہ کا عطر ہے۔ ۱۹۵۸ء میں ۳۲۸ر صفحات پر مشتمل محمد احمد میمن برادران بمبئی نے مطبع حجازیہ سے شائع کیا۔ دارالانصار قاہرہ (مصر) نے ۱۹۷۸ء میں اضافہ شدہ ایڈیشن دوجلدوں میں چھاپا، جو ۵۸۸ر صفحات پر مشتمل ہے۔

(۲) العقد الثمين فى فتوح الهند ومن ورد فيها من الصحابة والتابعين:

ہندوستان میں جو صحابہ وتابعین، محدثین وفقہاء تشریف لائے، ان کی خدمات کی مبسوط تاریخ، ۱۹۶۸ء میں پہلی بار ابناء مولوی محمد بن غلام رسول سورتی بمبئی نے ۳۳۵ر صفحات میں دوسری بار دارالانصار قاہرہ (مصر) نے ۱۹۷۹ء میں طبع کرایا، جو ۲۳۱ر صفحات پر مشتمل ہے۔

(۳) الهند فى عهد العباسيين:

اس سے عہد عباسی میں ہندوستان کے تعلقات وروابط کی نوعیت کا پتہ چلتا ہے۔

۸۷ر صفحات میں دارالانصار قاہرہ (مصر) نے ۱۹۷۸ء میں شائع کرایا۔

(۴) جواهر الاصول فی علم حديث الرسول:

حدیث کے اصول پر اہم علمی کتاب جو حوالہ جاتی کتب میں سے ایک اہم کتاب ہے۔ مورّخِ اسلامؒ نے اس کی تحقیق وموازنہ میں ایک مقدمہ بھی لکھا ہے۔ ۱۹۷۳ء میں ۱۶۰ر صفحات پر شرف الدین الکتبی واولادہٗ بمبئی نے چھاپا۔ اس کی طبع ثانی دارالسّلفیہ بمبئی اور مکتبہ علمیہ مدینہ منورہ نے طبع ثالث کی۔

(۵) تاريخ اسماء الثقات:

ابن شاہین بغدادی کا مخطوطہ ہے۔ جسے قاضی صاحب کے مقدمہ کے ساتھ شرف الدین الکتبی واولادہٗ بمبئی نے شائع کیا۔ یہ کتاب متنی تحقیق کی عمدہ مثال ہے۔ ۱۹۸۶ء میں ۲۳۵ر صفحات پر مشتمل اشاعت پزیر ہوئی۔

(٦) العرب والهند فی عهد الرساله:

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس کتاب سے عہد رسالت میں عرب و ہند کے درمیان گوناگوں تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔ دراصل یہ کتاب مورّخِ اسلامؒ کی اُردو تصنیف ''عرب و ہند عہد رسالت میں'' کا عربی ترجمہ ہے۔ جسے مصر کے ایک ازہری عالم شیخ عبدالعزیز عزت نے ترجمہ کیا ہے۔ انہوں نے جامعہ ازہر میں اُردو زبان پڑھی تھی۔ شاہ فاروق کے زمانہ میں شعبۂ اُردو کو ایک ازہری عالم محمد حسن مبارکپوری اعظمی نے جامعہ ازہر میں قائم کیا تھا۔ یہ کتاب ۱۹۷۳ء میں الهيئة المصريه العامة للكتاب قاہرہ سے شائع ہوئی، جو ۱۴۰ر صفحات پر مشتمل ہے۔

(۷) حكومات العرب فی السند والهند:

جیسا کہ عنوان سے پتہ چلتا ہے، عربوں کی اسلامی حکومتیں ہندوستان میں اسلام کی

ابتدائی صدیوں میں تھیں۔ عربوں نے ہندوستان پر اسلامی علوم وفنون اور اپنی تہذیب کے کیا اثرات چھوڑے ہیں، یہ کتاب اسی کی جھلکیاں پیش کرتی ہے۔

یہ کتاب مورّخِ اسلامؒ کی اُردو تالیف (ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں) کا عربی ترجمہ ہے۔ جسے مصر کے مشہور عالم ڈاکٹر عبدالعزیز عزت عبدالجلیل نے کیا ہے۔ سعودی عرب ریاض سے یہ کتاب پہلی بار ۱۹۷۵ء میں طبع ہوئی۔

(۸) دیوانِ احمد:

مولانا کے نانا مولانا احمد حسین رسول پوری کے عربی کلام کا مجموعہ ہے۔ جو مورّخِ اسلامؒ کی ترتیب ومقدمہ کے ساتھ ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا۔ مولانا محمد یحییٰ رسول پوری کا علمی تعاون بھی مولانا کو حاصل رہا۔ یہ دیوان ۴۸ رصفحات پر مشتمل ہے۔

اُردو تالیفات

(۹) اسلامی شادی:

خیر القرون میں اسلامی شادی بیاہ اور حقوق زوجین کی نوعیت احادیث کی روشنی میں بتائی گئی ہے۔ یہ ایک مختصر سا رسالہ ہے۔ جو صرف ۳۵ رصفحات کا ہے۔ اس کو ۱۹۸۵ء میں مکتبۃ الحق جوگیشوری بمبئی نے شائع کیا تھا۔ دوبارہ شیخ الہند اکیڈمی دیوبند نے ۱۹۸۸ء میں شائع کیا اور فرید بک ڈپو دہلی نے ۲۰۰۵ء میں چھاپا، جو ۵۶ رصفحات پر مشتمل ہے۔

(۱۰) اسلامی نظام زندگی:

ایک مسلمان کو دنیا میں کس طرح زندگی گزارنی چاہیے اس کا بیان ہے۔ کتاب جیبی سائز ۲۵۶ رصفحات پر مشتمل ہے۔ اس کو الحاج عبد اللہ سمکری ابن حاجی احمد مکی نے رفاہِ عام کے لیے اپنی طرف سے ۱۹۵۰ء میں شائع کیا تھا۔ ادارہ فیضان معرفت بلساڑ گجرات نے مارچ ۲۰۰۴ء میں طبع کیا۔ جو بڑے سائز کے ۱۶۰ رصفحات پر مشتمل ہے۔

(۱۱) اسلامی ہند کی عظمت رفتہ:

ہندوستان میں اسلامی علوم وفنون، مسلمانوں کی علمی و دینی اور تاریخی و تمدنی سرگرمیوں کے حوالے سے اہم پہلوؤں کی نشان دہی کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کا وجود ہندوستان کے لیے موسم بہار ثابت ہوا۔ یہ کتاب ۲۴۳ ر صفحات پر مشتمل ہے۔ ندوۃ المصنفین دہلی نے اس کو ۱۹۶۹ء میں شائع کیا۔

(۱۲) افاداتِ حسن بصری:

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے حالات وواقعات میں ۵۶ رصفحات کا کتابچہ ہے۔ جس کو دائرہ ملیہ اسلامیہ مبارکپور نے ۱۹۵۰ء میں شائع کیا تھا۔ دوبارہ فرید بک ڈپوئی دہلی سے ۲۰۰۵ء میں شائع کیا گیا۔

(۱۳) ائمہ اربعہ:

اس میں امام ابوحنیفہؒ، امام حنبلؒ، امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کے حالات وفقہ پر اجمالی بحث کی گئی ہے۔ کتاب ۲۵۵ رصفحات پر مشتمل ہے۔ جس کو شیخ الہند اکیڈمی دیوبند نے ۱۹۸۹ء میں اہتمام سے طبع کرا کے شائع کیا ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن مکتبہ تنظیم اہل سنت لاہور نے ۱۹۴۶ء میں شائع کیا تھا۔

(۱۴) آثار واخبار:

چار علمی، دینی، تاریخی مقالات کا مجموعہ ہے۔ جو ۱۵۰ رصفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں تین مقالات آل عبدالرحمٰن سلیمانی، آل ابومعشر سندی اور آل مقسم قیقانی بصری کا تعلق قدیم اسلامی ہند کے علمی ودینی خانوادوں سے ہے، جو قدیم زمانے سے عرب میں مقیم تھے۔ چوتھا مقالہ امام ابوالحسن مدائنی کے سوانح پر ہے، جو اسلامی ہند کے پہلے مورخ ہیں۔ یہ کتاب نومبر ۱۹۸۸ء میں ندوۃ المصنفین دہلی سے اشاعت پزیر ہوئی۔

(۱۵) آسودگانِ خاک:

ان معروف وگم نام لوگوں کا تذکرہ ہے جو پیوند خاک ہو چکے ہیں۔ ان کی چالیس سالہ علمی زندگی میں روزنامہ انقلاب اور ماہنامہ البلاغ ممبئی میں ان کی اشاعت ہو چکی ہے۔

(۱۶) بناتِ اسلام کی علمی و دینی خدمات:

یہ کتاب خواتین اسلام کی دینی و علمی خدمات پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس کو بمبئی کے مشہور مکتبہ شرف الدین الکتبی و اولادہ' نے شائع کیا تھا۔ دوبارہ اس کو دائرہ ملیہ مبارک پور کی طرف سے شائع کیا گیا۔ تیسری بار اسلامک بک فاؤنڈیشن دہلی سے ۲۰۰۶ء میں مطبوع ہوئی جو ۱۰۴ رصفحات پر مشتمل ہے۔

(۱۷) تبلیغی و تعلیمی سرگرمیاں عہد سلف میں:

اس کا موضوع نام ہی سے ظاہر ہے۔ یہ ایک مختصر سا رسالہ ہے۔ جو صرف ۳۵ رصفحات کا ہے۔ اس کو ۱۹۸۵ء میں مکتبۃ الحق جوگیشوری بمبئی نے شائع کیا تھا۔ دوبارہ شیخ الہند اکیڈمی دیوبند نے ۱۹۸۸ء میں شائع کیا اور فرید بک ڈپوئی دہلی نے ۲۰۰۵ء میں شائع کیا، جو ۱۳۰ رصفحات پر مشتمل ہے۔

(۱۸) تدوین سیر و مغازی:

یہ کتاب ۳۲۰ رصفحات پر مشتمل ہے۔ اپنے موضوع پر اُردو میں یہ پہلی کتاب ہے۔ جو علم و تحقیق کا شاہکار ہے۔ اس کو شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند نے ۱۹۸۰ء میں اور فرید بک ڈپو نئی دہلی نے ۲۰۰۴ء میں زیورِ طبع سے آراستہ کیا۔

(۱۹) تذکرۂ علمائے مبارکپور:

یہ قاضی صاحب کی پچیس سالہ تحقیق و تلاش کا ثمرہ ہے۔ اس سے مبارکپور کی ساڑھے چار سو سالہ تاریخ، مدارس و مساجد اور شخصیات کا پتہ چلتا ہے۔ یہ کتاب ۲۹۲ رصفحات پر مشتمل ہے۔ اس کو دائرہ ملیہ مبارکپور نے ۱۹۷۴ء میں شائع کیا تھا۔ ترمیم و اضافہ کے بعد ۲۰۰۸ء میں دوبارہ شائع ہو رہی ہے اور ۳۷۵ رصفحات پر شامل ہے۔

(۲۰) جواہر القرآن:

مورّخِ اسلامؒ نے مسلسل چالیس سال تک روزنامہ انقلاب بمبئی کے لیے جواہر القرآن کے عنوان سے قرآن مجید کی آیات کی تفسیر لکھی۔ جس میں عصری حالات و مسائل پر بھی روشنی ڈالی۔ یہ کتاب مولانا کی قرآن فہمی اور تفسیری علوم پر ان کی مکمل دستگاہ کی تحریری دستاویز ہے۔

(۲۱) حج کے بعد:

یہ مختصر سا رسالہ ہے۔ جو ۴۰ر صفحات کا ہے۔ انجمن خدام النبی بمبئی نے ۱۹۵۷ء میں شائع کیا تھا۔ دانش بک ڈپو ٹانڈہ ضلع امبیڈکر نگر نے جون ۲۰۰۴ء مین اور فرید بک ڈپو نئی دہلی نے ستمبر ۲۰۰۵ء میں شائع کیا۔

(۲۲) خلافت راشدہ اور ہندوستان:

خلافت راشدہ کے عہد مبارک میں ہندوستان میں مسلمانوں سے تعلقات کی نوعیت، علمی و دینی اور فکری و تمدنی اخذ و استفادہ اور سیاسی و سماجی حالات کا بیان ہے۔ یہ کتاب ۲۸۰ر صفحات پر مشتمل ہے۔ ۱۹۷۲ء میں ندوۃ المصنفین دہلی نے اس کو شائع کیا۔ بعد میں تنظیم فکر و نظر سندھ پاکستان نے اس کا نیا ایڈیشن چھاپا۔

(۲۳) خلافت بنو امیّہ اور ہندوستان:

یہ بھی عرب و ہند تعلقات اور مسلمانوں کی علمی و دینی سرگرمیوں کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ قاضی صاحب کے قلم نے ماضی کے نہاں خانوں کی خوب سیر کرائی ہے۔ یہ کتاب ۱۷۶ر صفحات پر مشتمل ہے۔ ندوۃ المصنفین دہلی نے اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۷۵ء میں شائع کیا۔ پھر تنظیم فکر و نظر سندھ پاکستان نے اپنے یہاں سے اس کو زیورِ طبع سے آراستہ کیا۔

(۲۴) خلافت عباسیہ اور ہندوستان:

اس میں عباسی دورِ خلافت میں مسلمانوں اور ہندوستان کے درمیان کے تعلقات کی وضاحت ہے۔ یہ تاریخ وتذکرہ نگاری کی عمدہ روایت اور اسلامی اثرات کا نادر نمونہ ہے۔ کتاب ۵۵۸/ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ندوۃ المصنفین دہلی نے ۱۹۸۲ء میں شائع کیا۔ دوبارہ تنظیم فکر ونظر سندھ پاکستان نے اپنے اہتمام میں چھاپا۔

(۲۵) خواتین اسلام کی علمی و دینی خدمات:

یہ کتاب پہلے ''بنات اسلام کی علمی و دینی خدمات'' کے نام سے شرف الدین الکتبی بمبئی اور دائرہ ملیہ مبارکپور نے شائع کیا تھا۔ بعد میں کچھ حک و اضافہ کے بعد اس کو شیخ الہند اکیڈمی دیو بند نے شائع کیا۔ کتاب میں مزید معلومات کا اضافہ ہے۔ یہ کتاب ۱۸۰/ صفحات پر مشتمل ہے۔

(۲۶) خیر القرون کی درسگاہیں اور اُن کا نظام تعلیم و تربیت:

اس کتاب میں خیر القرون کی اسلامی درسگاہوں کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ عہدِ رسالت سے دورِ صحابہ وتابعین تک کے علمی حلقوں، طریقۂ تدریس اور نظام تعلیم کا بیان تاریخ وسیر کی کتابوں کی مدد سے کیا گیا ہے۔ ۳۹۲/ صفحات پر مشتمل ہے اور ۱۹۹۵ء میں شیخ الہند اکیڈمی دیو بند نے اس کو شائع کیا۔ دوبارہ فرید بک ڈپوئی دہلی سے ۲۰۰۴ء میں اشاعت پزیر ہوئی۔

(۲۷) دیارِ پورب میں علم اور علماء:

پوربی اضلاع کی سات سو سالہ علمی و دینی تاریخ، یہاں کے علمی خانوادوں کی خدمات، اہم تصنیفی کارناموں کی تفصیلات، علماء وصوفیاء کے تمدنی آثار، مدارس و خانقاہوں کے احوال مستند کتابوں کے حوالے سے بیان کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب ۴۸۲/ صفحات پر مشتمل ہے۔ جس

میں مشرقی ہندوستان میں علمی سرگرمیوں کا محققانہ تذکرہ ہے۔ اس کو بھی ندوۃ المصنفین دہلی نے پہلی بار ۱۹۷۹ء میں شائع کیا۔ دوسری بار ۲۰۰۸ء میں البلاغ پبلیشرز دلی نے شائع کیا جو ۵۱۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

(۲۸) صالحات:

یہ بھی ۶۴ صفحات کا کتابچہ ہے۔ جو خاص طور پر خواتین کے لیے لکھا گیا تھا۔ یہ پہلی بار بمبئی سے ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا۔ دوبارہ انصار گرلس انٹر کالج مبارکپور ضلع اعظم گڑھ نے شائع کیا۔

(۲۹) طبقات الحجاج:

یہ ۱۹۵ صفحات کی کتاب ہے۔ جس کو انجمن خدام النبی صابو صدیق مسافر خانہ بمبئی نے ۱۹۵۸ء میں شائع کیا تھا اور فرید بک ڈپو دلی نے ۲۰۰۶ء میں طبع کرایا۔ جو ۳۰۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

(۳۰) عرب و ہند عہد رسالت میں:

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، یہ کتاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں عرب و ہند کے درمیان جو مختلف نوع کے تعلقات تھے، ان پر روشنی ڈالتی ہے۔ یہ کتاب ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ ۱۹۶۴ء میں اس کا پہلا اڈیشن ندوۃ المصنفین دہلی نے شائع کیا۔ اس کو مصر کے ایک مشہور عالم الدکتور عبدالعزیز عزت عبدالجلیل نے عربی میں ترجمہ کیا اور ۱۹۷۳ء میں الھیئۃ المصریہ قاہرہ نے اس کو شائع کیا۔ سندھ (پاکستان) کی تنظیم فکر و نظر نے اس کا سندھی زبان میں ترجمہ کر کے ۱۹۸۶ء میں شائع کیا۔ کراچی کے ایک ادارہ مکتبہ عارفین نے بھی اسے طبع کرایا۔ فرید بک ڈپو نئی دہلی نے مئی ۲۰۰۴ء میں اور مکتبہ الحق جوگیشوری بمبئی نے ۲۰۰۷ء میں اس کی اشاعت کی۔

(۳۱) علمائے اسلام کی خونیں داستانیں:

پہلی صدی ہجری سے موجودہ دور تک کی اسلامی تحریکوں اور مسلم حکومتوں کے فتنوں میں علمائے اسلام کو دار و رسن کی جن آزمائشوں سے گزرنا پڑا، اُس کی داستان اس کتاب میں پیش کی گئی ہے۔ یہ کتاب احسان دانش کے اصرار پر لکھی گئی تھی، مگر اس کی اشاعت تقسیم ہند کے ہنگاموں کی نذر ہوگئی تھی۔ ساٹھ سال بعد اس کا مسودہ دستیاب ہوا اور ۲۰۰۸ء میں شائع ہوئی، جو ۲۴۸ صفحات پر مشتمل ہے، ناشر قاضی اطہر اکیڈمی مبارکپور ضلع اعظم گڑھ اتر پردیش انڈیا۔

(۳۲) علمائے اسلام کے القاب وخطابات:

یہ کتابچہ علمائے اسلام کے القاب وخطابات پر انتہائی تحقیقی مقالہ ہے۔ جس کو کتابی شکل دی گئی ہے۔ یہ مقالہ آپ کی کتاب (مآثر و معارف) میں شامل ہے۔ خاص طور سے اس سے مدارسِ عربیہ کے طلباء عزیز استفادہ کرسکتے ہیں۔ تاریخی اور تحقیقی طور پر بتایا گیا ہے کہ کون سا لقب کب اور کس کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ یہ رسالہ کی شکل میں ۴۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ ۲۰۰۴ء میں پہلی بار فرید بک ڈپو دلی نے شائع کیا ہے۔

(۳۳) علی وحسین:

یہ چھوٹے سائز کے ۳۳۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ ایک کتاب کی تاریخی غلطیوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس کو ۱۹۶۰ء میں مکتبہ دائرہ ملیہ مبارکپور نے شائع کیا تھا۔ پاکستان سے ۲۰۰۰ء میں شائع ہوئی اور اسلامک بک فاؤنڈیشن دلی نے بھی ۲۰۰۷ء میں شائع کیا۔ جو ۲۹۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

(۳۴) قاضی اطہر مبارکپوری کے سفر نامے:

یہ سفرنامہ مورّخ اسلامؒ کے اُن علمی و دینی اور تہذیبی و تاریخی دَورے کی تفصیل بیان

کرتا ہے۔ جو وقتاً فوقتاً ہندوستان اور بلادِ اسلامیہ وعربیہ اور ممالک افریقہ کے حوالے سے مولانا کے قلم سے صفحۂ قرطاس پر منتقل ہوئے۔ یہ سفرنامہ عام سفرناموں سے مختلف اور انتہائی معلوماتی و تحقیقی ہے۔ اس کو پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ مورخِ اسلامؒ کی نظر اسلامی و دینی پہلوؤں کی طرف خاص طور سے اُٹھتی تھی اور ان کا قلم علوم ومعارف کی کہکشاں بناتا تھا۔ اس کو قاضی اطہر اکیڈمی لکھنؤ نے اگست ۲۰۰۵ء میں ۳۴۹ رصفحات پر مشتمل شائع کرایا۔

(۳۵) قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک:

یہ قاضی صاحب کی خودنوشت نہایت مختصر آپ بیتی ہے۔ پہلے اس کو دائرہ ملیہ مبارکپور نے شائع کیا تھا۔ پھر مکتبہ صوت القرآن دیوبند نے دوسرا صاف ستھرا اڈیشن شائع کیا۔ اس کے صفحات ۵۶ رہیں۔

(۳۶) کاروانِ حیات:

خودنوشت سوانح حیات کو ماہ نامہ ضیاء الاسلام شیخوپور نے اپنے قاضی اطہر مبارکپوری نمبر اگست تا دسمبر ۲۰۰۳ء میں شائع کیا۔ دوبارہ الگ سے کتابی صورت میں فرید بک ڈپو دہلی نے ۲۰۰۴ء میں بہت خوب صورت انداز میں چھاپ کر شائع کیا۔ اس میں ''قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک'' کو بھی شامل کرلیا گیا ہے۔ جو ۲۳۸ رصفحات پر مشتمل ہے۔

(۳۷) مآثر ومعارف:

یہ پچیس مقالات کا مجموعہ ہے۔ مختلف موضوعات مثلاً حدیث کی جمع وتدوین، دارِارقم کی علمی مرکزیت وحیثیت، تاریخ ورجال، فرقہ ومکاتب فکر، یوروپ میں مسلمانوں کی علمی خدمات وغیرہ پر محققانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ یہ کتاب ۲۷۱ رصفحات پر مشتمل ہے۔ ۱۹۷۱ء میں اس کو ندوۃ المصنفین دہلی نے شائع کیا۔

(۳۸) محمد کے زمانہ کا ہندوستان مع ہندوستان صحابہ کے زمانہ میں:

ناشر فرید بک ڈپو دلی۔ صفحات ۳۶۶ر سن طباعت ۲۰۰۵ء۔ اصل میں یہ کتاب مورّخِ اسلام کی دو کتابوں کی تلخیص ہے۔ پہلا حصہ ''عرب و ہند عہد رسالت میں''۔ دوسرا حصہ ''خلافت راشدہ اور ہندوستان'' سے ملخص ہے اور دونوں کو ایک جلد میں شائع کیا گیا ہے۔ اس کی تلخیص و تسہیل کرنے والے ایک پاکستانی عالم جناب مولانا ابومجاہد شمشیر ہیں۔ یہ کتاب پہلےمکتبہ ارسلان بنوری ٹاؤن کراچی پاکستان سے شائع ہوئی۔ اس کے بعد فرید بک ڈپو دلی نے اسی کا عکسی ایڈیشن طبع کرایا۔

(۳۹) مسلمان:

اسلامی آداب معاشرت پر ایک عام فہم انداز کا ۶۴ر صفحات پر مشتمل کتابچہ ہے۔ جس کو جمعیۃ المسلمین جنجیرہ بمبئی نے ۱۹۵۳ء میں شائع کیا تھا۔ دوبارہ انصار ایجوکیشنل اینڈ ویلفیر اکیڈمی مبارکپور نے ۱۹۷۶ء میں پھر انجمن اسلام ہائی اسکول بمبئی نے شائع کیا۔ ساجد لکھنوی نے بھی لکھنؤ سے شائع کیا۔ فرید بک ڈپو نئی دہلی نے ۲۰۰۴ء میں اور انجمن شیخ الہند قاسم آباد انجان شہید ضلع اعظم گڑھ یوپی نے ۲۰۰۶ء میں شائع کیا۔

(۴۰) مسلمانوں کے ہر طبقے میں علم و علماء:

یہ کتاب ۲۲۸ر صفحات میں قاضی صاحب کی وفات کے بعد چھپی اور اس پر مقدمہ بھی قاضی صاحب کے قلم سے ہے۔ اس کو شیخ الہند اکیڈمی دیوبند نے بڑے خوب صورت انداز میں ۱۹۹۸ء میں شائع کیا۔

(۴۱) مطالعات و تعلیقات:

اس میں مورّخِ اسلام کے وہ مقالات ہیں جو ماہنامہ البلاغ ممبئی کی ۲۶ر سال تک

آپ کی اڈیٹری میں مستقل عنوان سے شائع ہوتے رہے ہیں۔ کتابوں کے مطالعہ کے بعد تعلیقات وتبصرہ کی صورت میں یہ مضامین نہایت پرمغز اور تحقیقی ہوا کرتے تھے۔

(۴۲) معارف القرآن:

توحید، رسالت، کتاب اور دینی زندگی کے عنوانات پر قرآن کریم کی ایک سو آیات کی تشریح وتوضیح کی گئی ہے۔ یہ ۱۵۰ر صفحات کی کتاب ہے۔ جس کو تاج کمپنی بمبئی نے ۱۹۵۶ء میں شائع کیا۔ کتب خانہ فیض ابرار انکلیشور ضلع بھروچ گجرات نے ۲۰۰۶ء میں دوبارہ چھاپا۔

(۴۳) مکتوبات امام احمد بن حنبل:

اس کتابچہ میں امام احمد بن حنبل کے مکتوبات ہیں۔ جو مختلف اوقات میں مختلف طبقہ کو قرآن وحدیث کی روشنی میں لکھے گئے ہیں۔ یہ مکتوبات ایمان ویقین کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس رسالہ کو فہیم بک ڈپو مئو ناتھ بھنجن یوپی نے ۲۰۰۶ء میں شائع کیا ہے۔ جو ۴۸ر صفحات پر مشتمل ہے۔

(۴۴) مئے طہور:

قاضی صاحب کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔ جو ''مئے طہور'' کے نام سے مرتب ہو کر مولانا قمر الزماں مبارکپوری کے مبسوط مقدمہ کے ساتھ فرید بک ڈپو دہلی کی طرف سے ۲۰۰۶ء میں شائع ہو چکا ہے۔ جو ۴۵۸ر صفحات پر مشتمل ہے۔ ناشر قاضی اطہر اکیڈمی مبارکپور ضلع اعظم گڑھ اتر پردیش انڈیا۔

(۴۵) ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں:

جیسا کہ عنوان کتاب سے متبادر ہے۔ اس کتاب میں عربوں کی حکومت اور ہندوستان

کی سیاسی وسماجی، علمی ودینی اور تمدنی زندگی پر اسلام کے اثر ونفوذ کی مکمل تاریخ بیان کی گئی ہے۔ ۳۴۰ر صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۷ء میں ندوۃ المصنفین دہلی نے شائع کیا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن مکتبہ عارفین کراچی نے شائع کیا۔ تنظیم فکر ونظر سندھ پاکستان نے اس کا ایک اور ایڈیشن شائع کیا۔ مصر کے دکتور عبدالعزیز عزت عبدالجلیل نے اس کا عربی میں ترجمہ کر کے ''حکومات العرب فی السند والهند'' کے نام سے شائع کیا اور اس کو اسلام آباد یونیورسٹی پاکستان کے مجلّہ الدراسات العلمیۃ نے قسط وار شائع کیا۔ پھر مکتبہ آل یداللہ بکریہ ریاض نے اس کو کتابی شکل میں شائع کیا۔

(۴۶) ہندوستان میں علم حدیث کی اشاعت:

یہ رسالہ اصل میں ایک مقالہ ہے۔ جو سندھ پاکستان کی ادبی سندھی کانفرنس منعقدہ ۱۹۸۴ء میں مورّخِ اسلامؒ نے خود شریک ہوکر پڑھا تھا۔ اس میں پوری تحقیق کی گئی ہے کہ ہندوستان میں علم حدیث ابتداء اسلام میں آیا ہے۔ جب اسلام کی روشنی سندھ میں پہنچی تو ساتھ ہی یہ بہار بھی آئی۔ ناشر فہیم بک ڈپو مئوناتھ بھنجن صفحات ۴۸ر طباعت ۲۰۰۶ء۔ ناشر فرید بک ڈپو دلی صفحات ۴۸ر طباعت ۲۰۰۶ء۔